http://digestpk.blogspot.com/

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی

دسمبر 2010

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

http://digestpk.blogspot.com/

چینی نگینہ چینی — مدیر اعلیٰ — 11
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

قانونی دھوکا — نشور ھادی — 18
زرپرست ماحول میں پرورش پانے
والے نفس پرستوں کی داستانِ عبرت

حسرتِ ناتمام — عکس فاطمہ — 63
معاملہ فہم مجرم کا قصہ، اُسے اپنے
گرفت میں نہ آنے کا یقین تھا

وطن پرست — مختار آزاد — 67
ایک ہی منزل کے دو مسافروں کا
ماجرا، سفر ایک تھا لیکن انداز جدا جدا

گواہی — بابر نعیم — 81
ایک معمولی سراغ رساں کا معاملۂ زیست
...وہ دیرپا شہرت کی خواہش مند تھی

للکار — طاہر جاوید مغل — 90
محبت کے محاذ پر ڈٹے ہوئے شخص کی جدوجہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

پروانۂ زر — محمد عرفان آزاد — 133
موقع شناس مجرموں کی عیاریاں
......جہاں ہر ذرہ آفتاب تھا

تیسرا آدمی — ثمر عباس — 147
دو وکیلوں کے مابین ہونے والی باہمی
جرح و بحث کے دلچسپ کمالات

جلد 39 • شمارہ 12 • دسمبر 2010 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

زن گزیدہ — رضوانہ منظر — 161
اس شخص کا افسانہ جو ارتکاب
جرم کا واحد گواہ تھا

گرداب — اسما قادری — 164
تقدیر کی فسوں گری قسمت کی چالبازی یا مقدر
کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

دل کا معاملہ — آصف ملک — 195
اس سائنس داں کی مشکل جس کی ایجاد
اس کے لیے وبالِ جاں بن گئی تھی

چھوٹی سی بات — محمد عمر نعمان — 207
خودکشی کی واردات سے شروع ہونے
والے ایک منطقی انجام کی دلچسپ روداد

کایا پلٹ — سلیم انور — 215
ایک سادہ لوح عورت کا قصہ جس
کے گرد سازشی افراد کا گھیرا بڑھ رہا تھا

بازی گر — تنویر ریاض — 229
ایک تشنہ کام کی چہرہ نمائی... جس کے تمام
خواب کاغذی کشتیوں کے مانند ڈوب گئے تھے

شہر آشوب — مریم کے خان — 258
نئے موسموں کے انتظار میں زندگی تیاگ
دینے والے جانبازوں کا ماجرائے دگرگوں

تراش خراش — ادارہ و قارئین — 000
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے... کچھ
آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

http://digestpk.blogspot.com/

زرپرست ماحول میں پرورش پانے والے نفس پرستوں کی داستانِ عبرت

نشور ھادی

قانونی دھوکا

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ ......اور یہ رنگ بڑے معصوم اور دلکش ہوتے ہیں ...... مگر کیا مرد اور کیا زن ...... یہ شکم سیر ہوتے ہیں تو نفس کا طاغوت ان کے سروں پر ناچنے لگتا ہے ...... دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہوں نے دولت حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے اپنائے اور پھر آسودہ حال ہو کر معاشرے کی اخلاقی ...... سماجی ......اور روایتی قدروں کو اپنے پاؤں تلے پامال کرنے لگیں ...... نِت نئی اختراعیں تراش کر اپنی ذات کی تسکین کے لیے رشتوں کا تقدس پاؤں تلے کچلنے والوں کی ایسی کہانی ...... جو دولت کے پجاری اور نفس کے بے دام غلام بن چکے تھے ...... خواہشات کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال کر تسکینِ راحت تلاش کرنے والے ان مکروہ چہروں سے پردہ اٹھتا ہے تو پھر ایسی گھناؤنی حقیقتیں سامنے آتی ہے کہ شرم سے نگاہیں جھک جاتی ہیں۔

روحی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور آہستہ آہستہ دھواں اگلتے ہوئے پُرخیال انداز میں اپنے سامنے رکھے ہوئے پیگ کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ اس کا تیسرا پیگ تھا۔ جب اس نے پینا شروع کیا تھا تو رات نہیں ہوئی تھی لیکن اب اندھیرا پھیلے ہوئے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ کمرے کے سکوت میں دیوار گیر کلاک کی بہت مدھم ”ٹک... ٹک“ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے کے باہر اس بڑے اور نہایت شان دار بنگلے میں اگر کہیں کوئی آواز ہو بھی رہی ہوگی تو وہ اس کمرے میں نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ وہ ساؤنڈ پروف تھا۔

اپنی خواب گاہ کو ساؤنڈ پروف بنوانا روحی کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا صرف شوق تھا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کا باپ جمشید راؤ نہایت دولت مند شخص تھا۔

وہ گلاس روحی نے ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالا اور پھر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اس ریوالونگ چیئر کو جھلانے لگی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خمار آلود آنکھوں میں غور و فکر کی نادیدہ پرچھائیاں تھیں اور اس کا دماغ ان پرچھائیوں سے نبرد آزما تھا۔

ایک منٹ بعد اس نے چوتھا پیگ بنایا پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے اس کے قدم ایک کپ بورڈ کی طرف بڑھے۔ وہ بغیر اسٹریپ کی اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے ہوئے تھی جس کی ”ٹھک ٹھک“ میں دیوار گیر کلاک کی ”ٹک ٹک“ بالکل دب گئی۔

شراب کی بوتل روحی نے کپ بورڈ میں رکھی۔ بوتل رکھ کر وہ واپس اپنی کرسی کی طرف بڑھی۔ اس مرتبہ وہ بیٹھی نہیں۔ اس نے تپائی سے سگریٹ کیس اٹھایا، اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی پھر ایک گہرا کش لیتے ہوئے اس نے اپنے وینیٹی بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو کرسی کی پشت سے لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ کیس اور لائٹر وینیٹی بیگ میں رکھا۔ وینیٹی بیگ اس نے اپنے بستر پر اچھال دیا اور پھر گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لینے کے بعد کمرے میں ٹہلنے لگی۔

اس نے ٹہلتے ٹہلتے چوتھے پیگ کو اپنے حلق میں

http://digestpk.blogspot.com/

انڈیلا۔ اس کی سگریٹ اب ختم ہورہی تھی۔ وہ اس نے تپائی کے قریب جاکر ایش ٹرے میں بجھائی اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ گلاس اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ جب وہ کمرے سے نکلی... اس کے قدم ایک طرف اٹھتے رہے۔ دو ایک ملازموں سے سامنا ہوا۔ روحی نے ان کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ ملازم بھی نظریں جھکا کر گزر گئے۔ روحی کو اس عالم میں دیکھنا ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

جس کمرے کے دروازے پر روحی کے قدم رکے، وہ اس کی ماں کی خواب گاہ تھی۔ روحی نے ایک انگلی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے؟'' اندر سے بیگم جمشید کی آواز آئی۔

''میں ہوں مام...! روحی۔''

''آجاؤ۔ دروازہ بند نہیں ہے۔''

روحی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت دروازے کی طرف بیگم جمشید کی پشت تھی۔ وہ کپڑوں کی الماری میں سے کوئی ساڑی منتخب کررہی تھی۔ غالباً اسے کہیں جانا تھا اور وہ اس کی تیاری کررہی تھی۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے مام!'' روحی نے کہا اور بیگم جمشید کے بستر کی طرف بڑھی۔

''بولو!'' بیگم جمشید الماری سے ساڑی کا ایک ہینگر نکالتے ہوئے مڑی اور روحی کے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر چونکی۔ ''ابھی تک پی رہی ہو؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جی مام!'' روحی نے بے جھجک جواب دیا۔

''یہ ٹھیک بات نہیں ہے روحی!'' بیگم جمشید نے ناگواری سے کہا۔ ''تمہاری شراب نوشی بڑھتی جارہی ہے۔ پہلے تم زیادہ نہیں پیتی تھیں۔''

''وہ تو بہت پرانی بات ہوگئی۔'' روحی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب تو میں عموماً زیادہ پینے لگی ہوں۔ کبھی کوئی ذہنی دباؤ پڑ جائے تو...''

''اس وقت کیا ذہنی دباؤ ہے؟'' بیگم جمشید نے ساڑی کا ہینگر بستر پر ڈالتے اور روحی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹھ جائیے نا!'' روحی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر ماں کے بیٹھنے کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ''دراصل بات کچھ ایسی ہے کہ مجھے ہمت کرنے کے لیے مزید پیگ کا سہارا لینا پڑا۔ میرے لیے تو اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ ڈیڈ بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دیں گے... لیکن آپ اب بھی تھوڑی سی بیک ورڈ ہیں۔''

''کیا؟'' بیگم جمشید کی تیوری چڑھ گئی جیسے روحی نے اس کے لیے کوئی بہت برُا لفظ کہہ دیا ہو۔ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''یقیناً تمہیں اس وقت اتنا زیادہ نشہ ہوچکا ہے جو تمہاری برداشت سے باہر ہے ورنہ تم یہ بات نہ کہتیں۔ میں اس ماڈرن سوسائٹی کی عورت ہوں جس سے زیادہ ماڈرن ابھی ہمارے ملک میں کوئی نہیں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں نے کبھی کبھی محسوس کیا ہے کہ بعض معاملات میں آپ کے خیالات کچھ فرسودہ ہیں۔ میں آپ سے جو بات کہنے آئی ہوں، وہ کچھ ایسی ہی ہے کہ آپ کا فوری ردِعمل تو نیگیٹو ہی ہوگا، حالانکہ آپ بھی... خیر چھوڑیے! میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ کوئی شریف گائنا لوجسٹ جو بعد میں مجھے بلیک میل کرنے کے بارے میں نہ سوچے۔''

بیگم جمشید فوری طور پر تو چونکی پھر اس نے تیزی سے کہا۔ ''گائنا لوجسٹ کی ضرورت؟... کیوں؟... کیا تمہاری کوئی دوست...''

''نہیں مام!'' روحی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ہی ضرورت ہے۔ شبہ تو گزشتہ مہینے ہی ہوگیا تھا پھر اس مہینے بھی...'' روحی نے ایک گھونٹ لیا۔ ''آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات؟''

بیگم جمشید کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ روحی کو اس طرح تک رہی تھی جیسے کوئی بھوت نظر آگیا ہو۔

روحی ایک ٹشو پیپر سے اپنے گیلے ہونٹ خشک کرکے بولی۔ ''میں نے پندرہ دن تو انتظار کیا پھر آج صبح ایک لیڈی ڈاکٹر سے ملی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ اس نے میرا چیک اپ کرنے کے بعد مجھے مبارک باد دی۔ اب میں مجبور ہوگئی کہ آپ سے بات کروں۔ آپ ڈیڈ کو بتا دیجیے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ بندوبست کرسکتے ہیں۔''

''روحی!'' بیگم جمشید کی آواز غصے سے کانپ گئی۔ ''تم یہ اس طرح کہہ رہی ہو جیسے یہ کوئی عام سی بات ہو۔''

''دیکھا، غصہ آگیا نا آپ کو... میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کا فوری ردِعمل تو نیگیٹو ہی ہوگا۔''

''تو کیا پازیٹو ہونا چاہیے تھا؟'' بیگم جمشید زیادہ بھڑک کر بولی۔

''مام، پلیز!'' روحی نے کچھ منہ بنایا۔ ''ہماری سوسائٹی میں اب یہ کوئی خاص بات نہیں رہی۔ ہم لوگ ایک دقیانوسی زمانے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اب یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ احتیاط کے باوجود بعض اوقات کوئی گڑبڑ ہو

جاتی ہے۔ میری عمر چوبیس سال ہوچکی ہے۔ اس عمر میں جذبات تو بھڑکتے ہیں۔''

''اگر تم اپنے جذبات کے ہاتھوں بے بس ہوچکی تھیں تو مجھے بتاتیں۔ تمہاری شادی جلد از جلد کرادی جاتی۔ تم تو خود ہی شادی کے نام سے بھڑکتی رہی ہو۔''

''شادی!'' روحی نے پہلے سے زیادہ بُرا منہ بنایا۔ ''قانونی دھوکا جو معاشرے کو دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے جکڑ بندی بھی ہوجاتی ہے۔ انسان کو اپنی خواہشات چوری چھپے پوری کرنا پڑتی ہیں لیکن میں اپنی زندگی سے آزادانہ طور پر لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔''

''طوائف بن کر زندہ رہنا چاہتی ہو؟'' بیگم جمشید غصے سے کانپنے لگی۔

روحی دھیرے سے ہنسی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بیگم جمشید نے کوئی مضحکہ خیز بات کہی ہو۔

''روحی!'' بیگم جمشید نے خود پر قابو پایا... اور غصے کے باوجود دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہاں آؤ اور مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ اس سے تمہاری شادی کرادی جائے گی۔''

''اسے شاید دوسرا دھوکا کہیں گے جو معاشرے کو دیا جائے گا۔'' روحی نے بڑے مفکرانہ انداز میں کہا اور بیگم جمشید کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ''میں کسی کے ساتھ یہ دھوکا نہیں کرسکتی۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ مجھے اندازہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد اس سے میرا دل بھر جائے گا، میں کسی اور کو پسند کرنے لگوں گی۔ شادی تو مجھے باندھ دے گی۔ میں مجبور ہوجاؤں گی کہ اپنی خواہشات چوری چھپے پوری کروں یا پھر میرا لائف پارٹنر ایسا ہو جو ان باتوں کو اہمیت نہ دے۔''

''روحی!'' بیگم جمشید کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ''تم اس وقت چلی جاؤ میرے پاس سے... جب تم نشے میں نہ ہو تو بات کرنا۔ جو مناسب اقدام ہوگا، وہ کیا جائے گا۔''

''نہیں مام!'' روحی مسکرائی۔ ''آئندہ ایسا کوئی موقع آئے گا تو میں پیے بغیر آپ سے بات کرلوں گی۔ آج تو پہلا موقع ہے اس لیے مجھے اس کا سہارا لینا پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد آپ میری ایک اچھی دوست بن جائیں گی۔''

''میں کہتی ہوں... اس سے پہلے کہ میں آپے سے باہر ہوجاؤں، تم یہاں سے چلی جاؤ۔''

''نہیں مام!'' روحی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ساری بات اسی وقت ختم کرنا چاہتی ہوں۔ آخر آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں؟ میں نے ابھی کہا تھا، آج کا دور آپ کے دور سے مختلف ہے۔ میں خود کو مجبور نہیں سمجھتی۔ آپ نے اپنے دور کی وجہ سے مجبوراً ڈیڈ سے شادی کرلی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' بیگم جمشید نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مجبوراً سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''افسوس ہے کہ میں اتنی عمر کی ہوگئی لیکن آپ نے مجھے نہیں سمجھا۔ بچپن ہی سے میرا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ میری آنکھیں، میرے کان بہت تیز ہیں۔ میں دیوار سے ادھر کی آوازیں سن لیتی ہوں۔ ایک جملہ پڑھ کر ساری کہانی میری سمجھ میں آجاتی ہے۔ مجھے اب یاد نہیں لیکن وہ کوئی ایک ہی جملہ تھا جس نے مجھے آپ کی اور ڈیڈ کی کہانی سنا دی تھی۔ جوانی میں آپ اور ڈیڈ ایک دوسرے سے ملے تھے، ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے اور وہ پسندیدگی اس حد تک بڑھی تھی کہ آپ دونوں کی شادی سے پہلے ہی میرا وجود دنیا میں آگیا تھا۔ پسندیدگی تو خیر اپنی جگہ لیکن میری وجہ سے بھی آپ مجبور ہوگئی تھیں کہ ڈیڈ سے شادی کرلیں۔''

یہ سن کر بیگم جمشید کا چہرہ فق پڑ گیا۔

روحی بولتی رہی۔ ''شادی کے بعد ڈیڈ آپ کو لے کر بیرونِ ملک نکل گئے۔ واپسی ڈیڑھ سال بعد ہوئی تھی۔ اگر آپ دونوں یہیں رہتے تو لوگوں کو یہ بتانا مشکل ہوجاتا کہ میں شادی کے صرف چھ ماہ بعد کیسے پیدا ہوگئی تھی۔''

یکایک بیگم جمشید کا دایاں ہاتھ اٹھا لیکن تھپڑ پڑنے سے پہلے ہی روحی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے مام؟'' وہ کچھ حیرت سے بولی۔ ''آپ کیوں چاہتی ہیں کہ آپ کا یہ رویہ مجھے اور زیادہ زبان دراز کردے۔''

بیگم جمشید کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''اس سے زیادہ زبان درازی اور کیا ہوگی؟''

روحی بولتی رہی۔ ''میں پہلے یہ سب کچھ اپنی زبان پر نہیں لائی تو اس کا سبب یہ نہیں کہ میں اسے برا سمجھتی ہوں... ہرگز نہیں! یہ سب کچھ تو انسانی فطرت ہے۔ میں تو یہ بھی جانتی ہوں مام کہ چند مہینے پہلے مسز جعفری نے اسقاط کرایا تھا۔ اس کے لیے ڈیڈ ہی نے بات کی تھی۔ ڈاکٹر شیریں سے ان کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔''

بیگم جمشید کچھ سوچتی ہوئی ایک طرف دیکھتی رہی۔ غالباً اس میں یارا نہیں رہا تھا کہ بات کرتے ہوئے روحی سے آنکھیں ملائے۔

''آپ...'' روحی نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن دروازہ کھلنے کی آواز سن کر فوراً خاموش ہوگئی۔

کمرے میں آنے والا جمشید راؤ تھا۔ سوٹ میں ملبوس

http://digestpk.blogspot.com/

اور پرفیوم سے مہکا ہوا... جیسے کہیں جانے کے لیے تیار ہوا ہو۔

"ارے بھئی، تم اب تک تیار نہیں ہوئیں؟" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا پھر فوراً ہی بولا۔ "اوہو! بیٹی سے باتیں ہو رہی ہیں۔" وہ قریب آ گیا۔ اس نے روحی کی کمر پر تھپکی دی۔ "ماں سے باتیں کرتے ہوئے یہ بھی جاری ہے۔" اس کا اشارہ روحی کے ہاتھ میں موجود گلاس کی طرف تھا۔ اس نے یہ بات ہنستے ہوئے کہی تھی۔

"یس ڈیڈ!" روحی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ شاید کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں، ایک پارٹی ہے۔"

"آئی ایم سوری! میں ایک ضروری بات کرنے مام کے پاس آئی تھی۔ میری باتوں ہی کی وجہ سے مام تیار نہیں ہو سکیں۔" روحی نے خاموش ہو کر گلاس کا آخری گھونٹ پیا اور گلاس آگے بڑھ کر ایک تپائی پر رکھ دیا۔ "بس میں جا رہی ہوں۔" اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اب اس کی چال میں خفیف سی ڈگمگاہٹ تھی۔

جمشید راؤ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر بیوی کی طرف متوجہ ہو کر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "اس وقت یہ کچھ زیادہ پی گئی ہے۔"

"اور آپ شاید اس کے زیادہ پی جانے کو اہمیت نہیں دے رہے ہیں؟"

"کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

"اور اس کبھی کبھی میں کوئی گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اس وقت مجھے کیا بتا کر گئی ہے۔"

بیگم جمشید کے غیر معمولی سنجیدہ لہجے کے باعث جمشید راؤ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے بیوی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کہہ رہی تھی کہ میں آپ سے بات کر کے اس کے ابارشن کا بندوبست کرا دوں۔"

"او مائی گاڈ!" جمشید راؤ نے آہستگی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور پھر پیشانی رگڑتے ہوئے بولا۔ "یہ وہ کیا کر بیٹھی۔"

"زیادہ پی جانے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہے نا؟" بیگم جمشید نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ جوانی کا نشہ اس سے کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔" جمشید راؤ بیوی کی طرف دیکھے بغیر سوچتے ہوئے بولا۔ "اس قسم کے معاملات میں بس احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات احتیاط کے باوجود گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

بیگم جمشید نے کہنا چاہا... جیسے مسز جعفری کے معاملے میں گڑبڑ ہو گئی ہو گی...' لیکن یہ بات وہ زبان پر نہیں لا سکی۔ ایک سہما ہوا چور خود اس کے دل میں بھی موجود تھا۔

"وہ ہے کون؟" جمشید راؤ نے بیوی سے پوچھا۔ "اس سے بے بی کی شادی کرا دیتے ہیں۔"

"وہ شادی نہیں کرنا چاہتی، اس سے نجات چاہتی ہے۔ اسے آزاد رہنا زیادہ پسند ہے۔" بیگم جمشید کا لہجہ آخر میں کچھ تلخ ہو گیا۔

"ہوں۔" جمشید راؤ کچھ سوچنے لگا پھر یکایک بولا۔ "خیر! میں دیکھوں گا۔ تم اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اب کچھ دیر تو ہو جائے گی پارٹی میں پہنچنے میں۔"

بیگم جمشید کا خیال یہ تھا کہ اس وقت جمشید راؤ پارٹی کو بھول کر بیٹی کے مسئلے پر بات کرے گا تو اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ وہ کچھ بولی نہیں اور کپڑے تبدیل کرنے کے لیے ایک خوب صورت چوبی پارٹیشن کے پیچھے چلی گئی۔

جمشید راؤ ٹہلتا ہوا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر ڈاکٹر شیریں سے رابطہ کیا۔

"اس وقت میری یاد کیسے آ گئی راؤ صاحب؟" وہ بولی۔ "کیا کوئی اور کیس ہے؟" وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"ہاں ڈاکٹر شیریں!" جمشید راؤ نے کہا۔ "لیکن اس مرتبہ معاملہ میرا نہیں ہے۔" وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا جس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ اس کی آواز اس کی بیوی کے کانوں میں نہ جا سکے۔

ڈاکٹر شیریں بولی۔ "تو آپ کا کوئی دوست..."

"نہیں ڈاکٹر!" جمشید راؤ نے اس کی بات کاٹی۔ "بات میرے ہی گھر کی ہے۔ بے بی کہیں کچھ گڑبڑ کر بیٹھی ہے۔"

"روحی؟" ڈاکٹر شیریں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔" جمشید راؤ نے کہا۔ "وہ چوبیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس عمر میں اس نوعیت کا امکان تو رہتا ہے۔ بہرحال، یہ معاملہ صاف تو کرنا پڑے گا۔ میں آپ کو بے بی کا موبائل نمبر بتا دیتا ہوں۔ آپ اس سے بات کر کے وقت وغیرہ کا تعین کر لیجیے۔" جمشید راؤ نے اسے روحی کا نمبر بتایا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر شیریں بولی۔ "میں آپ کا حوالہ دے کر اس سے بات کر لوں گی۔"

"اس کام میں دیر نہ ہو۔" جمشید راؤ نے تاکید کی۔

"آج کل میں ہی ہو جانا چاہیے۔"

"میں ابھی بے بی سے بات کر لیتی ہوں۔"

"او کے!" جمشید راؤ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

بیگم جمشید کپڑے تبدیل کر کے چوبی پارٹیشن کے عقب سے نکل آئی اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

جمشید راؤ نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "ابھی تمہیں پندرہ منٹ تو اور لگ جائیں گے۔ خیر، وہ میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ وہ ابھی بے بی سے بات کر لے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم خوامخواہ اتنی سنجیدہ اور پریشان نظر آ رہی ہو۔"

بیگم جمشید کچھ نہیں بولی۔ اگرچہ قدم اس کے بھی بہک چکے تھے، اس کے باوجود وہ ایک طویل عرصہ گزار کر بھی اس سوسائٹی کے رنگوں میں خود کو پوری طرح نہیں رنگ سکی تھی۔ شاید اس کا سبب اس کا خاندانی پس منظر تھا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ شاہراہوں پر ٹریفک ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ ایسی صورت میں کسی کار کی تیز رفتاری، حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ روحی کو اس کا احساس اچانک ہوا تو اس نے فوراً اپنی کار کی رفتار کم کر دی۔

یہ کیا حماقت تھی؟ اس نے اپنی تیز رفتاری کے بارے میں سوچا اور اسے خیال آیا کہ اس کے دماغ سے شراب کا اثر ابھی کم نہیں ہوا تھا لیکن اتنا کم ضرور ہوا تھا کہ وہ اس بارے میں سوچ تو سکے۔ اس نے اپنی کار ایک ایسی سڑک پر موڑی جہاں ٹریفک بہت کم تھا۔ اس سڑک کے آنے والے موڑ پر جوس وغیرہ کی ایک دکان تھی۔ لوگ وہاں اپنی گاڑیاں کھڑی کر کے کچھ پیتے پلاتے تھے۔ روحی نے بھی وہیں گاڑی روکی۔ دکان کے ملازم لڑکے گاڑیوں کے درمیان گھوم پھر کر لوگوں کے آرڈرز لے رہے تھے۔ روحی نے ایک لڑکے سے لیمن اسکواش منگوایا تھا۔ لیمن اسکواش سے شراب کے اثرات کم ہو سکتے تھے۔

روحی کا مشاہدہ واقعی بہت تیز تھا۔ وہ کسی لمحے بھی اپنے آس پاس کے ماحول سے بے خبر نہیں رہتی تھی۔ کار روکتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے جس جگہ اپنی کار روکی تھی، وہیں برابر میں قربان بیگ کی کار کھڑی تھی۔ کار میں وہ اکیلا ہی تھا۔ روحی اس سے اپنے تعلقات منقطع کرنے کے بعد نہیں چاہتی تھی کہ اب اس سے کہیں آمنا سامنا ہو لیکن اس وقت وہ ناخوش گوار اتفاق ہو ہی گیا۔ اس وقت وہ یہ بھی کر سکتی تھی کہ اپنی کار ریورس گیئر میں ڈال کر بہ سرعت وہاں سے نکل جاتی لیکن کسی بھی صورت حال سے فرار بھی اس کا مزاج نہیں تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کر چکی تھی کہ قربان بیگ نے اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ قربان بیگ کو یہ تاثر بھی نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اس سے ڈر گئی ہے، تاہم لیمن اسکواش آنے تک وہ ایسی بنی رہی جیسے اس نے قربان کو دیکھا ہی نہ ہو۔

قربان بیگ کی کار لیفٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ روحی سے اس کا فاصلہ دو ڈھائی فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ روحی اپنے چہرے پر اس کی تیز آنکھوں کی چبھن محسوس کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے ہنی؟" آخر قربان بیگ سے خاموش نہیں رہا گیا۔ "اب میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرو گی؟"

روحی نے آہستگی سے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چونکنے کی اداکاری کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ قربان بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"میں نے جب یہاں کار روکی تھی تو تمہیں دیکھ لیا تھا۔"

"پھر بھی انجان بنی رہیں؟"

"تمہیں آخری ملاقات یاد نہیں؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اب ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔"

"مجھے بالکل اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ تم اس وقت سنجیدہ تھیں۔ میں نے اسے مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب تمہارا موبائل فون بھی مجھے ہر وقت بند ملنے لگا تو مجھے بہت الجھن ہوئی۔ تم جس کار میں مجھ سے ملنے آتی تھیں، اس کا نمبر مجھے یاد تھا۔ رجسٹریشن آفس کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ اس کار کی مالکہ کا نام شمسہ حیدر ہے۔ میں سمجھا کہ تم نے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہے۔ بہرحال، میں کسی نہ کسی طرح اس گھر تک پہنچ گیا جہاں وہ کار تھی۔ اس وقت مجھے بہت حیرت ہوئی جب میں نے شمسہ حیدر کو دیکھا جو تم نہیں تھیں۔"

روحی نے اسٹرا سے لیمن اسکواش کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے قربان بیگ کی ساری بات بڑے تحمل سے سنی لیکن اس نے قربان بیگ کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ جب وہ اپنی "مخصوص خواہشات" کے باعث کسی کو اپنا دوست بناتی تھی تو اسے اپنی اصل شخصیت سے بالکل بے خبر رکھتی تھی۔ اس سے ملاقات کے لیے جاتے وقت اپنے کسی واقف کار کی گاڑی لے لیا کرتی تھی۔ اس نے قربان بیگ کو اپنا صحیح نام بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے فرزانہ کے نام سے جانتا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

''قربان بیگ!'' روحی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے پاس کئی موبائل فون ہیں۔ میرے ہر موبائل فون کا نمبر میرے کسی ایک ہی دوست کو معلوم ہوتا ہے۔ اگر میں کسی سے اپنی دوستی ختم کرتی ہوں تو پھر وہ موبائل بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دیتی ہوں یا اس کی سم بدلوا لیتی ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ تم مجھ سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں مجھ سے رابطے کی کوشش کرنا بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اب ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔''

قربان بیگ نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا تم اس وقت بھی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرو گی؟''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' روحی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں اس وقت بھی سنجیدہ ہوں اور اُس وقت بھی سنجیدہ تھی جب میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم اب آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔''

''لیکن ایسی کیا بات ہو گئی تھی فرزانہ؟'' قربان بیگ نے حیرت سے کہا۔ ''ہم دونوں تو بہت اچھا وقت گزار رہے ہیں۔''

''ہماری دوستی کا وہ عرصہ کتنا تھا؟'' روحی نے پوچھا۔

قربان بیگ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تین مہینے تو یقیناً۔''

''اور اس عرصے میں ہماری ملاقاتیں؟''

''پندرہ بیس تو ہوئی ہوں گی۔''

''اکیس۔'' روحی بولی۔ ''مجھے بالکل صحیح تعداد یاد ہے۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا۔ میں اس میں کچھ ترمیم کروں گی۔ تمہارا وقت شاید اچھا ہی گزرا ہوگا لیکن میں صرف دو ماہ تک اچھا وقت گزار سکی۔ اس کے بعد تم سے میری اکتاہٹ بتدریج بڑھنے لگی۔ اس لیے میں نے تم سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔''

''فرزانہ!'' قربان بیگ سخت لہجے میں بولا۔ ''تم بھولی تو نہیں ہو گی کہ ہر ملاقات کے بعد بڑے نوٹوں کی ایک گڈی میری جیب سے تمہارے پرس میں منتقل ہو جایا کرتی تھی۔ کیا کسی وجہ سے وہ تمہیں کم محسوس ہونے لگی تھی؟''

روحی دھیرے سے ہنس دی۔ قربان بیگ نے اسے قطعی غلط سمجھا تھا لیکن روحی نے کبھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نوٹوں کی گڈی وہ خاموشی سے رکھ لیا کرتی تھی حالانکہ اس کی نظر میں وہ نہایت بے حیثیت رقم ہوتی تھی۔

قربان بیگ ذرا سا رک کر پھر بولا۔ ''شاید اب تمہیں کوئی بہت بڑی اسامی مل گئی ہے۔ تم اس وقت جس کار میں ہو اس کی قیمت چالیس لاکھ سے کم نہیں۔ اگر تم اس کے مالکانہ حقوق نہیں رکھتیں تو بھی اس نے تمہیں اس کے استعمال کی اجازت تو دے ہی دی ہے۔''

''یہی سمجھ لو۔'' روحی نے اپنی بے پروائی کا اظہار شانہ جھٹک کر کیا۔

''تم اس طرح مجھ سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتیں۔'' قربان بیگ نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں اپنا بیک گراؤنڈ نہیں بتایا ہے۔''

''تمہارا کوئی بیک گراؤنڈ بھی ہے؟'' روحی مسکرائی۔

''ایسا کہ تم خوف سے کانپتی ہوئی میرے قدموں میں آ گرو گی۔''

''میرے ساتھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لوگ میرے قدموں میں گرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ رہ گئی کپکپاہٹ تو وہ سردی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے؟''

''فرزانہ!'' قربان بیگ نے غصے کے باوجود اپنی آواز دبانے کی کوشش کی کیونکہ اِکا دُکا افراد ان کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ یہ بات روحی نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے دکان کے لڑکے کو بلانے کے لیے ہارن دیا۔ وہ اسکواش ختم کر چکی تھی۔

قربان بیگ بولا۔ ''لوگ ہماری طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم بعد میں بات کریں۔ تم مجھے اپنا موبائل نمبر دے دو۔''

روحی نے ٹالنے کے لیے ایک الل ٹپ نمبر دے دیا۔

اسی وقت دکان کا لڑکا قریب آ گیا۔ روحی نے اسے گلاس واپس کیا، پرس سے ایک نوٹ نکال کر دیا اور کہا۔ ''باقی تم رکھ لینا۔''

اتنی بڑی ''ٹپ'' ملنے پر لڑکے نے روحی کو زوردار سیلیوٹ جھاڑ دیا۔

روحی نے کار اسٹارٹ کی۔

''سنو فرزانہ!'' قربان بیگ جلدی سے بولا۔ ''اگر یہ نمبر غلط ثابت ہوا تو بھی میں تم تک پہنچ ہی جاؤں گا۔ اس کار کے نمبر سے مجھے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس تگڑی اسامی کو اتنی جلدی نہیں چھوڑو گی اس لیے تم تک میری رسائی ہو ہی جائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس تگڑی آسامی کو چھوڑ دو لیکن مجھ سے بھی ملتی رہو۔ تم مجھے بہت پسند ہو۔''

''لیکن تم مجھے اب بالکل پسند نہیں رہے۔'' روحی نے کار ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے اپنا موبائل نمبر غلط بتایا ہو گا؟'' قربان بیگ نے کہتے ہوئے جلدی سے اپنا موبائل فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔ روحی نے اسے بہت آسان نمبر بتائے تھے جو اسے یاد ہو گئے ہوں گے۔ وہ فوری طور پر چیک کرنا چاہتا تھا کہ نمبر ملانے پر اسے روحی کے موبائل فون کی گھنٹی سنائی دیتی ہے یا نہیں۔

روحی بے وقوف نہیں تھی کہ وہ قربان بیگ کو یہ بات چیک کرنے دیتی۔ وہ کار تیزی سے پیچھے لے گئی اور پھر اسے فرسٹ گیئر میں ڈال کر دوڑا دیا۔ اس نے موڑ بھی اتنی جلدی جلدی کاٹے کہ قربان بیگ اگر اس کا تعاقب کرنا چاہے تو کامیاب نہ ہو سکے۔

دس منٹ سے بھی کم وقت میں روحی کو یہ اطمینان ہو گیا کہ قربان بیگ کی کار اس کے تعاقب میں نہیں۔ اب اس نے اپنی کار کا رخ ایک خاص راستے پر کر دیا۔ جہاں اسے جانا تھا، وہاں پہنچنے میں اب اسے بیس منٹ لگتے۔ دس منٹ بعد اس نے کار میکڈانلڈ کے سامنے روکی۔ وہاں سے اس نے تین افراد کے کھانے کا سامان پیک کروایا، پانی کی کئی بوتلیں خریدیں۔ یہ سارا سامان لے کر وہ پھر روانہ ہو گئی۔

قربان بیگ کی باتیں اور دھمکیاں اس نے اپنے ذہن سے جھٹک دی تھیں۔ اس کی نظر میں اس قسم کے لوگوں کی اہمیت اس ٹشو پیپر سے زیادہ نہیں تھی جو استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔ روحی کافی عرصے سے اسی قسم کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ قربان بیگ جیسے کئی ٹشو پیپرز استعمال کرنے کے بعد اِدھر اُدھر پھینک کر بھول گئی تھی۔ صرف ایک نے کچھ زیادہ پر پُرزے نکالے تھے تو روحی نے اس کا معقول بندوبست کر دیا تھا۔ اس شخص کی لاش ساحلِ سمندر... پر پائی گئی تھی۔ اس کی کھوپڑی میں گولی کا ایک سوراخ تھا۔ جس پستول سے وہ گولی چلائی گئی تھی، وہ پستول لاش کے ہاتھ میں پایا گیا تھا۔ پولیس نے اسے خودکشی قرار دیتے ہوئے معمولی سی تفتیش کے بعد اس کیس کی فائل بند کر دی تھی۔

دس منٹ بعد روحی نے اپنی کار جدید طرز کے اپارٹمنٹس کی عمارت کے احاطے میں روکی۔ خورونوش کے سامان کے تھیلے لے کر وہ کار سے اتری۔ ڈیش بورڈ سے اس نے کارڈلیس کال بیل کا بٹن بھی نکال کر اپنی جینز کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس بٹن کو دبانے سے وہ گھنٹی بج اٹھتی جو دوسری منزل کے اس اپارٹمنٹ میں تھی جہاں طارق رہ رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز بہت مدھم تھی۔ روحی کی ہدایت کے مطابق طارق وہ گھنٹی ہر وقت اپنے قریب رکھتا تھا۔ باتھ روم میں بھی وہ گھنٹی اس کے قریب ہوتی تھی کیونکہ روحی کے آنے کا کوئی وقت معین نہیں تھا۔

روحی اس اپارٹمنٹ کو مقفل بھی رکھ سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ طارق کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتی تھی کہ وہ وہاں قیدی ہے... حالانکہ حقیقت یہی تھی۔

روحی لفٹ سے دوسری منزل پر پہنچی۔ اس نے کارڈلیس کال بیل کا بٹن دبایا اور اپارٹمنٹ کے دروازے پر جا رکی۔ اس نے سامان کے تھیلے ایک طرف رکھ دیے اور اس طرح جھکی جیسے دروازے کا قفل کھول رہی ہو۔

اس اپارٹمنٹ کے اور خصوصاً اس منزل پر رہنے والے جانتے تھے کہ وہ اپارٹمنٹ اسی کا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو یہ نہیں سمجھتا کہ دروازہ اندر سے کھولا گیا ہے۔

اندر سے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر روحی نے سامان کے تھیلے اٹھا لیے اور دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

''ہیلو!'' روحی، طارق کی طرف دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرائی۔

''ہیلو!'' طارق نے بھی اپنی آواز دھیمی رکھی اور دروازہ بند کر دیا۔

''میں یہ سامان فریج میں رکھ کر کپڑے تبدیل کروں گی۔ دس بارہ منٹ بعد تم میرے کمرے میں آ جانا۔'' روحی نے آہستہ سے کہا۔

طارق نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ گم صم تھا۔

کھانے کا سامان کچن کے فریج میں رکھ کر روحی اپنے کمرے میں داخل ہوئی جسے خواب گاہ کی طرز پر سجانے کے لیے بہت زیادہ رقم خرچ کی گئی ہو گی۔ تعیش کی ہر شے اس کشادہ خواب گاہ میں موجود تھی۔ دیواروں پر ایسی پینٹنگز تھیں جنہیں دیکھ کر جذبات کا برانگیختہ ہونا یقینی امر تھا۔

یہ اپارٹمنٹ روحی نے کافی عرصے پہلے خریدا تھا۔ جب بھی وہ ہلا گلا کرنے کے موڈ میں ہوتی تو اپنے دوستوں کو یہاں جمع کر لیتی تھی۔ ڈرائنگ روم کے وسیع و عریض کمرے کو ڈرائنگ روم کی طرز پر نہیں سجایا گیا تھا۔ روحی اسے ہال کے طور پر استعمال کرتی تھی جہاں اس کے دوستوں کی پارٹیاں ہوتی تھیں۔ دوستوں میں عورتوں اور مردوں کی تخصیص نہیں تھی۔

تین کمروں میں سے دو کو عام قسم کے بیڈ روم کی طرز پر

http://digestpk.blogspot.com/

آراستہ کیا گیا تھا تاکہ اگر پارٹی میں کوئی مدہوش ہوجانے کی حد تک پی جائے تو رات وہیں گزار سکے۔ تیسرے کمرے کی آراستگی پر بے تحاشا اخراجات کیے گئے تھے جو روحی صرف خود استعمال کرتی تھی۔

جمشید راؤ اور بیگم جمشید اس اپارٹمنٹ سے بے خبر نہیں تھے۔ بیگم جمشید کو روحی کی یہ ''علیحدگی پسندی'' اچھی نہیں لگی لیکن جمشید راؤ کی وجہ سے اسے خاموش رہنا پڑا۔ جمشید راؤ کے بہ قول جوان اولاد کو حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور آزادی سے زندگی گزار سکے۔

وہ دونوں میاں بیوی وہاں سال میں صرف ایک مرتبہ آیا کرتے تھے جب روحی اپنی سالگرہ وہاں مناتی تھی اور اپنے والدین کے جاننے والوں میں سے کسی کو بھی اس تقریب میں نہیں بلایا جاتا تھا۔ صرف اس کے اپنے دوست جمع ہوتے تھے۔ جمشید راؤ اور بیگم جمشید بھی اس پارٹی میں زیادہ دیر تک شریک نہیں ہوتے تھے۔ کیک کاٹنے کی رسم کے بعد وہ پانچ دس منٹ سے زیادہ نہیں رکتے تھے اور روحی کو سالگرہ کا تحفہ دے کر چلے جاتے تھے۔

روحی اس اپارٹمنٹ میں کبھی کبھی تنہا بھی وقت گزارتی تھی یا کبھی کوئی ایک آدھ اور بھی ہوتا تھا جسے دو ایک مرتبہ روحی کی ''عنایت'' حاصل ہوجاتی تھی۔ اس اپارٹمنٹ میں تنہا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس اپارٹمنٹ کی ایک خواب گاہ دس دن سے طارق کے تصرف میں تھی۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد روحی بستر پر نیم دراز طارق کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور ہلکے ہلکے کش لینے لگی۔ اس کی نظریں دروازے کی طرف تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''آجاؤ طارق!'' روحی نے قدرے بلند آواز میں کہا اور جب وہ اندر آگیا تو بولی۔ ''تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ تمہیں اندر آنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

طارق آہستگی سے قدم اٹھاتا ہوا بستر کی طرف آیا۔ روحی کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اس کے نقش و نگار بے حد جاذب نظر تھے۔ رنگت سرخ و سفید تھی۔ بال گھونگریالے تو نہیں لیکن کئی جگہ سے خمیدہ تھے۔ بالوں کی وہ خمیدگی بھی اس کی کشش میں اضافے کا سبب تھی۔ جسم کسی ریسلر کی طرح ورزشی تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اسے بے حد معصوم آدمی ظاہر کرتے تھے۔

وہ قریب آکر پائنتی بیٹھ گیا۔ اس کے اس انداز پر روحی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ہمیشہ آکر اسی طرح بیٹھ جاتے ہو۔'' وہ بولی۔ ''قریب آؤ!''

اس وقت طارق شاید یوں محسوس کررہا ہو جیسے کوئی قسائی اپنی چھری تیز کیے اسے اپنے قریب بلا رہا ہو۔ اسے روحی کی بات بہرحال ماننا تھی۔ وہ اٹھ کر بستر کے درمیانی حصے تک آیا اور پھر روحی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے قریب کرلیا۔

''آئی ایم سوری طارق!'' وہ بولی۔ ''آج مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ دراصل مام سے ایک ضروری بات کرنے میں کچھ وقت لگ گیا۔''

طارق نے شاید اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم نے کہا تھا کہ جلد ہی میرا کچھ بندوبست کردو گی لیکن مجھے یہاں قید ہوئے دس دن گزر چکے ہیں۔''

''قید؟'' روحی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''میں دروازہ مقفل کر کے تو نہیں جاتی۔ تم جب چاہو باہر نکل سکتے ہو۔ قباحت صرف یہ ہے کہ اگر باہر نکلو گے تو تمہاری زندگی چند گھنٹوں کے اندر اندر ختم ہوجائے گی۔ اسمیشر گروپ کے نشانے باز اب بھی کتوں کی طرح سارے شہر میں تمہاری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ریلوے اسٹیشن، ائرپورٹ اور بیرونِ شہر جانے والی بسوں کے اڈوں پر ان کی کڑی نظر ہے۔ گارسیا آرگنائزیشن کے چیئرمین نے انہیں حکم دیا ہے کہ تمہیں تلاش کر کے اس طرح ختم کیا جائے کہ تمہاری لاش بھی کسی کو نہ مل سکے۔''

''مگر تم نے کہا تھا کہ مجھے اس شہر سے نکالنے کا کچھ بندوبست کردو گی۔''

''مجھے... تمہیں اس شہر سے نہیں، اس ملک سے نکالنے کا بندوبست کرنا ہے... اور وہ میں کررہی ہوں۔ اس کام میں مجھے اپنے اندازے سے زیادہ وقت لگ رہا ہے لیکن عجلت کر کے میں تمہاری زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ شہر سے نکالنا تو غالباً کچھ ایسا مشکل نہیں لیکن اس ملک کے کسی بھی گوشے میں تم محفوظ نہیں رہ سکتے۔ گارسیا آرگنائزیشن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں تمہیں کسی خطرے میں کیسے ڈال دوں طارق؟ تم جانتے ہو کہ میں تمہیں...... پسند کرنے لگی ہوں۔''

''مجھے نرگس اب شدت سے یاد آنے لگی ہے۔''

''جب میں تمہیں ملک سے باہر بھجوا دوں تو اسے وہاں بلا لینا۔''

''میں تو اس وقت بھی تڑپ رہا ہوں اس کے لیے۔''

روحی نے ایک طویل سانس لی۔ ''کیا اس نے کبھی تمہیں، مجھ سے زیادہ آسودہ کیا ہے؟''

طارق کے چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔

''جواب دو!'' روحی کچھ توقف سے بولی۔ ''کیا وہ تمہیں اتنا آسودہ کرسکی ہے جتنا میں نے تمہیں کیا ہے؟''

''ہم کبھی ایک دوسرے سے اتنے قریب نہیں ہوئے۔'' طارق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''حالانکہ ہم ایک دوسرے کو بچپن سے چاہتے ہیں۔ میں یا وہ شادی سے پہلے قربت کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہم ایک دوسرے سے پاک و صاف محبت کرتے ہیں۔''

روحی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''بدھو!'' اس نے طارق کا چہرہ اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پاک محبت کیا ہوتی ہے؟''

طارق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''جو میں اور نرگس ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔''

''فرسودہ بات!'' روحی نے منہ بنایا۔ ''جذباتی آسودگی کی خواہش ہی دراصل محبت ہوتی ہے۔ معاملہ یا مسئلہ صرف یہ ہے کہ تمہارے طبقے میں بندشیں بہت ہیں ورنہ محبت کا مطلب یا مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ مجھے بتاؤ... کبھی تم نے سنا ہے... کیا کبھی کسی نوجوان کو کسی بڑھیا سے محبت ہوئی ہے؟ یا کوئی لڑکی کبھی کسی بوڑھے پر عاشق ہوئی ہے؟''

''ایسی مثالیں ہیں مگر کم کم ہیں۔'' طارق نے روحی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''میرے پڑوس میں ہی ایک لڑکی تھی جس نے شادی کے لیے زیادہ عمر کے ایک آدمی کو پسند کیا تھا۔''

''یہ تو افتادِ طبع کی بات ہے۔ بعض لڑکیوں کو زیادہ عمر کے مرد یا لڑکوں کو زیادہ عمر کی عورتیں پسند ہوتی ہیں لیکن میں نے زیادہ عمر کی نہیں، بوڑھے اور بڑھیوں کی بات کی ہے۔ ایسی کوئی مثال ہے تمہاری نظر میں؟''

طارق خاموش رہا۔

''جواب دو!'' روحی شوخی سے بولی۔ ''دو نا جواب! ایسا کبھی دیکھا یا سنا ہے تم نے؟''

''نہیں۔'' طارق نے آہستہ سے کہا۔

''تو اس سے کیا ثابت ہوا؟ محبت تو ایک خوب صورت سا نام گھڑ لیا گیا ہے۔ اس لفظ کے پسِ پردہ صرف جذباتی خواہشات ہوتی ہیں۔'' روحی نے کہتے ہوئے طارق کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

چاند

چاند کو ہاتھ لگا آئے ہیں اہلِ ہمت
اب ارادہ ہے کہ وہ جانب مریخ بڑھیں
ایک ہم ہیں کہ دکھائی نہ دیا چاند ہمیں
ہم اسی سوچ میں کہ عید پڑھیں یا نہ پڑھیں

مرسلہ: طارق سلطان اعوان، حیدرآباد

طارق کے دل کی دھڑکنیں جو پہلے ہی تیز ہوچکی تھیں اور تیز ہوگئیں۔ اسے قربت کے لمحے قریب آتے محسوس ہونے لگے۔

روحی بولی۔ ''اسی خواہش نے مجھے تمہارے قریب کیا ہے طارق! میں اس مکار دنیا کی طرح منافق نہیں ہوں۔ میں ہرگز نہیں کہوں گی کہ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو۔ ہاں، یہ ضرور کہوں گی کہ جو آتش فشاں تمہارے وجود میں ہے، وہ میں نے کبھی کسی میں نہیں دیکھا۔''

روحی نے طارق کا ہاتھ اتنی زور سے دبایا کہ نشیب و فراز ایک ہوگئے۔

اسی دورانیے میں روحی ہلکا سا شاور لے کر باتھ روم سے نکل آئی تھی۔ اس وقت طارق نے آنکھیں کھولیں اور پھر جلدی سے بند بھی کرلیں۔

روحی اس وقت اپنی بنیان اور جینز پہن رہی تھی۔ گاؤن اس نے الماری میں پھینک دیا تھا۔ طارق نہیں دیکھ سکا کہ روحی کی داہنی پنڈلی پر کسے ہوئے ایک چرمی تسمے میں ایک پستول موجود ہے۔

''کھانا کھانے کے لیے تیار ہوجاؤ طارق! میں ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔'' روحی نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

کھانے کا ایک پیکٹ فریج میں چھوڑ کر روحی نے باقی کھانا نکال کر مائیکروویو اوون میں گرم کیا۔ جو پیکٹ اس نے فریج میں چھوڑا تھا، وہ اگلے دن دوپہر میں طارق کے کام آتا۔ ناشتے کا سارا سامان بھی کچن میں موجود تھا۔ ناشتے کی

http://digestpk.blogspot.com/

جو چیزیں ایک آدھ دن بعد خراب ہوسکتی تھیں یا ہو جاتی تھیں، وہ بھی روجی ایک دن کے وقفے سے لے آیا کرتی تھی۔ دس دن سے یہی معمول تھا۔

کھانا کھانے کے بعد روجی ایک گوشے میں لگے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ طارق کو اس نے اپنے پہلو میں بٹھایا اور اپنے دائیں ہاتھ کی بانہہ اس کی گردن میں ڈال دی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے ریموٹ اٹھا کر سامنے رکھا ہوا بڑا سا ٹی وی آن کر دیا تھا۔ کسی چینل سے خبریں نشر ہو رہی تھیں جو بہت عام سی تھیں۔ روجی نے چینل بدل دیا۔ اس کا پسندیدہ چینل ''ڈس کوری'' تھا اور اس وقت اس پر چلنے والا پروگرام بھی بہت اچھا تھا۔ روجی نے ریموٹ ایک طرف رکھ دیا اور پروگرام دیکھنے لگی۔ کبھی کبھی وہ ایک پیار بھری نظر طارق پر بھی ڈال لیتی تھی۔

طارق اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی عدم دلچسپی محسوس کر کے روجی کا منہ بن گیا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا اور بولی۔ ''تم کسی چیز میں دلچسپی ہی نہیں لیتے۔''

''روجی!'' طارق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل گرفتہ سی آواز میں کہا۔ ''آج مجھے نرگس بہت شدت سے یاد آ رہی ہے۔ میں اسے فون بھی نہیں کر سکا۔ وہ بہت پریشان ہو گی — میں نے یہاں ٹیلی فون کا وائر دیکھا ہے لیکن اس کا انسٹرومنٹ نہیں ہے۔ غالباً تم نے ہی ہٹایا ہو گا۔ میرا موبائل بھی تم مجھ سے لے چکی ہو۔ اگر میں خود کو قیدی نہ سمجھوں تو اور کیا سمجھوں؟''

روجی نے ایک طویل سانس لی۔ ''دراصل تم اس صورتِ حال کی نزاکت نہیں سمجھ سکتے۔'' روجی نے اپنا دوسرا ہاتھ طارق کے گریبان میں ڈال دیا اور اپنی انگلیاں اس کے سینے کے گھنے بالوں میں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے تمہارا موبائل تمہارے پاس کیوں نہیں رہنے دیا اور ٹیلی فون کا انسٹرومنٹ یہاں سے کیوں ہٹایا۔ یہ سب کچھ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے طارق! میں ایک بات پھر دہراؤں گی۔ گارسیا آرگنائزیشن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ان کے آدمی نہ صرف ٹیلی فون کمپنی بلکہ موبائل کمپنیز میں بھی موجود ہیں جنہیں تمہارے بارے میں ہدایات دی جا چکی ہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری آواز ٹریس کر لی تو انہیں یہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ویسے بھی وہ یہاں تک پہنچ چکے ہوتے، اگر یہ اپارٹمنٹ میرا نہیں ہوتا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تمہیں میں نے پناہ دی ہو گی۔''

''اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہو جاتا تو میں اس جال میں کبھی نہ پھنستا۔'' طارق نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''نرگس میری زندگی ہے روجی! اگر میں جلد اس سے نہ مل سکا یا کم از کم اس کی آواز نہ سنی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں دو ایک دن میں ہی بیمار پڑ جاؤں گا۔''

روجی سوچنے لگی، یہ نرگس آخر کیسی لڑکی ہے کہ طارق اب بھی اس کا دیوانہ بنا ہوا ہے۔

روجی کا اپنے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ اگر کسی مرد کو مل جائے تو وہ مرد دنیا کی ہر عورت کو بھلا سکتا ہے لیکن طارق کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔

''تم مجھے آخر کب تک یہاں سے نکال سکو گی؟'' طارق نے پوچھا اور بڑی آہستگی سے روجی کا ہاتھ اپنے جسم سے دور کر دیا۔ وہ لمس اس کے جذبات کو متغیر کر رہا تھا۔

روجی اس وقت نرگس کے بارے میں سوچ رہی تھی اس لیے طارق کی اس حرکت پر دھیان نہیں دے سکی۔ اسے اس وقت پہلی مرتبہ خواہش ہوئی کہ وہ اس لڑکی نرگس کو دیکھے جو طارق کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔

ایک اعتبار سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ روجی کے سینے میں رقابت کی چنگاری چٹخنے لگی تھی۔

''جواب نہیں دیا تم نے؟'' طارق کچھ توقف سے بولا۔

روجی نے اس کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ عجلت کی گئی تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ چاہتی تو طارق کو شہر سے نکال کر بہت دور پہنچا چکی ہوتی جہاں گارسیا آرگنائزیشن کے ہاتھ اس تک نہ پہنچ پاتے۔ طارق کی زندگی آرگنائزیشن کے اسمیشر گروپ سے محفوظ ہو جاتی لیکن روجی ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اس نے طارق کے وجود میں اپنا آئیڈیل دیکھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک وہ اپنے اسی آئیڈیل کی تلاش میں بھٹکتی رہی تھی لیکن اب اسے مزید بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ طارق میں ایک بہت بڑا طوفان ہے جس کی شورش ایک طویل عرصے تک کم نہیں ہو سکتی۔ اس طویل عرصے کے لیے وہ طارق کو اپنا رفیقِ زندگی بنانا چاہتی تھی۔ نرگس کے بارے میں طارق نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا لیکن روجی سمجھتی تھی کہ اس کا قرب حاصل کرنے کے بعد طارق کو کسی دوسری لڑکی کا خیال آ ہی نہیں سکتا... مگر اب دس دن گزرنے کے بعد بھی طارق کے دل و دماغ پر نرگس چھائی ہوئی تھی۔

ٹیلی فون اور موبائل کا معاملہ بھی روجی نے اسی لیے ختم کیا تھا کہ طارق اپنے کسی ہمدرد سے رابطہ نہ کر بیٹھے۔

روجی نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ طارق کو ہمیشہ اس اپارٹمنٹ تک محدود رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے منصوبہ بنا لیا تھا کہ طارق کو آرگنائزیشن سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

وہ سوچتی رہی کہ نرگس کو اپنی راہ سے ہٹانا ضروری ہے۔

طارق پریشان لہجے میں بولا۔ ''اگر تم عجلت سے گریز کرنا چاہتی ہو تو مجھے کم از کم موبائل تو دے دو۔ میں کبھی کبھی نرگس سے بات تو کر لیا کروں۔''

''موبائل یا ٹیلی فون کا استعمال تمہارے لیے خطرناک ہو گا۔'' روجی نے اپنی بات پھر دہرائی۔

''تب میں یقیناً بیمار پڑ جاؤں گا۔'' طارق نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کیا میں ایسا کوئی بندوبست کر دوں کہ وہ تمہارے پاس آ جائے؟'' روجی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں؟'' طارق چونکا۔ ''اس اپارٹمنٹ میں؟''

''ہاں۔''

''اس کا مستقل طور پر... میرا مطلب ہے، جب تک میں یہاں ہوں، اس وقت تک کے لیے وہ یہاں نہیں آ سکتی۔ ہاں، ایک تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ کبھی کبھی یہاں آ کر مجھ سے مل لیا کرے۔''

''وہ کیسے؟''

''میرا پیغام اس تک پہنچ جائے۔''

''رازداری بہت ضروری ہے طارق!''

''رازداری تو رہے گی۔ میں اسے ایسا خط لکھوں گا کہ وہ ہرگز کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ کراچی میں اس کی ایک خالہ رہتی ہیں۔ میں جب میرپور خاص سے یہاں آیا تھا تو نرگس نے مجھے ان کا پتا دیا تھا۔ ان کے علاوہ یہاں خالہ کی کوئی اور عزیزہ بھی رہتی ہیں۔ میں نرگس کے نام ایک چھوٹا سا خط لکھ دوں گا۔ وہ اپنے گھر والوں سے کوئی بہانہ کر کے یہاں اپنی خالہ کے پاس آ جائے گی۔ پھر میرے پاس آنے کے لیے اسے اپنی خالہ سے ان کی عزیزہ کے گھر جانے کا بہانہ کرنا پڑے گا۔''

''جب وہ اس عزیزہ کے پاس نہیں پہنچے گی تو خالہ کو اس کا علم نہیں ہو گا؟''

ہر شمارہ خاص شمارہ
سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ سرگزشت

دسمبر 2010ء کا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے
محبِ اسلام
برصغیر کے ایک مبلغ اسلام کی سوانح حیات جس نے اسلام کی تکذیب پر بھی مضامین لکھے
پوست کا پھول
یورپ کے ایک مسلمان شاعر کا زندگی نامہ
چیرنگ کراس
لاہور کا دل کہے جانے والے علاقے کی تاریخ
امید کا خیمہ
عالمی میڈیا کو متوجہ کر لینے والے حادثے کا تذکرہ
ان کے علاوہ
بھی بہت ساری سچ بیانیاں، سچی اور معلوماتی داستانیں، دلچسپ تحریریں
آپ کے علم کی پیاس بجھانے کا واحد ذریعہ، دلچسپ ماہنامہ
صرف ایک بار پڑھ کر دیکھیں پھر خود ہی آپ گرویدہ ہو جائیں گے،
آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

http://digestpk.blogspot.com/

"فوری طور پر تو ممکن نہیں ہے۔ اس کی خالہ گلشنِ معمار میں رہتی ہیں اور ان کی عزیزہ وہاں سے کافی دور رہتی ہیں۔ ان کا رابطہ ہونا بہت مشکل ہے۔"

"موبائل.... ٹیلی فون؟"

"وہ نرگس کی خالہ کے گھر میں تو ہے مگر ان کی عزیزہ کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ وہ لوگ بہت غریب ہیں۔"

"اچھا تو..." روحی سوچتے ہوئے بولی۔ "تم اس کے نام خط لکھ دو۔"

"ابھی؟" طارق نے خوش ہو کر جلدی سے پوچھا۔

"ہاں۔" روحی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ جلد از جلد تم تک پہنچ جائے گی... تبھی تم یہاں سکون سے اتنا وقت گزار سکو گے کہ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست کر دوں۔"

طارق نے جلدی سے خط لکھ ڈالا۔

روحی نے پڑھا۔ لکھا تھا۔ "نرگس! تم میری وجہ سے یقیناً پریشان ہو گی۔ بات کچھ ایسی ہے کہ میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا اور اس معاملے میں راز داری بھی بہت ضروری ہے۔ کسی کو بھی میرے اس خط کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم اپنی خالہ سے ملنے کا بہانہ کر کے کراچی آ جاؤ۔ پھر ان سے ان کی عزیزہ کے گھر جانے کا بہانہ کر کے تم مجھ سے ملنے آ سکتی ہو۔"

روحی بولی۔ "یہ خط تو ادھورا ہے۔"

"ہاں۔" طارق نے کہا۔ "پہلے میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ خط تم ڈاک سے تو نہیں بھیجو گی؟"

"عقل مندی کی بات کی ہے تم نے۔" روحی مسکرائی۔ "میں خود یہ خط لے کر جاؤں گی۔"

"خود؟"

"ہاں، خود! کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی؟ اور پھر راز داری بھی تو ضروری ہے۔ ہم دونوں اور نرگس کے علاوہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ تم خط میں میرا ذکر کر دو لیکن اس طرح کہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔"

طارق نے خط اس کے ہاتھ سے لے کر پھر لکھنا شروع کیا۔ جب اس نے خط مکمل کر لیا تو روحی نے اسے دوبارہ پڑھا۔ طارق نے اضافہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "میرا یہ خط تمہیں مسز عالم پہنچائیں گی۔ یہ اور عالم صاحب میرے ہمدردوں میں سے ہیں۔ اگر تم نے ان کی ہدایات کے مطابق عمل کیا تو ہماری ملاقات آسانی سے ہو جائے گی۔"

خط کے آخر میں طارق نے اپنا نام لکھ دیا تھا۔

روحی ہنس پڑی۔ "یہ مسز عالم خوب سوجھا تمہیں۔"

"کیا یہ مناسب نہیں؟"

"بہت مناسب ہے۔" روحی نے کہا۔ "ضروری ہے کہ وہ مجھے شادی شدہ سمجھے۔ یہ خط میں اسے پرسوں پہنچا سکوں گی۔"

"کل ہی کیوں نہیں؟" طارق جلدی سے بولا۔

"مجھے ایک بہت ضروری کام سے کراچی میں رکنا ہے۔"

روحی اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ دوسرے دن اسے اپنا ابارشن کرانا تھا۔ اس نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ "کل یہاں بھی صبح دس گیارہ بجے تک آؤں گی۔ کھانے کا اتنا سامان لا دوں گی کہ رات تک چل سکے۔"

طارق نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا پھر کچھ فکرمندی سے بولا۔ "مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ نرگس کو اپنے بارے میں بتاؤں گا کیا؟"

"سوچ لینا کچھ۔" روحی نے بے پروائی سے کہا۔ اس کے دماغ میں ایک ایسا منصوبہ تھا کہ نرگس کو کچھ بتانے یا نہ بتانے کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

وہ بولی۔ "مجھے یہ تو بتاؤ کہ نرگس ہے کس مزاج کی؟"

"وہ ایک سیدھی بچی، سمجھ دار لڑکی ہے۔ میٹرک کر چکی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ زیادہ پڑھے لیکن اس کے والد کی مالی حیثیت اتنی نہیں ہے کہ وہ اسے زیادہ پڑھا سکتے۔ وہ اگرچہ آزاد خیال آدمی ہیں اس لیے نرگس بھی ایسی ہی ہے لیکن اس آزاد خیالی کا موازنہ تم کراچی کی ماڈرن سوسائٹی سے نہیں کرنا۔"

روحی ہنسی۔ "یعنی وہ میری جیسی آزاد خیال نہیں ہے؟"

طارق کچھ نہیں بولا۔ روحی کی اس بات کے جواب میں کچھ کہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے خیال کے مطابق روحی آزاد خیال نہیں بلکہ ایک بُرے کردار کی لڑکی تھی۔ اس کے اندازِ فکر کے سامنے مغربی طرزِ زندگی کو بھی ایک اعتبار سے "ہیچ" کہا جا سکتا تھا۔ عورت اور مرد کے تعلق کے حوالے سے روحی اس سے بھی بہت باتیں کر چکی تھی۔ اس کا شادی کو ایک "قانونی دھوکا" کہنا ہی طارق کو اچھا نہیں لگا تھا۔ روحی نے اپنے بے باکانہ طرزِ زندگی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سی دلیلیں گھڑ لی تھیں۔ طارق کے لیے تو اس کی طرزِ زندگی کے لیے "بے باکانہ" بھی بہت کم تر درجے کا لفظ

تھا۔ یہ طارق کی مجبوری تھی کہ وہ روحی کے اشاروں پر ناچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

روحی نے پوچھا۔ "اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟"

"بہت کم۔" طارق نے جواب دیا۔ "ماں باپ اور دس سال کا ایک بھائی۔ اس کا نام امجد ہے۔ اسکول میں پڑھتا ہے۔"

"نرگس کے پاس موبائل ہے؟" روحی نے فکرمندی سے پوچھا کیونکہ منفی جواب ملنے کی صورت میں اسے نرگس کے گھر جانا پڑتا جس سے وہ گریز کرنا چاہتی تھی۔

"موبائل تو ہے اس کے پاس۔"

طارق کا جواب سن کر روحی نے اطمینان محسوس کیا۔

"نمبر بتاؤ اس کا۔" روحی نے کہا۔

طارق نے نمبر بتایا جو روحی نے اپنے موبائل فون میں محفوظ کر لیا۔

روحی نے پوچھا۔ "میں اسے تمہارا حوالہ دے کر کہیں بلاؤں گی تو وہ آ جائے گی نا؟"

"تم اس کے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں؟ پتا بہت آسان ہے۔ میں وہ لکھ کر دے دیتا ہوں۔"

"نہیں طارق!" روحی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس کے گھر والوں کے سامنے جانا مناسب نہیں سمجھتی۔ تمہارا خط مجھے بڑی راز داری کے ساتھ اس تک پہنچانا ہے۔ اس کے گھر والوں کو میں اپنے بارے میں بتاؤں گی کیا؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔" طارق نے اتفاق کیا۔

"اسی لیے میں اسے فون کر کے کہیں بلانا چاہتی ہوں۔"

"کسی اجنبی عورت کے بلاوے پر کہیں جانا..." طارق نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ ڈرے گی۔"

"میں تمہارا نام جو لوں گی۔"

"وہ بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب ہو گا۔ دس دن سے ان لوگوں کو میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تم سے میرا نام سن کر وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے بیٹھ جائے۔"

"تب تو پھر میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ مجھ پر اعتبار کر کے کہیں آ کر مجھ سے ملے گی، تبھی تو میں اسے تمہارا خط دوں گی۔ کوئی ایسی بات بتاؤ کہ وہ فون پر ہی مجھ پر اعتبار کر لے۔ اسے یقین آ جائے کہ تم نے ہی مجھے اس کے پاس بھیجا ہے۔ کوئی ایسی بات یاد کرو جو صرف تم اور نرگس جانتے ہوں۔"

"یہ ٹھیک سوچا تم نے۔" طارق مسکرایا۔ "ایسی کئی باتیں ہیں جو ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

روحی اس وقت سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ طارق کی مسکراہٹ کا سبب نرگس کے بارے میں گفتگو تھی۔ روحی نے اپنی باتوں پر اسے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ اس احساس نے اس کے دل میں رقابت کی چنگاری کو اور ہوا دی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ نرگس کو طارق کی زندگی سے قطعی دور کر دے گی۔

طارق نے اسے کئی ایسی باتیں بتائیں جو اس کے اور نرگس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہاری زبان سے یہ باتیں سن کر اسے بالکل یقین آ جائے گا کہ تمہیں میں نے ہی بھیجا ہے۔"

"اچانک تم بہت خوش نظر آنے لگے؟"

"میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں نرگس سے مل سکوں گا۔"

"اس خوشی میں تم اور زیادہ پُرجوش ہو سکتے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

روحی نے معنی خیز نظروں سے بستر کی طرف اور پھر طارق کی طرف دیکھنے کے بعد ایک بار پھر اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے سینے کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "اگر ممکن ہو تو میں تمہارا نام جوالا مکھی رکھ دوں۔"

طارق کے چہرے سے مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

"ذبح" ہونا اور ہوتے رہنا ان دنوں اس کا مقدر بن گیا تھا۔

☆☆☆

صبح روحی نو بجے بیدار ہوئی۔ وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس کا معمول تو ساڑھے سات بجے اٹھنے کا تھا لیکن اتوار کو وہ عموماً نو بجے تک ہی اٹھتی تھی۔ وہ بستر سے فوراً نہیں اٹھی۔ ایک توبہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے وہ گزشتہ رات کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ خاصی رات تک طارق کے وجود میں چھپے طوفان سے متصادم رہی تھی۔ اس نے وہ سب کچھ سوچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے ایک سسکاری سی لی اور پھر بستر سے اٹھ کر ٹانگیں نیچے لٹکا دیں۔ باتھ روم اسی جانب تھا۔ سلیپرز پہنتے ہوئے اس کی نظر تہ کیے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی جو اس کی سائڈ ٹیبل پر اس کے بالوں کے ایک کلپ کے ساتھ رکھا تھا۔

روحی کو فوراً یاد آ گیا کہ رات کو جب وہ لیٹی تھی تو وہاں کوئی کاغذ نہیں تھا۔ وہ کاغذ کوئی اس وقت وہاں ر

http://digestpk.blogspot.com/

جب وہ سو رہی تھی۔ اس کے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بولٹ نہیں کیا گیا تھا۔ روحی اسے کھلا رکھنے کی عادی تھی۔

روحی کے خیال میں ناممکن تھا کہ وہ کوئی ملازم رکھ گیا ہو۔ کسی ملازم کی مجال نہیں تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے بیڈروم میں داخل ہو۔ وہ کاغذ یا تو بیگم جمشید رکھ کر جاسکتی تھی یا جمشید راؤ! روحی کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ جب اس نے کاغذ اٹھایا۔ کاغذ تہ کیا گیا تھا۔ اس پر جو تحریر تھی، وہ جمشید راؤ کی تھی۔

لکھا تھا۔ ''تم سو رہی ہو اس لیے یہ چند سطریں لکھ کر جارہا ہوں۔ رات کو تم دیر سے گھر لوٹی تھیں اس لیے ملاقات نہیں ہوسکی۔ تمہارا موبائل فون بھی بند ملا تھا۔''

روحی کی عادت تھی کہ جب طارق کے پاس ہوتی تھی تو موبائل فون بند کر دیتی تھی تاکہ اس کے اور طارق کے درمیان کوئی مخل نہ ہو۔

جمشید راؤ نے اس مختصر تمہید کے بعد لکھا تھا۔ ''آج تم نو بجے تک جاگو گی اس لیے دس بجے تک ''لاج'' پہنچنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ میں نے آج ہنگامی طور پر ایگزیکٹو میٹنگ کال کی ہے۔ تمہاری شرکت اس لیے بھی ضروری ہے کہ قربان بیگ کے بارے میں بھی کچھ بات ہوگی۔''

آخری فقرے نے روحی کو چونکا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کو قربان بیگ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی عجیب بات تھی کہ ایگزیکٹو میٹنگ میں قربان بیگ کے بارے میں بات کی جاتی۔

غسل کرنے، تیار ہونے اور عجلت کے ساتھ ناشتا کرنے میں اس کے چالیس منٹ صرف ہوئے۔ اس کے بعد وہ تیز رفتاری سے ''لاج'' کی طرف روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر شیریں سے اس کا دو بجے کا وقت طے ہوا تھا اس لیے میٹنگ اس وقت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ صرف طارق کا معاملہ تھوڑا بہت متاثر ہوسکتا تھا۔ اس سے روحی نے دس گیارہ بجے تک آنے کے لیے کہا تھا۔ اگر میٹنگ صرف ڈیڑھ دو گھنٹے تک چلتی تو اس معاملے میں بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ طارق ایک بجے سے پہلے کھانا نہیں کھاتا تھا۔

دس بجنے میں دو منٹ باقی تھے جب روحی نے اپنی کار ''لاج'' کے احاطے میں روکی۔ ''لاج'' کی دو منزلہ چھوٹی سی عمارت بظاہر صرف ایک اسنوکر کلب تھی جو صرف گارسیا آرگنائزیشن کے ایگزیکٹوز یا کچھ دوسرے بڑے بڑے منصب داروں کے لیے تھی مگران بڑے مناصب پر فائز لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کی آرگنائزیشن کے تحت غیر قانونی کام بھی کیے جاتے ہیں۔ صرف ایگزیکٹوز ہی کو ان کاموں کے بارے میں معلوم تھا۔ ان میں سے ایک روحی بھی تھی۔ جمشید راؤ اس آرگنائزیشن کا چیئرمین تھا۔

روحی تیزی سے دوسری منزل پر پہنچی۔ میٹنگ کا کمرا اسی منزل پر تھا جس کے دروازے پر دو چپراسی موجود تھے۔ آرگنائزیشن کے دوسرے لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ وہ دونوں آرگنائزیشن کے اسمیٹر گروپ کے نہایت خطرناک آدمی تھے۔

روحی میٹنگ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہاں سب موجود تھے۔ لمبی میز کے ایک سرے پر جمشید راؤ بیٹھا تھا۔ آمنے سامنے کی چار چار کرسیوں پر باقی ممبرز بیٹھے تھے۔ چیئرمین کے بالکل سامنے، دوسرے سرے کی کرسی خالی تھی جو روحی کے لیے تھی۔

''میں ایک منٹ لیٹ ہوگئی۔'' روحی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ اس کی نظریں جمشید راؤ کی طرف تھیں۔ ''آئی ایم سوری سر!''

ان لوگوں کے سامنے وہ جمشید راؤ کو ''ڈیڈ'' نہیں کہتی تھی لیکن وہ سب لوگ جانتے تھے کہ روحی، جمشید راؤ کی بیٹی ہے۔

روحی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے میز پر سادہ کاغذوں کا ایک چھوٹا سا پیڈ اور نہایت قیمتی بال پوائنٹ رکھا ہوا تھا۔ یہ اشیا ہر ممبر کے سامنے موجود تھیں۔ ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق اس پیڈ پر میٹنگ کے نوٹس لکھ سکتا تھا۔

''بات شروع کی جائے؟'' جمشید راؤ نے ایک ممبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کل رات میں تم سے تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ اس کے مطابق ایجنڈا بنالیا ہے نا؟''

''یس سر!'' ممبر نے اپنے سامنے ایک کاغذ پھیلایا جس پر میٹنگ کا ایجنڈا لکھا ہوا تھا۔ اس میں چھ باتیں تھیں۔ ان میں سے ایک طارق کے لاپتا ہو جانے اور اس کا کوئی سراغ نہ لگنے کے بارے میں تھی اور قربان بیگ کا صرف نام لکھا ہوا تھا۔

''پہلے طارق اور قربان بیگ کے بارے میں ہی بات کرلی جائے۔'' جمشید راؤ نے کہتے ہوئے اپنے سامنے رکھے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔ ''ان دونوں ہی باتوں کے لیے بہرام کو بھی بلانا پڑے گا۔''

پارسی بہرام اسمیٹر گروپ کا چیف تھا۔

''آجاؤ بہرام!'' جمشید راؤ نے کہا اور ریسیور واپس

رکھ دیا۔

بہرام قریب ہی کے کسی کمرے میں اپنی طلبی کا منتظر تھا۔ اسے وہاں آنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔

اس دوران میں روحی کا دماغ طارق میں کم اور قربان بیگ میں زیادہ الجھا رہا تھا۔

بہرام کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے جبڑے کسی بلڈاگ کی طرح بھاری تھے۔ سرخ و سفید رنگت اور آنکھیں خاصی گہری نیلی تھیں۔ جبڑے کے علاوہ باقی نقش ونگار میں بھی سختی تھی۔

وہ کمرے میں آکر... جمشید راؤ کی کرسی کے قریب مؤدب کھڑا ہوگیا۔

''ابھی تک طارق کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔'' جمشید راؤ نے پیشانی پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ تم لوگ ناکارہ ہوتے جارہے ہو؟''

''سر!'' بہرام نے ادب سے کہا۔ ''ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ شہر کی ناکابندی فوراً کی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شہر سے نہیں نکل سکا ہے۔ وہ ضرور کسی کے گھر میں روپوش ہے۔ اس نے اپنے معاملے میں کسی سے بھی رابطہ نہیں کیا ہے۔ اس کا موبائل فون مستقل بند مل رہا ہے۔ میں نے تین آدمیوں کی ڈیوٹی تو صرف اس پر لگادی ہے کہ وہ طارق کا نمبر مستقل ڈائل کرتے رہیں۔ کسی وقت بھی اس کا موبائل فون نہ تو انگیج ملا ہے اور نہ اس کی گھنٹی بجی ہے۔''

''میں یہ فضول باتیں نہیں سننا چاہتا۔'' جمشید راؤ نے بگڑ کر کہا۔ ''آرگنائزیشن کو صرف طارق کی لاش سے دلچسپی ہے۔''

''یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے سر... کہ اس نے جہاں بھی روپوشی اختیار کی ہے، وہاں سے باہر نکلے۔ شہر کے سارے گھروں میں گھس کر تو شاید پولیس بھی اسے تلاش نہیں کرسکتی۔''

''شہر میں اس کے شناسا کتنے ہیں؟''

''ان کی تعداد تو برائے نام ہے۔ گہرے تعلقات تو اس کے کسی سے بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود ان سب لوگوں کے گھر چیک کیے جاچکے ہیں اور اس کے بعد اب بھی ان کی کڑی نگرانی کی جارہی ہے۔''

''تمہارے خیال کے مطابق اس نے اپنا موبائل فون مستقل طور پر بند کردیا ہے لیکن جہاں بھی وہ روپوش ہوا ہے، وہاں ٹیلی فون تو ہوسکتا ہے؟''

''میرا اندازہ ہے کہ اس نے ٹیلی فون بھی استعمال

پہلی ترجیح

امریکی صدارت کی کرسی حاصل کرنے کے لیے حریفوں میں پنجہ آزمائی ہورہی تھی۔ انتخابی مہم زوروں پر تھی۔ ایک امیدوار کے منیجر نے فون پر کہا۔

''صبح تم ڈلاس پہنچو، وہاں تمہارا انتخابی حریف لوگوں کو تمہارے بارے میں جھوٹی باتیں بتارہا ہے۔''

''میں ڈلاس ضرور جاؤں گا لیکن اس سے پہلے ہوسٹن جانا چاہتا ہوں۔'' امیدوار نے جواب دیا۔

''لیکن پہلے ڈلاس جاکر تقریر کرو، وہاں تمہارے بارے میں جھوٹ بولا جارہا ہے۔''

''پہلے ہوسٹن۔'' امیدوار نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''کیونکہ وہاں میرے بارے میں سچ اگلا جارہا ہے۔''

سیالکوٹ سے محمد امین کا تعاون

نہیں کیا۔ پولیس سے تو وہ رابطہ کرے گا نہیں اور اگر وہ کرتا تو یہ بات چھپی نہیں رہتی۔ پولیس میں ہمارے مخبر بہت چوکس ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ایسے حالات میں انسان اپنے گھر والوں سے ضرور رابطہ کرتا ہے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ میرے دو آدمی میرپور جاکے بھی چھان بین کرچکے ہیں۔ طارق کا معذور باپ اور اس کی ماں پریشان ہیں کہ ان دنوں میں اس نے انہیں نہ تو اخراجات کے پیسے بھیجے ہیں اور نہ ہی ٹیلی فون کیا ہے جبکہ وہ روزانہ ہی فون کیا کرتا تھا۔ یہی صورت حال اس گھر کی ہے جہاں طارق کی منگیتر رہتی ہے۔ اس کا نام نرگس ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان دنوں وہ اداس نظر آرہی ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ طارق نے اس سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ نرگس کے والدین بھی پریشان ہیں۔ نرگس کا باپ روزانہ ہی طارق کے گھر کے چکر لگا رہا ہے۔''

جمشید راؤ کے علاوہ باقی ممبرز کے چہروں پر بھی تشویش کے تاثرات ابھر آئے تھے اور روحی کی تو یہ مجبوری تھی کہ وہ اس قسم کی اداکاری کرے۔

جمشید راؤ نے بہرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسی صورت میں اور کیا قدم اٹھایا جاسکتا ہے؟''

''اگر آپ کے دماغ میں کوئی بات ہو تو حکم دیجیے۔''

http://digestpk.blogspot.com/

اس کے عین مطابق عمل کیا جائے گا۔‘‘

’’تمہارے دماغ میں کیا ہے؟‘‘

’’انتظار۔‘‘ بہرام نے کہا۔ ’’صرف انتظار سر! وہ جہاں بھی روپوش ہے، ساری زندگی تو وہاں نہیں گزار سکتا۔ شہر کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا ہوٹل ہم چیک کر چکے ہیں۔ وہ کسی کے گھر میں ہی روپوش ہے جہاں سے وہ کبھی نہ کبھی تو باہر نکلے گا اور جب باہر نکلے گا تو صرف موت ہی اس کا استقبال کرے گی۔‘‘

جمشید راؤ نے طائرانہ نظروں سے تمام ممبرز کی طرف دیکھا۔ سب خاموش تھے۔ اس وقت روحی پہلی مرتبہ بولی۔

’’وہ بازارِ حسن میں کسی کے گھر پر بھی ہو سکتا ہے۔‘‘

’’میڈم!‘‘ بہرام نے کہا۔ ’’میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔‘‘

جمشید راؤ نے ایک طویل سانس لے کر میز پر آہستگی سے مکا مارا اور بولا۔ ’’آرگنائزیشن کے لیے اس کی موت بہت ضروری ہے۔‘‘

’’اور میرے لیے اس کی زندگی۔‘‘ روحی نے اپنے دل میں کہا۔

’’اچھا خیر!‘‘ جمشید راؤ نے بہرام کی طرف دیکھا۔ ’’اب قربان بیگ کے بارے میں بتاؤ۔‘‘

اس وقت بہرام نے بڑے غور سے روحی کی طرف دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ روحی کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ وہ کوئی سرسری سا اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ اس میٹنگ میں قربان بیگ کی کوئی بات کہاں سے آ گئی؟

’’سر!‘‘ بہرام، جمشید راؤ کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’آپ تو میڈم سے اس بارے میں بات کر چکے ہوں گے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ جمشید راؤ نے جواب دیا۔ ’’گفتگو کا موقع نہیں مل سکا۔‘‘

بہرام کو جواب دینے کے بعد جمشید راؤ نے روحی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’قربان بیگ نامی شخص سے تمہاری کوئی ناچاقی ہو گئی ہے؟‘‘

’’نہیں تو۔‘‘ روحی نے اپنے تنے ہوئے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ’’کسی سے ناچاقی تو تعلقات بڑھنے کے بعد ہوتی ہے۔ قربان بیگ سے تو بس دو تین پارٹیوں میں سرسری سی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔‘‘

جمشید راؤ نے سوالیہ نظروں سے بہرام کی طرف دیکھا۔

’’میڈم!‘‘ بہرام نے روحی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’کل رات جب آپ ایک اسنیک بار سے لیمن اسکواش پی رہی تھیں تو قربان بیگ کی کار آپ کی کار کے برابر میں کھڑی تھی۔ آپ دونوں میں کچھ باتیں ہوئی تھیں۔ کئی بار ایسا لگا تھا جیسے قربان بیگ کو آپ پر غصہ آیا ہو۔‘‘

روحی اپنی پیشانی پر بل ڈال کر بولی۔ ’’کیا تم میرا تعاقب کرتے رہتے ہو؟‘‘

’’نہیں میڈم! میں یہ جسارت کیسے کر سکتا ہوں؟ اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت میں بھی وہاں رکا تھا۔ آپ دونوں کی باتیں تو مجھے سنائی نہیں دے سکیں لیکن کئی مرتبہ قربان بیگ کے چہرے سے ایسا ہی لگا جیسے وہ کسی بات پر بگڑ رہا ہو۔‘‘

’’وہ مجھ پر نہیں بگڑ رہا تھا۔‘‘ روحی نے منہ بنا کر کہا۔ ’’ایک پارٹی میں کسی لڑکی نے اس سے کچھ بدتمیزی کر دی تھی۔ وہ اسی بدتمیزی کو یاد کر کر کے چراغ پا ہو رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ میں اسے اس لڑکی کا نام پتا بتا دوں۔ میں اسے کچھ نہیں بتا سکی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کا صرف نام جانتی ہوں لیکن میں نے نام بھی نہیں بتایا۔ میں خود کو کیوں کسی کے جھگڑے میں ڈالوں؟‘‘

’’تو میں غلط سمجھا تھا۔‘‘ بہرام نے کہا پھر جمشید راؤ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ’’لیکن مجھے تشویش ہو گئی تھی اسی لیے میں نے آپ کو اس بارے میں بتایا تھا۔ میڈم کو شاید قربان بیگ کے بیک گراؤنڈ کا علم نہیں ہو گا۔‘‘

’’کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟‘‘ روحی بول پڑی۔

’’میڈم!‘‘ بہرام اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’وہ کوئی خطرناک مجرم تو نہیں ہے لیکن بھتا خور ہے۔ اس نے کئی غنڈوں سے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ ان میں سے دو ایک غنڈے تو قتل بھی کر چکے ہیں۔ ایک غنڈا تو اپنی سزا بھگتا کر پچھلے سال جیل سے آیا ہے۔ دوسرے پر پولیس قتل کا جرم ثابت نہیں کر سکی تھی۔ ان غنڈوں کے ذریعے وہ بعض بزدل قسم کے سرمایہ داروں کو دھمکا کر ان سے اچھی خاصی رقوم حاصل کرتا رہتا ہے۔ انہی رقوم میں سے کچھ رقم ان غنڈوں کو بھی دیتا رہتا ہے۔ وہ اسی میں خوش ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ عیار بھی ہے اس لیے ان غنڈوں کو آسانی سے بے وقوف بنائے رکھتا ہے۔ سرمایہ داروں سے رقوم وہ خود وصول کرتا ہے اس لیے غنڈوں پر ظاہر ہی نہیں کرتا کہ وہ کتنی رقوم حاصل کر رہا ہے۔ ان غنڈوں سے اس نے بعض ایسے لوگوں کو پٹوایا بھی ہے جن کی اس سے اَن بن ہو گئی تھی۔ یہی سب کچھ جاننے کی وجہ سے میں پریشان ہوا تھا۔ آپ سے ناچاقی کی صورت میں وہ آپ کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوتا۔‘‘

’’میری اس سے کوئی ناچاقی نہیں ہے۔‘‘ روحی کے لیے جھوٹ بولنا ضروری تھا ورنہ شاید اسمیشر گروپ کے دو تین آدمی اس کی حفاظت پر مامور کر دیے جاتے۔ ان کی وجہ سے روحی کو اپنی آزادانہ نقل و حرکت میں دشواری پیش آتی۔ اس کا روزانہ رات کو تن تنہا اپنے اپارٹمنٹ میں جانا بھی ان لوگوں کو کسی شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ یہ خیال تو شاید انہیں نہ آتا کہ اس نے طارق کو اپنے اپارٹمنٹ میں چھپا رکھا ہے لیکن وہ الجھن میں پڑ سکتے تھے۔ اس طرح اپارٹمنٹ میں طارق کی موجودگی خدشات کی لپیٹ میں آ جاتی۔ وہ لوگ بہرام سے اس کا ذکر کرتے تو وہ بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ روحی جانتی تھی کہ وہ بلا کا زیرک ہے۔

روحی کا جواب سننے کے بعد بہرام بولا۔ ’’مگر اس نے اپنی کار آپ کی کار کے پیچھے دوڑائی تھی۔ آپ نہ جانے کس طرف نکل گئی تھیں کہ وہ آپ تک نہ پہنچ سکا لیکن میں اس دوران میں اس کے پیچھے اس لیے لگا رہا کہ آپ کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔‘‘

’’غیر مسلح میں بھی نہیں رہتی ہوں۔‘‘ روحی نے منہ بنا کر کہا۔ ’’لیکن اگر اس نے میرا تعاقب کرنا چاہا تھا تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہو گی کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہو گا۔ دراصل میں اس کا ایک سوال نظر انداز کر کے وہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔ اس نے میرا پیچھا اس لیے کیا ہو گا کہ مجھے کہیں روک کر اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔‘‘

جمشید راؤ نے کچھ تشویش سے پوچھا۔ ’’تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں بنے گا؟‘‘

’’بالکل یقین ہے سر!‘‘ روحی نے مسکرا کر کہا۔ ’’وہ تو مرعوب ہے مجھ سے۔ وہ جانتا ہے کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔‘‘

وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ اسے یہ کسی قیمت پر منظور نہیں تھا کہ اس کے لیے باڈی گارڈز رکھ دیے جاتے۔ اگرچہ قربان بیگ اسے دھمکا بھی چکا تھا لیکن روحی کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی۔ وہ مسلح رہتی تھی اور سمجھتی تھی کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کر سکتی ہے۔ اس نے دو ایک جملے اور کہے تا کہ جمشید راؤ اس کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو جائے۔

ان باتوں کے بعد بہرام کو وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ ایجنڈے پر موجود دوسرے معاملات سے اسمیشر گروپ کو الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ گارسیا آرگنائزیشن کے ان غیر قانونی اور خطرناک معاملات کے راز صرف ان لوگوں کے سینے میں دفن رہتے تھے جو اس وقت میٹنگ روم میں موجود تھے۔

میٹنگ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوئی۔ روحی پریشان تھی کیونکہ وقت اب کم رہ گیا تھا۔ دو بجے اسے ڈاکٹر شیریں کے ساتھ ہونا تھا۔ اس سے پہلے وہ طارق کو کھانے پینے کا سامان پہنچانا چاہتی تھی۔

عمارت سے باہر آ کر روحی .... کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کے پاس صرف ڈیڑھ گھنٹا ہے۔ ڈاکٹر شیریں سے دو بجے کا وقت طے تھا۔

کار آہستگی سے حرکت میں لاتے ہوئے وہ اسمیشر گروپ کے چیف بہرام کے بارے میں بھی سوچنے لگی جس کے بیان کے مطابق وہ اتفاقاً اسنیک بار پہنچ گیا تھا۔ روحی اس بیان کو شبہے کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ بھی ممکن تھا کہ بہرام کو کچھ شبہ ہو گیا ہو اور وہ اس کی نگرانی کرنے لگا ہو۔ اسمیشر گروپ کو یہ اختیار خود جمشید راؤ نے دیا تھا کہ اگر انہیں کسی ایگزیکٹیو پر بھی کسی معاملے میں کوئی شبہ ہو جائے تو وہ اس بارے میں جانچ پڑتال کریں۔ ایگزیکٹیو بورڈ کے ممبر میں سے یہ بات صرف روحی کو معلوم تھی۔ اسے جمشید راؤ نے بتا دیا تھا کیونکہ وہ اس کی بیٹی تھی۔

کچھ بھی ہو... روحی نے فیصلہ کیا، کسی نہ کسی طرح طارق کو سامان تو پہنچانا ہو گا لیکن احتیاط بہر حال کرنا ہو گی۔ اگر وہ اسے سامان لے کر اپارٹمنٹ میں جاتے دیکھ لیتا تو یقیناً گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ روحی کھانے پینے کا اتنا سامان آخر کس کے لیے لے گئی ہے؟

روحی نے فیصلہ کیا کہ سامان خود لے جانے کے بجائے منگوا لیا جائے۔ کئی ہوٹل ایسے تھے جہاں صرف فون کر کے کھانا گھر پر منگوا لیا جاتا ہے۔ روحی نے ایک ایسے ہی ہوٹل کا رخ کیا لیکن اس دوران میں بھی بہت ہوشیاری سے اس بات کا خیال رکھا کہ اگر اس کا تعاقب ہو تو وہ اس سے بے خبر نہ رہے۔

ہوٹل پہنچنے پر اسے یقین تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ وہاں اس نے کھانے کا آرڈر کرتے ہوئے اپارٹمنٹ کا پتا بھی بتا دیا اور ادائیگی بھی کر دی پھر تاکید کی۔ ’’کھانا تیس چالیس منٹ میں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر اس سے زیادہ دیر لگنے کا امکان ہو تو میرا یہ آرڈر کینسل سمجھیں۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی میڈم!‘‘ جواب

http://digestpk.blogspot.com/

میں کہا گیا۔ ”آپ نے آرڈر میں کوئی ایسی چیز نہیں لکھوائی ہے جس کی تیاری میں زیادہ وقت لگے۔ ہمارا آدمی آدھے گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔ اگر اسے کسی بھی وجہ سے کچھ دیر ہوئی تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کی ہوگی۔“

روحی نے وہاں سے ٹھنڈے مشروب کی بوتل لی اور اس میں اسٹرا ڈال کر اس کے گھونٹ لیتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ صرف اس مشروب ہی کے لیے ہوٹل میں گئی تھی۔ اگر گروپ کا کوئی آدمی یا خود بہرام وہاں کی نگرانی کر رہا ہوتا تو وہ بس اتنا ہی سمجھتا جتنا روحی ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا، تاہم وہ احتیاط سے کام لے رہی تھی۔

کار میں بیٹھتے بیٹھتے اس نے بڑے بڑے گھونٹ لے کر بوتل ختم کر دی اور اسے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ کے پائدان میں لڑھکا دیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے وہ کار حرکت میں لائی۔ اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے تھوڑا سا پیچیدہ راستہ اختیار کیا۔ سیدھے راستے سے وہ سولہ سترہ منٹ میں اپنی منزل پر پہنچ جاتی۔ دوسرا راستہ اختیار کرنے کے باعث اسے بائیس منٹ لگ گئے۔ یہ تاخیر اس نے اس لیے کی تھی کہ اپنے عقب سے پوری طرح باخبر ہو جائے۔

جب وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو ہوٹل سے چلے ہوئے اسے چھبیس منٹ گزر چکے تھے۔ چار منٹ بعد ہوٹل کے آدمی کو کھانا لے کر آ جانا چاہیے تھا اور اگر اسے دیر ہو جاتی تو مزید پانچ منٹ لگ سکتے تھے۔

طارق نے اسے خالی ہاتھ دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

روحی مسکرا کر بولی۔ ”مجھے تمہارے لیے کھانے کا سامان لے کر آنا چاہیے تھا لیکن میں خالی ہاتھ ہوں۔ تم نے پوچھا نہیں؟“

”مجھے خیال تھا کہ تم خود ہی بتا دوگی۔“

روحی نے اس کے سینے سے لگ کر اسے اپنے بازوؤں میں کستے ہوئے کہا۔ ”تم بھی خوب ہی ہو۔ خود کوئی سوال نہیں کرتے۔“

”جب ضرورت ہوتی ہے تو کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں نے کل تم سے پوچھا تھا کہ آج میرپور کیوں نہیں جاؤ گی؟“

”آج مجھے اپنے پیٹ کی صفائی کروانا ہے۔“ روحی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”پیٹ کی صفائی؟“ طارق حیرت سے بولا۔

اب روحی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ طارق کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتانے لگی کہ آج اس نے خود کھانا لانے کے بجائے منگوا لیا ہے۔ طارق نے اس پر بھی تبصرہ نہیں کیا کہ معمول میں یہ تبدیلی کیوں؟

روحی اسے صوفے کے قریب لے جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ طارق کا قرب پاتے ہی وہ بہت بے چین ہو جاتی تھی لیکن اس کے پاس وقت کم تھا۔ وہ وہاں صرف اتنی دیر کے لیے تھی کہ ہوٹل سے کھانا آ جائے۔

عجلت کا عیش و طرب اسے پسند نہیں تھا ورنہ وہ دس پندرہ منٹ تو رک ہی سکتی تھی۔

ڈور انٹرکام کا بزر بجا تو وہ صوفے سے اٹھ گئی۔ اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا۔ ”کون؟“

جواب میں ہوٹل کا نام سنائی دیا۔

روحی نے خود جا کر دروازہ کھولا۔ کھانے کا سامان لیا اور معقول ٹپ دے کر آدمی کو رخصت کرنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

”آج تھوڑی سی دیر ہو گئی ہے تمہارے کھانے میں۔“ روحی نے کہا۔ ”اور یہ کل دوپہر تک کا کھانا ہے کیونکہ میں کل صبح ہی میرپور نکل جاؤں گی۔ ابھی یہ گرم ہے۔ جو کھاؤ، وہ نکال لو... باقی فریج میں رکھ دو۔ میں آج تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔ مجھے اب جانا ہے۔“

سب سامان اس نے تپائی پر رکھ دیا۔

طارق سے تھوڑی سی ”چھیڑ چھاڑ“ کر کے وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ طارق اس کے ساتھ دروازے تک گیا۔ وہ باہر نکل گئی تو اس نے دروازہ بولٹ کر لیا۔ اس نے ایسی آواز سنی جیسے باہر سے چابی لگائی جا رہی ہو۔ یہ طارق کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ باہر سے روحی خواہ مخواہ چابی قفل میں گھمایا کرتی تھی۔ اس نے طارق کو بتا بھی دیا تھا کہ ایسا وہ اس لیے کرتی تھی کہ اس عمارت میں رہنے والا دیکھے تو یہی سمجھے کہ وہ اپنا اپارٹمنٹ مقفل کر رہی ہے۔

طارق واپس لوٹا۔ اس نے کھانے کا سارا ہی سامان فریج میں رکھ دیا تھا۔ اسے ابھی بھوک نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا بیشتر وقت لیٹے لیٹے یا ٹہلتے ہوئے گزرا کرتا تھا اور دماغ پر خیالات کی یورش رہتی تھی۔ نرگس اسے ہر وقت یاد آتی رہتی تھی اور اس کا دماغ نرگس سے متعلق واقعات کی آماج گاہ بنا رہتا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ بچپن میں وہ بہت ہی نٹ کھٹ تھی۔ وہ اکثر طارق کو اپنے گھر کے قریب بلکہ تقریباً متصل آموں کے باغ میں لے جایا کرتی تھی تاکہ وہ درخت سے

کچی کچی اور چھوٹی کیریاں توڑنے میں اس کی مدد کر سکے۔ اسے چھوٹی کیریاں پسند تھیں۔ وہ چودھری رحمت کا باغ تھا جو نرگس کے علاوہ کسی کو بھی کیریاں نہیں توڑنے دیتا تھا۔ اسے نرگس کی شرارتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

نرگس اور طارق کے بچپن کا زمانہ اس باغ میں بہت گزرا تھا اور جوان ہونے کے بعد بھی جب انہیں چوری چھپے ملنا ہوتا تھا تو وہ اسی باغ میں کسی پوشیدہ جگہ پر ملا کرتے تھے۔ اس پوشیدہ جگہ سے صرف چودھری رحمت ہی واقف تھا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اسے ان کی پاکیزہ محبت بہت اچھی لگتی تھی۔ اس نے ان دونوں کو کبھی ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ وہاں چھپ کر بس باتیں کیا کرتے تھے۔ انہوں نے باغ میں ہی ایک دوسرے سے شادی کا پیمان باندھا تھا اور شادی کے بعد کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ طارق کی خواہش تھی کہ جب وہ بی اے کرنے کے بعد کہیں ملازم ہو جائے گا، تبھی شادی کرے گا۔

ایک مرتبہ ایک چغل خور قسم کے شخص نے ان دونوں کو باغ میں ایک ساتھ دیکھ لیا۔ اس نے بات دونوں کے گھروں تک پہنچا دی۔ دونوں گھروں میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ بات یہ چل نکلی تھی کہ فوری طور پر ان دونوں کی شادی کر دی جائے تاکہ کوئی ”ایسی ویسی“ صورتِ حال سامنے آنے پر دونوں گھروں کی بدنامی نہ ہو۔

طارق نے اس سال بی اے کا آخری پرچہ دیا تھا اور نتیجہ آنے کا منتظر تھا۔ وہ ملازمت کرنے کے بعد ہی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر چودھری رحمت اس کے کام آیا۔ وہ بڑی حد تک طارق کا رازدار بن چکا تھا۔ اسی نے ان دونوں کے گھر والوں کو ان کی پاکیزہ محبت کا یقین دلایا اور یہ ذمے داری لی کہ ان دونوں کی ملاقاتوں کے باعث ”ایسی ویسی“ کوئی بات سامنے نہیں آ سکتی۔

چودھری رحمت کا سارے پڑوس میں احترام کیا جاتا تھا۔ اس کی ضمانت پر وہ دونوں فوری شادی کے بندھن سے بچ گئے مگر ان کی منگنی کر دی گئی۔ طارق اس معاملے میں چودھری رحمت کا بہت ممنون ہوا۔

بی اے میں طارق کی فرسٹ ڈویژن آئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی اچھی ملازمت کر لے گا لیکن خاصے دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی اسے مایوسی ہوئی۔ وہ خود کو خاصا باصلاحیت سمجھتا تھا اس لیے چھوٹی موٹی ملازمتیں اس نے قبول نہیں کی تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کراچی جا کر قسمت آزمائے۔ نرگس نے، اس کے گھر والوں نے یا خود طارق کے والدین نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اب طارق کراچی میں تھا اور اس وقت کو دل ہی دل میں برا بھلا کہا کرتا تھا جب اسے کراچی کی سوجھی تھی۔

پندرہ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جب وہ ایک انٹرویو میں ناکامی کے بعد بڑی افسردگی کے عالم میں اس عمارت سے نکلا... تو اس کی ملاقات ایک اجنبی نوجوان سے ہوئی تھی۔

”میں بھی یہاں انٹرویو ہی دینے آیا تھا۔“ اس نے طارق سے بات چھیڑی۔ ”ناکام میں بھی رہا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا ہے کہ تمہیں گارسیا آرگنائزیشن میں ملازمت مل سکتی ہے۔“

”یہ نام میں نے کہیں پڑھا ہے۔“

”ضرور پڑھا ہوگا۔ اخباروں میں اس کے بڑے بڑے اشتہار آتے رہتے ہیں۔ میں وہاں بھی ملازمت کے لیے جا چکا ہوں لیکن انٹرویو میں ناکام رہا۔“

”تو مجھے وہاں کیسے ملازمت مل سکتی ہے؟“

”دراصل انہیں کسی وجہ سے تمہارے ہی جیسے ملازم کی ضرورت ہے۔“

”مجھ میں کیا خاص بات ہے؟“

”تم بہت خوب صورت ہو۔ ایسی مردانہ وجاہت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ انٹرویو کے لیے جو لڑکیاں آئی تھیں، وہ تمہیں کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔“

”میں کسی لڑکی کی طرف دیکھنا زیادہ پسند نہیں کرتا۔“

”تم غیر معمولی طور پر شریف بھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہ ملازمت مل جائے گی۔ وہاں کام کرنے والے ایک شخص نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جگہ ابھی پُر نہیں ہوئی۔ تم درخواست اور اپنی ایک تصویر لے کر آرگنائزیشن کے چیئرمین جمشید راؤ کے پاس چلے جاؤ۔“

”میں سیدھا اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟ اتنے بڑے لوگوں کے چپراسی مجھ جیسے اجنبی کو اندر داخل ہی نہیں ہونے دیں گے۔“

”تم داخل ہو جاؤ گے۔ دراصل یہ چیئرمین کے چپراسی کو بھی معلوم ہے کہ اس کے صاحب کو تم جیسے ایک نوجوان کی ضرورت ہے۔ اس نے اگر تمہیں فوراً اندر نہیں جانے دیا تو بھی اپنے صاحب کو تمہارے بارے میں اطلاع ضرور دے گا اور اس کی بات سن کر چیئرمین تمہیں یقیناً اندر بلا لے گا۔“

اجنبی نوجوان کی باتیں بالکل درست ثابت ہوئیں۔

طارق کو ملازمت مل گئی اور ملازمت بھی ایسی جس کا وہ تصور

http://digestpk.blogspot.com/

بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے جمشید راؤ نے اپنا پی اے مقرر کیا تھا۔

اس وقت طارق کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ملازمت کے لیے ایسے نوجوانوں کو باقاعدہ ''شکار'' کیا جاتا تھا جو بڑے شہروں کے نوجوانوں کی طرح تیز وطرار نہ ہوں جنہیں بال کی کھال نکالنے کی عادت ہوتی ہے۔

طارق سے ملنے والا اجنبی نوجوان گارسیا آرگنائزیشن ہی کا ایک کارندہ تھا جس کا کام ہی صرف یہ تھا کہ چھوٹے موٹے شہروں سے آئے ہوئے سادہ مزاج نوجوانوں کو شکار کریں کیونکہ جمشید راؤ ہر چوتھے چھٹے مہینے اپنا پی اے لازمی بدل لیا کرتا تھا۔

اس تبدیلی کی وجہ طارق کی سمجھ میں چار ماہ بعد آئی تھی۔ شروع میں تو اس نے جمشید راؤ سے یہ بات سنی تھی کہ اسے کوئی باصلاحیت پی اے ملتا ہی نہیں ہے۔

طارق کا خیال تھا کہ اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے اس کی یہ ملازمت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس نے موبائل فون پر یہ خوش خبری سب سے پہلے نرگس کو اور اس کے بعد اپنے والد کو سنائی تھی۔

طارق کو اس ملازمت کی بہت اچھی تنخواہ کے ساتھ ایک ڈیکوریٹڈ فلیٹ اور ایک...... کار بھی ملی تھی جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ آرگنائزیشن نے صرف ایک سال پہلے خریدی تھی جسے جمشید راؤ کے دو پی اے استعمال کرچکے تھے۔ کار تقریباً نئی جیسی تھی۔ ڈرائیونگ طارق نے کالج کے زمانے میں اپنے ایک دوست سے سیکھی تھی۔ ڈرائیونگ لائسنس اس کے پاس نہیں تھا جو آرگنائزیشن نے اس کے لیے دو دن میں مہیا کروادیا۔

طارق نے پہلے مہینے میں تین مرتبہ روحی کو دیکھا جو اپنے باپ سے ملنے دفتر آئی تھی۔ اس کے جسم پر کسے ہوئے لباس کی وجہ سے طارق نے ہر مرتبہ اسے اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

طارق کی زندگی بڑی آسودگی اور خوشی سے گزر رہی تھی۔ صبح ناشتا وہ خود بنالیتا تھا۔ دوپہر کے اور رات کے کھانے کے لیے اسے کسی ہوٹل کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ ہفتے کی شام کو وہ میرپورخاص چلا جاتا تھا۔ موبائل فون پر نرگس سے اس کی گفتگو کراچی میں رہتے ہوئے بھی ہوتی رہتی تھی۔ میرپور میں نرگس سے ملاقات کا موقع اسے صرف ایک مرتبہ مل سکا تھا۔ وہ دونوں چودھری رحمت کے باغ میں ہی ملے تھے۔

دوسرے مہینے کے آغاز ہی میں وہ ایک رات کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد چائے پی رہا تھا کہ روحی یکایک اس کی میز پر آدھمکی۔ کم از کم طارق کو ایسا ہی لگا تھا۔ طارق نے اسے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا حالانکہ جب وہ ہوٹل میں داخل ہوئی ہوگی تو وہاں موجود ہر شخص کی نظریں اس کی طرف اٹھی ہوں گی۔ اس کے حد درجہ چست لباس کی وجہ سے ایسا لگتا تھا جیسے اس کے متناسب اعضا کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آنا چاہتے ہوں۔

''ہائے!'' روحی نے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔

جواب میں طارق کے منہ سے ''جی'' کے سوا کوئی لفظ نہیں نکل سکا تھا۔ اس کی نظریں بھی جھک گئی تھیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اسے یقیناً بڑے رشک سے دیکھ رہے ہوں گے۔

''کیا بات ہے طارق!'' روحی بڑی بے تکلفی سے بولی۔ ''میں کبھی کبھی آفس آتی ہوں، تب بھی تم نے میری طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ اب اس وقت بھی تم میری طرف نہیں دیکھ رہے ہو؟''

''میں یہ گستاخی کیسے کرسکتا ہوں؟'' طارق کی نظریں جھکی رہیں۔ ''آپ آخر میرے باس کی بیٹی ہیں۔''

''اگر میں ان کی بیٹی نہیں ہوتی تو تم مجھے دیکھتے؟''

''جی... جی... شاید... نہیں۔'' طارق نے تذبذب سے جواب دیا۔

''کیوں؟'' روحی بولی۔ ''اس صورت میں کیوں نہیں؟''

''لڑکیوں کو دیکھنا... یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔''

''اوہ، کم آن۔'' روحی اٹھلائی۔ ''تم ابھی تک بہت پرانی دنیا میں رہ رہے ہو۔''

طارق خاموش رہا۔ وہ چائے کا آخری گھونٹ لے چکا تھا۔ اب اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ نکلے۔ روحی کا قرب کسی کے... بھی مشامِ جاں کو معطر کرنے کا سبب بن سکتا تھا لیکن طارق کو اس سے وحشت ہورہی تھی۔ اس کا مزاج عام نوجوانوں سے یکسر مختلف تھا۔

ویٹر قریب آگیا۔ وہ یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ طارق اپنی مہمان کے لیے بھی کچھ منگوائے گا لیکن روحی اس سے کہنے لگی۔

''نہیں، کچھ نہیں! بس بل لے آؤ۔''

ویٹر چلا گیا۔

روحی پھر طارق کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''بس اتفاق ہے کہ تم سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ تمہاری کار کھڑی دیکھی تو رک گئی۔ خیال آیا تھا کہ تم ہوٹل ہی میں ہوگے۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ دفتر میں تو تم سے باتیں ہو نہیں سکتی تھیں۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو طارق!''

یہ آخری فقرہ ایسا تھا کہ طارق کو اپنے دماغ میں دھماکا سا ہوتا محسوس ہوا۔ وہ روحی تو کیا، کسی بھی لڑکی سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں رکھتا تھا اور نہ رکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بات صرف نرگس کے منہ سے اچھی لگتی تھی۔

''کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟'' روحی نے پوچھا۔

طارق سٹپٹا گیا۔ جواب دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''مجھے اب جانا ہے۔'' وہ بڑی مشکل سے کہہ سکا۔ ''دفتر میں ایک صاحب سے اچھی خاصی شناسائی ہوگئی ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا تھا کہ کھانے کے بعد ان کے گھر آؤں گا۔''

طارق کو اپنے مزاج کے خلاف جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا اور غالباً روحی نے بھی اس کا جھوٹ سمجھ لیا ہوگا لیکن وہ صرف ہنس کر رہ گئی۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ پہلی ملاقات میں اتنی ہی بات کافی ہے، ورنہ ''شکار'' شاید زیادہ بھڑک جائے۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ طارق کچھ دوسری قسم کی شے ہے۔

ہوٹل سے باہر نکل کر روحی نے طارق کو اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کسی وقت میرے موبائل فون پر رابطہ کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر تم نہیں کرو گے تو میں کرلوں گی۔ مجھے اس موبائل فون کا نمبر معلوم ہوگیا ہے جو دفتر نے تمہیں دیا ہے۔ اس بات کو بھول جاؤ طارق کہ میں تمہارے باس کی بیٹی ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگے گا اگر تم مجھے اپنا صرف دوست سمجھو۔''

طارق نے کارڈ تو لے لیا مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ روحی اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔

طارق اس رات اپنے بستر پر بہت بے قرار رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ روحی کس قسم کی لڑکی ہے۔ وہ خود کردار کا مضبوط سہی لیکن زمانے کی ہوا سے ناآشنا نہیں تھا۔ مغرب زدہ طبقے کے طور طریق اسے معلوم تھے۔ روحی کی بے باکی نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا جس سے اسے وحشت ہورہی تھی۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ روحی سے اپنی جان وہ اس صورت میں چھڑا سکے گا جب یہ ملازمت ہی چھوڑ دے... جو وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس ملازمت ہی کی تنخواہ سے وہ شادی کے بعد نرگس کے لیے آسائشات مہیا کرسکتا تھا جو اس کی دلی خواہش تھی۔

اس کے موبائل فون کا نمبر روحی نے معلوم کرلیا تھا۔ اگر وہ اسے فون نہ کرتا تو وہ اسے کرلیتی۔ اس کی بے باکی سے طارق کو یہ اندیشہ بھی ہوگیا تھا کہ وہ کسی وقت شاید اس کے فلیٹ میں ہی آدھمکے۔

طارق کا یہ اندیشہ تو رنگ نہیں لایا لیکن موبائل پر ہر رات روحی کی کال آتی رہی۔ طارق کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنا موبائل فون بند رکھے۔ جمشید راؤ کوئی بات پوچھنے کے لیے اسے کسی وقت بھی فون کرلیا کرتا تھا۔ طارق کے خیال کے مطابق اس کا موبائل فون بند ملنے پر جمشید راؤ ناراض بھی ہوسکتا تھا اور وہ ناراضی اس کی ملازمت کے خاتمے پر منتج ہو

قدردان

حکومتِ ہند کے ایک انگریز افسر کو کسی مشاعرے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ یہ ادبی تقریب انہیں بہت پسند آئی۔ انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے اردو زبان سیکھی اور اپنے آپ کو اردو شاعری کے شیدائیوں میں شامل کرنے لگے اور کچھ ہی عرصے کے مطالعے کے بعد انہوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کردیا کہ وہ میر، غالب، مومن، انشاء کا کلام سمجھنے لگے ہیں اور اس کے مطالب و معانی سے بخوبی واقف ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ایک محفل میں جہاں وہ حسب معمول اس قسم کی گوہر افشانیوں میں مشغول تھے، ایک صاحب نے میر تقی میر کا یہ سادہ سا شعر پڑھ کر مطلب دریافت کیا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

شعر سن کر فرمانے لگے کہ ہاں، اس کا مٹبل ہم سمجھا۔ اس کا مٹبل ہے کہ اَم، ٹم اور میر صاحب سب جیل کھانہ جانا مانگتا۔

مرسلہ، دائمہ یونس، کراچی

http://digestpk.blogspot.com/

سکتی تھی۔

روحی موبائل فون پر طارق سے گفتگو کے دوران اپنی پچھلی کال سے زیادہ بے تکلف اور بے باک ہوتی جارہی تھی۔

طارق کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس لڑکی سے کس طرح اپنی جان چھڑائے؟ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بس کچھ ہی دن بعد روحی خود ہی اس کے جسم و جاں کی مالک بن جائے گی اور وہ اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہو گا... وہ صرف یہی سوچتا رہا کہ روحی کو کس طرح خود سے بدظن کرے؟ اس وقت روحی کے جانے کے بعد بھی وہ یہی سب کچھ سوچتا رہا اور جب اس سوچ بچار سے تھک گیا تو اس نے اٹھ کر فریج سے کھانا نکالا جو روحی نے کسی ہوٹل سے منگوایا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح روحی سو کر اٹھی تو معمولی سی نقاہت محسوس کررہی تھی جس سے اسے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر شیریں نے گزشتہ روز ہی اس کے ابارشن کے بعد اس سے کہہ دیا تھا کہ دوسری صبح وہ اٹھے گی، تب بھی اسے نقاہت محسوس ہو گی لیکن گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ خود کو معمول کے مطابق محسوس کرنے لگے گی۔

غسل کرنے کے بعد روحی نے ناشتا کیا۔ پھر بستر پر دوبارہ لیٹ کر کچھ دیر آرام کیا۔ اس کے بعد وہ اٹھی اور میر پور جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

تیار ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ اسے اپنے کسی جاننے والے کا نام نہیں بلکہ صرف نمبر دکھائی دیا۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ روحی نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو!''

''کیا حال ہے روحی عرف فرزانہ!'' دوسری طرف سے تمسخرانہ انداز میں پوچھا گیا۔

روحی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے قربان بیگ کی آواز پہچان لی تھی۔

''تو تم نے میرا موبائل نمبر معلوم کرلیا؟'' وہ تلخی سے بولی۔

''موبائل نمبر ہی نہیں، سب کچھ معلوم کرلیا۔ اپنا نام تم نے ابھی مجھ سے سن ہی لیا ہے۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ تم گارسیا آرگنائزیشن کے چیئرمین جمشید راؤ کی بیٹی ہو۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے حیرت ہوئی۔ تم مجھ سے اس طرح ملتی رہیں جیسے کوئی کال گرل ہو۔ تم مجھ سے جو رقوم حاصل کرتی رہیں، ان کی تمہاری نظر میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہونا چاہیے تھی۔ غالباً اس طرح تم یہی چاہتی تھیں کہ میں تمہاری اصل شخصیت کے بارے میں جان نہ سکوں۔''

روحی بولی۔ ''اب جبکہ تم جانتے ہو کہ میں کس کی بیٹی ہوں تو تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ مجھ سے ناچاقی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ ڈیڈ کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔''

قربان بیگ ہنسا۔ ''تمہیں بھی علم نہیں کہ میرے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔''

روحی کو اس کے تعلقات کی نوعیت کا علم بہرام سے ہو چکا تھا جس کا اس نے قربان بیگ سے اظہار نہیں کیا اور بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ اب مجھ سے رابطہ نہ کرنا۔''

''یہ تو ممکن ہی نہیں روحی! ابھی تو میرا تم سے دل بھی نہیں بھرا تھا کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں تڑپ رہا ہوں تمہارے لیے۔ یہ بتاؤ کہ اب ملاقاتوں کا سلسلہ کب سے شروع ہوگا؟''

''تم نہ جانے کیا بکواس کررہے ہو... مجھے ایسی بے ہودہ باتیں بالکل پسند نہیں۔'' روحی محتاط ہو گئی کیونکہ قربان بیگ یہ گفتگو اپنے موبائل میں ریکارڈ کرسکتا تھا۔

''اگر تم انہیں بے ہودہ با میں کہہ رہی ہو تو چلو چھوڑو۔ مجھے باتوں سے زیادہ عمل کرنا پسند ہے۔ اگر تم نہیں مانیں تو مجھے اپنا ایک...''

روحی نے غصے میں آکر رابطہ منقطع کر دیا لیکن اس وقت تک قربان بیگ نے اپنا فقرہ مکمل کرلیا تھا۔ ''ٹرمپ کارڈ کھیلنا پڑے گا۔''

روحی کے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ قربان بیگ اس کے خلاف کس قسم کا ٹرمپ کارڈ کھیل سکتا ہے۔

مزید کچھ گفتگو ہوتی تو ممکن تھا کہ قربان بیگ اپنے ''ٹرمپ کارڈ'' کے بارے میں کچھ بتا دیتا لیکن روحی خود ہی رابطہ منقطع کرچکی تھی۔ اب یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ خود قربان بیگ سے رابطہ کرتی۔ اس صورت میں قربان بیگ سمجھ لیتا کہ وہ ''ٹرمپ کارڈ'' کی بات سے پریشان ہو گئی ہے جبکہ روحی کا یہ مزاج نہیں تھا کہ کسی پر اپنی پریشانی کا اظہار کرے۔ اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ قربان بیگ اس کی باتیں ریکارڈ کرسکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ قربان بیگ پھر اسے فون کرے گا لیکن روحی چاہتی تھی کہ فی الحال اس کی الجھن کسی قسم کی پریشانی میں تبدیل نہ ہو جائے۔ وہ اس وقت میر پور جارہی تھی اور اس کے دماغ میں یہ سوال شروع ہی سے گردش کرتا رہا تھا کہ وہ نرگس کو اپنے ساتھ کراچی کس طرح لاسکتی ہے؟

ابھی تک وہ کوئی تدبیر نہیں سوچ سکی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ میر پور میں نرگس سے ملنے کے بعد اسے شاید کوئی تدبیر سوجھ ہی جائے۔

قربان بیگ کی کسی بات سے پریشان ہونے سے بچنے کے لیے اس نے اپنا موبائل فون بند کردیا اور گھر سے روانہ ہوگئی۔

تیز رفتاری کی صورت میں میر پور خاص تک کی ڈرائیو تین گھنٹے سے زیادہ کی نہیں۔ روحی نے ایک مرتبہ بائی روڈ ایک لمبا سفر کیا تھا تو میر پور سے بھی گزری تھی۔ وہ کچھ دیر تک کار میں ہی میر پور .... دیکھنے کے لیے وہاں کچھ دیر تک چکر لگاتی رہی اس لیے اسے علم تھا کہ وہاں کوئی اچھا ریستوران یا ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ نرگس کو بلاسکتی۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ نرگس کو ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال پر بلالے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹیشن پر دو ایک بک اسٹال ضرور ہوں گے۔

کار جب میر پور میں داخل ہوئی تو روحی نے کار ایک جگہ روک کر اپنا موبائل فون کھولا اور نرگس سے رابطہ کیا۔

''ہیلو!'' ایک کھنکناتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

''نرگس؟'' روحی نے پوچھا۔

''جی!'' نرگس کے لہجے میں کچھ حیرت یا الجھن تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ اس سے بات کرنے والی لڑکی یا عورت کون ہے؟

روحی کو یقین تھا کہ دوسری طرف سے بولنے والی نرگس ہی ہو گی۔ طارق اسے بتا چکا تھا کہ اس گھر میں کوئی اور نوجوان لڑکی نہیں ہے۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ نرگس کا کہیں رکھا ہوا موبائل فون اس نے اٹھالیا ہو، تاہم اس نے زور دے کر پوچھا۔

''تم نرگس ہی ہونا؟''

''جی ہاں۔'' جواب ملا۔ ''مگر آپ کون ہیں؟ آپ کی آواز میرے لیے اجنبی ہے لیکن آپ میرا نام جانتی ہیں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں اپنے گھر میں ہوں... کیوں؟''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ تمہارے آس پاس تو کوئی نہیں ہے جو تمہاری باتیں سن سکے۔ میں تمہیں ایک خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔''

''کیا بات؟'' نرگس کی کھنکناتی ہوئی آواز تھوڑی سی بھرائی۔ پھر اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے کمرے میں اکیلی ہوں۔''

''اور اکیلی پڑی طارق کے بارے میں سوچ رہی ہو گی؟''

دوسری طرف سے چونک کر پوچھا گیا۔ ''تم کون ہو؟''

''لوگ مجھے مسز عالم کے نام سے جانتے ہیں۔'' روحی نے کہا۔ ''مجھے طارق ہی نے بھیجا ہے۔ تمہارے نام اس کا ایک خط ہے میرے پاس۔''

''طارق کہاں ہے؟'' نرگس نے بے تابی سے پوچھا۔

''دس گیارہ دن سے اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔''

''وہ ایک ایسی مشکل میں پڑ گیا ہے کہ کسی سے رابطہ بھی نہیں کرسکا۔ میرے شوہر عالم صاحب اور میں اس کے ہمدرد ہیں لیکن معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہم دونوں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ بس اتنا ممکن ہوا ہے کہ اس نے تمہارے نام ایک خط لکھ کر میرے حوالے کردیا ہے۔ وہ خط مجھے بہت رازداری کے ساتھ تمہیں پہنچانا ہے۔ میں صرف اسی کام سے میر پور آئی ہوں۔''

''تو میرے گھر آجاؤ۔'' نرگس نے جلدی سے کہا۔ ''میرا پتا...''

''پتا تو مجھے طارق سے بھی معلوم ہوسکتا تھا۔'' روحی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''گھر آؤں گی تو رازداری نہیں رہے گی۔ تمہارے گھر والے تو مجھے دیکھ ہی لیں گے۔ طارق نے مجھے تاکید کی ہے کہ یہ خط میں تمہیں اس طرح دوں کہ کسی بھی تیسرے فرد کو تم سے میری ملاقات کا علم بھی نہ ہو۔''

''تو پھر؟'' نرگس کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔

''میں اس وقت ریلوے اسٹیشن پر ہوں۔ یہاں آجاؤ۔ میں تمہیں بک اسٹال پر کھڑی مل جاؤں گی۔ میں نے آسمانی رنگ کی ساڑی باندھی ہوئی ہے۔'' روحی ہنسی۔ ''مزید شناخت کے لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب تم وہاں پہنچو تو میں بک اسٹال والے سے پوچھوں کہ چودھری رحمت کا آموں کا باغ کہاں ہے؟''

نرگس چونکی۔ ''تم چودھری رحمت کو جانتی ہو؟''

''مجھے اس کے بارے میں طارق سے معلوم ہوا تھا۔ تم دونوں ہمیشہ اسی کے باغ میں تو ملتے رہے ہو۔'' روحی نے جواب دیا پھر اس نے دو ایک باتیں اور بھی کیں جو اسے طارق نے بتائی تھیں اور جو اس کے خیال کے مطابق صرف اس کے یا نرگس کے علم میں تھیں۔

http://digestpk.blogspot.com/

یہ باتیں کرنے سے روحی کا مقصد یہ تھا کہ نرگس اس پر فوراً اعتماد کرلے اور اس سے ملنے آجائے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' نرگس کی سانسیں تیز ہوگئیں۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

''ایک بار پھر تاکید کرتی ہوں کہ کسی کو بتانا نہیں۔''

''چھوٹے بھائی کو تو بتانا ہی پڑے گا۔ میں اسی کے ساتھ آؤں گی۔''

''نہیں۔'' روحی نے جلدی سے کہا۔ ''تمہیں اکیلے آنا ہے۔ میں نے کہا نا کہ رازداری بہت ضروری ہے۔''

''میں چھوٹے بھائی کو سمجھا دوں گی۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔''

''نہیں۔'' روحی نے سختی سے کہا۔ ''میں طارق کی مدد تو کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ میرے لیے پریشانی کا سبب بن جائے گا، اگر میں تمہارے علاوہ بھی کسی کی نظر میں آؤں۔ اگر تم اکیلی نہیں آسکتیں تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔ طارق سے کہہ دوں گی کہ مجھے ناکام کیوں لوٹنا پڑا۔''

روحی کو یقین تھا کہ نرگس ایسا ہرگز نہیں چاہے گی۔ اس کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ نرگس جلدی سے بولی۔ ''اچھا، میں آتی ہوں۔ میری اسکول کی کچھ دوست ہیں۔ گھر والوں سے کہہ دوں گی کہ ان میں سے کسی کے گھر جارہی ہوں۔''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ گھر والوں سے کیا بہانہ کرو گی۔ مجھے تم صرف یہ بتاؤ کہ یہاں کتنی دیر میں پہنچ رہی ہو؟''

''مجھے کپڑے تو تبدیل کرنا ہوں گے۔ اس میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ گھر سے باہر نکل کر رکشا کر لوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' روحی نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ نرگس کتنی دیر میں ریلوے اسٹیشن پہنچ سکے گی۔

''تم مجھے پہچان تو لوگی نا؟'' نرگس بولی۔ ''طارق کے پاس میری بہت سی تصویریں ہیں۔ وہ اس نے تمہیں ضرور دکھائی ہوں گی۔''

''ہاں، میں تمہیں پہچان لوں گی۔ بس تم جلدی سے تیار ہوکر آؤ۔'' روحی نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔ وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس نے نرگس کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اسے تصویر دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

موقع نہ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ طارق کے غائب ہونے کے چوتھے دن طارق کا باپ کراچی پہنچ گیا تھا۔ طارق کا گھر مقفل پانے کے بعد اس نے طارق کے دفتر کا رخ کیا تھا۔ وہاں اسے یہ بات بتائی گئی تھی کہ طارق چار دن سے دفتر نہیں آیا۔ بس فون پر بتاتا رہا ہے کہ وہ بیمار ہے۔ پھر جب طارق کے باپ نے اظہار کیا کہ طارق کا گھر تو مقفل ہے، تب دفتر والوں نے بھی تشویش ظاہر کی۔ اس طرح بات پولیس تک پہنچ گئی۔ باقاعدہ رپورٹ بھی درج ہوئی۔ پولیس نے طارق کے گھر کا قفل توڑ کر وہاں کی تلاشی لی۔ اس کے بعد گھر سیل کردیا گیا۔ اس کے بعد سے پولیس بھی طارق کی تلاش میں تھی۔ ان لوگوں نے میرپور جاکر بھی پوچھ گچھ کی تھی مگر انہیں کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

طارق کا گھر سیل ہوجانے کے باعث یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ روحی کسی طرح وہاں جاکر نرگس کی تصویر دیکھ سکے اور طارق کے پرس میں اس کی تصویر تھی نہیں۔ محبت کرنے والے عموماً ایک دوسرے کی تصویر اپنے ساتھ رکھتے ہیں لیکن اس معاملے میں طارق کی سوچ دوسری تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نرگس کی تصویر پر اتفاقاً بھی کسی کی نظر پڑے اور پرس میں تصویر ہونے کی صورت میں یہ اتفاق ممکن تھا۔

لیکن روحی کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ وہ نرگس کو کس طرح پہچان سکے گی۔ وہ تیز رفتاری سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کے علاوہ شاید ہی کوئی تنہا لڑکی بک اسٹال پر آئے اور اگر آئے گی بھی تو وہ اس کی طرف دھیان دینے کے بجائے بک اسٹال والے سے چودھری رحمت کی کوئی بات چھیڑ دے گی۔ ایسی صورت میں بک اسٹال پر تنہا آنے والی لڑکی اگر نرگس ہوتی تو خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوجاتی۔ اس نے نرگس کو اپنی ساڑی کا رنگ تو بتا ہی دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد روحی جب بک اسٹال پر کھڑی مختلف رسائل اور کتابیں اٹھا کر دیکھ رہی تھی، اس وقت اس کا خیال تھا کہ نرگس کو دو تین منٹ کے اندر وہاں آجانا چاہیے۔

روحی نے خوامخواہ ایک مہنگی کتاب بھی خرید لی۔ وہ بک اسٹال والے کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ صرف وقت گزاری کے لیے اس کے رسائل اور کتابیں تلپٹ نہیں کررہی ہے۔

اسٹیشن پر اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے مگر جو تھے، ان کی توجہ کا مرکز روحی ہی بنی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس موقع کے لیے اس نے چست اور تنگ لباس کا انتخاب نہیں کیا تھا لیکن وہ خوب صورت تو بہرحال تھی اور اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے معلوم ہورہا تھا۔ اس قسم کی لڑکیاں میرپور خاص کے

چھوٹے اسٹیشن پر شاذ ہی نظر آتی ہوں گی۔

دو تین نوجوان بک اسٹال پر آگئے۔ روحی نے اندازہ لگالیا کہ وہ صرف اس کے قریب ہونے کے لیے بک اسٹال پر آئے تھے، کچھ خریدنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ روحی نے ان کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ وہ بڑے انہماک سے ایک رسالے کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی لیکن اپنے ماحول سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ایک نوجوان لڑکی کو بک اسٹال کی طرف آتے دیکھا۔

روحی کے دل میں خیال آیا کہ اگر یہی لڑکی نرگس ہے تو یقیناً طارق کا ذوق نہایت گھٹیا ہے۔ اس لڑکی کے نقوش جاذبِ نظر تو تھے مگر اس کا شمار خوب صورتوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایسی دبلی پتلی تھی جیسے چغتائی آرٹ کا نمونہ ہو... اور روحی کو چغتائی آرٹ سخت ناپسند تھا۔ اس کے خیال کے مطابق صرف وہ جسم دل کش کہا جاسکتا تھا جو بھرا ابھرا اور گداز ہو۔

وہ لڑکی روحی کے بالکل قریب آکھڑی ہوئی۔

روحی کے خیال کے مطابق وہ نرگس نہیں ہوسکتی تھی، تاہم اس نے بک اسٹال والے سے کہا۔ ''تم بتا سکتے ہو اس شہر میں چودھری رحمت کا باغ کہاں ہے؟''

بک اسٹال والے نے کچھ والہانہ سے انداز میں روحی کو بتانا شروع کیا کہ وہ کس راستے سے چودھری رحمت کے باغ تک پہنچ سکتی ہے۔

ابھی بک اسٹال والے کی بات پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ قریب آنے والی لڑکی نے دھیرے سے کہا۔ ''میں آگئی ہوں۔''

روحی نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''اوہ... ہیلو نرگس!'' پھر فوراً ہی اس نے نرگس کا ہاتھ پکڑا اور خریدی ہوئی کتاب دوسرے ہاتھ میں سنبھالے ایک طرف بڑھتی چلی گئی۔

''خط کہاں ہے؟'' نرگس نے بے چینی سے پوچھا۔

''لو۔'' روحی نے کتاب اس کی طرف بڑھائی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں نے یہ کتاب یونہی خرید لی تھی۔ پھر فوراً خیال آیا کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ خط میں نے کتاب میں ہی رکھ دیا ہے۔ اب تم پڑھوگی تو دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ تم کتاب پڑھ رہی ہو۔''

نرگس نے فوراً کتاب کھولی۔

''صفحہ چھیاسٹھ کے بعد دیکھو۔'' روحی نے کہا۔

نرگس نے جلدی جلدی اوراق پلٹے۔ خط اس کے سامنے آگیا۔ وہ اس نے تیزی سے پڑھ ڈالا۔ خط مختصر سا تھا۔

''طارق کی تحریر تو پہچانتی ہوگی تم؟'' روحی بولی۔

''مجھ سے زیادہ کون پہچان سکتا ہے؟'' نرگس کی آواز دل گرفتہ سی تھی پھر اس نے پوچھا۔ ''طارق کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟''

''یہ تمہیں کراچی پہنچنے کے بعد طارق سے ہی معلوم ہو سکے گا۔'' روحی نے کہا۔ ''تم چاہو تو ابھی میرے ساتھ کراچی چلی چلو۔''

''یہ تو ناممکن ہے۔'' نرگس نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''طارق کی وجہ سے پہلے ہی سب پریشان ہیں۔ میں کسی کو کچھ بتائے بغیر غائب ہوجاؤں گی تو سب فوراً ہی پولیس اسٹیشن کا رخ کریں گے۔ طارق نے خط میں لکھا بھی ہے کہ میں کراچی اپنی خالہ کے گھر آجاؤں۔ اس نے تم پر اعتماد اور تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی بات بھی کی ہے لیکن میں تمہاری ہدایات پر کراچی آنے کے بعد ہی عمل کرسکوں گی۔ تم خود سوچو، اچانک تمہارے ساتھ چلے جانے سے میرے گھر والوں پر کیا ردِعمل ہوگا؟''

روحی چاہتی تو تھی کہ نرگس کو اپنے ساتھ لے جائے لیکن اب تک وہ ایسی کوئی تدبیر نہیں سوچ سکی تھی جس پر عمل کرتے ہوئے نرگس اندیشوں کا شکار نہ ہوتی۔ اس نے خود کو نرگس کی دلیل سمجھنے پر مجبور پایا۔

''تو تم کب آسکوگی کراچی؟'' اس نے پوچھا۔

''دل تو چاہ رہا ہے کہ ابھی اڑ کر اپنے طارق کے پاس پہنچ جاؤں۔'' نرگس آب دیدہ ہوگئی۔ ''لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ میں کل ہی کراچی آسکوں گی۔ میری کوشش یہی ہو گی کہ آج ہی اپنے گھر والوں کو آمادہ کرلوں کہ وہ مجھے خالہ سے ملنے کے لیے جانے کی اجازت دے دیں۔''

''اگر انہوں نے اجازت نہ دی؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں اپنی بات منوا لیتی ہوں۔ میری کوشش ہوگی کہ کل صبح ہی یہاں سے نکل جاؤں اور دوپہر تک اپنی خالہ کے گھر کراچی پہنچ جاؤں۔ کراچی پہنچ کر تمہاری ہدایات پر عمل کرنا آسان ہوگا۔'' یہ جواب دے کر نرگس نے کتاب لوٹائی اور کہا۔ ''خط میں نے اسی میں چھوڑ دیا ہے۔ مناسب نہیں کہ یہ میرے پاس رہے۔''

'عقل مند تو ہے یہ سینک سلائی سی لڑکی!' روحی نے سوچا۔ وہ خود بھی نرگس سے وہ خط واپس لے لینا چاہتی تھی لیکن اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

http://digestpk.blogspot.com/

”ذرا اپنا موبائل تو دو۔“ روحی نے اس سے کہا۔

نرگس نے چپ چاپ اپنا موبائل اس کو دے دیا۔ وہ روحی کی اس فرمائش پر الجھ سی گئی تھی۔

روحی نے کہا۔ ”میں نے تمہیں کال کی تھی اس لیے میرا نمبر تمہارے موبائل میں ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ روحی نے جواب دیتے ہوئے اپنے موبائل کا نمبر نرگس کے موبائل سے مٹا دیا۔

”اب میں تم سے کس طرح رابطہ کروں گی؟“ نرگس نے موبائل واپس لیتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی فکر نہ کرو۔ میں خود تم سے رابطہ کرلوں گی۔“

روحی باتیں کرتے ہوئے نرگس کو اسٹیشن سے باہر لے آئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم روانہ ہو جاؤ۔“ روحی بولی۔ ”جلدی واپس گھر پہنچنا غالباً تمہارے لیے بہتر ہوگا۔“

”ہاں۔“ نرگس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا۔ ”میں کہہ کر بھی آئی تھی کہ جلدی لوٹ آؤں گی۔“

روحی نے محسوس کیا کہ نرگس، طارق کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے روحی سے یہ پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا کہ وہ کراچی سے کس طرح آئی تھی۔ نرگس رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی تو روحی نے اپنی کار کی طرف رخ کیا۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو خوب محسوس کر رہی تھی لیکن مردوں کی للچائی ہوئی نظروں کو محسوس کرنا اب اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے بس اتنا خیال رکھا کہ اگر وہاں کوئی مشکوک شخص ہو تو اس کی نظر میں آجائے۔ اگر کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہوتا تو اس سے باخبر رہنا اس کے لیے بے حد ضروری تھا۔

وہاں ایسا کوئی شخص دکھائی نہیں دیا جس پر وہ شبہ... کرتی۔ ویسے بھی اس نے خیال رکھا تھا کہ میرپور آتے ہوئے کوئی اس کے تعاقب میں نہ ہو۔

اب ایک بج چکا تھا۔ روحی بھوک محسوس کر رہی تھی لیکن رک کے کسی ہوٹل میں کھانا کھانا اس نے پسند نہیں کیا اور کراچی روانہ ہوگئی۔

اسٹیشن پر تو نرگس کو دیکھ کر اس کے دماغ کو جھٹکا لگا ہی تھا... اب وہ پھر سوچنے لگی تھی کہ طارق اس لڑکی سے کیسے محبت کرنے لگا جو بہ قول شخصے، پھونک مارنے سے اڑ جاتی۔

بہرحال، اس نے پہلے کی طرح پھر سوچنا شروع کیا۔ وہ اپنی راہ میں آنے والا ہر پتھر ہٹانے پر آمادہ تھی۔ نرگس کو دیکھ کر تو اسے یوں لگا تھا جیسے وہ پتھر بھی نہیں، ایک معمولی سی کنکری ہو۔

اس سوچ کے ساتھ ہی روحی کو خیال آیا کہ اس کا موبائل بند تھا۔ اس نے نرگس کو اسٹیشن بلوانے کے لیے کال کرنے کے بعد وہ پھر بند کر دیا تھا۔ کراچی میں اس نے قربان بیگ کی کال آنے کے بعد موبائل بند کیا تھا۔ وہ نرگس سے ملنے سے قبل قربان بیگ کی باتوں سے خود کو مکدر نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اب نرگس سے ملنے کے بعد اس نے ضروری سمجھا کہ موبائل بند نہ رکھے۔ اسے جمشید راؤ، اس کی ماں یا کوئی اور بھی فون کر سکتا تھا۔

جب کراچی سے اس کا فاصلہ طے ہونے میں ایک گھنٹے سے بھی کم رہ گیا تو اس کے موبائل فون پر کال آئی۔ غصے سے اس کے ہونٹ بھنچ گئے کیونکہ وہ نمبر قربان بیگ کا تھا۔ فوری طور پر تو روحی کو خیال آیا کہ وہ کال ریسیو نہ کرے لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس طرح کام نہیں بنے گا۔ قربان بیگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا، اس سے رابطے کی کوشش کرتا ہی رہتا۔ وہ اس کی کال ریسیو نہ کرتی تو وہ کسی ایسے نمبر سے فون کرتا جس سے روحی واقف نہ ہوتی اور کال ریسیو کر لیتی۔ اس وقت یہ بھی ممکن تھا کہ روحی کے قریب کچھ اور لوگ ہوتے جن کی وجہ سے اس کے لیے قربان بیگ سے بات کرنا مشکل ہو جاتی... لہٰذا بہتر یہی تھا کہ وہ اسی وقت قربان بیگ سے فیصلہ کن بات کر لے۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو!“ اس کی آواز میں غصہ تھا۔

دوسری طرف سے قربان بیگ کے ہنسنے کی آواز آئی پھر کہا گیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم اپنا موبائل فون مستقل تو بند نہیں رکھ سکو گی اسی لیے میں بیس بیس منٹ کے وقفے سے کال کرتا رہا لیکن اس مرتبہ میں نے شاید تین ساڑھے تین گھنٹے کے وقفے سے فون کیا ہے۔ اگر تم نے اپنا فون بند کیا تو پھر جو نقصان تمہیں پہنچے گا، اس کے لیے مجھے الزام نہ دینا۔“

روحی کے دماغ میں قربان بیگ کے الفاظ ”ٹرمپ کارڈ“ پہلے ہی الجھن کا سبب بن رہے تھے۔

”مجھے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟“ روحی نے ہونٹ بھینچ لیے۔

”آج میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میرا کاروبار کاسمیٹکس کا ہے۔ ان میں ایک ایسی کریم بھی شامل ہے جو خواتین استعمال کرتی ہیں۔ اس سارے کاروبار کے لیے مجھے اشتہارات بھی دینا پڑتے ہیں۔ تم جانتی ہی ہوگی کہ اس قسم کے اشتہار میں ماڈل گرلز کو لانا پڑتا ہے۔ اب تم خود سوچو کہ اگر اس کریم کے اشتہار میں تمہاری تصویر چھپ جائے تو تمہارے والد پر اس کا کیا ردِعمل ہوگا؟“

روحی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”تم نے کبھی چھپ کر میری تصویریں بھی لی ہیں؟“

قربان بیگ پھر ہنسا۔ ”چھپ کر تو نہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمہیں معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا ایک شوق یہ بھی ہے۔ میں جن لڑکیوں سے ملتا ہوں، ان کی تصویریں ضرور کھینچتا ہوں۔ ایسی تصویریں جو خاص حالت کی ہوں۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میرے پاس تمہاری کیسی اچھی اچھی تصویریں ہوں گی۔ ان تصویروں کو اس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ فحاشی کی زد میں نہ آئیں لیکن اگر تم نے یا تمہارے باپ نے ان تصویروں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنا چاہی تو پھر وہ تصویریں مکمل حالت میں بھی سامنے آسکتی ہیں... اور یہ تو ظاہر ہے کہ میں ان تصویروں میں نہیں ہوں گا۔“

”جھوٹ بول کر مجھے ڈرانا چاہتے ہو۔“ روحی بولی۔ ”میری نگاہیں بہت تیز ہیں۔ تم نے میری کوئی تصویر نہیں کھینچی ہے۔“

”میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم بہت ہوشیار لڑکی ہو اس لیے مجھے تصویر لینے کا کام بڑی ہوشیاری سے کرنا پڑا۔ ہوشیار انسان بھی بعض اوقات چوٹ کھا جاتے ہیں اور اگر انسان کسی خاص کیفیت میں ہو تو پھر اس کی نظر ضرور چوک سکتی ہے۔“

قربان بیگ کے پُراعتماد لہجے سے روحی کو اندازہ ہوا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

”اگر ایسی کوئی بات ہے تو کیا تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟“

”بلیک میلنگ سے اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ میں رقم کا مطالبہ کروں گا تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کوئی بہت دولت مند آدمی نہیں ہوں لیکن مجھے پیسے کی ہوس نہیں ہے۔ میں ایک اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ تم مجھ سے ناتا نہ توڑو اور مجھ سے ملتی رہو۔“

”کیا تم مجھے ایسی کوئی ایک تصویر دکھا سکتے ہو؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں... جب کہو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پھر کسی وقت تم سے رابطہ کروں گی۔“

”مجھے اپنا دشمن مت سمجھنا روحی! تمہاری قربت میرے لیے غیر معمولی ثابت ہوئی ہے۔ تم نے میری تشنگی اور بڑھا دی ہے۔ میں وہ تشنگی ختم کرنے کا خواہش مند ہوں۔ بس... میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتا...“

روحی نے اس کے لہجے کی نرمی کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں کوشش کروں گی کہ تم سے جلد از جلد فون پر رابطہ کروں۔“

پھر اس نے جواب سنے بغیر لائن کاٹ دی۔ اب اس کے چہرے پر تشویش، پریشانی اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ کچھ دیر کے لیے طارق اور نرگس کو بھول کر قربان بیگ کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کا کچھ بندوبست کرنا اب اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

جب اس کی کار ٹول پلازا سے گزرنے کے بعد کراچی کی شہری حدود میں داخل ہو رہی تھی تو جمشید راؤ کی کال آگئی۔

”کہاں ہو؟“ جمشید راؤ نے پوچھا۔ ”دوپہر کو مجھے تمہارا موبائل بند ملا تھا۔ پھر کچھ مصروفیت رہی، دوبارہ فون کرنے کا موقع اب مل سکا ہے۔“

”میں آپ سے ذکر کر چکی ہوں کہ میں سوئڈش سفیر کے ایک ایسے شوفر کی تلاش میں ہوں جو کچھ عرصے پہلے بیماری کے سبب ملازمت چھوڑ چکا ہے۔“ روحی موبائل فون بند ہونے کی بات ٹال گئی۔

جمشید راؤ نے پوچھا۔ ”پھر... کچھ کامیابی ہوئی؟“

”ابھی تو نہیں ہوئی ڈیڈ۔“

”اب وقت کم رہ گیا ہے۔ راست اقدام کے بارے میں سوچو۔ کل سوئڈش سفیر جس ٹی پارٹی میں جا رہا ہے، وہ پارٹی مس مت کر دینا۔“

روحی بولی۔ ”ڈیڈ! میں نے ایسا بندوبست کر لیا ہے کہ اس پارٹی میں سوئڈش سفیر سے میرا تعارف کرا دیا جائے گا۔ اس کے بعد میں آرگنائزیشن کے مقصد کی طرف تیزی سے بڑھ سکوں گی۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں تمہاری کارکردگی کچھ تیز ہو جائے۔ میں نے فون اس لیے کیا تھا کہ تم نہ جانے کب گھر آؤ۔ شام کی فلائٹ سے میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔“

”ابھی آپ کہاں ہیں؟“

”ابھی تو گھر پر ہوں۔“

”میں تیس چالیس منٹ میں گھر پہنچ جاؤں گی۔ آپ کی ائرپورٹ کی طرف روانگی تو میرا خیال ہے کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوگی؟“

”ہاں۔“ جمشید راؤ نے جواب دیا پھر بولا۔ ”اچھا ہے کہ تم تیس چالیس منٹ میں آجاؤ۔ روانہ ہونے سے پہلے تم سے کچھ ضروری باتیں بھی ہو جائیں گی۔“

روحی کو اندازہ تھا کہ جمشید راؤ اس سے سوئڈش سفیر ہی

http://digestpk.blogspot.com/

کے بارے میں بات کرے گا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جمشید راؤ اسلام آباد کیوں جا رہا تھا۔ اسے وہاں ایک ڈنر میں شرکت کرنا تھی جس میں ملک کے تمام بڑے تاجروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہ دعوت برسرِ اقتدار پارٹی کے وزیرِ تجارت کی طرف سے دی گئی تھی۔ اس کا امکان تھا کہ جمشید راؤ کو وہاں دو ایک دن رکنا پڑتا لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

طارق کا وہ دن بے چینی میں گزرا لیکن جب پانچ بج گئے تو اس کی بے چینی خاصی بڑھ گئی۔ روحی نے اس سے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار بجے تک میرپور سے واپس آجائے گی۔

سوچتے سوچتے طارق کو خیال آیا کہ روحی نے یہ تو بہرحال نہیں کہا تھا کہ وہ میرپور سے واپسی پر سیدھی اسی کے پاس آئے گی۔ یہ تو اس نے خود ہی سمجھ لیا تھا۔ روحی شاید رات ہی کو آتی۔

ان خیالات کے بعد طارق کو روحی کے انتظار کی بے چینی تو نہ رہی لیکن یہ سوالات اس کے دماغ میں کلبلاتے رہے کہ میرپور میں نرگس سے روحی کی ملاقات کس انداز میں ہوئی ہوگی؟ ہوئی بھی ہوگی یا نہیں؟ اس کا خط نرگس کو مل گیا ہوگا یا نہیں؟

ان سوالوں کے ساتھ طارق کے دماغ میں یہ خیال بھی بسا رہا کہ محبت کی بے قراری میں اس کی نرگس کو کراچی بلانے کی خواہش غلط تو نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں آکر اس کے ساتھ وہ بھی کسی مصیبت میں پڑ جائے۔

طارق دل ہی دل میں اس دن کو کوسنے لگا جب اس نے گارسیا آرگنائزیشن میں ملازمت کی تھی۔

ملازمت کیے دو ماہ گزرے تھے جب... ایک دن صبح ہی صبح جمشید راؤ کو اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

''پریشان نہ ہو۔'' جمشید راؤ نے اندر آکر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔ دفتر آنے میں تمہیں ابھی ایک گھنٹا اور لگتا جبکہ میں اس وقت دفتر میں نہیں ہوں گا۔ دفتر تو کیا، میں کراچی میں بھی نہیں ہوں گا۔ تمہیں یہ کام سونپ کر مجھے فوراً ائرپورٹ روانہ ہونا ہے۔ میں ایک مختصر دورے پر لندن جا رہا ہوں۔ پرسوں واپس آجاؤں گا۔ یہ پروگرام رات کو اچانک بنا تھا۔ میرا اسی وقت کی فلائٹ سے جانا بے حد ضروری ہے جبکہ ایک بہت ضروری کام یہاں بھی ہے جو میں تمہارے سوا اور کسی کو نہیں سونپ سکتا۔ اب دفتر میں مجھے تم سے زیادہ کسی پر اعتماد نہیں ہے۔''

آخری فقرہ سن کر طارق کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔

''آپ فون کر کے مجھے اپنے دولت خانے پر بلا لیتے۔''

''اس میں اور زیادہ وقت لگ جاتا۔'' جمشید راؤ نے کہا۔ ''اچھا، اب وقت بہت کم ہے اس لیے توجہ سے بس میری بات سن لو۔ دفتر میں تمہاری ملازمت سے قبل ایک غیر ملکی کمپنی سے ہمارا ایک معاہدہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ کل رات اچانک اس کی تجدید کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ ان کا ایک نمائندہ یہاں ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ اسے فوری طور پر کچھ فائلیں اور کاغذات پہنچانا ہیں۔ وہ سب کچھ اس بریف کیس میں ہے۔'' جمشید راؤ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بریف کیس اس کی طرف بڑھایا۔ ساتھ ہی ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ ''وہ تمہیں اندر بلا لے گا لیکن تم سے تجارت یا اس معاہدے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ تمہیں بٹھا کر چائے بھی پلائے گا اور اس دوران میں رسمی سی باتیں کرے گا۔ بریف کیس تم فوراً ہی اس کے حوالے کر دینا اور چائے پی کر وہاں سے چلے آنا۔ دفتر میں تمہیں بس وہی کام کرنے ہیں جن کی ہدایات میں تمہیں دے چکا ہوں۔ پرسوں تک میں لندن سے واپس آہی جاؤں گا۔ اس کام کا ذکر تم کسی سے مت کرنا۔''

طارق نے جمشید راؤ کی ہدایت پر من و عن عمل کیا۔ ہوٹل کے کمرے میں اس کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی، وہ کوئی یورپین تھا۔ طارق کو یہ اندازہ لگانے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی کہ اس آدمی کا تعلق کس ملک سے ہوگا۔

دوسرا دن چھوڑ کر اگلے دن جمشید راؤ لندن سے واپس آگیا تھا۔

اس وقت طارق کے دل میں کسی بھی قسم کے شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس کی نوبت اس دن آئی جب کوئی ایک ماہ بعد جمشید راؤ نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر اسے ایک چھوٹا سا بریف کیس دیتے ہوئے کہا۔

''تم یہ لے کر ائرپورٹ پہنچو طارق! لاہور جانے والی ایک فلائٹ میں تمہارے نام سے ایک ٹکٹ لے لیا گیا ہے لیکن تمہیں لاہور نہیں جانا ہے۔ ٹکٹ صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ تم ڈیپارچر لاؤنج تک پہنچ سکو۔ وہاں تمہیں کسی جگہ یہ آدمی بیٹھا ہوا ملے گا۔'' جمشید راؤ نے طارق کو ایک ادھیڑ عمر غیر ملکی کی تصویر دکھائی تھی۔ ''اس کو ذرا دیر تک غور سے دیکھ کر اس کا چہرہ ذہن نشین کر لو تاکہ غلطی کی گنجائش نہ رہے۔ جب تم اس

کے قریب جاؤ گے تو وہ اپنی برابر کی کرسی سے اپنا بیگ اٹھا لے گا۔ تم اسی کرسی پر بیٹھ جانا اور یہ بریف کیس فرش پر اس طرح رکھنا کہ دیکھنے والے یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ یہ بریف کیس تمہارا ہے یا اس غیر ملکی کا۔ پھر جب یہ اعلان ہوگا کہ اس فلائٹ کے مسافر جہاز میں پہنچیں تو وہ غیر ملکی اٹھتے وقت اپنے بیگ کے ساتھ یہ بریف کیس بھی اٹھا لے جائے گا۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا ہے، اس کے بجائے تم ڈیپارچر لاؤنج سے باہر آکے اپنا ٹکٹ کینسل کرا دینا۔ بہانہ یہ کرنا کہ تمہیں اچانک اپنے کسی عزیز کی موت کی اطلاع موبائل فون پر ملی ہے اس لیے تمہیں کراچی میں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد تم ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آکے سیدھے دفتر آجانا۔''

ان ہدایات کو سن کر طارق کے کان کھڑے ہو گئے تھے کیونکہ کسی کو بریف کیس دینے کا یہ ایک پُراسرار طریقہ تھا۔

جمشید راؤ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے مزید کہا۔ ''دراصل لاہور کے ایک ادارے سے ہمارا ایک تجارتی معاملہ چل رہا ہے۔ ہماری مخالف کمپنی چاہتی ہے کہ وہ معاملہ نہ چل سکے اس لیے سارے کام بڑی رازداری سے کیے جا رہے ہیں۔ اگر اس آدمی کو دفتر بلا کر یہ کاغذات دیے جاتے تو ہماری مخالف کمپنی کو بھی اس کا علم ہو جاتا لیکن اس طریقۂ کار کی وجہ سے وہ لوگ بے خبر رہیں گے۔ بس ایک مرتبہ یہ کاغذات لاہور پہنچ جائیں تو پھر وہ کمپنی ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکے گی۔''

طارق کو یہ باتیں بھی مطمئن نہیں کر سکی تھیں۔ اسے یہی بات بہت زیادہ کھٹک رہی تھی کہ لاہور کی کسی کمپنی کا آدمی غیر ملکی کیوں ہے؟

''یہاں سے تم پہلے اپنے گھر جاؤ گے۔'' جمشید راؤ نے کہا۔ ''دراصل ہمارے مخالفوں کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ دفتر سے ہمارا کوئی آدمی سیدھا ائرپورٹ گیا ہے۔ اپنے گھر پہنچنے کے بعد تم اپنی کار وہیں چھوڑ دینا اور ٹیکسی سے ائرپورٹ جانا۔ ممکن ہے کہ ہمارے مخالف تمہاری کار بھی پہچانتے ہوں اور وہ ائرپورٹ پر پہچان لی جائے۔ میں نے کہا نا کہ یہ کام بہت رازداری سے کرنا ہے۔''

اس کام میں اتنی رازداری کی اصل وجہ کا علم طارق کو بعد میں ہوا۔ اس وقت تو اس نے جمشید راؤ کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل کیا تھا۔ اپنی کار گھر لے جا کر چھوڑی اور ایک ٹیکسی میں ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔ وقت کے بارے میں ہدایات بھی اسے جمشید راؤ ہی سے ملی تھیں۔

ائرپورٹ جاتے ہوئے وہ مسلسل سوچتا رہا کہ یہ کوئی غیر معمولی معاملہ ہے اور بات صرف وہ نہیں ہے جو اسے جمشید راؤ نے بتائی ہے۔ اسے یہ خدشہ بھی ہو چلا تھا کہ اگر یہ کوئی غلط سلط کام ہوا تو وہ بھی کسی پریشانی میں پڑ سکتا ہے۔ اس نے فلموں میں دیکھا تھا کہ بعض بڑے بڑے باوقار اداروں کی آڑ میں غلط کام بھی کیے جاتے ہیں۔

ان سب خیالات کے باوجود یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے مشکل تھا کہ وہ یہ ملازمت چھوڑ دے۔

ان الجھنوں کے ساتھ وہ ائرپورٹ پہنچا۔ رسمی کارروائیوں سے گزر کر جب وہ ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوا تو پریشان کن خیالات اسے گھیرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک طرف بڑھتے ہوئے، مسافروں پر نظر دوڑانا شروع کی۔ اسے اس غیر ملکی کی تلاش تھی جس کی تصویر اسے جمشید راؤ نے دکھائی تھی۔ اسے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ غیر ملکی اسے دکھائی دیا جو بڑے آرام سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ جمشید راؤ کے کہنے کے مطابق اس کے برابر کی سیٹ پر ایک سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔

طارق جب اس کے پاس جا کر رکا تو غیر ملکی نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا بیگ سیٹ سے اٹھا کر اپنے قدموں کے پاس رکھ لیا۔

طارق نے اس سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بریف کیس اس طرح رکھا کہ وہ اس غیر ملکی کی دسترس میں بھی رہے۔

ڈیپارچر لاؤنج میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ فلائٹ کے مسافروں کے لیے اسپیکر کے ذریعے التماس کی گئی کہ وہ اب طیارے میں سوار ہونے کے لیے ''شٹل'' کا رخ کریں۔

یہ وہی لاہور جانے والی فلائٹ تھی۔ جمشید راؤ نے طارق کے لیے وقت کا تعین اس طرح کیا تھا کہ اسے ڈیپارچر لاؤنج میں زیادہ وقت نہ گزارنا پڑے۔

اعلان سنتے ہی اور بہت سے مسافروں کے ساتھ وہ غیر ملکی بھی اٹھا۔ اس نے اپنے بیگ کے ساتھ وہ بریف کیس بھی اٹھا لیا تھا جو طارق کو جمشید راؤ سے ملا تھا۔

بہ مشکل ایک منٹ رک کر طارق بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کا رخ ڈیپارچر لاؤنج سے باہر جانے والے راستے کی طرف تھا۔ اس کے انداز سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ بہت عجلت میں ہے۔

ٹکٹ کینسل کرانے کے بعد وہ ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے وہاں ایک ہڑبونگ کا احساس ہوا۔

http://digestpk.blogspot.com/

اس احساس کی وجہ بھی فوراً اس کی سمجھ میں آگئی۔ پولیس کے کئی ٹرک وہاں آکر رکے تھے اور پولیس والوں نے کود کود کر ان میں سے اترنا شروع کر دیا تھا۔ انہی کی وجہ سے وہاں موجود لوگوں میں ہلچل مچی تھی۔

''میرے ساتھ آؤ... جلدی۔'' اس نے روحی کی آواز سنی اور چونکا۔ روحی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ''تیزی سے آؤ میرے ساتھ، ورنہ گرفتار بھی ہو سکتے ہو۔''

روحی کے دوسرے فقرے نے طارق کے دماغ پر دھماکا سا کر دیا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیالات پہلے ہی سے گردش کر رہے تھے کہ وہ کسی پریشانی میں نہ پڑ جائے۔ اس نے روحی کے ساتھ تیزی سے قدم بڑھا دیے۔

اور پھر روحی اسے اپنی کار میں بٹھا کر اس اپارٹمنٹ میں لے آئی۔

''بچ گئے تم!'' روحی نے گھر آتے ہی اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ورنہ گرفتار کر لیے جاتے۔''

راستے میں وہ بالکل خاموش اور سوچ میں ڈوبی رہی تھی۔

طارق نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ائرپورٹ پر آخر ہوا کیا تھا؟ پولیس کی اتنی بڑی نفری...''

روحی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہاں اس کے بعد کیا ہوا، کیا نہیں ہوا... یہ جاننے کے لیے مجھے جانا پڑے گا۔ موبائل فون پر کسی سے اس کے بارے میں بات نہیں کروں گی۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک کمرا دکھا دوں۔ تم وہاں آرام کرو۔ میں ایک دو گھنٹے بعد واپس آکر تمہیں اس بارے میں کچھ بتا سکوں گی۔ اگر کوئی ڈور انٹر کام بجائے تو جواب دینے یا پوچھنے مت چلے جانا۔ میں باہر سے مقفل کر کے جاؤں گی۔ یہ ضروری ہے کہ کسی کو یہاں تمہاری موجودگی کا علم نہ ہو۔''

طارق کے حواس اتنے پراگندہ تھے کہ وہ روحی سے کچھ اور استفسار نہ کر سکا۔ روحی نے اسے اپارٹمنٹ کا جو بیڈروم دکھایا، وہ وہیں رک گیا۔

روحی تین گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس دوران میں طارق پریشان ہی رہا۔ اس پریشانی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب روحی نے اسے ایک اخبار کا سپلیمنٹ دیا۔

سپلیمنٹ کی سرخی تھی۔

''ایک غیر ملکی جاسوس کی ڈرامائی گرفتاری!''

ذیلی سرخی میں لکھا تھا۔ ''جاسوس ایک فلائٹ سے لاہور جا رہا تھا۔ طیارے کا انجن اسٹارٹ ہو چکا تھا جب طیارے کو رکوا کر پولیس طیارے میں داخل ہوئی اور جاسوس کو گرفتار کیا۔ ائرپورٹ پر ہلچل، طیارے کے مسافر پریشان!''

خبر کے مطابق ایک اطلاع ملنے پر پولیس برق رفتاری سے ائرپورٹ پہنچی تھی۔ جاسوس کے پاس کچھ اہم سرکاری دستاویزات تھیں جو ایک ذریعے کے مطابق کسی مقامی شخص نے ڈیپارچر لاؤنج میں جاسوس کے حوالے کی تھیں۔ ذرائع کے مطابق دوسرکاری ایجنسیاں اس مقامی شخص کی تلاش میں تھیں اور شبہ انور نامی ایک شخص پر کیا جا رہا ہے جس نے طیارے کی روانگی سے ذرا پہلے اپنا لاہور کا ٹکٹ کینسل کرایا تھا۔

خبر خاصی تفصیلی تھی لیکن اس کا لبِ لباب اس سے زیادہ نہیں تھا۔

''انور!'' نام پڑھ کر طارق کا جسم سنسنا اٹھا۔ اس کے لیے لاہور کا ٹکٹ اسی نام سے بنوایا گیا تھا۔

''اب تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم کتنے بڑے خطرے میں پھنس گئے ہو۔'' روحی بولی۔

''تو...'' طارق کے لہجے میں لکنت آگئی۔ ''گارسیا آرگنائزیشن کے تحت یہ کام کیا جاتا ہے؟''

''یہ کام بھی کیا جاتا ہے۔'' روحی نے جواب دیا۔ ''وہ تو کہو کہ مجھے عین وقت پر کسی ذریعے سے خبر مل گئی اور میں تمہیں وہاں سے بچا لائی۔'' پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اسی سے اندازہ لگا لو کہ مجھے تم سے کتنا لگاؤ ہے... لیکن تم مجھے ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے ہو۔''

طارق کو ان باتوں سے زیادہ حیرت روحی کی مسکراہٹ پر ہوئی۔ وہ ان حالات میں بھی مسکرا رہی تھی۔ اس حیرت کے ساتھ ساتھ کچھ اور خیالات بھی اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ وہ خیالات، سوالات بن کر اس کی زبان پر آنے لگے اور روحی نے صاف صاف جوابات دیے۔ یہ بھی نہیں چھپایا کہ اس آرگنائزیشن کے لیے وہ خود بھی کام کرتی تھی اور اسے اس کے لیے خود اس کے باپ جمشید راؤ نے آمادہ کیا تھا کیونکہ روحی اپنی افتادِ طبع کے باعث اس کام کے لیے بہت موزوں تھی اور ہمیشہ مؤثر بھی ثابت ہوئی تھی۔

روحی سے ہی اسے ''اسمیشر گروپ'' کے کارندوں کے بارے میں بھی معلوم ہوا تھا جو ہر اس شخص کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے تھے جس کے بارے میں شبہ بھی ہو جاتا تھا کہ وہ آرگنائزیشن کے راز سے واقف ہو گیا ہے۔

اس قسم کے اکثر کام جمشید راؤ اپنے کسی پی اے سے لیا کرتا تھا اور جب شبہ ہوتا تھا کہ پی اے آرگنائزیشن کے

عذر

ایک شخص رات کے وقت گھبرایا ہوا ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بولا۔

''جناب! میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے براہِ کرم ابھی میرے ساتھ چلیے۔''

ڈاکٹر اپنا بیگ اٹھا کر اس شخص کے ساتھ روانہ ہو گیا اور اس کے گھر پہنچ کر کہا۔ ''بیوی کہاں ہے؟''

''جناب! وہ سامنے والے کمرے میں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اچھا تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی جا کر تمہاری بیوی کو دیکھتا ہوں۔'' قہر درویش بر جان درویش، وہ شخص باہر ہی انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے باہر آکر کہا۔ ''تمہارے پاس اسکروڈرائیور ہے؟''

وہ شخص یہ سوچتا ہوا کہ ڈاکٹر واقعی قابل ہے اور اس نے فوراً معلوم کر لیا کہ میری بیوی کا اسکرو ڈھیلا ہو گیا ہے، اسکروڈرائیور تلاش کرنے لگا اور پھر ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر پھر کمرے سے باہر آیا اور ہتھوڑا طلب کیا۔ اس بار اس شخص کا ماتھا ٹھنکا۔ بہرحال اس نے خاموشی سے ہتھوڑا بھی ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر پھر نمودار ہوا اور چھینی طلب کی۔ اس بار اس شخص سے ضبط نہیں ہو سکا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر! کیا تم میری بیوی کا بھیجا ہی نکال پھینکنا چاہتے ہو۔ ڈاکٹر ہو یا قسائی!''

ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''بھائی! ابھی تو میرا بریف کیس ہی نہیں کھلا۔''

مرسلہ: طاہر مغل۔ چھالیہ سے

بارے میں کچھ سوچنے لگا ہے تو اسے ایک بڑی رقم دے کر ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا اور ساتھ ہی اسے ڈھکے چھپے انداز میں دھمکی بھی دی جاتی تھی کہ اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسی لیے جمشید راؤ کے پی اے بدلتے رہتے تھے۔ یہ نوبت صرف دو مرتبہ آئی تھی کہ کسی نے اپنے باپ یا بیٹے کی گمشدگی کے بارے میں رپورٹ کی ہو اور پولیس کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ گمشدہ شخص گارسیا آرگنائزیشن میں جمشید راؤ کا پی اے تھا۔

''تم دوسرے آدمی ہو۔'' روحی نے اس سے کہا۔ ''پہلے ایک شخص کا قیمہ کر کے سمندر میں بہایا جا چکا ہے۔ اس نے پولیس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا علم آرگنائزیشن کو بروقت ہو گیا۔ تم دوسرے آدمی ہو جو کیونکہ غائب ہو گیا ہے لہٰذا اب اسمیشر گروپ کے لوگ تمہیں ہر جگہ ڈھونڈتے پھریں گے۔''

''تو تم نے مجھے غائب کیوں کیا؟''

''نہ کرتی تو بھی تمہارا حشر اچھا نہیں ہوتا... کیونکہ قانون کے رکھوالوں کو انور نامی ایک شخص کی تلاش ہے اس لیے وہ جلد یا بہ دیر سراغ لگا ہی لیں گے کہ وہ تم ہو جو طارق کے نام سے جمشید راؤ کے پی اے کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہو۔ اس کا اندازہ ڈیڈ نے بھی کر لیا ہے۔ اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ آج تم دفتر سے اپنے گھر واپس جاتے تو یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہوتی یا نہیں۔''

طارق کانپ گیا لیکن روحی نے اس کی ڈھارس بندھائی اور یقین دلایا کہ وہ اسے چند دن کے اندر اندر صرف کراچی سے ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر بھجوا دے گی۔

طارق کے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا رہا کہ روحی نے اپنی آرگنائزیشن سے غداری کیوں کی؟ اس سوال کا جواب اسے دوسری رات کے بعد ملنا شروع ہو گیا۔ دوسری رات روحی نے اسے اپنے بیڈروم میں بلایا اور خود اس وضع میں تھی کہ اسے دیکھ کر کسی بھی مرد کے جذبات برانگیختہ ہو سکتے تھے۔

اس کے بعد طارق اس کا ''کھلونا'' بن کر رہ گیا۔

اسی دوران میں نرگس کی بات طارق کی زبان پر آگئی اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس سے غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی؟

پھر یہ سوال شاید غلطی ہی سے اس کی زبان پر روحی کے سامنے بھی آگیا جب وہ سات بجے کے قریب اس سے ملنے آئی تھی۔

''اس میں غلطی کی کیا بات ہے؟'' روحی نے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ کہیں وہ بھی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔''

'مصیبت میں تو اسے پڑنا ہے۔' روحی نے اپنے دل میں کہا پھر طارق سے بولی۔ ''اس لڑکی سے مل کر مجھے حیرت

http://digestpk.blogspot.com/

ہوئی ہے طارق!''

''کیوں... کیا مطلب؟'' طارق کے منہ سے نکلا۔

''اس دھان پان سی لڑکی میں مجھے تو کوئی کشش نظر نہیں آئی۔ تمہیں شاید احساس یا اندازہ نہیں طارق کہ تم کیا ہو... نفس کا دیو پیکر غولِ بیابانی!''

اس کا مطلب سمجھ کر طارق کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں گا اگر تم مجھ سے اس کے بارے میں ایسی باتیں نہ کرو۔'' طارق نے اپنے جذبات قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''پھر کس سے کروں؟ کسے سمجھاؤں؟'' روحی کچھ تلخ ہوگئی۔

''تمہیں ضرورت ہی کیا ہے کہ مجھے سمجھاؤ؟''

''تم میرے ہو طارق!'' روحی نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''لہٰذا مجھے اس سے سروکار تو ہوگا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم مجھ سے دور ہو کر ساری زندگی بے سکون رہو۔ وہ سکون تمہیں نرگس نہیں، صرف میں دے سکتی ہوں۔''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' طارق اس وقت شاید بھول گیا تھا کہ وہ روحی کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ اسے قانون کے ہاتھوں تک یا اسمیشر گروپ کی قتل گاہ تک پہنچا سکتی تھی۔

''میں کیا چاہتی ہوں؟'' روحی مسکرائی پھر کچھ رک کر بولی۔ ''ایک شرط لگاؤ گے مجھ سے؟''

''کیسی شرط؟''

''نرگس اگر تمہیں برداشت کر سکی تو میں تم پر اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں گی، ورنہ تم نرگس کو چھوڑ دینا۔''

''یہ تم کیسی شرط لگا رہی ہو... اور ہار جیت کا فیصلہ کیسے ہوگا؟''

''ہو جائے گا۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''فی الحال تو میں اب یہ چاہتا ہوں کہ نرگس یہاں نہ آئے۔''

روحی چونکی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔'' طارق نے کہا۔ ''میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں اب یہاں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔''

''وہ تو کل میر پور سے کراچی آجائے گی۔''

''تم اس سے رابطہ نہ کرنا۔ وہ مایوس ہو کر واپس چلی جائے گی۔''

''نہیں، اب تو اسے یہاں آنا ہی ہے۔'' روحی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں اسے پرسوں یہاں لاؤں گی۔ کل ہی لاتی لیکن کل ایک پارٹی میں میری شرکت ضروری ہے۔''

روحی کو اگلے دن اس پارٹی میں شرکت کرنا تھی جہاں سوئڈش سفیر کو آنا تھا۔

''اب تم یہ ضد کیوں کر رہی ہو؟'' طارق بولا۔ ''یہ تو میری خواہش تھی کہ وہ یہاں آئے لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں نہ آئے۔''

''لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں آئے۔''

''کیوں؟'' طارق نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں اب اس سے کیا دلچسپی؟''

''یہ میں پرسوں ہی بتاؤں گی۔'' روحی نے مسکرا کر کہا۔ ''اب ہمیں ان باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ بارہ بجے تک مجھے واپس گھر بھی جانا ہوگا۔ تم بڑے عجیب ہو طارق! میری قربت کے لیے تو لوگ پاگل رہتے ہیں، لیکن میرے قریب ہوتے ہوئے تمہیں کچھ نہیں ہوتا... تمہارے جذبات میں تیزی نہیں آتی؟''

طارق نے اس کی بات کے جواب میں نظریں جھکا لیں اور روحی کو جانے کی عجلت تھی، وہ اسے پیار کرتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

روحی کا دوسرا دن، آرگنائزیشن کے کاموں کے حوالے سے بہت مصروف گزرا۔ شام کو اس نے جس پارٹی میں شرکت کی، وہ گیارہ بجے کے بعد ختم ہوئی اس لیے طارق سے ملنے روحی تھوڑی سی دیر کے لیے جا سکی۔ طارق اس رات بھی مصر رہا کہ نرگس کو وہاں نہ لایا جائے لیکن روحی کا اصرار تھا کہ شرط کا فیصلہ تو اب ہو کر رہے گا... ہار جیت تو ہو کر رہے گی۔

کیسی شرط؟ کیسی ہار جیت؟ طارق کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ شرط اس اعتبار سے یک طرفہ تھی کہ وہ روحی نے لگائی تھی۔ طارق تو یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس شرط کی ہار جیت کا فیصلہ ممکن کیسے ہے؟ طارق کی الجھن بڑھتے بڑھتے کسی حد تک ہیجان میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن روحی کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ طارق کو صرف اپنا بنائے رکھنے کے لیے اس پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔

نرگس اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کراچی پہنچ چکی تھی۔ روحی نے چند جملوں کے تبادلوں کی حد تک موبائل فون پر نرگس سے رابطہ کیا تھا اور نرگس سے صرف اتنی بات کی کہ وہ کسی وجہ سے اسے اگلے دن شام کو طارق کے پاس لے جا سکے گی۔

اسی دن روحی کو اپنے موبائل پر قربان بیگ کا پیغام ملا کہ وہ بے چینی سے اس کی کال کا انتظار کر رہا ہے۔

روحی نے پیغام کا جواب پیغام ہی سے دیا لیکن احتیاط یہ برتی تھی کہ اپنے پاس پڑے ہوئے موبائل فونز میں سے ایک موبائل فون کا استعمال کیا تھا۔ اس موبائل کی ''سم'' اس کے نام سے نہیں تھی۔

روحی کا جوابی پیغام یہ تھا کہ اگلے روز دوپہر ایک بجے وہ لیمن اسکواش پینے اسی ''اسپاٹ'' پر جائے گی جہاں قربان بیگ سے اس کی تلخ گفتگو ہو چکی تھی۔ قربان بیگ وہاں آکر اس سے مل سکتا تھا۔

روحی نے جس موبائل فون سے پیغام بھیجا تھا، وہ اس فون پر بھی قربان بیگ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قربان بیگ اس کی آواز اپنے موبائل فون میں ریکارڈ کر لے گا۔ اسی لیے وہ قربان بیگ سے دوبدو بات چیت کرنا چاہتی تھی۔

روحی کے علم میں ایسی ''ڈیوائس'' آچکی تھیں جو موبائل فون میں لگانے کے بعد آواز کو یکسر بدل دیتی تھیں اور وہ ڈیوائسز گارسیا آرگنائزیشن کے پاس بھی آچکی تھیں لیکن موبائل فون میں انہیں لگانے کا کام ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔ آرگنائزیشن کے پاس ایسے صرف دو آدمی تھے جن کا تعلق آرگنائزیشن کے اسمیشر گروپ سے تھا۔

روحی اپنے کسی بھی موبائل میں وہ ڈیوائس لگوانے کے لیے جمشید راؤ سے بھی کہہ سکتی تھی لیکن اس نے براہِ راست بہرام سے بات کی۔ اس نے بہرام کو صرف ایک بار ''نوازا'' تھا لیکن وہ تبھی سے اس کا بندہ بے دام بن چکا تھا۔

''اس کا علم کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے بہرام کو وہ موبائل فون دیتے ہوئے کہا جس کے ذریعے وہ قربان بیگ کو پیغام بھیج چکی تھی۔

پیغام بھیجنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قربان بیگ دوسرے دن کا انتظار کرے۔ حقیقتاً وہ قربان بیگ سے ملاقات کرنے کے بجائے اس سے موبائل فون پر ہی بات کرنا چاہتی تھی۔

بہرام نے اس موبائل فون میں مطلوبہ ڈیوائس لگوانے کے بعد وہ روحی کو اس وقت دیا تھا جب وہ رات کو پارٹی سے واپس لوٹی تھی۔

صبح بیدار ہونے کے بعد روحی کچھ دیر تک لیٹی سوچتی رہی۔ اس دن اسے دو کام کرنے تھے جن کی منصوبہ بندی اس نے کر لی تھی اور اب اس منصوبے پر صرف نظرِ ثانی کر رہی تھی۔

گیارہ بجے اس نے ڈیوائس لگے ہوئے موبائل فون پر قربان بیگ سے رابطہ کیا۔

''خوب!'' قربان بیگ نے اس کی آواز پہچان لی۔

موبائل فون میں لگی ہوئی ڈیوائس کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ سننے والے کو تو آواز کسی فرق کے بغیر سنائی دیتی لیکن اگر اسے ریکارڈ کیا جاتا تو آواز یکسر تبدیل ہو کر ریکارڈ ہوتی۔

روحی بولی۔ ''یہ خوب کیوں کہا تم نے؟''

''تم نے پیغام بھی اسی نمبر سے بھیجا تھا، اب بات بھی اسی نمبر سے کر رہی ہو؟'' قربان بیگ نے کہا پھر ہنس کر بولا۔ ''غالباً اس کی سم تمہارے نام سے نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک سمجھے تم۔'' روحی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''دیکھو قربان! جب تک ہمارے بگڑے ہوئے تعلقات معمول پر نہیں آجاتے، میں محتاط رہنا چاہتی ہوں۔''

''گڈ!'' قربان بیگ بولا۔ ''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم تعلقات معمول پر لانا چاہتی ہو۔''

''ہاں۔'' روحی نے کہا۔ ''لیکن یہ خیال اپنے دل میں نہ لانا کہ میں اپنی ان تصویروں سے ڈر گئی ہوں جو تم نے کھینچ لی ہیں۔ ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں قربان! اس قسم کی تصویریں کمپیوٹر سے بھی بنائی جا سکتی ہیں۔ میں تمہیں عدالت میں کھینچ لیتی... تم پر ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر دیتی لیکن اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔''

''ضرورت... کیا مطلب؟''

''تم مجھے سمجھ نہیں سکے ہو قربان! تم نے یہ اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ میں جذباتی طور پر بہت شدید ہوں۔''

''اسی نے تو مجھے تمہارا دیوانہ بنایا ہے جانِ من۔''

''پوری بات سنو!'' روحی نے کہا۔ ''اپنی اسی شدت پسندی کی وجہ سے میں بھٹکتی رہی ہوں... یا یوں کہہ لو کہ جستجو میں رہی ہوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہو سکی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب بہت پوچھتے ہو تم۔'' روحی ہنسی۔ ''خیر، میرا مطلب یہ ہے کہ جو بات میں صنفِ مخالف میں چاہتی ہوں، وہ مجھے نہیں مل سکی لیکن یہ طے ہے کہ تم ان سب سے بہتر ہو...''

''واقعی؟''

''فی الحال تو تم اس بات سے خوش ہو جاؤ کہ ہم آج رات مل رہے ہیں۔''

''کب آؤ گی؟'' قربان بیگ نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے مناسب وقت دیکھنا پڑے گا۔ نو بجے کے بعد

http://digestpk.blogspot.com/

میری کال کا انتظار کرنا۔ میں نو، ساڑھے نو کے درمیان فون کروں گی۔"

روحی نے فی الحال یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ آج رات وہ اس کے پاس نہیں آئے گی بلکہ اسے اپنے ساتھ لے جائے گی۔ اس نے قربان بیگ کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے جا کر قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بعد میں اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا کام وہ بہرام کے سپرد کر دیتی۔ اس قسم کے کام اسمیشر گروپ کے لیے بہت معمولی نوعیت کے تھے۔

روحی کی تصاویر قربان بیگ کے موبائل میں ہوتیں اور موبائل اس کے ساتھ ہی ہوتا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس نے وہ تصاویر اپنے کمپیوٹر میں منتقل کر کے ان کے پرنٹ نکالے ہوں گے۔ وہ سب کچھ اس کے قتل کے بعد اس کے گھر کی تلاشی لے کر تلف کیا جا سکتا تھا۔ اس کام میں کوئی مشکل اس لیے نہیں ہوتی کہ قربان بیگ اکیلا ہی رہتا تھا۔

بہرام وہ سارا کام تن تنہا کر گزرتا۔ روحی کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ اس کی تصاویر بہرام کی نظر میں آ جاتیں۔ اگرچہ روحی نے اسے اپنی اس افتادِ طبع کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس کے اندازے کے مطابق بہرام اس کی کیفیات سے خوب واقف ہو چکا تھا۔

وہ کیونکہ بہرام کو نواز چکی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ بہرام دوبارہ بھی تمنائی ہوگا۔ اس کے لیے روحی کا یہ اشارہ بہت ہوتا کہ اس کام کے بعد وہ اس کے لیے کچھ وقت نکالے گی۔

کوئی بھی خوب صورت عورت کسی بھی مرد کو اپنی انگلیوں کے اشارے پر نچا سکتی ہے۔ اس فلسفے پر روحی کو کامل یقین تھا۔

اس نے بازار سے دو چرمی تھیلے خریدے جو سائز میں چھ فٹ سے کم نہیں تھے۔ وہ تھیلے رکھنے کے لیے اس نے ایک بریف کیس بھی خریدا اور اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔

طارق نے فوراً دروازہ بند نہیں کیا۔ شاید اسے توقع تھی کہ روحی کے پیچھے نرگس بھی ہوگی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" روحی جلدی سے بولی۔ "دروازہ بند کرو۔"

طارق نے کھوئے کھوئے سے انداز میں دروازہ بند کیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ تم نرگس کو بھی ساتھ لائی ہوگی۔"

"نہیں، ابھی میں بس کچھ سامان رکھنے آئی ہوں۔" روحی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ طارق خوف سے کانپ جائے گا، اگر وہ اسے بتائے گی کہ آج رات اسے ایک لاش ایک تھیلے میں بند کرنا ہے اور پھر اس تھیلے کو دوسرے تھیلے میں بند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لاش وہاں سے ہٹانے میں اگر کچھ دیر ہو جائے تو لاش کی بو پھیلنے کا خدشہ نہ رہے۔

وہ بریف کیس اپنے کمرے میں رکھ کر لوٹی تو طارق بیرونی کمرے ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔

"بس اب میں جا رہی ہوں۔" روحی نے طارق سے کہا۔ "اب مجھے نرگس سے رابطہ کرنا ہے۔"

"پلیز!" طارق نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "اسے یہاں نہ لاؤ۔"

روحی ہنس کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جواب میں کچھ کہہ کر کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

اپارٹمنٹ سے کچھ دور نکل آنے کے بعد اس نے اپنی کار کی رفتار کم کرتے ہوئے نرگس کے موبائل پر کال کی۔

"میں بہت بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔" نرگس چھوٹتے ہی بولی۔ "کل تم نے مجھ سے بات کی تھی تو میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق اپنے موبائل سے تمہارا نمبر صاف کر دیا تھا لیکن وہ میں نے ذہن نشین کر لیا ہے۔ اس کے باوجود میں انتظار کرتی رہی اور تمہیں فون نہیں کیا۔"

"اچھا کیا جو نہیں کیا۔" روحی بولی۔ "اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ تم نے وہ نمبر ذہن نشین کر لیا ہے۔ وہ نمبر بس تمہارے موبائل فون میں نہیں ہونا چاہیے۔"

"اب؟"

نرگس کے مبہم سوال میں روحی کے لیے کوئی ابہام نہیں تھا۔ وہ بولی۔ "آج تمہیں پہلے تو اپنی خالہ سے کوئی بہانہ کر کے ان کی کسی عزیزہ کے گھر جانا ہے۔"

"میں وہیں سے بول رہی ہوں۔" نرگس نے جواب دیا۔ "خالہ سے بات کر کے آ گئی ہوں۔ ان سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ آج رات میں یہیں گزاروں گی اور کل واپس آؤں گی۔"

"اور تمہارا بھائی؟"

"وہ بھی میرے ساتھ آیا ہے۔"

"لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ طارق کے پاس تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔"

"مجھے یاد ہے۔" نرگس نے جواب دیا۔ "میرے خالو ہمیں چھوڑنے یہاں آئے ہیں۔ ذرا دیر بعد وہ میرے بھائی کو لے کر واپس چلے جائیں گے۔"

"طارق نے اپنے خط میں تمہیں کچھ اور ہدایات بھی دی تھیں؟"

"میں اس کے مطابق عمل نہیں کر سکی۔" نرگس نے جواب دیا۔ "خالو بہ ضد تھے کہ مجھے یہاں پہنچانے کے لیے خود چلیں گے۔"

"تو اب؟"

"طارق سے ملنے کے لیے کس وقت چلنا ہے؟" نرگس نے پوچھا۔

"اس کا انحصار تم پر ہے۔ تم کس بہانے سے اور کب وہاں سے نکل سکتی ہو؟"

"ایک بہانہ تو ہے میرے ذہن میں۔" نرگس نے جواب دیا۔ "شام کو میں بہانہ کروں گی کہ میرا دل گھبرا رہا ہے اس لیے میں خالہ کے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"یہ لوگ تمہیں اکیلے جانے دیں گے؟"

"مجبوری ہوگی۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں ہوگا جو مجھے خالہ کے گھر تک چھوڑنے جائے۔"

"تو تم وہاں سے کب تک نکل سکو گی؟"

"سات بجے تک۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے گھر سے اگلے اسٹاپ پر اتر جانا۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ آج میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں کہ مجھے ایک فون اس وقت کر لینا جب گھر سے نکل رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" نرگس نے جواب دیا پھر جلدی سے پوچھا۔ "طارق کو تو بتا دیا نا کہ آج میں اس سے ملنے پہنچوں گی؟"

"ہاں، وہ بڑی بے چینی سے تمہارا منتظر ہے۔" اس وقت کسی خیال کے باعث روحی کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

رابطہ منقطع کر کے روحی نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ اس وقت تین بجے تھے۔ گویا چار گھنٹے کا وقت باقی تھا۔

وہ چار گھنٹے روحی نے کچھ ایسے کاموں میں گزارے جن کا تعلق گارسیا آرگنائزیشن سے تھا۔ ان کاموں کے بعد وہ مقررہ وقت پر اس جگہ پہنچ گئی جہاں ایک گھر میں نرگس موجود تھی۔ روحی کے خیال کے مطابق اب اس کا فون آ جانا چاہیے تھا مگر نہیں آیا تھا۔ روحی نے خود ہی اس سے رابطہ کیا۔

"تمہیں دو تین منٹ پہلے مجھے فون کرنا تھا۔" وہ کچھ سخت لہجے میں بولی۔

"مجھے خیال تھا کہ تم انتظار کر رہی ہو گی۔ میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔ یہاں گڑبڑ یہ ہوئی کہ ایک بچے کو تیز بخار ہو گیا۔ اسے قریب کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا ہے۔ میں گھر میں صرف ایک بچی کے ساتھ ہوں۔ اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں نکل سکتی۔ میں نے بات تو کر لی ہے کہ مجھے خالہ کے گھر واپس جانا ہے مگر عین وقت پر یہ گڑبڑ ہو گئی۔ اب وہ لوگ آ جائیں تو میں نکلوں۔"

روحی نے ایک طویل سانس لی۔ "کتنی دیر لگ سکتی ہے؟"

"وہ لوگ ابھی ابھی تو گئے ہیں۔ آدھا گھنٹا تو لگ جائے گا۔"

لیکن آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے کے قریب ہو چکا تھا جب نرگس نے موبائل فون کے ذریعے روحی کو اطلاع دی کہ اب وہ گھر سے نکل رہی ہے۔

روحی اس دوران میں اپنی کار اسی علاقے میں دوڑاتی رہی لیکن اصل مقام سے زیادہ دور نہیں نکلی۔ وہ تیزی سے اپنی کار اس بس اسٹاپ پر لے گئی جہاں نرگس کو بس سے اترنا تھا۔

یہ تاخیر روحی کے لیے پریشان کن تھی۔ نرگس کو اپارٹمنٹ لے جاتے لے جاتے ساڑھے آٹھ بج جاتے۔ وہاں اسے طارق اور نرگس سے کچھ خاص گفتگو کرنا تھی جس میں اندازے سے زیادہ وقت بھی لگ سکتا تھا جبکہ نو ساڑھے نو بجے کے درمیان اسے قربان بیگ کو بھی فون کرنا تھا۔

غلط سگنل

ایک خاتون کار چلا رہی تھی کہ پیچھے سے ایک کار آ کر اس کی کار سے ٹکرا گئی۔ خاتون غصے سے لال پیلی ہو کر بولی کہ اس نے تو باقاعدہ سگنل دیا تھا، پھر اس کی کار کو ٹکر کیوں ماری گئی؟

دوسری کار چلانے والے نے جواب دیا۔ "محترمہ! آپ کا ہاتھ پہلے اوپر کی طرف اٹھا، پھر نیچے گر گیا۔ اس کے بعد سیدھا ہو گیا اور پھر خم کھا گیا۔ کیا ان حرکتوں سے آپ کی مراد سگنل دینا ہے؟"

"اوہ میرے خدا!" خاتون بولی۔ "پہلے تین سگنل غلط تھے۔ کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ میں نے انہیں رد کر دیا تھا؟"

منڈی بہاءالدین سے ارشد سہیل کا مرسلہ

http://digestpk.blogspot.com/

روحی اس تاخیر پر جھنجلائی ہوئی تھی لیکن اس نے نرگس پر اس کا اظہار نہیں کیا۔

روحی کو خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنا پڑی جس پر نرگس کچھ نہیں بولی۔ طارق تک پہنچنے کے لیے وہ اتنی ہی بے چین تھی کہ اسے زیادہ سکون شاید اس صورت میں ملتا جب روحی کی کار جیٹ کی رفتار سے پرواز شروع کر دیتی۔

راستے میں نرگس نے طارق کے حوالے سے بہت کچھ جاننا چاہا لیکن روحی مبہم انداز میں جواب دیتی رہی۔

''طارق تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔'' روحی کے ہر مبہم جواب کی تان اسی ایک جملے پر ٹوٹتی رہی۔

آخر وہ عمارت آگئی جس کا ایک اپارٹمنٹ روحی کی ملکیت تھا اور روحی اس رات وہاں دو خطرناک کھیل کھیلنے کے منصوبے بنا چکی تھی۔

طارق نے کارڈلیس بیل سننے کے بعد دروازہ کھول دیا۔ روحی اور نرگس اندر داخل ہوئے۔

''طارق... طارق!'' نرگس کہتی ہوئی تیزی سے اس کے قریب گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اس کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

روحی کا خیال تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جائیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

روحی کے لیے وہ ایک عجیب سی بات تھی کہ ان دونوں نے صرف ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑنے پر اکتفا کیا۔

''میں نے تمہیں تمہاری نرگس لا دی۔'' روحی نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ شرط پوری ہونی ہے جو میں تم سے لگا چکی ہوں۔ مجھے اس بارے میں نرگس سے خود بھی بات کرنا ہوگی لیکن پہلے تم اسے اپنے کمرے میں لے جا کر حالات سے آگاہ کر دو۔ تم اسے جو کچھ بھی بتانا چاہو، بتا دینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس ذرا وقت کا خیال رہے۔ مجھے ابھی کہیں جانا بھی ہے۔ نرگس سے تم اپنی گفتگو دس پندرہ منٹ میں مکمل کر کے اسے میرے پاس بھیج دو۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔''

طارق کے چہرے پر تفکرات کا تاثر گہرا ہو گیا۔ وہ روحی کو جواب دیے بغیر نرگس کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے کمرے کی طرف لے گیا۔

روحی ٹہلنے لگی۔ بار بار وہ اپنی گھڑی میں وقت دیکھ رہی تھی۔

نرگس پندرہ منٹ بعد لوٹی۔ اس کے ساتھ طارق بھی تھا۔

''تم ابھی اپنے کمرے میں جاؤ۔'' روحی نے طارق سے کہا۔ ''میں پہلے نرگس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

اس وقت نرگس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ یقیناً اسے طارق سے تمام حالات کا علم ہو چکا ہوگا۔ ان ساری باتوں کے لیے پندرہ منٹ کا وقت ناکافی تھا لیکن طارق کو اختصار سے کام لینا پڑا ہوگا۔

طارق نے ڈھارس بندھانے کے لیے نرگس کا شانہ تھپکا اور اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' روحی نے اپنے قریب کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرگس سے کہا۔

نرگس بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''طارق نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا؟'' روحی پھر بولی۔ ''تمہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ آخر ایسا کیا ہے تم میں کہ طارق کو تم سے محبت ہو گئی؟''

نرگس خاموش رہی۔

''جواب دو؟'' روحی نے کچھ بگڑ کر کہا۔ ''میرے پاس وقت کم ہے۔''

نرگس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہ سوال تمہیں طارق سے کرنا چاہیے تھا۔''

''اس سے بھی کر چکی ہوں۔'' روحی نے کہا۔ ''اس کا جواب میرے لیے اطمینان بخش نہیں تھا۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ تم اس سے محبت کرتی ہو... وہ ایسا ہی ہے کہ دنیا کی ہر عورت اس سے محبت کر سکتی ہے لیکن تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ اس سے دور ہو جاؤ۔''

''میں اس سے دور ہو جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''اور میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔'' جواب دیتے ہوئے نرگس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ''ضروری نہیں کہ ہر کوئی تمہارے ان خیالات سے اتفاق کرے۔''

''تم یہ بحث کرنا چاہو گی تو بھی جیت نہیں سکو گی۔ ایک جھوٹی زندگی کے لیے دلائل نہیں لائے جا سکتے۔ خیر، بحث میں بھی نہیں کرنا چاہتی۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ کچھ اور بھی کرنا ہے مجھے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم آج اور ابھی اس امتحان سے گزر جاؤ۔ تم خود ہی طارق سے دہشت زدہ ہو جاؤ گی۔ آئندہ کبھی اس کا نام بھی نہیں لینا چاہو گی اور طارق کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تم اس کی منزل نہیں ہو۔ وہ دریا کے کنارے پیاسا کھڑا رہ جائے گا تو اس کا دل چاہے گا کہ اپنا ہی جسم نوچ ڈالے۔''

''اگر تم اسے کوئی امتحان سمجھتی ہو تو میں ابھی اس امتحان سے نہیں گزر سکتی۔'' نرگس نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''اور طارق بھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''تم دونوں کو اس کے لیے تیار ہونا ہوگا۔'' روحی نے نرگس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ آج طارق کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ تمہیں بھولنے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔ اس کی زبان پر اب تمہارا نام نہیں آنا چاہیے۔ آگ لگ جاتی ہے میرے سینے میں! اور آج کے بعد وہ تمہارا نام لے گا بھی نہیں۔ ابھی وہ دوسرے تجربے سے نہیں گزرا۔ جب گزر جائے گا تو سمجھ لے گا کہ اس کی منزل صرف میں ہی بن سکتی ہوں ورنہ اس کی زندگی ایسی بن جائے گی جیسے سرکش موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر نا آسودگی کے عالم میں واپس لوٹ جاتی ہیں۔''

نرگس خاموش رہی۔ اس کی سانسیں بہت تیزی سے چلنے لگیں۔

''چلو!'' یکایک روحی کھڑی ہوئی۔ اس نے نرگس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اسے طارق کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ ''طارق سے شادی تو میں صرف اس لیے کروں گی کہ آج کا معاشرہ خود چاہتا ہے کہ اسے قانونی دھوکے دیے جائیں لیکن اس شادی کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے پابند ہو جائیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیں گے۔ وہ بھی آزاد ہوگا اور میں بھی آزاد رہوں گی۔ میری مام اور میرے ڈیڈ کی زندگی میرے لیے ایک آئیڈیل ہے۔ وہ دونوں بھی اسی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی طلب یکساں ہو لیکن یکسانیت سے بھی تو بعض اوقات اکتاہٹ ہو جاتی ہے۔ اس وقت انسان وقتی طور پر کہیں اِدھر اُدھر نکل جاتا ہے جس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اور طارق بھی اسی طرح آزاد رہیں گے۔ میں اس پر بھی اعتراض نہیں کروں گی اور وہ مجھ پر کوئی قدغن نہیں لگائے گا۔''

آخری فقرہ روحی نے اس وقت کہا جب وہ اور نرگس، طارق کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

طارق، روحی کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ قدغن کی بات کس سلسلے میں کہی گئی ہے۔

''سنبھالو اسے۔'' روحی نے نرگس کو اس کی طرف دھکیل دیا۔ ''ایک گھنٹا ہے تمہارے پاس... میں ایک گھنٹے میں واپس آؤں گی۔ اس ایک گھنٹے میں تم دونوں اس مرحلے سے گزر جاؤ جس کے بارے میں بات ہو چکی ہے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' طارق بولا۔ ''اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے اسمیشر گروپ کے حوالے کر دو۔''

''نہیں طارق!'' نرگس چیخ پڑی۔ ''میں تمہیں موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ میں نے بہت سوچا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی طارق! خدا ہماری مجبوری دیکھ رہا ہے۔''

''نرگس!'' طارق حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں۔'' نرگس آب دیدہ ہو گئی۔ ''ہماری محبت کو اس کڑے امتحان سے گزرنا ہوگا۔''

روحی کے ہونٹوں پر اس وقت ایک زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ پاگل لڑکی امتحان دینے کے لیے تیار ہے۔'' روحی طارق سے بولی۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ اس تجربے سے گزر کر تم اس لڑکی کو آسانی سے بھلا دو گے۔ تمہیں مجھ سے جو کچھ ملا ہے، وہ یہ دھان پان سی لڑکی تو کیا، کوئی لڑکی بھی تمہیں نہیں دے سکتی۔ بس اب میں جا رہی ہوں۔ اس وقت میں اس کمرے کو باہر سے مقفل کر جاؤں گی لیکن...'' اس نے نرگس کی طرف دیکھا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ تم اس قسم کی باتیں کر کے مجھے دھوکا دے سکو گی۔ میں ابھی تو یہاں سے جا رہی ہوں لیکن واپس آ کر سب کچھ دیکھ لوں گی۔ میں نے اس اپارٹمنٹ میں اپنے بہت سے شوق پورے کیے ہیں۔ ان میں سے ایک شوق یہ بھی ہے کہ اس اپارٹمنٹ میں ہر جگہ خفیہ طور پر ویڈیو کیمرے لگائے گئے ہیں۔ اس کمرے کا جو بستر ہے، ویڈیو کیمرا اسے فوکس کیے ہوئے ہے۔ میں اس کمرے سے باہر جا کر وہ بٹن دبا دوں گی جس سے کیمرا کام کرنا شروع کرتا ہے۔ واپس آ کر میں وہ ویڈیو دیکھ لوں گی۔ مجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم دونوں اس امتحان سے گزرے ہو یا نہیں۔ اور اگر گزرے ہو تو...'' روحی ہنسی۔ ''میں دیکھ لوں گی کہ نرگس پر کیا گزری اور اس کا کیا حال ہوا ہے۔'' اس نے طارق کی طرف دیکھا۔ ''تم بھی پریشان اور الجھے ہوئے نظر آؤ گے ہی... اس انسانی کی طرح جو لبِ ساحل پیاسا کھڑا رہ جاتا ہے۔''

http://digestpk.blogspot.com/

طارق کا چہرہ فق پڑ گیا اور نرگس سر جھکائے کھڑی تھی۔

روحی کمرے سے نکل آئی اور دروازہ مقفل کر دیا۔ ویڈیو کیمرے کو آن کرنے والا بٹن دبا کر وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس وقت نو بج چکے تھے اور اس نے قربان بیگ سے نو ساڑھے نو بجے کے درمیان فون کرنے کے لیے کہا تھا۔

☆☆☆

کار میں بیٹھنے کے بعد روحی نے موبائل فون پر قربان بیگ سے رابطہ کیا۔

”صحیح وقت پر فون کر لیا۔“ قربان بیگ نے اس کی آواز سننے کے بعد کہا پھر پوچھا۔ ”کب پہنچ رہی ہو؟“

”پہلے تو میں لیمن اسکواش پیوں گی۔“

”پی کر آ جاؤ! کتنی دیر لگے گی؟“

”تم بھی وہیں آ جاؤ نا... تم بھی کچھ پی لینا۔“

”اسی جگہ جہاں...“

”ہاں۔“ روحی نے ہنس کر بات کاٹ دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں پہنچتا ہوں۔“

روحی نے محسوس کیا کہ اس کے ”رام“ ہو جانے سے قربان بیگ بہت خوش ہے۔ وہ کار حرکت میں لائی۔ قربان بیگ سے رابطہ تو اس نے اس موبائل فون سے کیا تھا جس میں ایک خاص قسم کی ڈیوائس لگی ہوئی تھی۔ اب اس نے دوسرے موبائل پر بہرام سے رابطہ کیا۔

”یس میڈم!“ بہرام اس کی آواز سنتے ہی مؤدبانہ انداز میں بولا۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا بہرام!“ روحی نے کہا۔ ”قربان بیگ میرے لیے مسئلہ بن رہا ہے۔“

”میں نے تو پہلے ہی خدشہ ظاہر کر دیا تھا میڈم!“

”بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب زمین اس کے زندہ جسم کا بوجھ برداشت نہ کرے تو بہتر ہے۔“

”اوہ!“ بہرام کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے جلدی سے کہا۔ ”یہ کام آج رات ہی کر دیا جائے گا میڈم!“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ روحی نے کہا۔ ”میں اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے جا کر اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔ ریوالور کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں گی۔ تمہیں بس لاش ٹھکانے لگانا ہو گی اس کی۔“

”آپ اسے کب...“

روحی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت تمہیں دوبارہ فون کر دوں گی۔ اب تم سنو کہ پہلے تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم نے اس کی کار جس اسپاٹ پر میرے ساتھ دیکھی تھی، میں تھوڑی دیر بعد اس سے وہیں مل رہی ہوں۔ میں اپنی کار وہیں چھوڑ کر اس کی کار میں چلی جاؤں گی۔ تم وہاں سے میری کار میرے اپارٹمنٹ لے آنا۔ وہیں نیچے قربان بیگ کی کار کھڑی ہو گی۔ وہ کار تمہیں وہاں سے اس طرح لے جانا ہے کہ پھر کبھی اس کا سراغ نہ مل سکے۔“

”بہت بہتر۔“

”اس کے بعد تمہیں ایک کام اور بھی کرنا ہے لیکن اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے بعد! میں اس کام کے بارے میں تمہیں اسی وقت بتاؤں گی جب تم میرے اپارٹمنٹ سے اس کی لاش لے کر جاؤ گے۔ تم وہاں ساڑھے گیارہ بجے آ جانا۔ میری ہدایات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔“

”کر لی ہیں میڈم۔“

بہرام نے یہ معلوم کرنے کی جسارت نہیں کی کہ روحی اور قربان بیگ کے معاملات اس حد تک خراب کیسے ہو گئے کہ روحی کو اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

روحی جب اسپاٹ پر پہنچی، اس کے پانچ منٹ بعد قربان بیگ بھی آ گیا۔ روحی کو اندازہ تھا کہ اسے وہاں پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اسپاٹ سے زیادہ فاصلے پر تھا۔

روحی اپنی کار سے اتر کر مسکراتے ہوئے اس کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”خواب سا لگ رہا ہے مجھے۔“ قربان بیگ نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ”اسی جگہ تم سے کچھ تند و تیز باتیں ہو چکی ہیں۔“

”اب ماضی کی کوئی تلخی یاد نہ کرو۔“ روحی نے کہا۔

قربان بیگ نے قریب آ جانے والے لڑکے کو دو لیمن اسکواش کا آرڈر دیا۔

”آج کے بعد...“ وہ بولا۔ ”میری زندگی پھر خوش گوار ہو جائے گی۔“

”اور ہمیشہ رہے گی۔“

”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی تم نے کہہ دیا ہے کہ ماضی کی کوئی تلخی نہ دہراؤں۔“

”ضرورت کیا ہے وہ باتیں یاد کرنے کی...“ روحی نے کہا۔ ”کیا میرا یہ اعتراف کافی نہیں ہے کہ مجھے تم سے بہتر رفیق نہیں مل سکا؟“

قربان بیگ ہنسا۔ ”اور تم مجھے اس سے بھی بہتر بنا دو گی۔“

”بے شک!“

وہ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ لیمن اسکواش کے دو گلاس آئے اور پی بھی لیے گئے۔ ادائیگی کے بعد روحی نے کہا۔ ”تمہاری کار آج میں ڈرائیو کروں گی۔“

”اور تمہاری کار؟“ قربان بیگ نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔

”میں نے یہاں پہنچتے ہی گھر فون کر دیا تھا۔ شوفر ٹیکسی میں وہاں سے روانہ ہو چکا ہو گا۔ وہ میری گاڑی لے جائے گا۔“

”خوب! گویا پہلے ہی پروگرام بنا لیا تھا کہ میری گاڑی آج تم چلاؤ گی؟“

”ہاں۔“

ان دونوں نے اپنی نشستیں تبدیل کر لیں۔

قربان بیگ بولا۔ ”یہ تمہیں سوجھی کیا؟“

”اگر میں ڈرائیو نہ کرتی تو تمہیں بار بار راستے کے بارے میں بتانا پڑتا۔“

”اچھا۔“ قربان بیگ ہنسا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ تمہاری قربت کا نشہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بھلا دیتا؟“

”آج میں تمہاری نہیں، تم میرے مہمان بنو گے۔“

”کیا مطلب؟“

”میرا ایک خوب صورت اپارٹمنٹ ہے۔ وہاں چل رہے ہیں ہم۔“

قربان بیگ چونکا۔

روحی کہتی رہی۔ ”وہاں میری خواب گاہ کی آرائش تمہیں بہت پسند آئے گی۔ میں نے اسے صحیح معنوں میں طرب گاہ بنایا ہے۔ بڑا خوابناک ماحول ہے۔ شراب بھی ہر قسم کی موجود ہے۔“

”یہ تم نے اچانک سوچ لیا؟“

”ہاں۔“

لیکن روحی نے یہ اچانک نہیں سوچا تھا، بس اچانک بتایا تھا۔ سوچ تو وہ پہلے چکی تھی لیکن بتایا اس لیے نہیں تھا کہ قربان بیگ یہ پروگرام کسی اور کو نہ بتا دے۔ اب روحی کے ساتھ اس کی رفاقت کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

قربان بیگ نے ایک طویل سانس لی۔ وہ کچھ سنجیدہ نظر آنے لگا۔

”کیوں؟“ روحی اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر بولی۔ ”کیا تمہیں میرے اپارٹمنٹ جانا پسند نہیں؟“

”غلط سمجھیں تم۔“

”پھر کس سوچ میں پڑ گئے؟“

”تم جانتی ہو کہ گھر پر رات کو بھی میرے فون آتے رہتے ہیں۔“

”آج میری خاطر وہ فون نہیں سنو گے تو زمین کی حرکت نہیں رک جائے گی۔“ روحی نے محبوبانہ خفگی ظاہر کی پھر بولی۔ ”ذرا اپنا موبائل دینا۔“

”کیوں؟ تمہارے پاس نہیں ہے؟“

”تم دو تو۔“

قربان بیگ کے چہرے پر الجھن کا تاثر تھا لیکن اس نے اپنا موبائل جیب سے نکال کر روحی کی طرف بڑھا دیا۔

روحی نے موبائل لے کر اس کا سوئچ آف کیا اور اپنے وینٹی بیگ میں ڈال لیا۔

قربان بیگ حیرت سے بولا۔ ”یہ کیا؟“

روحی دل آویز انداز میں مسکرائی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ آج رات ہمارے درمیان کوئی آئے... کوئی کیا، کسی کی آواز بھی نہیں۔“

قربان بیگ مسکراتا ہوا والہانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”آج موسم بھی اچانک ہی خوش گوار ہو گیا ہے۔“ روحی پھر بولی۔

تھوڑی دیر پہلے مطلع ابر آلود ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بوند ونڈ اسکرین پر آ گرتی تھی۔

قربان بیگ نے کہا۔ ”کراچی کا موسم بھی خوب ہے۔ ساری گرمی بارش کے بغیر ہی گزر گئی۔“

”آج بھی ضروری نہیں کہ بارش ہو۔“ روحی نے کہا۔ ”آوارہ بادل بھی کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ آئے اور ٹہلتے ہوئے گزر گئے۔“

موسم کی یہ گفتگو دھیرے دھیرے رومانی ہوتی چلی گئی۔ قربان بیگ کے ہاتھوں نے ہلکی پھلکی گستاخیاں بھی کیں۔ روحی اس کی حرکتوں پر مسکراتی رہی۔

”اپارٹمنٹ آ گیا۔“ روحی نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت پھوار پڑنے لگی۔

روحی نے کار روک دی۔ دونوں اتر کر تیزی سے آگے بڑھے۔ انہوں نے خود کو تیز ہوتی ہوئی بارش سے بچا لیا مگر تھوڑا بہت بھیگ ہی گئے۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ روحی نے ہنس کر کہا۔ ”جسم کو یہ تھوڑی سی خنکی اچھی لگ رہی ہے۔“

http://digestpk.blogspot.com/

جواب میں قربان بیگ نے بھی کچھ کہا لیکن اس کی آواز بادلوں کی گرج میں دب گئی جس کے ساتھ بجلی بھی چمکی تھی۔

اپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے روحی کا دھیان نرگس اور طارق کی طرف چلا گیا۔ اسے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوئے ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ منٹ ہو چکے تھے۔ اب اسے دیکھنا تھا کہ ان دونوں نے کیا کیا؟ نرگس نے جو باتیں کی تھیں، ان سے تو ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ طارق کو بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرے گی۔

روحی اور قربان بیگ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ روحی اسے اپنے بیڈ روم کی طرف لے گئی۔ قربان بیگ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہاں کا جائزہ لیا۔

"بہت خوب صورت۔" اس نے اس طرح کہا جیسے الفاظ اس کے منہ سے بے اختیار نکلے ہوں۔

"بیٹھو!" روحی نے اس سے کہا اور اس کپ بورڈ کی طرف بڑھی جس میں شراب کی بوتلیں رکھی تھیں۔

قربان بیگ اپنا کوٹ اتارنے لگا۔

روحی ڈرنک لے کر مڑی تو قربان بیگ بڑی بے تکلفی سے بستر پر نیم دراز ہو گیا اور اپنے جوتے کے فیتے کھولنے لگا۔

روحی نے بوتل بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھی اور قربان بیگ سے کہا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔ کچن سے گلاس وغیرہ اور کچھ نمکین چیزیں لے آؤں۔ کوئی چیز گرم کرنے میں شاید تھوڑا سا وقت بھی لگ جائے۔"

قربان بیگ نے سر ہلایا اور بوتل اٹھا کر دیکھنے لگا۔

روحی کمرے سے نکلی۔ اسے طارق اور نرگس کی وڈیو دیکھنے کی بہت جلدی تھی۔ اس وقت اسے یہ خیال بھی آیا کہ اسے ایک ہی رات میں دونوں پروگرام نہیں بنانے چاہیے تھے۔

طارق کے کمرے کی وڈیو نکالنے کے لیے اسے کمرے میں نہیں جانا پڑا۔ وہ باہر سے بھی نکالی جا سکتی تھی۔ وہ لے کر روحی ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچی۔ کمرا کیا، وہ ایک کوٹھری سی تھی جو غالباً اسٹور کے طور پر استعمال کیے جانے کے لیے بنائی گئی ہو گی لیکن روحی نے اسے "ماسٹر روم" بنا لیا تھا۔ جب وہ وہاں کوئی پارٹی کرتی تھی تو ہر جگہ کے وڈیو کیمرے اسٹارٹ کر دیتی تھی۔ اس کے دوست جہاں جہاں جو کچھ بھی کرتے رہتے تھے، روحی وہاں بیٹھ کر مانیٹرز پر ان سب کی حرکات دیکھ کر لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔ اس کے سب دوست اسی کی طرح آزاد خیال تھے اور ان بھی لڑکوں، لڑکیوں کی عمریں نوجوانی کی حدود سے آگے نہیں نکلی تھیں۔

روحی نے وڈیو لگائی اور مانیٹر پر طارق کے کمرے کے وہ مناظر دیکھنے لگی جو ریکارڈ کیے گئے تھے۔

وہ سب کچھ دیکھ کر روحی کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہاں وہ سب کچھ نہیں ہوا تھا جو روحی چاہتی تھی۔ اس نے وڈیو "فارورڈ" کر کر کے پانچ منٹ میں دیکھ لی۔ اس میں صرف اتنا ہی تھا کہ نرگس اور طارق بستر پر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کے چہروں سے فکر و تردد نمایاں تھا۔ ان کی گفتگو اس موضوع پر تھی کہ وہاں سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

روحی کے سامنے نرگس نے جو یہ بات کہی تھی کہ وہ طارق کو زندہ دیکھنے کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے... تو یہ اس نے صرف اس لیے کہا تھا کہ اسے اور طارق کو کچھ سوچنے کی مہلت مل جائے۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس مہلت سے وہ اور طارق کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

روحی مانیٹر روم سے نکل کر کچن میں پہنچی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان دونوں سے بعد میں نمٹے گی، پہلے قربان بیگ کا کام تمام کرے گی۔

اس کام میں تھوڑی سی تاخیر وہ اس لیے کر رہی تھی کہ بہرام کو اس نے ساڑھے گیارہ بجے بلایا تھا۔

کچن سے سب چیزیں لے کر جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اس وقت بھی بہرام کی آمد میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ روحی چاہتی تھی کہ قربان بیگ کی لاش فوری طور پر اپنے اپارٹمنٹ سے ہٹوا دے۔

قربان بیگ بڑے اطمینان سے اس کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

روحی کچن سے جو ٹرے لائی تھی، وہ اس نے ایک تپائی پر رکھ دی اور تپائی اٹھا کر بستر کے قریب پہنچا دی۔

"بہت رومان انگیز ہے تمہارا کمرا۔" قربان بیگ بولا۔

"میں نے بتایا تو تھا تمہیں۔" روحی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ کر ڈرنک بنانے لگی۔

"بستر پر ہی آ جاؤ نا۔" قربان بیگ نے کہا۔

روحی اس کی بے تابی نظر انداز کرتے ہوئے ہنس کر بولی۔ "پیگ بنا کر میں گاؤن پہنوں گی۔ ان کپڑوں کے ساتھ تو بسترِ طرب پر لیٹنا بڑی احمقانہ بات ہو گی۔ میرا گاؤن

تمہیں بہت پسند آئے گا۔ وہ میری جلد کی طرح گلابی... باریک اور نرم ہے۔"

روحی اس قسم کی باتوں سے قربان بیگ کے جذبات بھڑکانا چاہتی تھی۔ جب کوئی اس کے لیے ناپسندیدہ ہو جاتا تھا تو وہ اس کے جذبات برانگیختہ کر کے اسے پیاسا چھوڑ کر لطف اندوز ہوتی تھی۔ قربان بیگ کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ روحی اسے کچھ ہی دیر میں زندگی کی سرحدوں کے اس پار پہنچا دینا چاہتی تھی۔

ایک گلاس قربان بیگ کو دے کر دوسرے گلاس سے ایک بڑا گھونٹ لیتی ہوئی وہ اپنی وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے وارڈروب سے اپنا گاؤن نکالا۔

"ذرا دانت بھی صاف کروں گی۔" روحی نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آج شام پیسٹ نہیں کر سکی تھی۔ اس کی وجہ سے الجھن محسوس کر رہی ہوں۔"

اس طرح روحی کا مقصد کچھ وقت گزارنا بھی تھا۔ اس نے گاؤن نکالتے وقت اپنا وینٹی بیگ وارڈروب میں رکھ دیا تھا لیکن اس میں سے قربان بیگ کا موبائل نکال لیا تھا۔ کوشش یہ بھی کی تھی کہ قربان بیگ اس کی یہ حرکت نہ دیکھ سکے۔

باتھ روم جا کر اس نے قربان بیگ کے موبائل میں اپنی تصویریں دیکھیں۔

"اس حرکت کا مزہ تم ابھی چکھ لو گے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "لیکن اس کا مزہ تمہیں یاد نہیں رہے گا۔ مرنے کے بعد کچھ یاد نہیں رہتا۔"

اس نے شراب کا ایک اور گھونٹ لینے کے بعد اپنے کپڑے اتار کر گاؤن پہنا۔ پنڈلی سے اس نے چرمی تسمہ کھول لیا تھا۔ اس میں سے پستول لے کر چرمی تسمہ اس نے اپنی اتاری ہوئی جینز کی جیب میں ڈال دیا۔

اب قربان بیگ کا خاتمہ ہو جانا چاہیے، وہ سوچتی ہوئی باتھ روم سے نکلی۔

اتنی سی دیر میں قربان بیگ نے اپنا پہلا پیگ ختم کر لیا تھا اور اب خود ہی دوسرا گلاس بنا رہا تھا۔ اس نے فوراً نظر اٹھا کر روحی کی طرف دیکھا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔ "اس گاؤن میں تو تم قلوپطرہ سے بھی زیادہ پُرکشش لگ رہی ہو۔" پھر اس نے پوچھا۔ "یہ تم نے اپنا ایک ہاتھ پیچھے کیوں کر رکھا ہے؟"

شراب کا گلاس روحی کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ دایاں ہاتھ وہ پشت پر کر کے اپنی کمر پر رکھے ہوئے تھی۔

"تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔" روحی بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔"

قربان بیگ نے جو دوسرا پیگ بنایا تھا، اس میں پانی انڈیلتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "اچھا... تو دکھاؤ۔"

اب وہ بستر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پشت سے ہٹا کر قربان بیگ کے سامنے کر دیا۔

قربان بیگ تپائی سے گلاس اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ وہ اس طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

روحی کے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ بڑی سفاک تھی۔

"روحی!" قربان بیگ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ کیا مذاق ہے؟"

"تم نے میری جو تصویریں کھینچی تھیں، وہ کیا مذاق تھا؟" روحی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا' وہ تو میرا شوق ہے۔ اب تم پرانی باتیں کیوں چھیڑ رہی ہو؟ تم نے کہا تھا کہ..."

روحی نے اس کی بات کاٹی۔ "اور یہ میرا شوق ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں چھ گولیاں ہیں۔ یہ سب تمہارے لیے ہیں۔"

قربان بیگ بستر سے اترا۔

"نہیں، میں تمہیں اپنے قریب نہیں آنے دوں گی۔" روحی نے تیزی سے کہا اور ٹریگر دبا دیا۔

گولی قربان بیگ کے سینے میں لگی۔ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ اس کے سینے سے خون ابل پڑا تھا۔ روحی ٹریگر دباتی چلی گئی۔ چھ گولیاں قربان بیگ کے سینے میں پیوست ہوئیں۔ ہر گولی کھانے پر اس کے جسم نے جھٹکا کھایا تھا۔ اس کے سینے سے ابلتے ہوئے خون کے چھینٹے روحی کے گاؤن پر بھی پڑے اور اس کے چہرے پر بھی۔

چھ گولیاں کم نہیں ہوتیں۔ قربان بیگ کا جسم لڑھکا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کا خون اب قالین کو بھی رنگین کر رہا تھا۔

روحی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر ایک ہی سانس میں اپنا گلاس خالی کر دیا۔ اب اس کا انداز ایسا ہو گیا تھا جیسے اس پر جنون طاری ہو۔ اس نے گلاس ایک طرف اس طرح پھینکا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ پھر وہ وارڈروب کی طرف بڑھی۔ اسے کھولا۔ اپنا خالی پستول اس میں پھینکا اور وینٹی بیگ سے ریوالور نکال لیا۔ اسے یہ

http://digestpk.blogspot.com/

خیال نہیں آیا تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز طارق اور نرگس نے بھی سنی ہوں گی۔۔۔ کیونکہ اس نے اپنے گھر کی خواب گاہ کی طرح یہ کمرا بھی ساؤنڈ پروف بنوایا تھا۔

ریوالور ہاتھ میں سنبھالے ہوئے وہ کمرے سے نکلی۔ اس وقت بہرام کو آجانا چاہیے تھا۔ وہ ڈور انٹر کام کا بٹن دباتا تو روحی کو دروازہ کھولنے کے لیے جانا پڑتا مگر اب جنونی کیفیت میں اسے طارق اور نرگس ہی یاد رہ گئے۔

تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے روحی کے دماغ میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ اگر طارق نرگس کو بھلا کر اس کا نہیں ہو سکتا تو اب اسے بھی ختم ہو جانا چاہیے۔

روحی لاشوں اور گولیوں کے کھیل پہلے بھی کھیل چکی تھی اس لیے اس کے اعصاب پر یہ بوجھ قطعی نہیں تھا کہ اس کے اپارٹمنٹ میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ خود اس کے لباس اور چہرے پر خون کے چھینٹے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت خوفناک نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

وہ قفل کھول کر طارق کے کمرے میں داخل ہوئی۔ قفل کھلنے کی آواز سن کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں روحی پر جم گئیں اور ان کے چہروں کے رنگ بدل گئے۔ روحی انہیں اس لیے بھی زیادہ خوفناک نظر آئی ہوگی کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''میں ویڈیو دیکھ چکی ہوں۔'' روحی ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح بولی جیسے کوئی بلی غرائی ہو۔

طارق اور نرگس خاموش رہے۔

''تم دونوں نے امتحان نہیں دیا۔'' روحی پھر بولی۔ ''اگر امتحان دیا ہوتا تو تم دونوں کو اندازہ ہو جاتا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے ہو۔ طارق! تم اب نرگس کو نہیں بھولو گے اور پوری طرح میرے نہیں بن سکو گے۔۔۔ لہٰذا اب میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ میری پسندیدہ چیز بھی اگر کسی وجہ سے میرے لیے ناپسندیدہ ہو جائے تو میں اسے مٹا دیتی ہوں۔''

''تم لوگ تو خونیں کھیل کھیلنے کے عادی ہو۔'' طارق نے بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ ''تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔ مار دو مجھے! میں نرگس کے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کروں گا جو تم چاہتی ہو۔''

''تو پھر مرو!'' روحی نے ریوالور کی نال اس کی طرف سیدھی کی۔

''پہلے مجھے مارو!'' نرگس لپک کر طارق کے سامنے آگئی۔

''پاگل لڑکی!'' روحی نے دانت پیسے۔ ''میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی لیکن پہلے طارق کو ماروں گی۔ مجھ پر اس وقت خون سوار ہے۔ ابھی ایک شخص کو قتل کر بھی چکی ہوں۔ اس کے خون کے چھینٹے میرے اوپر بھی آئے ہیں۔ تم دونوں دیکھ ہی رہے ہو گے۔''

''سب کچھ جانتی ہوں تمہارے بارے میں!'' نرگس بڑی حقارت سے بولی۔ ''تم لوگ مختلف ممالک کے راز چرا کر دوسرے ملکوں کو بیچتے ہو۔ اس کام میں تم اپنے باپ کی دستِ راست ہو۔''

روحی چونکی اور تیزی سے بولی۔ ''یہ تمہیں کس نے بتایا؟''

''کیا یہ غلط ہے؟'' نرگس بولی۔ ''یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک باپ نے اپنی بیٹی کو ان گندے کاموں میں اپنے ساتھ رکھا ہے۔''

''اب تمہیں سسک سسک کر مرنا پڑے گا۔'' روحی غصے سے بولی۔ ''تمہیں بتانا پڑے گا کہ تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟ فی الحال تم دونوں میرے ساتھ چلو۔''

روحی کو اچانک خیال آیا تھا کہ طارق پر گولیاں برسانے کے لیے یہ کمرا مناسب نہیں ہے۔ گولیاں چلنے کی آوازیں اپارٹمنٹ کے باہر بھی جاتیں۔ اسی خیال کی وجہ سے وہ ان دونوں کو اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں لے جانا چاہتی تھی۔

''یہ اب کہیں نہیں جائیں گے۔'' ایک آواز نے خصوصاً روحی کو چونکا دیا۔

آواز عقب سے آئی تھی۔ روحی نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے میں خون سے تربتر قربان بیگ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ روحی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''حیران نہ ہو۔'' قربان بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب تم میرے لیے خطرناک ثابت ہو گی اس لیے میں بلٹ پروف جیکٹ پہن کر آیا۔ اس پر ایک اور پلاسٹک کی جیکٹ تھی جس میں بکرے کا خون بھرا ہوا تھا۔''

روحی نے دانت پیس کر قربان بیگ کے سر کا نشانہ لیا۔

''روحی!'' قربان بیگ تیزی سے بولا۔ ''میری نگاہیں بہت تیز ہیں۔ ٹریگر پر تمہاری انگلی کا دباؤ دیکھتے ہی میں تم پر گولی چلا دوں گا۔ مت بھولو کہ ریوالور میرے ہاتھ میں بھی ہے۔''

روحی پر جنون طاری تھا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا لیکن اس

کا ٹریگر دبنے سے پہلے قربان بیگ کے ریوالور نے گولی اگل دی جو روحی کے اسی ہاتھ کے بازو میں لگی جس میں ریوالور تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا اور بازو سے ابلتا ہوا خون اس کے حریری گاؤن پر سرخی پھیلانے لگا۔

روحی اپنے بائیں ہاتھ سے دایاں بازو پکڑے قربان بیگ کو گھورتی رہ گئی۔

اسی وقت ایسی آوازیں آئیں جیسے باہر سے کوئی بیرونی دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

قربان بیگ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ ''معاف کرنا روحی! تمہارا قیمتی دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ وہ پولیس والے ہیں۔ میں ان کے لیے دروازہ کھول کر یہاں آتا لیکن تم نے اسے اندر سے مقفل کر دیا تھا اور چابی تمہارے۔۔۔''

قربان بیگ کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

''یہ کیا؟'' قربان بیگ چونکا۔

روحی اس وقت ذرا بھی خوف زدہ نظر نہیں آرہی تھی۔ چہرے پر تکلیف کا تاثر بھی نہیں تھا۔ اس کے برخلاف وہ غصے میں تھی۔ اس نے قربان بیگ کے چونکنے سے فائدہ اٹھایا اور ریوالور کی پروا کیے بغیر قربان بیگ پر جست لگا دی۔

قربان بیگ نے اندھا دھند گولی چلانے سے اس لیے گریز کیا تھا کہ روحی ہلاک بھی ہو سکتی تھی یا اس گولی کا رخ طارق یا نرگس کی طرف بھی ہو سکتا تھا۔ وہ روحی کے دھکے سے ڈگمگا گیا۔ روحی نے دوسری جست دروازے کی طرف لگائی تھی اور فرش پر گرا ہوا ریوالور۔۔۔ اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''رک جاؤ۔'' قربان بیگ چیختا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

اسی وقت گھپ اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے فیوز اڑا دیا تھا یا پھر بجلی جانے کے سبب تاریکی چھا گئی تھی۔

اب باہر چلنے والی گولیوں کے علاوہ اپارٹمنٹ کے اندر بھی گولیاں چلنے لگی تھیں۔ یہ مقابلہ روحی اور قربان بیگ میں ہی ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کہیں نہ کہیں آڑ لیتے ہوئے ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے۔

نرگس جب طارق کے سامنے آئی تھی تو اس کی پشت طارق کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ پلٹ کر طارق کے سینے سے لپٹ گئی۔

''ادھر۔۔۔ ادھر آجاؤ۔۔۔ آڑ میں۔'' طارق اسے تیزی سے دیوار کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھٹکی ہوئی گولی اس کمرے میں بھی آسکتی ہے۔''

شگفتگی

ایک پبلشر نے مشہور امریکی مصنفہ اگاتھا کرسٹی سے اس کی خودنوشت سوانح شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا اور اس سلسلے میں ضروری گفتگو کرنے کے لیے اسے ایک ریستوران میں لے گیا۔

اگاتھا مناسب رائلٹی پر اپنی سوانح لکھنے پر راضی ہو گئی۔ گفتگو کے دوران اس نے کہا۔ ''مجھے ایک ایسی چھوٹی سی نوٹ بک کی ضرورت ہے، جس میں، میں اپنی زندگی کے وہ واقعات جو مجھے یاد آئیں لکھ سکوں۔''

کھانے کے بعد پبلشر اسے اسٹیشنری کی ایک دکان پر لے گیا جہاں اگاتھا نے اپنی مرضی کے مطابق ایک چھوٹی اور خوب صورت سی نوٹ بک پسند کر لی۔

جب سیلز مین نے بتایا کہ نوٹ بک کی قیمت ایک ڈالر ہے تو اگاتھا نے یہ کہتے ہوئے کہ قیمت بہت زیادہ ہے، نوٹ بک واپس کاؤنٹر پر رکھ دی اور واپس جانے کے لیے مڑی۔

''مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنی طرف سے یہ نوٹ بک آپ کے لیے خریدلوں۔'' پبلشر نے اگاتھا سے کہا۔ ''میں اسے بھی کھانے کے بل کا ایک حصہ سمجھ لوں گا۔''

اگاتھا کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں ایک نوٹ بک کے بجائے دو لوں گی۔''

کراچی سے راشد حسین کی کاوش

نرگس کچھ نہیں بولی۔ اس کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ ان دونوں کو ہی یہ احساس نہیں تھا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوئے تھے۔

گولیوں کا شور بہت شدید تھا۔ اسی شور میں نرگس نے طارق کو بتایا کہ قربان بیگ کسی خفیہ محکمے کا افسر ہے۔ اس نے صبح ہی نرگس کے خالو سے اور اس کے بعد نرگس سے ملاقات کی تھی۔ اس کے کسی آدمی نے میر پور خاص تک روحی کا پیچھا کیا تھا۔ اس طرح نرگس کی شخصیت سامنے آئی تھی۔ جب وہ کراچی آئی تو قربان بیگ نے اس سے مل کر اسے بتایا کہ

http://digestpk.blogspot.com/

روحی ایک خطرناک لڑکی ہے۔ اس کی آرگنائزیشن کا کام کئی ممالک کے راز چرا کر اِدھر اُدھر بیچنے کا ہے۔ جمشید راؤ کے پی اے کی گمشدگی کے باعث آرگنائزیشن اس محکمے کی نظر میں مشکوک ہوگئی تھی اور وہ کیس قربان بیگ کے سپرد کیا گیا تھا۔

قربان بیگ کا سرکاری شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد نرگس نے اس پر یقین کرلیا تھا۔ اس نے قربان بیگ کو وہ ساری باتیں بتا دی تھیں جو روحی نے اس سے طارق کے بارے میں کی تھیں۔ اس بیان کی روشنی میں قربان بیگ نے سارا معاملہ بھانپ لیا تھا۔ اس نے نرگس کو ہدایت کی تھی کہ وہ روحی کے ساتھ ضرور جائے۔ اس نے یہ ذمے داری لی تھی کہ وہ اسے اور طارق کو کچھ نہیں ہونے دے گا۔ اس نے نرگس کو ایک چھوٹا سا مائک دیا تھا جو اس نے اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔ اس کی وجہ سے ساری باتیں کسی نامعلوم مقام پر ریکارڈ ہوتی رہی تھیں جن سے قربان بیگ ہمہ وقت باخبر رہا تھا۔

قربان بیگ اور روحی کے تعلق کی کہانی نرگس کے علم میں نہیں تھی۔ اس بارے میں قربان بیگ نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس کہانی سے ان دونوں کو دلچسپی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ انہیں معلوم ہوا تھا، اسی کے نتیجے میں وہ دونوں اس وقت محفوظ تھے۔

طارق کے دماغ میں یہ خیال چکرا رہا تھا کہ روحی یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکے گی لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپارٹمنٹ کے باہر گولیاں کیوں چلنے لگی تھیں۔

اور نرگس سوچ رہی تھی کہ اس عذاب سے نکلنے کے بعد وہ طارق کو میرپور واپس لے جائے گی۔ اس کے معصوم دماغ میں یہ خیال پختہ ہوگیا تھا کہ بڑے شہروں کی سبھی بڑی ملازمتوں میں ایسے ہی خطرناک کام ہوتے ہوں گے۔

باہر سے ایسی آواز آئی جیسے دروازہ ٹوٹ کر گرا ہو۔ اندھیرے میں اپارٹمنٹ وزنی جوتوں کی دھمک سے گونجنے لگا۔ طارق اور نرگس جس کمرے میں تھے، اس کے باہر آڑی ترچھی روشنیاں چکرانے لگیں۔ غالباً پولیس والوں کے پاس طاقتور ٹارچز تھیں۔

باہر چلنے والی گولیوں کی آوازیں بہ تدریج کم ہوتے ہوتے اب ختم ہوچکی تھیں اور اب اپارٹمنٹ میں بھی کوئی گولی نہیں چل رہی تھی۔

روشنی جس طرح اچانک غائب ہوئی تھی، اسی طرح واپس بھی آگئی۔

''عمارت کا فیوز اڑایا گیا تھا۔'' قربان بیگ کہتا ہوا کمرے میں داخل ہوا پھر اس نے پوچھا۔ ''تم دونوں ٹھیک ہونا؟''

''روحی؟'' طارق سوالیہ انداز میں بول پڑا۔

''گرفتار کرلی گئی ہے۔'' قربان بیگ نے بتایا۔ ''بہت ہی جری ثابت ہوئی۔ میری کئی گولیوں سے زخمی ہو چکی ہے لیکن چہرے پر اب بھی طنطنہ ہے۔'' پھر وہ نرگس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''پولیس کی ایک گاڑی تمہیں ابھی تمہاری خالہ کے گھر پہنچا دے گی۔''

''اور طارق؟'' نرگس نے جلدی سے پوچھا۔

''فکرمند نہ ہو۔'' قربان بیگ مسکرایا۔ ''ان کو ابھی اپنا بیان ریکارڈ کرانے پولیس ہیڈ کوارٹر جانا ہوگا۔ تمہارا بیان کل صبح تمہارے گھر آکے ریکارڈ کرلیا جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔''

طارق جلدی سے بولا۔ ''نرگس کو پولیس کار تک چھوڑنے کے لیے...''

''ہاں ہاں! تم بھی چل سکتے ہو۔'' قربان بیگ نے اس کی پوری بات سنے بغیر اس کا مطلب سمجھ لیا۔

وہ دونوں قربان بیگ کے ساتھ کمرے سے اور پھر اپارٹمنٹ سے نکلے۔ وہاں کئی پولیس والوں کے علاوہ بھی کچھ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں ایک لاش بہرام کی بھی تھی جسے وہ دونوں پہچانتے ہی نہیں تھے۔

باہر دھواں دھار بارش ہورہی تھی۔ نرگس کے لیے ایک پولیس کار قریب لائی گئی۔ اس وقت اس نے اور طارق نے روحی کو بھی دیکھا جسے ہتھکڑیاں لگا کے باہر لایا جارہا تھا۔ اس کے باریک گاؤن پر ایک چادر ڈال دی گئی تھی لیکن وہ اتنی زخمی تھی کہ چادر پر بھی خون کے دھبے آگئے تھے۔

وہ پولیس کار وہاں پہلے ہی لائی جاچکی تھی جس میں روحی کو لے جایا جانا تھا۔ اس میں سوار ہونے سے پہلے روحی کی نظر طارق اور نرگس پر پڑی۔ اس کے چہرے پر نفرت کے شدید تاثرات ابھر آئے۔ اس کی آنکھوں سے ایسا قہر برسنے لگا کہ نرگس نے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔ روحی کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

پولیس کی گاڑی جب روحی کو لے کر چلی گئی تو طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کسی خوفناک صیاد سے چھٹکارا پالیا ہو۔

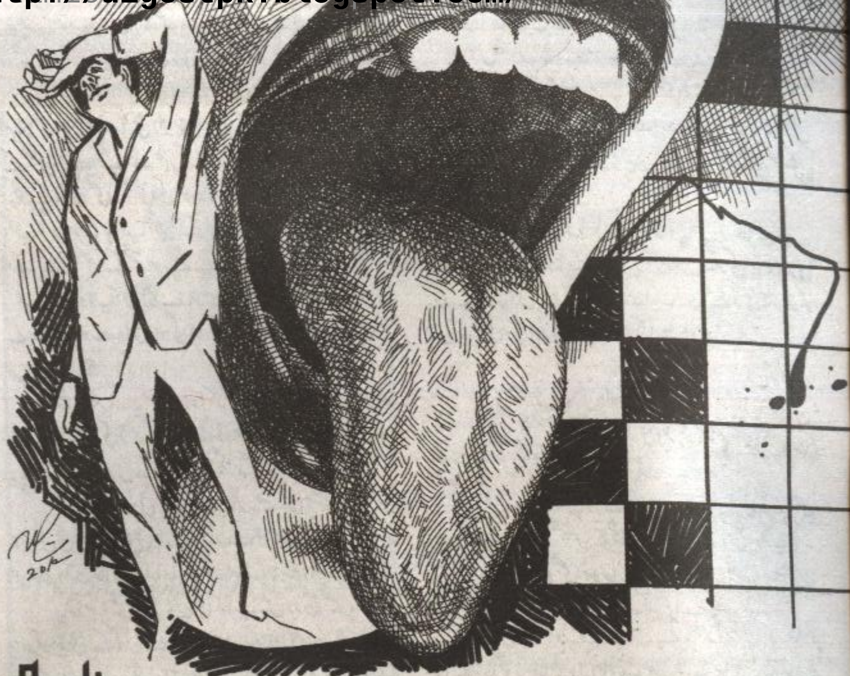

حسرتِ ناتمام

عکسِ فاطمہ

کوئی اپنی ذہانت کا لاکھ استعمال کرلے مگر جب تقدیر...... تدبیر کا ساتھ نہ دے تو پھر حسرتوں کو تعبیر نہیں ملتی۔ اسے بھی تدبیر سے اپنی تقدیر بدل دینے کا زعم تھا۔

معاملہ فہم مجرم کا قصہ، اُسے اپنے گرفت میں نہ آنے کا یقین تھا

ایڈی مورٹن کا میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا خواب اسی روز فنا ہوگیا تھا جس روز کالج انتظامیہ نے انٹرنس کے امتحان میں اس کے تحریف شدہ مضمون کی جانچ کرلی تھی۔ ایڈی کو یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا تھا۔ تب اس نے مقامی کمیونٹی کالج میں دو سال کے کورس کے لیے خود کو انرول کرالیا تھا اور مستقبل میں ڈاکٹر کے بجائے لیبارٹری اسسٹنٹ بننے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ایڈی ہمیشہ آزردہ رہتا تھا۔ خاص طور پر ویک اینڈ پر شراب نوشی اس کی مشکلات میں مزید اضافہ کردیتی تھی۔ اس کی پھولی ہوئی ناک پر باریک سرخ نسیں اس طرح نمایاں ہو جاتی تھیں جیسے کسی مکڑی نے سرخ رنگ کا جالا بُن دیا ہو۔ شراب کی گرمی سے ذہن پر چھائی دھند میں وہ اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ زندگی اس کے ساتھ بھک منگوں کا سا سلوک کیوں کررہی ہے۔

اس شب ایڈی اپنی بوڑھی کنواری آنٹی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی زندگی بھر کی جمع شدہ پونجی اسٹاکس بونڈز اور نقدی پر مشتمل تھی جبکہ زندگی اس کے ساتھ انصاف نہیں کررہی تھی۔ شراب پینے کے بعد اس پر ایک بار پھر افسردگی غالب آگئی۔

دھند لکے کے وقت وہ شراب خانے سے نکل آیا۔ اس

http://digestpk.blogspot.com/

نے لیمپ پوسٹ سے باندھی ہوئی اپنی موٹر سائیکل کا تالا کھولا اور کک مار کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔

ایڈی، آنٹی الزبتھ کا اکلوتا رشتے دار تھا۔ ایڈی کو یہ بھی علم تھا کہ اس کا نام آنٹی الزبتھ کی تیار کردہ وصیت میں شامل ہے لیکن اسے کب تک صبر کرنا ہوگا، یہ بات اسے بار بار کچوکے لگاتی تھی۔ آنٹی کی موت ایک اٹل حقیقت تھی... لیکن کب؟ دوسری جانب اس کے لیے اپنی ترقی اور امید کے امکانات تو کبھی کے ختم ہو چکے تھے۔

اب وہ یہ آس لگائے ہوئے تھا کہ کب آنٹی کی معمول کے مطابق موت واقع ہوگی اور کب قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہوگی؟

لیکن پھر اسے معلوم ہوا کہ کس طرح ایک علاج سے دل کے مریض کی زندگی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایڈی کو جب یہ بات پتا چلی تو اس کے تیور مزید بگڑ گئے۔

آنٹی الزبتھ دل کے ایسے عارضے میں مبتلا تھیں جس میں دل کی دھڑکن اپنی نارمل رفتار سے تیز ہو جاتی ہے اور اگر اس کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو یہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ تمام باتیں میڈیکل کی کتاب میں درج تھیں جنہیں پڑھ کر ایڈی کے گول بے کیف چہرے پر اداسی اور مایوسی کے سائے منڈلانے لگے۔ اس مرض کے علاج کے بارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ جیبی سائز کی گھڑی کے برابر ایک آلہ جو کہ پیس میکر کہلاتا ہے، مریض کی جلد کے نیچے اس کی پیوند کاری کر دی جاتی ہے۔ اس کے لیے مریض کو دو دن اسپتال میں رہنا پڑتا ہے۔ پیس میکر لگانے سے فبری لیشن کا مریض ایک طویل عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے۔

یہ پڑھ کر ایڈی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے مستقبل کو ایک طویل عرصے تک کے لیے ساکت کر دیا گیا ہو۔

لیکن پھر اس مضمون کا مزید مطالعہ کرنے پر پیس میکر کے بارے میں ایک ایسی بات پتا چلی جس پر ایڈی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لکھا تھا کہ جن لوگوں کو پیس میکر کی پیوند کاری کی جائے، وہ اس بات کا خصوصی دھیان رکھیں کہ ایسی اشیا سے دور رہیں جن سے برقی رو سے پیدا کردہ مقناطیسی شعاعیں نکلتی ہیں جیسے کہ سیل فون۔ اس میں مزید یہ تحریر تھا کہ اصل خطرہ بہت زیادہ قوت والے مقناطیسوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

ایڈی تصور میں آنٹی الزبتھ کو اعتماد کے ساتھ اپنی عمر کے نوّے سال میں قدم رکھتے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ خود بہ مشکل گھسٹ گھسٹ کر اپنی زندگی کے قدم بڑھا رہا تھا اور وہ بھی زندگی کی آسائشوں سے محرومی کے ساتھ...!

اس تصور نے اسے مزید افسردہ کر دیا۔

ایک عام آدمی کی طرح اسے بھی زندگی کی ہر آسائش کی طلب تھی لیکن خاص طور پر اسے ایک عرصے سے کنورٹیبل بیمر گاڑی کی خواہش تھی جو کہ لڑکیوں کے لیے مقناطیسی کشش رکھتی تھی۔

ایڈی کو پتا چلا کہ آنٹی الزبتھ کا آپریشن ویلنٹائن ڈے سے ایک روز قبل ہونا ہے۔ یہ آپریشن پیس میکر کی پیوند کاری کے لیے تھا۔ اس نے آپریشن سے ایک دن پہلے آنٹی الزبتھ کو فون کیا، تسلی دی اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

☆☆☆

ایڈی مسلسل ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔

اسے یہ خبر پتا چل گئی کہ آنٹی الزبتھ کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔ کیا خوش قسمتی ہے... ایڈی نے سوچا!

کل وہ ویلنٹائن ڈے کے موقع پر اپنی آنٹی کے لیے ان کے پسندیدہ چاکلیٹس کا تحفہ لے کر اسپتال پہنچ جائے گا۔ آنٹی کی تیمارداری بھی ہو جائے گی اور انہیں تھوڑا سا مکھن لگانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ایڈی نے فیصلہ کیا۔

ایڈی کا منصوبہ اے بی سی کے مانند آسان اور سادہ تھا۔ وہ طاقتور مقناطیسوں کا ایک سیٹ اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یہ مقناطیس اسے ایس الیکٹرانکس کی سیل میں آسانی سے دستیاب ہو جائیں گے۔ وہ اسپتال میں آنٹی کے بیڈ پر پہنچنے کے بعد اپنے خاندانی رشتے اور لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سینے پر جھک جائے گا۔

اس کے پاس چھپے ہوئے مقناطیسوں کی لہریں آنٹی کے سینے میں پیوند شدہ پیس میکر کو ڈسٹرب کر دیں گی۔ ان کے دل کی دھڑکنیں بے قاعدہ ہو جائیں گے اور دل بہت تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگے گا۔

...اور پھر دل ساکت ہو جائے گا!

کسی کو بھی اس پُرتشدد حرکت کا شبہ تک نہیں ہوگا اور نہ ہی ایسا کوئی سراغ پایا جائے گا۔ اسے از روئے شماریات ایک حسنِ اتفاق سمجھا جائے گا کیونکہ پیس میکر کی تکنیک میں ایسی ناکامی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

ایس الیکٹرانکس کی سیل میں ایڈی نے چار عدد ایسے چپٹے مقناطیس منتخب کیے جو بے حد طاقتور تھے۔ ان میں سے ہر ایک پانچ پانچ انچ لمبا اور چوتھائی انچ موٹا تھا۔ اس نے آزمانے کے لیے انہیں جدا کرنا چاہا تو اسے خاصی جدوجہد سے کام لینا پڑا۔

پرفیکٹ...! ایڈی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ادائیگی کے لیے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے قیمت اپنے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادا کی۔ کاؤنٹر کلرک نے رسید اسی پلاسٹک بیگ میں ڈال دی جس میں مقناطیس رکھے ہوئے تھے۔

ایڈی نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا اور اسٹور سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

ویلنٹائن ڈے پر ایڈی اپنے منصوبے کے تحت اسپتال پہنچ گیا۔

اسپتال کے گھومنے والے دروازوں سے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس سائن بورڈ پر ڈالی جو سامنے ہی لگا ہوا تھا... جس میں وزیٹرز سے دھول مٹی اڑنے کی معذرت کی گئی تھی کیونکہ سیکیورٹی کے نظام میں بہتری کا کام جاری تھا۔

دو کاریگر اپنے کام میں مشغول تھے۔ دہشت گردوں کا خوف اسپتالوں تک آن پہنچا ہے... ایڈی نے تعجب سے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

آنٹی الزبتھ کارڈیک وارڈ کے کمرا نمبر 207 میں مقیم تھیں۔ لفٹ سے باہر آنے کے بعد ایڈی دائیں جانب گھوم گیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ تمام نرسیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔

ایڈی نے چاکلیٹس کا ڈبا اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور داہنے ہاتھ سے پلاسٹک بیگ میں رکھے ہوئے مقناطیسوں کا سیٹ نکال کر اپنے کوٹ کے اوپری پاکٹ میں رکھ لیا۔

آنٹی الزبتھ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی تاش کا تنہا کھیلے جانے والا گیم سولیٹیئر کھیل رہی تھیں۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر اپنے بھتیجے کی جانب دیکھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

ایڈی نے اپنی بیس بال کیپ سر پر سے اتار دی اور مارتھا ایم کے چاکلیٹس کا ڈبا اونچا کرتے ہوئے چہکا۔ ”سویٹس فار دی سویٹ آنٹی!“

”اوہ، ہاں! آج ویلنٹائن ڈے ہے۔“ آنٹی الزبتھ نے مبہم لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ لوگ مجھے یہ کھانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”انہیں گھر لے جانا آنٹی!“ ایڈی نے بناوٹی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں اپنی فیورٹ آنٹی کے رخسار کا بوسہ لے لوں تو آپ برا تو نہیں منائیں گی؟“ ایڈی نے جھک

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہو سکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المُسلم دار الحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

http://digestpk.blogspot.com/

کر چاکلیٹس کا ڈبا آنٹی کو تھما دیا۔ پھر قدرے اٹکتے ہوئے اسے بتانے لگا کہ کس طرح ہر کوئی اس کی صحت کے بارے میں فکر مند ہے۔ لیکن اسے پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

پھر وہ اس رخ سے جدھر اس کے کوٹ کی جیب میں طاقتور مقناطیس پوشیدہ تھا، اپنی آنٹی پر جھک گیا اور اس سے اپنی چاہت کا اظہار کرنے لگا۔

لیکن چند ہی لمحوں میں آنٹی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور تکلیف کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ وہ اپنا سینہ تھام کر تیزی سے چلانے لگی۔ ''اوہ، میرا دل... میرا دل... یہ اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ جلدی کرو... نرس کو بلا کر لاؤ۔''

''ابھی لایا۔'' ایڈی نے اپنی کیپ اٹھائی اور دروازے کی جانب لپکا۔ کاریڈور میں اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ہال میں پہنچ کر اس نے اپنا رخ لفٹ کی جانب کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے اوپر پانچویں منزل پر لفٹ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی ہے۔ لفٹ نیچے آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بالآخر لفٹ اس فلور پر آ گئی۔ ایڈی تیزی سے لفٹ میں سوار ہو گیا۔

لابی میں لفٹ سے اتر کر جب وہ آگے بڑھا تو اس نے سیکیورٹی کے یونیفارم میں ملبوس ایک شخص کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا جس کے ہولسٹر میں ریوالور بھی لگا ہوا تھا۔

ایڈی ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا سا گیا۔

''معاف کیجیے گا جناب! آپ ہماری مدد کرنے میں برا تو نہیں مانیں گے؟'' اس سیکیورٹی گارڈ نے ایڈی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہم نے اپنے نئے میٹل ڈیٹیکٹر کو ابھی ابھی آن کیا ہے۔ اس کی آزمائش کرنی ہے اور آپ سب سے پہلے فرد ہیں جو ہمیں دکھائی دیے ہیں۔ پلیز! اس کے نیچے سے گزر جائیں۔ یہ ایک رسمی کارروائی ہے۔''

جونہی ایڈی اس ڈیٹیکٹر کے اندر سے گزرا، ایک تیز سیٹی کی سی آواز گونجی۔ قریب میں مصروف ورکرز نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ کام کر رہا ہے۔'' انہوں نے چہکتے ہوئے کہا۔

''بے شک۔'' سیکیورٹی گارڈ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''تھینک یو سر! اب آپ جا سکتے ہیں۔ آپ باہر جا رہے تھے نا؟''

اس سے قبل کہ ایڈی کوئی جواب دیتا، سیکیورٹی گارڈ کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے فوری جواب دیا اور پھر غضب ناک نگاہوں سے ایڈی کو گھورنے لگا۔

☆☆☆

چند منٹ بعد ایڈی اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کے دفتر میں کھڑا تھا۔ اسے سیکیورٹی گارڈ، ایڈمنسٹریٹر، سفید کوٹ میں ملبوس ایک ٹیکنیشن اور ایک نرس نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

نرس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا مستطیل ٹکڑا تھا جو اس نے سیکیورٹی گارڈ کی جانب بڑھا دیا۔

''پلیز! اپنا نام بتائیں اور اپنا کریڈٹ کارڈ میرے حوالے کر دیں۔'' سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔

ایڈی نے اپنا کریڈٹ کارڈ بٹوے میں سے نکال کر گارڈ کی جانب بڑھا دیا۔

گارڈ نے باری باری نرس کے تھمائے ہوئے کاغذ اور ایڈی کے کریڈٹ کارڈ پر نگاہ ڈالی اور پھر بولا۔ ''اس کے نمبر کریڈٹ کارڈ سے میچ کر رہے ہیں۔''

تب نرس گویا ہوئی۔ ''کمرا نمبر 207 میں موجود پیس میکر کی مریضہ ہمیں مردہ حالت میں ملی ہے... اور اسکاٹ جو کہ ٹیکنیشن ہے، وہ کاریڈور کے سیکیورٹی ٹیپ کا جائزہ لے رہا تھا تو اس نے اس شخص کو جو اپنی بیس بال کی کیپ سے شناخت ہو رہا ہے، اپنے بیگ میں سے کوئی مستطیل سی شے نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔

''جب اس نے وہ شے اپنے کوٹ کی جیب میں منتقل کی تو اسے پتا نہیں چلا کہ کاغذ کا یہ ٹکڑا پلاسٹک بیگ میں سے فرش پر گر پڑا ہے۔ یہ بات عین اس شخص کے کمرا نمبر 207 میں داخل ہونے سے پہلے کی ہے۔ لیکن اب ہمیں پتا چل گیا ہے کہ وہ کاغذ کا ٹکڑا اور وہ مستطیل شے کیا تھی جو اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھی تھی۔ یہ کاغذ مقناطیس کی خریداری کی رسید ہے اور مقناطیس پیس میکر کے بدترین دشمن شمار ہوتے ہیں۔ تب ہم نے فوراً ہی تمہارے اسٹیشن فون کیا کہ شاید یہ شخص اب بھی عمارت میں موجود ہو۔''

گارڈ نے آگے بڑھ کر ایڈی کے کوٹ کی جیب ٹٹولتے ہوئے مقناطیسوں کا سیٹ باہر نکال لیا اور اسے ایڈمنسٹریٹر کے سامنے رکھ دیا۔

تب ایڈمنسٹریٹر پہلی بار گویا ہوا۔ ''مسٹر ایڈی مورٹن! ہم پولیس کو فون کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی آمد تک آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔'' ساتھ ہی اس نے سیکیورٹی گارڈ کو چوکنا رہنے کا اشارہ کیا۔

گارڈ نے ایڈی پر نظریں جماتے ہوئے اپنے ریوالور کے دستے پر گرفت مضبوط کر دی۔

ایڈی نے اپنا خواب ایک بار پھر فنا ہونے پر بے بسی سے اپنا سر تھام لیا۔

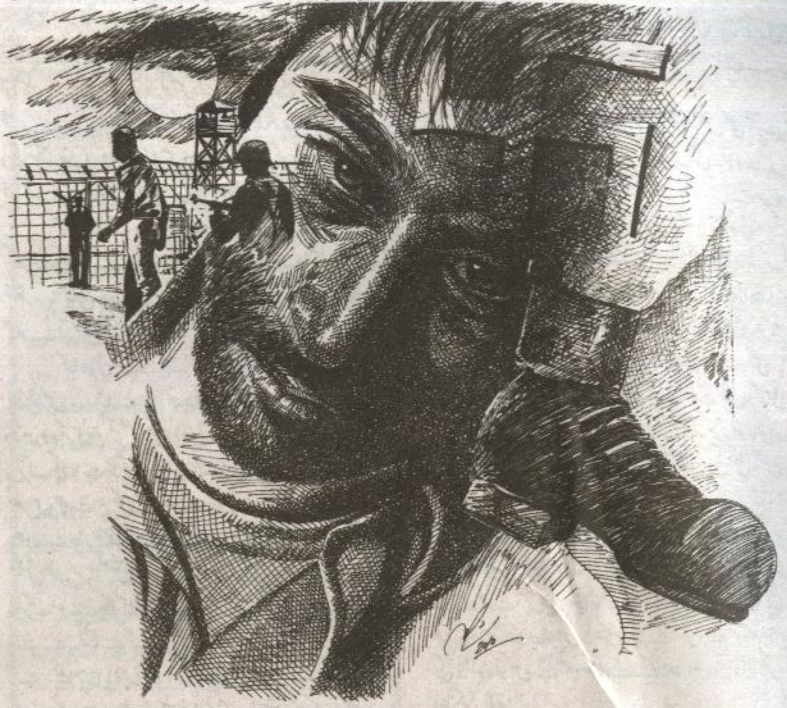

وطن پرست

مختار آزاد

زندگی کے لیے زندہ رہنا سب کی خواہش ہوتی ہے ...... مگر مقصد کے لیے جان دینا اُس کی خواہش تھی۔ میدانِ جنگ میں بر سرِ پیکار دو فوجیوں کی داستان۔ ایک ہر حال میں زندہ رہنے کا خواہشمند تھا اور دوسرا جاں سے گزر جانے کو بیقرار تھا۔

ایک ہی منزل کے دو مسافروں کا ماجرا، سفر ایک تھا لیکن انداز جدا جدا

''مسٹر نوکس! کیا آپ مجھے سن سکتے ہیں؟''

کیپٹن پیٹرک آئنس ورتھ نے نرم لہجے میں کہا مگر کمرے میں کرسی پر نیم دراز شخص بالکل ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ پیٹرک اس شخص کو کئی لمحے سے راہداری میں کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں نوکس کو سزا سنائے جانے کے بعد رکھا گیا تھا۔ کمرے کا اندرونی منظر کھلے دروازے سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ کچھ دیر پہلے ہی پہرے پر متعین سنتری نے کھولا تھا۔

http://digestpk.blogspot.com/

''مسٹر نوکس!'' کیپٹن پیٹرک نے ایک بار پھر پکارا مگر جواب ندارد۔ وہ راہداری میں خاموش کھڑا اس کی توجہ کا منتظر تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ نوکس اپنے اردگرد کی ہر چیز سے بے خبر ہے یا وہ جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کر رہا ہے۔ پیٹرک دیکھ سکتا تھا کہ راہداری میں دروازے کے بالکل ساتھ ہی حفاظت پر مامور سنتری چوکس کھڑا ہوا تھا۔

کیپٹن پیٹرک خاموشی سے چند لمحوں تک راہداری میں کھڑا رہ کر کمرے کے اندر موجود نوکس کی توجہ حاصل کرنے کا منتظر رہا لیکن جب اسے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

''کیا حال ہے... اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟'' اس نے نوکس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ انداز میں کہا۔ اس وقت وہ کرسی پر گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ اس بار بھی اس نے کیپٹن پیٹرک کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کرسی پر بیٹھے نوکس کی نظریں چھت پر جمی تھیں اور وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا سے مکمل طور پر لاتعلق ہو چکا ہے۔ نوکس کی حالت دیکھ کر کیپٹن پیٹرک سوچنے لگا کہ یہ اعصابی تھکن نہیں بلکہ اس سے آگے کی بات ہے۔ لگتا ہے کہ اس شخص کے اعصاب مکمل طور پر جواب دے چکے ہیں یا اس کا دماغ شدید صدمے کے سبب کام کرنا چھوڑ چکا ہے۔ دوسری طرف نوکس بدستور چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

پیٹرک نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ کمرے کے ایک کونے میں رکھا اور پلٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''میں تمہارے معائنے کے لیے آیا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' نوکس کی نگاہیں بدستور چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ پلکیں تک نہیں جھپکا رہا تھا۔ اس بار بھی وہ کیپٹن پیٹرک کے سوال کے جواب میں خاموش رہا۔

اسی اثنا میں راہداری میں سنتری گشت کرنے لگا۔ اس کے بھاری بوٹوں سے خاموش راہداری میں آواز گونجنے لگی۔ سنتری راہداری کا چکر لگا رہا تھا اور اس کے بوٹوں سے پیدا ہونے والی یہ آواز ماحول پر طاری خاموشی توڑ رہی تھی۔ اس آواز کے سوا، کمرے کے اندر اور باہر مکمل طور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''پلیز... کیا آپ اپنی قمیص کے بٹن کھول دیں گے؟ مجھے آپ کا معائنہ کرنا ہے۔'' کیپٹن پیٹرک نے اسٹیتھو اسکوپ نکالتے ہوئے نوکس کو ایک بار پھر مخاطب کیا لیکن وہ بدستور بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ کیپٹن پیٹرک آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں سے کرسی پر بیٹھے نوکس کی قمیص کے اوپری بٹن کھولے اور اسٹیتھو اسکوپ کانوں سے لگا کر اس کے سینے کا معائنہ کرنے لگا۔

سینے کی دھڑکن معمول سے کچھ کم تھی، نبض بھی آہستہ چل رہی تھی لیکن یہ بات باعثِ تشویش نہیں تھی۔ وہ سانس بھی معمول کے مطابق لے رہا تھا۔ کیپٹن نے اس کے سر کا بھی اچھی طرح معائنہ کیا لیکن وہاں کوئی زخم یا معمولی سا گومڑا تک بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھ کی پتلیاں بھی ٹھیک ٹھاک کام کر رہی تھیں۔ اس نے کانوں کا معائنہ کیا۔ اگر محاذِ جنگ پر بم دھماکوں کے نتیجے میں اس کی سماعت متاثر ہوئی تھی تو اس کی علامات نظر آنی چاہیے تھیں لیکن کان کا معائنہ بھی بالکل درست ثابت ہوا۔ وہاں ایسی کوئی علامت نہیں دکھائی دی جس سے اس کے بہرے ہو جانے کی تصدیق ہو پاتی۔ اس کے جسم پر بھی بظاہر ایسی کوئی علامت نہیں پائی گئی جس سے اس کے گم صم ہو جانے کا تعلق بنتا ہو۔

''یہ بم دھماکے کے نتیجے میں ہونے والا اعصابی صدمہ ہے۔'' پیٹرک زیرِلب بڑبڑایا۔ ''شاید یہ 'شیل شاک' کا شکار ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کا دماغ اور اعصاب بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے اس کے گم صم ہو جانے کی۔'' وہ نوکس کے طبی معائنے کے بعد دل ہی دل میں نتائج اخذ کر رہا تھا۔

''نوکس... تم جانتے ہو لوگ تمہارے بارے میں بہت پریشان ہیں۔ وہ تمہاری خاموشی سے تشویش میں مبتلا ہیں۔'' پیٹرک اپنے طبی آلات بیگ میں رکھ کر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے مخاطب کیا۔ ''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں تمہارا مکمل طبی معائنہ کر کے انہیں بتاؤں کہ تمہیں خطرے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' حسبِ سابق اس بار بھی پیٹرک کی باتوں پر نوکس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ''جانتے ہو تم اس وقت کہاں ہو؟''

نوکس پھر بھی خاموش رہا۔

''کیا تمہیں علم ہے کہ تمہیں قتل کے جرم میں سزا سنائی جا چکی ہے۔'' پیٹرک نے یہ بات اس طرح کہی جیسے وہ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے نوکس کے اعصاب کو جھٹکا دینا چاہتا ہو مگر نوکس پر اس بات کا بھی کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔

''تمہیں بہت جلد فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے موت کی سزا پر عمل درآمد کر دیا جائے گا۔'' پیٹرک نے کچھ توقف کرتے ہوئے کہا لیکن وہ بدستور لاتعلق سا بیٹھا رہا.... ایسا لگتا تھا کہ وہ سننے، سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے عاری ہو چکا ہے۔ کیپٹن پیٹرک حیرت سے اسے تک رہا تھا۔

یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ یورپ کے کئی ممالک کی طرح فرانس بھی اپنی بقا اور دفاع کے لیے برسرِ پیکار تھا۔ پیٹرک نے حال ہی میں فرانس کی زمینی فوج کے میڈیکل کور میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ نفسیات اور طب میں ماہر تھا اور ان دنوں فارغ التحصیل تھا۔ اسے افسران نے نوکس کے طبی معائنے اور نفسیاتی حالت کا سبب جاننے کے لیے متعین کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ محاذِ جنگ کے قریب قائم ایک فوجی کیمپ میں تھے۔ پیٹرک کو اس کی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ جنگ کے دوران ہنگامی حالت میں ہونے والی جبری بھرتی کے پروگرام کے تحت فوج میں شامل کیا گیا تھا۔ وہ فوج کے بجائے آزادانہ طور پر میڈیکل پریکٹس کرنے کا خواہش مند تھا لیکن جنگ نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ فوج میں شمولیت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ایک ایسے سپاہی کے خصوصی نفسیاتی و طبی معائنے کے لیے بھیجا گیا جسے اپنے ہی ایک افسر کو گولی مار کر قتل کر دینے کے جرم میں کورٹ مارشل کر کے موت کی سزا دی گئی تھی... مگر قتل کے واقعے کے بعد سے اب تک مجرم سپاہی پر سکتہ طاری تھا۔

پیٹرک کچھ دیر تک خاموش بیٹھ کر اس کے کسی بھی ردِعمل کا منتظر رہا لیکن لگتا تھا کہ نوکس زندہ انسان نہیں بلکہ ایک لاش ہے جو ہر چیز سے لاتعلق ہے۔ کافی وقت اسی طرح گزر گیا لیکن جب کیپٹن پیٹرک، مجرم نوکس کی توجہ حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا تو وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔ کونے میں رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور اس پر اچٹتی سے نظر ڈالی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا تو سنتری دروازے پر ہی مستعدی سے کھڑا ہوا تھا۔ ''کچھ کھایا پیا ہے اس نے؟'' پیٹرک نے رک کر سنتری سے دبے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں سر!'' سنتری نے جواب دیا۔ ''پہلے تو اس نے تھوڑا بہت کھا پی لیا تھا لیکن پھر اس نے کھانے پینے کی کسی چیز کو نہ تو ہاتھ لگایا، نہ کچھ مانگا۔ بھوکا پیاسا پڑا ہوا ہے۔''

''تم کب سے یہاں پر ڈیوٹی کر رہے ہو؟''

''چار دن ہو گئے۔'' سنتری نے کیپٹن کو بتایا۔

''اس نے کسی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی ہے؟ تم نے محسوس کیا کہ کسی وقت یہ زیرِلب کچھ بڑبڑا رہا ہو؟'' پیٹرک نے سنتری سے ایک اور سوال کیا۔

''بالکل نہیں سر!'' سنتری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ تو بالکل زندہ لاش کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔''

''یہ کب سے اس حالت میں ہے؟''

''میں تو اسے پہلے دن سے ہی اسی حالت میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔''

''تم اسے کورٹ مارشل کے لیے کس طرح لے کر گئے تھے؟'' پیٹرک نے سنتری سے پھر سوال کیا۔ اسے حیرت تھی کہ اس بے حس وجود کو کس طرح اس کمرے سے نکال کر باہر لے جایا گیا ہوگا۔ یہی بات جاننے کے لیے اس نے سنتری سے سوال کیا۔٭٭

جزاک اللہ!

بچپن میں ایک آواز جو کان میں گونجا کرتی تھی وہ آواز آج بھی مسجد میں اسی طرح سنائی دیتی ہے۔ جمعے کی نماز سے پہلے مسجد کمیٹی کے دو ارکان ایک صاف ستھرے کپڑے کے دو سرے تھامے نمازیوں کی قطار کے سامنے گزرتے ہیں اور جزاک اللہ، جزاک اللہ کی صدا بلند کرتے چلے جاتے ہیں! لوگ حسبِ استطاعت اس کپڑے میں دس، بیس، سو روپے ڈال دیتے ہیں، جمعے کی نماز کے بعد مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلانات شروع ہو جاتے ہیں! حاجی شریف صاحب نے دس روپے بھیجے ہیں، جزاک اللہ! جزاک اللہ، ایک ننھی منی پیاری سی بچی عائشہ پانچ کا نوٹ لے کر آئی ہے، عائشہ ملک ارشد صاحب کی بیٹی ہے، ملک ارشد صاحب علاقے کی بہت مخیر شخصیت ہیں، ماشاءاللہ ان کا سارا خاندان دینی کاموں میں آگے آگے ہے، جزاک اللہ عائشہ بیٹی، اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔ شیدے پہلوان نے مسجد کی چٹائیوں کے لیے سو روپے بھیجے ہیں۔ آج تک کسی دنگل میں شیدے پہلوان کی پیٹھ نہیں لگی۔ مسجد کی خدمت میں بھی یہ سب سے آگے ہیں، جزاک اللہ شیدے پہلوان جی جزاک اللہ! حافظ عباس صاحب کی طرف سے ابھی دو سو روپے وصول ہوئے ہیں حافظ صاحب دوحہ قطر کے عبدالحمید صاحب کے سمدھی ہیں، یہ سارا خاندان دینی کاموں میں پیش پیش ہے جزاک اللہ حافظ عباس صاحب۔

''یہ کمرشل سروس'' گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا جاری رہتی ہے مگر ''جزاک اللہ'' کی آوازیں اس کے علاوہ بھی ہر قدم پر سنائی دیتی ہیں۔

(''ہنسا رونا منع ہے'' عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے اقتباس۔ ولید بلال کی عرق ریزی)

http://digestpk.blogspot.com/

''اُس وقت اِس کی یہ حالت نہیں تھی۔'' سنتری نے کہنا شروع کیا۔ ''میں نے اور ایک دوسرے سنتری نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کرسی سے اٹھایا تھا اور یہ ہم دونوں کے بیچوں بیچ مرے مرے قدموں سے چلتے ہوئے کمرائے عدالت تک پہنچا تھا۔'' سنتری نے تفصیل سے بتایا۔ وہ دونوں کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہی باتیں کر رہے تھے۔

پیٹرک نے ایک بار پھر اس کمرے میں جھانکا جہاں نوکس کو رکھا گیا تھا... مگر وہ بدستور اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا جیسے پہلے تھا۔

''ٹھیک ہے۔ کمرا بند کر کے تالا لگا دو۔'' پیٹرک نے سنتری کو حکم دیا۔

مضافات میں واقع یہ فارم ہاؤس دراصل قدیم طرز کی بنی ہوئی ایک کشادہ عمارت تھی جسے اس وقت فرانسیسی افواج رجمنٹل ہیڈکوارٹر کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ عمارت گو کہ مضبوط بنی ہوئی تھی لیکن اس پر بھی دشمن افواج فضائیہ بمباری کر چکی تھی جس کے آثار عمارت کے ٹوٹے پھوٹے حصے کی صورت میں واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ بمباری کے باعث اس عمارت کے ایک بڑے حصے کو کافی نقصان پہنچا تھا مگر پھر بھی یہ ناقابلِ استعمال نہیں...

''ٹھیک ہے۔ شکریہ تمہارا۔'' سنتری نے تالا لگا دیا تو پیٹرک نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ کرنل براؤننگ کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔

جس وقت کیپٹن پیٹرک، کرنل براؤننگ کے دفتر کے باہر پہنچا، اس وقت وہ بڑی سی میز کے پیچھے اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے میجر ایلمنڈ بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ میجر ایلمنڈ رجمنٹ کی اس انفنٹری کمپنی کا کمانڈر تھا جس میں نوکس شامل تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر پیٹرک راہداری میں ہی کمرے کے نیم کھلے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی کرنل کی نظر کیپٹن پیٹرک پر پڑی، اس نے فوراً سیلیوٹ کیا۔

''ہاں تو کیا رپورٹ ہے؟'' کرنل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کی اجازت دی...... وہ اس کی میز کے مقابل پہنچ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا۔

''سر... میں نے مسٹر نوکس کا تفصیلی معائنہ کر لیا ہے۔ وہ سکتے میں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' کرنل نے سوال کیا۔

''وہ نہ تو بول سکتا ہے اور نہ ہی کسی بات پر ردِعمل ظاہر کرنے کی حالت میں ہے۔ وہ تو ہلنے جُلنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔ اصل میں اس وقت نوکس مکمل طور پر سکتے کی بدترین صورتِ حال کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔'' پیٹرک نے کرنل کو جواب دیا۔

''کیپٹن...'' یہ سن کر کرنل کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔ ''یہ تو ہم پہلے سے ہی جانتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں سر!'' کیپٹن نے جواب دیا۔

''اس دن کارپورل ڈیلے کو قتل کرنے سے پہلے تک وہ بالکل درست حالت میں تھا۔'' میجر ایلمنڈ نے کیپٹن پیٹرک کی بات سن کر لقمہ دیا۔ ''جب ہم اسے گرفتار کر کے یہاں لائے تھے، تب سے اب تک وہ اسی حالت میں ہے... جس حالت میں تم نے اس کا معائنہ کیا ہے۔''

''ابتدائی معائنے میں اس کے جسم پر چوٹ کا کوئی ظاہری نشان موجود نہیں ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ بدترین ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی یہ دماغی حالت 'شیل شاک' کی وجہ سے ہو۔ بمباری اور دھماکوں کی وجہ سے اکثر عام لوگ اور فوجی اس ذہنی صدمے کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' کیپٹن پیٹرک نے تفصیل سے نوکس کے طبی معائنے کی ابتدائی رپورٹ اپنے افسران کے سامنے زبانی طور پر پیش کرتے ہوئے کہا۔

رپورٹ سن کر کرنل براؤننگ اور میجر ایلمنڈ نے خشمگیں نگاہوں سے پیٹرک کو گھورا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ناٹک نہیں کر رہا؟'' کرنل نے درشتی سے سوال کیا۔

''سر... میں اس بارے میں پورے وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' پیٹرک نے ہچکچاتے ہوئے بے یقینی لہجے میں کہا۔ ''مگر اس کی جو حالت ہے، وہ یہی ظاہر کرتی ہے کہ وہ ذہنی دباؤ میں ہے۔''

''خیر چھوڑو۔ ہمیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں کہ اس وقت اس کی ذہنی حالت کیا ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپی ہمیں وہ بات جان لینے میں ہے کہ چار دن پہلے ایسا کیا ہوا تھا جس پر اس نے کارپورل ڈیلے کو قتل کر ڈالا۔'' کرنل نے کہا۔ ''ویسے تو ہم جانتے ہیں کہ اس نے کارپورل پر گولی چلائی تھی جس کے نتیجے میں وہ مارا گیا۔ مگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے گولی کیوں چلائی؟ اگرچہ ہم یہ بات بھی جانتے ہیں لیکن اس کے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔''

''سر... کسی کی ظاہری جسمانی حالت سے یہ بات جان لینا تو بہت ہی مشکل کام ہے۔'' پیٹرک نے کرنل سے کہا۔ ''یہ کام تو اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب دوسرا شخص اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کر رہا ہو اور اس کا جسم بظاہر تمام احساسات سے عاری دکھائی دے رہا ہو۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ حقائق جاننے کے لیے مجھے نوکس کو کچھ وقت کے لیے اسٹیشن لے جانے کی اجازت دی جائے تاکہ میں چوبیس گھنٹے اس کا تفصیلی جائزہ لے کر کوئی حتمی رائے قائم کر سکوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' کرنل نے قطعی لہجے میں سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نوکس خطرناک مجرم ہے۔ میں اسے کہیں اور لے جانے کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ تو موقع ملتے ہی کسی اور کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' کرنل کے لہجے میں سختی در آئی.... ''اس نے جرم یہاں کیا ہے، اس کا مقدمہ بھی یہیں چلا ہے اور سزا بھی یہیں ملے گی۔ ہم اسے کہیں اور لے جانے کی اجازت کسی بھی حالت میں بھی نہیں دے سکتے۔''

''لیکن سر!'' کیپٹن پیٹرک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ مریض کی حالت دیکھ کر اس وقت کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے حوالے سے، میں اس وقت تھوڑا سا کنفیوز ہوں۔ آپ کا اصرار ہے کہ میں اس بات کا حتمی تعین کروں کہ نوکس سے جو جرم سرزد ہوا ہے، وہی اس کا ذمے دار بھی ہے؟ ویسے بھی یہ بات آپ اس وقت کہہ رہے ہیں جب اسے قتل کے جرم میں سزا بھی سنائی جا چکی ہے۔''

''یہ معاملہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا کہ نظر آ رہا ہے۔'' پیٹرک کی بات سن کر میجر ایلمنڈ نے کہا۔ ''اگر نوکس واقعی فاترالعقل ہے، تب بھی وہ قتل کرنے کا ذمے دار ہے۔ تو ایسے میں ہم اس بات پر کیوں بحث کریں کہ اس کی دماغی حالت کیسی ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے کہ تم نوکس سے اس محرک یا محرکات کا پتا چلانے کی کوشش کرو جو قتل کا سبب بنے۔ یہ جاننا اس لیے اہم ہے کہ وہ کورٹ مارشل کے دوران بھی بالکل خاموش اور بے حس رہا ہے۔ اس نے اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سزا دیے جانے کے باوجود یہ بات جاننا چاہتے کہ ایسی کیا بات ہو گئی تھی جس پر مشتعل ہو کر اس نے ایک انسان اور وہ بھی اپنے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

ان دو تجربہ کار فوجی افسران کے سامنے بات کرتے ہوئے نوآموز کیپٹن پیٹرک کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ وہ ایک ڈاکٹر اور ماہرِ نفسیات تھا۔ صرف دو ماہ پہلے ہی اس نے فوج میں ملازمت شروع کی تھی۔ اب تک وہ فوج کے قوانین اور فوجیوں کے مزاج سے بھی پوری طرح آشنا نہیں تھا۔ اسے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایک شخص کو اپنا دفاع کیے بنا قتل جیسے سنگین جرم میں ظاہری اسباب کی بنا پر موت کی سزا کیسے سنا دی گئی؟ اور اب وہ اسباب جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے جو قتل کا محرک بنے۔ وہ بھی اس مجرم کے منہ سے جو بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ ماہرِ نفسیات لاکھ تجربہ کار ہو لیکن جب اس کا مریض اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو وہ اس سے حقائق کیسے اُگلوا سکتا ہے؟ اسے یہ بات بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں صرف ایک ہی راستہ بچا تھا اور وہ یہ کہ نوکس کے ماضی کو کھنگال کر حقائق کا پتا چلانے کی کوشش کی جائے۔

''نوکس کا میڈیکل ریکارڈ کیا کہتا ہے؟'' پیٹرک نے کرنل سے سوال کیا۔

''بالکل صاف ہے۔ وہ پوری سروس میں صرف ایک بار ہی زخمی ہوا تھا، وہ بھی صرف دو ماہ پہلے۔ اسے معمولی زخم آئے تھے لیکن وہ کچھ ہی عرصے میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا تھا۔''

''ماضی میں اس کو درپیش نفسیاتی مسائل کے حوالے سے کیا کوئی معلومات موجود ہیں؟'' پیٹرک نے دوبارہ کرنل سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' کرنل کے بجائے میجر ایلمنڈ نے سخت لہجے میں انکار کیا۔ ''اس حوالے سے اس کے میڈیکل ریکارڈ میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو قابلِ توجہ ہو یا اس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہو۔''

''کیا یہ نوکس کا سروس ریکارڈ ہے؟'' پیٹرک نے میز پر میجر کے سامنے رکھی ہوئی فائل پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میجر نے جواب دیا۔ اس فائل میں اس کے کورٹ مارشل کا بھی ریکارڈ ہے۔ کیا تم اسے دیکھنا چاہو گے؟'' میجر نے پیٹرک سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' پیٹرک نے جواب دیا۔ ''اس فائل کا مطالعہ مجھے نوکس کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے... یہ لو۔'' میجر نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔

''ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے تمہاری حتمی رپورٹ اس فائل میں چاہیے۔ اس کے بنا یہ فائل اس بلڈنگ سے کسی بھی صورت باہر نہیں جا سکتی۔'' کرنل نے پیٹرک سے کہا۔ ''اب آپ لوگ جا سکتے ہیں... میٹنگ ڈسمس۔''

☆☆☆

''یار! میرے لیے تو یہ کیس مصیبت بن گیا ہے۔'' اس وقت وہ اپنے ساتھی کیپٹن مورس کے ساتھ میس میں بیٹھا ہوا

http://digestpk.blogspot.com/

چائے پی رہا تھا۔ میس کی زیادہ تر میزیں خالی تھیں۔ اس وقت کھانے یا چائے کا وقفہ بھی نہیں ہوا تھا اس لیے لگ بھگ پورا میس خالی پڑا ہوا تھا۔

''ویسے اس بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟'' کیپٹن مورس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''نوکس کی سروس فائل سے تو یہی نظر آتا ہے کہ وہ اس واقعے سے پہلے تک ایک مثالی سپاہی تھا۔'' پیٹرک نے مورس سے کہا۔ ''وہ کافی عرصے سے فوج کی ملازمت کر رہا ہے لیکن ایک بار بھی اس پر قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کا الزام نہیں لگا۔''

''اس قتل کے اصل محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟'' مورس نے سوال کیا۔

''میں یہی تو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے یہ بات حیران کن ہے کہ جس محاذ پر وہ پہلی بار زخمی ہوا تھا، صحت یابی کے بعد اسے دوبارہ وہیں بھیج دیا گیا جہاں اس نے اپنے ہی ایک ساتھی کو قتل کر دیا۔'' پیٹرک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ویسے ہم کیا یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ڈیلے اور نوکس کے مابین کوئی ذاتی پرخاش تھی جو قتل کا سبب بنی؟'' پُرسکون بیٹھے ہوئے کیپٹن مورس نے آگے کی طرف جھک کر پیٹرک کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں تھا۔ کم از کم عینی شاہدین کے بیانات پر مشتمل جو سمری کورٹ مارشل فائل میں لگی ہوئی ہے، اسے پڑھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔'' پیٹرک نے جواب دیا۔ ''جب قتل ہوا، وہاں ایک اور سپاہی موجود تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ کارپورل ڈیلے نے پہاڑی چوٹی پر چڑھنے کا حکم دیا لیکن نوکس نے یہ کہہ کر حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ پہاڑی پر چڑھنا خودکشی کے مترادف ہے... جس پر کارپورل برانگیختہ ہوا اور اس نے نوکس کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ اس پر نوکس کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے رائفل سیدھی کی، نشانہ لیا اور کارپورل ڈیلے وہیں ڈھیر ہو گیا۔'' مورس پلکیں جھپکائے بغیر پیٹرک کی بات سن رہا تھا۔ پیٹرک نے چند لمحے توقف کیا۔ چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

''ویسے مجھے یہ 'شیل شاک' کا ہی کیس لگتا ہے۔ میں نے اس حوالے سے متعدد کیسز کو اسٹڈی کیا ہے۔'' پیٹرک نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''ان میں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ ایک شخص جس کے دماغ کو بمباری اور دھماکوں کی آوازوں کے باعث نادیدہ مگر تکلیف دہ صدمہ پہنچا... اور پھر ایک دن وہ اچانک کسی بات پر مشتعل ہوا اور سنگین جرم کا ارتکاب کر بیٹھا۔ ایسا اکثر میدانِ جنگ میں سرگرم فوجیوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ جب وہ کسی بات پر طیش میں آ کر اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان سے کوئی سنگین یا معمولی نوعیت کا جرم سرزد ہو جاتا ہے۔ ایسا اکثر انہی فوجیوں کے ساتھ ہوتا ہے جو بہت زیادہ عرصے تک میدانِ جنگ میں رہیں۔''

''ویسے کیا 'شیل کاک' کے اثرات جسم پر دوسرے امراض کی طرح دکھائی دیتے ہیں؟'' مورس نے جو پیٹرک کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا، اچانک سوال کیا۔

''شیل شاک'' کے نتیجے میں بظاہر تو متاثرہ شخص کی جسمانی حالت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی اس کی جسمانی علامات دیکھنے میں آتی ہیں لیکن اس شخص کا رویہ منفی ہونے لگتا ہے اور اعصاب میں تناؤ آ جاتا ہے جس کی وجہ سے دماغ پر دباؤ بڑھنے لگتا ہے اور پھر... اگر نوکس بھی اسی کیفیت کا شکار ہوا ہے تو تم دیکھ ہی سکتے ہو کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔'' پیٹرک نے مورس کی طرف دیکھتے ہوئے بات ختم کی۔ ''لگتا ہے بات تمہاری سمجھ میں آ چکی ہو گی۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' کیپٹن مورس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''نوکس بزدل نہیں تھا۔ اس نے بہادری سے ملازمت کی اور سپاہی سے نائب کارپورل کے عہدے تک ترقی کی۔ وہ ہرگز بزدل نہیں تھا۔ یہ بات اس کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے اگر......... یہ مان لیا جائے کہ کارپورل ڈیلے نے اسے بزدلی کا طعنہ دیا تو وہ اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ سکا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس پر شیل شاک بھرپور قوت سے اثر انداز ہو رہا تھا۔'' پیٹرک، مورس کو دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔

''تمہارے خیال میں جب تم نوکس کے نفسیاتی تجزیے کی حتمی رپورٹ دے دو گے، تب اس کے ساتھ کیا...... ہو گا؟'' کیپٹن مورس نے سوال کیا۔

''اس کے بچنے کے امکانات بہت زیادہ روشن نہیں۔'' پیٹرک نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ وہ کل کرنل اور میجر کے رویے سے اندازہ کر چکا تھا کہ دونوں مجرم کی نفسیاتی حالت سے زیادہ اُس جرم کو اہمیت دے رہے تھے۔ پیٹرک کا خیال تھا کہ نفسیاتی پس منظر کو نظر انداز کر کے کوئی بھی سزا ماورائے عدالت اقدام ہو گی مگر وہ مجبور تھا۔ اس کی ذمے داری نفسیاتی تجزیے کی رپورٹ تک محدود تھی۔ اس سے آگے کیا ہو گا، یہ اس کے بس سے باہر تھا۔

''ویسے تو یہ قتل جن حالات میں ہوا ہے، اس بارے

میں کوئی وثوق سے کچھ کہنے کو تیار نہیں۔ ایک عینی شاہد کے سوا کسی دوسرے نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ کورٹ مارشل میں بھی صرف وہی سارجنٹ پیش ہوا تھا جس نے قتل کے بعد نوکس کو گرفتار کیا تھا۔ وہ بھی صرف ایک منٹ کے لیے۔ اس نے کورٹ کو بھی یہی بتایا کہ جب وہ پہنچا تو قتل ہو چکا تھا۔'' پیٹرک نے مورس سے کہا۔ اس کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی۔

''دیکھو... میری بات مانو اور جو تم سے کہا گیا ہے، وہی کرو۔ اس سے زیادہ سوچو گے تو تمہاری اپنی صحت خراب ہو جائے گی۔'' مورس نے ہمدردانہ لہجے میں اسے مشورہ دیا۔ یہ سن کر پیٹرک مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ مورس اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے جہاں سپاہ گری صدیوں سے اجداد کا پیشہ ہے۔۔ اس لیے وہ صرف حکم کی بجا آوری کا ہی مشورہ دے سکتا ہے۔

''دوست... بہت بہت شکریہ تمہارا۔'' اس نے مورس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

پیٹرک سمجھ رہا تھا کہ اگر اس کی رپورٹ ثابت کر دے کہ قتل گو کہ نوکس کے ہی ہاتھوں ہوا ہے لیکن وہ ان محرکات کا ذمّے دار نہیں تھا جس کے باعث جرم ہوا تو شاید اس ساکت پڑے شخص کی سزا معاف ہو جائے۔

☆☆☆

دوسرے دن پیٹرک دوبارہ اس کمرے میں گیا جہاں کورٹ مارشل کے بعد نوکس کو رکھا گیا تھا۔ اس نے تفصیل سے اس کا معائنہ کیا۔ وہ نوکس کے ساتھ ایک گھنٹے تک موجود رہا لیکن کوئی نئی بات نہیں جان سکا۔ نوکس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اب بھی وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

جب وہ اس پرانے فارم ہاؤس سے باہر نکل رہا تھا، جہاں پر نوکس کو قید رکھا گیا تھا اس تو کی نظر ایک نوجوان سپاہی پر پڑی۔ یہ اس پلاٹون سے وابستہ تھا جس میں نوکس شامل رہ چکا تھا۔ دراصل یہ فوجی بطور کلرک کام کر رہا تھا اور پیٹرک کی اس سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔

''کیسے ہو جوان؟'' کیپٹن نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

''بالکل ٹھیک سر!'' پیٹرک کی بات سنتے ہی کاغذوں کے پلندے میں کھویا ہوا سپاہی ایک دم الرٹ ہو گیا اور فوراً سیلیوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ لانس کارپورل نوکس کی آخری پوسٹنگ کس محاذ پر تھی؟'' پیٹرک نے سوال کیا۔

''یس سر! اس کے لیے مجھے ریکارڈ بھی چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے علم ہے۔ وہ انفنٹری کے ساتھ اسی محاذ پر مصروفِ جنگ تھے۔'' کلرک نے مستعدی سے جواب دیا۔

''شکریہ۔'' پیٹرک آگے بڑھ گیا۔

کیپٹن پیٹرک کا فیلڈ اسپتال اور نوکس کا قید خانہ جہاں واقع تھا وہ جگہ محاذِ جنگ کے بہت قریب تھی۔ وہ باہر نکلا اور کھلے علاقے میں پہنچ کر مشرق کی طرف رخ کر کے دیکھنے لگا۔ اسے ہمیشہ کی طرح اس سمت سے متواتر دھماکوں اور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ گزشتہ چھ ہفتوں سے یہاں موجود تھا۔ اگرچہ اس دوران جنگ کی شدت میں کسی حد تک کمی آ چکی تھی لیکن اب بھی کوئی رات ایسی نہیں جاتی تھی جب شب خون میں مارے گئے اور زخمی ہونے والے جوانوں کو یہاں واقع فیلڈ اسپتال

اناڑی کانٹے

انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اردو بولنے میں ہے۔ جس طرح ایک نوآموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں، اسی طرح ہمارا انگریزی ''مٹر گوشت'' بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا۔ ادھر ہاتھوں سے کھانا خلافِ شان تھا۔ لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا، لہٰذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جائے، تو اردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا، ہم آنکھ بچا کر انگلیوں سے ہی بوٹی اچک لیتے۔ گویا انگریزی کھانا اردو میں کھا لیتے۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے جو ٹفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اتارتے ہی نہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لیے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے، ادھر نکلے! قصہ مختصر، پیشتر اس کے کہ ان مومن مٹروں کو کوئی گزند پہنچتا، بیرے پلیٹیں اٹھا کر چل دیے۔

کرنل محمد خان کی بجنگ آمد سے اقتباس

(جنید رشید......گلستان جوہر، کراچی)

http://digestpk.blogspot.com/

میں نہ پہنچایا جاتا ہو۔

پیٹرک سوچ رہا تھا کہ وہ محاذ پر جائے اور نوکس کے ساتھیوں سے ملاقات کر کے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ آخر اس دن ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے نوکس اتنا بڑا جرم کر بیٹھا۔ پیٹرک واقعے سے چند روز، چند گھنٹے یا چند منٹ پیشتر تک کے تمام حالات کو جان لینے کا خواہش مند تھا... تاکہ اس بنیاد پر وہ نوکس کے بارے میں حتمی رپورٹ کو منصفانہ طور پر تیار کر سکے مگر یہ ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔

یہ دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت تک پیٹرک فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ ہر حال میں محاذِ جنگ پر جا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی اثنا میں اسے ایک شخص نظر آیا۔ یہ میڈیکل کور کا سپاہی ویلڈین تھا۔ اس نے ہاتھوں میں فیلڈ اسٹریچر اٹھایا ہوا تھا۔

''محاذ پر جا رہے ہو جوان؟'' پیٹرک نے فوجی لب و لہجے میں اسے پکارا۔

''یس سر!''

''کب تک واپس لوٹو گے؟''

''تھوڑی دیر لگے گی۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ''میں محاذِ جنگ پر خندقوں کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔'' اگرچہ اس کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن پیٹرک نے پھر بھی سپاہی کی دلی تسلی کے لیے وضاحت کی تاکہ اسے کوئی شک نہ ہو کہ ڈاکٹر کا اگلے مورچے پر کیا کام ہے؟

''میں آپ کو وہاں لیے چلتا ہوں۔'' سپاہی نے جواب دیا۔ ''آپ کچھ دیر ٹھہریے۔ میں ایمبولینس لے آؤں۔''

تھوڑی دیر میں ویلڈین ایمبولینس لے کر آ گیا اور وہ محاذ کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر بعد پیٹرک محاذ سے پیچھے کھودی گئی ان تین خندقوں کے پاس موجود تھا جو فرانس کے مضافات میں کھلے ہوئے اس محاذِ جنگ پر ریزرو کے طور پر کھودی گئی تھیں۔

یہاں کافی کیچڑ تھی۔ ویلڈین، پیٹرک اور ایمبولینس ڈرائیور نے ربڑ کے بنے ہوئے ٹخنوں تک لمبے جوتے پہنے ہوئے تھے، اس وجہ سے انہیں اس کیچڑ کو عبور کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

''لگتا ہے رات یہاں خوب بارش ہوئی ہے۔'' پیٹرک نے اِردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ابھی تک پانی آہستہ آہستہ بہتا ہوا نشیب میں جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''جی سر! یہاں تو صورتِ حال پھر بھی کافی بہتر ہے۔ وہاں آگے تو کئی خندقوں میں پانی بھر گیا ہے۔'' ویلڈین نے جواب دیا۔ ''اب تو وہ خندقیں تالاب دکھائی دے رہی ہیں۔''

وہ لوگ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے خندق میں داخل ہو گئے۔ یہ خندقیں اس طرح کھودی گئی تھیں کہ ہر خندق سرنگ کے ذریعے دوسری خندق سے ملی ہوئی تھی۔ دراصل یہ خندقیں فرانس کی سرزمین کے تحفظ کے لیے دفاعی محاذ کے طور پر قائم کی گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں پیٹرک، ویلڈین کی ہمراہی میں اگلے مورچوں تک پہنچ گیا۔

اسے ہر طرف تھکے ماندہ جسموں اور پژمردہ چہرے والے فوجی نظر آ رہے تھے جن کی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ 'ایک جسم... جس کی رگوں میں لہو دوڑتا ہے، ہاتھ میں بندوق ہے جو اپنے ہی جیسے دوسرے باوردی شخص کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کا منتظر ہے۔ مرنے اور مارنے کے علاوہ ان انسانوں کے پاس زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں... تو ایسے میں زندگی کی رعنائیاں ان آنکھوں میں کیسے رقص کر سکتی ہیں؟' کیپٹن پیٹرک اپنے دل میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب تک وہ اپنی سوچ کو فوجی نکتۂ نظر کے مطابق نہیں ڈھال سکا تھا۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ حال ہی میں میڈیکل گریجویشن کر کے فارغ ہوا تھا۔ ابھی پریکٹس شروع ہی کی تھی کہ جنگی حالات کے باعث جبری بھرتی کا شکار ہوا اور فرانس کی فوج میں شامل کر کے محاذِ جنگ پر بطور میڈیکل افسر بھیج دیا گیا... اس لیے اب تک وہ عام آدمی کی طرح ہی سوچتا تھا۔ وہ عام آدمی جسے جنگ نے تباہی، موت اور بے گھری کے سوا کچھ اور نہیں بخشا تھا۔

''لیجیے سر! ہم اگلے مورچے پر پہنچ گئے۔'' ویلڈین نے ایک جگہ رکتے ہوئے کہا۔ ''خیال رکھیے گا، کسی بھی وقت جرمن یا برطانوی بمبار طیارے حملہ کر سکتے ہیں۔''

''بہت بہتر۔'' کیپٹن پیٹرک نے مختصر سا جواب دیا۔ جن حالات میں وہ فوج میں بھرتی کیا گیا تھا، وہ ایسے نہیں تھے کہ اس کی بھرپور تربیت ہو پاتی۔ ویسے بھی میڈیکل کور کو حالات کے پیشِ نظر جو تربیت دی گئی تھی، وہ توپ خانے کے سپاہیوں کی تربیت کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھی۔ ویلڈین تجربہ کار فوجی تھا اور یہ بات جانتا تھا کہ محاذِ جنگ پر کیا کچھ ہو سکتا ہے... اس لیے اس نے پیٹرک کو ازخود حفاظتی اقدامات کی تاکید کی تھی۔

اچانک آسمان پر ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں بمباری شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں پیٹرک تیزی سے گردن جھکاتا ہوا ایک خندق میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد دھماکوں اور گولیاں چلنے کی آوازیں رک گئیں۔ پیٹرک جس خندق میں موجود تھا، اس میں صرف دو سپاہی اور ایک افسر تھا۔ گولہ باری تھمی تو اس فوجی افسر نے سگریٹ نکالی اور اسے بھی پیش کی۔

''میرا نام کیپٹن پیٹرک ہے۔'' اس نے سگریٹ پیش کرنے والے افسر سے تعارف کرواتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

''میں سارجنٹ فنلے ہوں۔''

''میں نوکس کا طبی اور نفسیاتی تجزیہ کر رہا ہوں۔ تم نوکس کو جانتے ہو؟'' پیٹرک نے سارجنٹ سے پوچھا۔

''جی ہاں... میں نوکس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس کے لہجے سے سردمہری ظاہر ہو رہی تھی۔

''کیا تم وہی سارجنٹ ہو جس کی کمانڈ میں نوکس ڈیوٹی کر رہا تھا؟'' پیٹرک نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''مجھے نوکس کے بارے میں تم سے بات کرنی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ وقت گفتگو کے لیے مناسب نہیں ہے۔'' پیٹرک نے اِردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر... ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

اسی دوران میں خندق کے باہر گولہ پھٹنے کی آواز گونجی۔ یہ خندق سے کافی دور گرا تھا لیکن پھر بھی پیٹرک پریشان ہو گیا۔

''ویسے محاذِ جنگ پر مجھے ایسا سوال کرنا تو نہیں چاہیے مگر مجبوری ہے۔ یہاں کوئی دوسری ایسی جگہ ہے جہاں ہم کچھ دیر سکون سے بیٹھ کر بات چیت کر سکیں؟'' پیٹرک نے سارجنٹ سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے ایسی جگہ جو زیادہ محفوظ ہو۔''

''جی ہاں...'' سارجنٹ فنلے نے جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میرے پیچھے پیچھے آئیے۔''

وہ سارجنٹ کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا خندق سے باہر آیا۔ میدان میں کچھ آگے چل کر وہ ایک اور خندق میں اترنے لگے۔ اسے خندق کے بجائے گڑھا کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ گڑھا اتنا گہرا اور بڑا تھا کہ بیک وقت درجن بھر آدمی اس میں بہ آسانی سما سکتے تھے۔ اس کی چھت پلائی وڈ شیٹ ڈال کر بنائی گئی تھی جس پر جھاڑ جھنکاڑ بکھیر کر اسے بمبار طیاروں کی نظر میں آنے سے بچانے کے لیے کیموفلاج کر دیا گیا تھا۔

اندر دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سارجنٹ نے کرسیاں گھسیٹیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے مدِ مقابل بیٹھ گئے۔

''سارجنٹ... کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس دن نوکس کے ساتھ کیا کچھ ہوا تھا؟'' کیپٹن پیٹرک نے فوراً کام کی بات شروع کر دی۔

''مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں کورٹ مارشل کے دوران کرنل اور میجر کو بتا چکا ہوں۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''اس کے باوجود آپ وہ سب کچھ میری زبانی سننا چاہتے ہیں تو بتا دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سارجنٹ خاموش ہوا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

''اس دن میں نے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ پہاڑی پر چڑھ کر پوزیشن سنبھالیں لیکن نوکس نے ایسا کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ نہ تو خود اوپر جائے گا، نہ ہی اپنے ماتحت جوانوں کو اوپر جانے دے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کام خود کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ کارپورل ڈیلے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے مشتعل ہو کر اسے گولی مار دی۔'' پیٹرک کے لیے یہ کوئی انکشاف نہیں تھا۔ وہ کورٹ مارشل فائل میں یہ بات پڑھ چکا تھا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ جب تم نے پلاٹون کو اوپر جانے کا حکم دیا تو اس وقت نوکس نے کیا کہا تھا؟'' پیٹرک نے سوال کیا۔

''دوسری طرف جرمن موجود تھے اور وہ زمین 'نومینز لینڈ' تھی۔ اس کے باوجود جرمنوں نے ہم پر حملہ کیا اور ہمارے بے شمار جوان مار دیے۔ جب میں نے جوانوں کو اوپر جانے کا حکم دیا تو نوکس نے کارپورل ڈیلے سے کہا کہ وہ نومینز لینڈ پر حملہ کرنے کے لیے نہیں جائے گا۔ جرمن ہم سے زیادہ بہتر اسلحہ رکھتے ہیں۔ وہ ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان پر حملہ کرنے کے بجائے خندقوں میں بیٹھ کر انہیں آگے بڑھنے سے روکا جائے۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ جب میں اوپر پہنچ کر پوزیشن لے کر جرمنوں پر حملہ کرنا چاہتا تھا تو وہ ایسا کرنے سے کیوں انکار کر رہا تھا؟'' سارجنٹ نے کہا۔

''جب نوکس نے تمہارا حکم ماننے سے انکار کیا تو اس وقت تم کہاں تھے؟'' پیٹرک نے سوال کیا۔

''جب نوکس اوپر جانے سے انکار کر رہا تھا، اس وقت میں خندق میں اپنے آپریشن روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب مجھے علم ہوا کہ نوکس اوپر جانے سے انکار کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے اب تک کوئی بھی جوان اوپر نہیں گیا تو یہ سن کر میں خندق سے نکلا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سارے جوان وہیں جمع تھے اور ڈیلے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

http://digestpk.blogspot.com/

''جب تم جوانوں کے قریب پہنچے تو کیا اس وقت بھی نوکس اوپر نہ جانے کے حوالے سے اپنی دلیلیں پیش کررہا تھا؟''

''جی ہاں۔ جب وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ نوکس کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی اوپر جانے سے ہچکچا رہے ہیں تو میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنا اسلحہ پھینک دے لیکن اسی دوران اس نے بندوق سیدھی کی اور مجھے نشانہ بنانے لگا لیکن کارپورل بیچ میں آگیا۔ دراصل وہ نوکس پر جھپٹ کر مجھے بچانا چاہتا تھا لیکن چُوک ہوگئی اور وہ بے چارہ اپنی جان سے گیا۔'' سارجنٹ نے تفصیل سے اپنے تئیں پورا واقعہ کیپٹن پیٹرک کے گوش گزار کیا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ اس دن سے پہلے کبھی تم نے یہ محسوس کیا کہ نوکس کے اعصاب بے سکون ہورہے ہیں یا وہ پریشان ہے؟''

''نہیں سر! ایسا تو کبھی محسوس نہیں کیا۔ البتہ جب سے وہ اسپتال سے لوٹا تھا، اس کے بعد سے وہ کچھ بیزار سا اور ست لگنے لگا تھا۔''

''کیا میں اس کے ماتحت جنگ لڑنے والے جوانوں سے مل سکتا ہوں؟'' کیپٹن پیٹرک نے پوچھا۔

''یہ ناممکن ہے؟''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ سب میرا حکم مانتے ہوئے پہاڑی پر چڑھے مگر اس سے پہلے کہ پوزیشن لے پاتے، جرمنوں نے حملہ کردیا۔ زیادہ تر مارے گئے اور ایک دو جو بچے تھے، وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال بھجوا دیے گئے۔ اب ان میں سے ایک شخص بھی یہاں موجود نہیں ہے۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔ ''ویسے اگر نوکس میرا حکم مان لیتا تو شاید اسے زندہ رہنے کا ایک چانس تو مل ہی جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جرمنوں کے حملے میں زندہ بچ کر اس وقت ہمارے درمیان بیٹھا ہوتا مگر اب تو موت ہی اس کا مقدر ہے۔'' سارجنٹ نے ہلکی سے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

''جو اوپر گئے اور مارے گئے، انہیں تو نوکس نے بچانے کی کوشش کی تھی؟'' پیٹرک نے سوال کیا۔

''نہیں... یہ غلط ہے۔ نوکس کی کج بحثی نے ہی ان سب کی جان لی ہے۔'' سارجنٹ نے نوکس پر الزام عائد کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے توپ خانے سے گولہ باری کرکے پہاڑی کے پار جرمن سپاہیوں کو منتشر کردیا تھا۔ ایسے میں اگر جوانوں کو نوکس اپنی بحث میں نہ الجھالیتا تو وہ اوپر پہنچ کر بہ آسانی جرمنوں پر قابو پاسکتے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ ہمیں نوکس کی وجہ سے اوپر پہنچنے میں تاخیر ہوئی جس کی وجہ سے انہیں خود کو دوبارہ آرگنائز کرنے کا موقع مل گیا۔ یوں جب ہمارے جوان اوپر پہنچے تو جرمنوں نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے جوانوں کو جان بوجھ کر بحث میں الجھایا تھا۔''

''بہت خطرناک بات کہی ہے تم نے اپنے آخری جملے میں۔ اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ تم اس پر غداری کا الزام عائد کررہے ہو۔ ویسے یہ بات تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟'' پیٹرک نے پوچھا۔

''گرفتار کیے جانے کے دوسرے دن میں اس سے ملا تھا، اس کوٹھری میں جہاں اسے رکھا گیا ہے۔ اس دن پیش آنے والا سارا واقعہ میں نے اسے سنایا۔ وہ سب کچھ چپ چاپ سنتا رہا اور ایک لفظ بھی نہیں بولا لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہہ رہا ہو، میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔''

''تمہاری بات سن کر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر کیا تھا؟''

''نہیں... مگر وہ میری بات سن رہا تھا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' پیٹرک نے پوچھا۔

''اس لیے کہ جب میں بول رہا تھا تو اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر جمائی ہوئی تھیں۔''

''شکریہ سارجنٹ... تم سے بڑی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں۔'' کیپٹن پیٹرک کچھ دیر خاموش رہا اور کچھ سوچتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس کو کھڑا ہوتا دیکھ کر سارجنٹ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پیٹرک خندق سے باہر نکلنے لگا۔ اس کے پیچھے سارجنٹ چل رہا تھا۔

''سر! آپ جانتے ہیں نوکس کو سزائے موت دینے کے لیے جو فائرنگ اسکواڈ بنایا جائے گا، اس میں خود کو شامل کرنے کی درخواست کی ہے میں نے۔'' خندق سے باہر نکل کر سارجنٹ فنلے نے مسکرا کر پیٹرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس غدار کو گولی مارنے میں خوشی محسوس کروں گا۔''

کیپٹن پیٹرک جب محاذ سے واپس فیلڈ اسپتال پہنچا تو سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ سیدھا ان خیموں کی طرف بڑھا جہاں ایسے فوجیوں کو رکھا گیا تھا جن کے جسم کا کوئی عضو جنگ میں ضائع ہوچکا تھا۔ آپریشن کے بعد انہیں الگ الگ خیموں میں رکھا گیا تھا تاکہ صحت یاب ہونے پر انہیں گھروں کو بھیجا جاسکے۔

وہ ریکارڈ روم میں گیا اور یہاں موجود زخمی فوجیوں کا ریکارڈ دیکھنے لگا۔ صرف ایک فوجی ایسا تھا جو چھ دن قبل یہاں لایا گیا تھا۔ اس کی ٹانگ جرمن حملے میں بری طرح زخمی ہوئی

تھی جسے گھٹنے سے اوپر تک کاٹ دیا گیا تھا۔ اب اس کی صحت یابی کا انتظار تھا تاکہ اسے گھر واپس بھیجا جاسکے۔ اس فوجی کا نام جارج تھا اور وہ لانس کارپورل نوکس کی ماتحتی میں لڑ رہا تھا۔ یہ پہاڑی کے اوپر اس جرمن حملے میں زخمی ہوا تھا جس کی وجہ سے اب نوکس کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کیے جانے کا انتظار تھا۔

جب پیٹرک اس فوجی کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ سو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پین کلر اور نشہ آور انجکشن کے زیرِ اثر حالتِ نیند میں تھا۔ پیٹرک جارج کو بیدار کرکے بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ رات ہونے والی ہے۔ اندھیرا چھاتے ہی محاذِ جنگ سے زخمیوں کی آمد شروع ہوجائے گی۔ اس لیے اس کے پاس بہت تھوڑا وقت باقی بچا تھا۔ ایسے میں پیٹرک کے پاس جارج کو نیند سے جگانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

جارج اس کے بیڈ کے پاس پہنچا اور اسٹول کھینچ کر سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ ''جارج... جارج! جاگو... اب جاگ بھی جاؤ۔'' پیٹرک اتنی آہستگی سے کہہ رہا تھا کہ کہیں وہ ہڑبڑا کر اٹھ نہ بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ جارج نے آنکھیں کھولیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گہری نیند سے بیدار ہورہا ہے۔

''کیسے ہو جارج؟'' پیٹرک نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر پوچھا۔

''پہلے سے کچھ بہتر محسوس کررہا ہوں۔'' جارج نے خمار آلود لہجے میں کہا۔

''گڈ! تم جلد ہی ٹھیک ہوکر اپنے گھر چلے جاؤ گے۔'' جارج یہ سن کر مسکرا دیا۔ کیپٹن پیٹرک کچھ دیر تک اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ جب اسے لگا کہ اب جارج پوری طرح بیدار ہوچکا ہے تو اس نے سوال کیا۔

''تم نوکس کے ساتھ ہی محاذ پر تھے نا؟''

''جی ہاں۔''

''جانتے ہو نوکس کا کورٹ مارشل ہوچکا ہے؟''

''اچھا۔'' اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ''لیکن کیوں؟ کیا سزا دی گئی ہے اسے اور کس جرم میں؟'' یہ سنتے ہی اس نے فوراً بے ترتیب سوال کر ڈالے۔

''فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے موت اور وہ بھی کارپورل ڈیلے کے قتل کے جرم میں۔'' کیپٹن پیٹرک نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اوہ میرے خدا... یہ کیا غضب ہوگیا۔'' جارج بدستور صدمے میں دکھائی دے رہا تھا۔

''ویسے وہ اپنے اعصاب کھو بیٹھا تھا اس دن۔'' پیٹرک نے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کا ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔ پیٹرک کو اندازہ ہوگیا تھا کہ جارج اس واقعے کے بارے میں پوری سچائی جانتا ہے۔ یہ رائے اس نے نوکس کی سزا کی بات سن کر جارج کے چہرے پر آنے والے تاثرات کی بنیاد پر قائم کی تھی۔

''نہیں سر... وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اگر بروقت آرڈر ملتے تو وہ یقیناً پوزیشن کے لیے پیش قدمی کرتا۔'' جارج نے بے چینی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' پیٹرک نے یہ سن کر سوال کیا۔ اس کے لیے جارج کے یہ الفاظ اہم ترین انکشاف تھے۔

''اصل میں منصوبے کے تحت توپ خانے کی گولہ باری کے فوراً بعد ہمیں پیش قدمی کرنا تھی لیکن سارجنٹ فنلے نے تاخیر سے حکم بھیجا۔ اس وقت تک کافی دیر ہوچکی تھی۔ تب نوکس نے کہا تھا کہ اب پیش قدمی کرنا خودکشی ہوگا۔ بس اس

حسرت آنسو

تاج محمد آنسو اپنے دوستوں کو بتا رہے تھے۔

''واہ واہ، سوئٹزر لینڈ کی کیا بات ہے۔ وہاں کے باشندے بڑے مہمان نواز، ہمدرد اور مخلص ہوتے ہیں۔ تعارف کے بغیر وہ سڑکوں ہی پر غیر ملکیوں سے گفتگو کرنے لگتے ہیں اور بار بار پوچھتے ہیں کہ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ وہاں ایک دن بھی ایسا نہیں جاتا جب تمہیں کھانے اور فلم دیکھنے کی دعوت نہ دی جائے۔ کھانے اور فلم کے بعد تمہارا اس روز کا میزبان تمہیں اپنے گھر لے جائے گا۔ اور اپنے ہاں آرام کرنے کی درخواست کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سوئٹزر لینڈ میں تمہیں اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑتا۔''

دوستوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہمیں پتا بھی نہیں چلا اور تم چپکے ہی چپکے سوئٹزر لینڈ ہو آئے، کب گئے تھے یار؟''

''میں نہیں گیا تھا۔'' تاج محمد آنسو نے بتایا۔ ''میری سالی اسی ہفتے وہاں سے آئی ہے۔''

اسلام آباد سے کاشان عباس کا تعاون

http://digestpk.blogspot.com/

کے بعد اس نے اپنے ماتحت جوانوں کو اوپر جانے سے روک دیا۔ اسی دوران ڈیلے بھی آگیا۔ وہ بے چارہ تو مفت میں مارا گیا۔"

"تو تمہیں لگتا ہے کہ آرڈر تاخیر سے ملے ورنہ وہ پیش قدمی کرنے سے نہیں ہچکچاتا؟" پیٹرک نے وضاحتی انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تو پھر اس نے مشتعل ہو کر کارپورل کو کیوں مارا؟"

"ڈیلے کو اس نے نہیں مارا۔ اوپر پہاڑی پر ایک جرمن فوجی پیش قدمی کرتے ہوئے پہنچ چکا تھا۔ گولی اس نے چلائی تھی جو کارپورل کو لگی۔ نوکس کی جوابی فائرنگ سے جرمن سپاہی بھی مارا گیا مگر اس کے ساتھی لاش اٹھا کر واپس اپنے مورچے کی طرف بھاگ گئے۔"

"تو جس وقت ڈیلے مارا گیا، اس وقت سارجنٹ وہاں نہیں تھا؟"

"نہیں... وہ تو لگ بھگ آدھ گھنٹے کے بعد وہاں پہنچا تھا۔" جارج جو حقیقت بیان کر رہا تھا، وہ تو سارجنٹ کے بیان سے بالکل ہی الٹ تھی۔

"تو اس نے نوکس پر یہ الزام کیوں لگایا کہ وہ اسے گولی مارنا چاہتا تھا؟"

"اس لیے کہ وہ نوکس سے شدید نفرت کرتا ہے۔" جارج نے بتایا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ نوکس کا دادا اور دادی نسلاً جرمن عیسائی تھے جبکہ سارجنٹ فنلے یہودی ہے۔ اس لیے اسے ہٹلر کی جرمن فوج ہی نہیں بلکہ پوری جرمن قوم سے نفرت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جرمن قوم کرۂ ارض پر یہودیوں کی بدترین دشمن ہے۔ میں خود بھی یہودی ہوں۔ اس ناتے وہ کئی بار میرے سامنے اس بات کا اظہار کر چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے ہمیشہ اس کے ان خیالات سے بیزاری ہی رہی ہے۔ ویسے نوکس پکا فرنچ قوم پرست ہے۔ وہ فرانس کی سرزمین کو اپنی ماں کہتا ہے۔ اس سے تو کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ اس کے سامنے کوئی فرانس کو برا بھلا کہے اور وہ چپ چاپ سُن لے۔"

جارج کی باتوں نے تو ایک اور ہی کہانی بیان کر دی تھی۔ جارج کی باتیں سن کر یہ کیس دوسری ہی نوعیت کا معلوم ہو رہا تھا۔ پیٹرک جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، وہ جان چکا تھا۔ اس کے بعد وہ زخمی جارج کے ساتھ وقت گزاری کے لیے کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

دوسرے دن وہ ایک بار پھر نوکس کے معائنے کے لیے اس کی کوٹھری میں گیا لیکن اس کی حالت بدستور پہلے جیسی ہی تھی۔ گم صم کھلی آنکھوں سے بیٹھا ہوا وہ چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ پیٹرک ایک گھنٹے تک اس کے پاس بیٹھا رہا اور بات کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

نوکس کے معائنے سے واپسی کے بعد کیپٹن پیٹرک اپنے دفتر میں پہنچا اور اپنی رپورٹ لکھنا شروع کی۔

"اس وقت جبکہ یہ رپورٹ لکھی جا رہی ہے، نوکس بدستور سکتے کی کیفیت میں ہے۔ اگرچہ یہ بات تو طے ہے کہ جس وقت مبینہ طور پر کارپورل ڈیلے کے قتل کا حادثہ پیش آیا، اس وقت وہ ذہنی طور صحت مند تھا، تاہم اس کے بعد اس پر جو کیفیت طاری ہوئی، وہ بدستور بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ بطور ماہرِ نفسیات اور طبی معالج میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لانس کارپورل پر جس قتل کا الزام لگا ہے، ہوسکتا ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوا ہو۔ اس لیے جب اسے اس جرم میں گرفتار کیا گیا اور کورٹ مارشل کے لیے پیش کیا گیا۔ نیز، اس مبینہ جرم میں اسے سزا بھی دے دی گئی.... جس نے ہوسکتا ہے اسے شدید ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا ہے۔ اس لیے وہ مکمل طور پر اپنے حواس کھو بیٹھا۔ میری گزارش ہے کہ اس واقعے کی مزید گہرائی سے تفتیش کی جائے۔ اگر پھر بھی جرم درست ثابت ہو تو کورٹ مارشل کے فیصلے کو برقرار رکھا جائے ورنہ اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔ تاکہ ایک شاندار فوجی سروس کا ریکارڈ رکھنے والے سپاہی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔"

اس دن دوپہر کو کیپٹن پیٹرک نے اپنی رپورٹ کرنل براؤننگ کے پاس نوکس کی فائل کے ہمراہ بھجوادی۔ اگرچہ نوکس کو سزائے موت دی جا چکی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ اب اعلیٰ فوجی حکام فائل میں اس رپورٹ کی موجودگی کے باعث سزا کی توثیق کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔

پیٹرک کا خیال درست تھا۔ جب نوکس کی سزا پر عمل درآمد کے لیے فائل توثیق کے لیے ملٹری ہیڈ کوارٹر کو بھجوائی گئی تو اعلیٰ افسران نے توثیق سے انکار کر کے ازسرِ نو تفتیش کا حکم دیا۔ تفتیش کے لیے ایک بریگیڈیئر اور دو کرنل پر مشتمل تین رکنی کمیٹی قائم کی گئی۔ کیپٹن پیٹرک کی رپورٹ کے جمع کروائے جانے کے صرف چند روز کے اندر اندر ہی واقعے کی ازسرِ نو تفتیش کا آغاز ہو گیا۔

تفتیشی ٹیم کے سربراہ بریگیڈیئر ڈگلس نے کیپٹن پیٹرک کو بھی بیان کے لیے بلایا۔ اس حوالے سے جو تفتیش ازخود کیپٹن نے کی تھی، اس نے نہ صرف ٹیم کو اس بارے میں بتایا

بلکہ جارج کے انکشافات سے بھی آگاہ کر دیا۔ جارج اب تک فیلڈ اسپتال میں ہی زیرِ علاج تھا۔ نوکس اور سارجنٹ فنلے کے بعد وہ تیسرا زندہ شخص تھا جو اس واقعے کے بارے میں تمام تر سچائی جانتا تھا۔ تفتیشی ٹیم نے کیپٹن پیٹرک کے بیان کی روشنی میں جارج سے بھی تفصیلی بیان لیا۔ پیٹرک کو یقین تھا کہ جارج کا بیان اس پورے کیس کی نوعیت ہی بدل کے رکھ دے گا۔ نوکس کورٹ مارشل کیس کی ازسرِ نو تفتیش کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔

"سر!" ہفتہ بھر بعد کرنل براؤننگ نے کیپٹن پیٹرک کو طلب کیا۔ وہ کرنل کے کمرے میں پہنچا اور سیلیوٹ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"تین دن بعد نوکس اور سارجنٹ فنلے کو فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے سزائے موت دی جائے گی۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ کل سے صبح و شام، دونوں مجرموں کا طبی معائنہ کر کے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ اس فائل میں لگاؤ گے۔"

"بہت بہتر سر! کیا میں اب جا سکتا ہوں؟"

"تم یہ نہیں پوچھو گے کہ سارجنٹ کو کب گرفتار کیا گیا؟" کرنل کا مزاج آج خاصا خوش گوار لگ رہا تھا۔

"آپ بتانا چاہیں تو ضرور بتایئے۔" کیپٹن پیٹرک نے کہا تو کرنل نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ویسے تو میں نے ہی نوکس کو سزا سنائی تھی لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم نے حقائق کو سامنے لانے میں ہماری مدد کی۔" کرنل براؤننگ نے کہنا شروع کیا۔ "ہیڈ کوارٹر کی تحقیقاتی ٹیم نے جب اس کیس کی ازسرِ نو تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ سارجنٹ فنلے نسل پرست تھا اور اسی بنا پر وہ نوکس سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر نوکس کو پھنسانے کے لیے سازش تیار کی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے جرمن مورچے پر بمباری کے بعد زمینی دستے کو پیش قدمی کا حکم دینے میں تاخیر کی جس کی وجہ سے کارپورل ڈیلے کی جان گئی۔ نوکس موت کے سامنے پہنچا اور متعدد جوان یا تو اپنی زندگی سے محروم ہوئے یا اپنے اعضا کھو بیٹھے۔ اس لیے تفتیشی ٹیم نے سارجنٹ کو قصوروار پایا۔ اسے گرفتار کر کے کورٹ مارشل کیا گیا۔ اب اسے سزائے موت دی جانے والی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر نوکس تو بے قصور ثابت ہوا... پھر اس کی سزا کیوں برقرار رکھی گئی؟" پیٹرک نے سوال کیا۔

"اس نے اپنے کمانڈر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ فوج میں کمانڈر کا حکم ماننے سے انکار بغاوت ہے۔ نوکس کا جرم ثابت ہو گیا کہ وہ حکم عدولی کر کے بغاوت کا مرتکب ہوا ہے اور بغاوت کی سزا صرف موت ہے۔" کرنل نے تفصیل سے اسے بتایا۔

دوسرے دن پیٹرک نوکس کے معائنے کے لیے اس کے کمرے میں گیا۔ وہ بدستور سکتے کی سی کیفیت کا شکار تھا مگر آج وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور کافی نحیف دکھائی دے رہا تھا۔

حسبِ سابق پیٹرک نے سب سے پہلے اس کا طبی معائنہ کیا۔ نوکس کی نبض بہت ہلکی چل رہی تھی۔ آج پیٹرک نے نوکس کے اعصاب کو جانچنے کے لیے ایک نیا طریقہ سوچا تھا۔

وہ نوکس کے بستر کے قریب اسٹول رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نوکس کے الٹے ہاتھ کی کلائی کو تھاما اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ دھیمے لہجے میں اس کی گرفتاری کے بعد سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات تسلسل سے اسے سنا رہا تھا۔ جب وہ سارجنٹ فنلے کی گرفتاری، اس کو دی گئی سزائے موت اور تین دن بعد اس پر عمل درآمد کی بات بتانے لگا تو اس نے محسوس کیا کہ نوکس کی نبض ایک دم تیز ہو گئی ہے۔ ورنہ جب وہ یہ بتا رہا تھا کہ تیسرے دن اسے سزائے موت دے دی جائے گی، تب بھی اس کی نبض پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پیٹرک ماہرِ نفسیات بھی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ نوکس کو اپنی موت پر کوئی افسوس نہیں ہے لیکن اسے اس بات پر خوشی محسوس ہوئی ہے کہ جو مجرم ہے، وہ اپنی سزا کو پہنچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر

وجۂ شہرت

اسکاٹ لینڈ کے باشندے اپنی کنجوسی کے باعث بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی ذہن میں ان کی یہی "چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے" والی صفت گھومنے لگتی ہے... کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسکاٹ، کچھ خرچ کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں تین اسکاٹ ایک اتوار کو چرچ میں گئے۔ جب چندے کی پلیٹ سامنے آئی تو ایک اسکاٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"برے پھنسے۔" اور فوراً بے ہوش ہو گیا۔

اور اس کے باقی دونوں ساتھی اسے جلدی سے اٹھا کر طبی امداد کے لیے باہر لے گئے۔

مرسلہ: محمد امین، کوئٹہ

http://digestpk.blogspot.com/

بعد اس نے محسوس کیا کہ نوکس نے پلکیں جھپکائی ہیں۔ اس نے کچھ دیر بعد اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو بھی حرکت دی۔

کوئی گھنٹا بھر بعد نوکس وہاں سے اٹھ آیا۔ آج پہلی بار اس نے نوکس کی حالت میں کوئی تبدیلی محسوس کی تھی۔ ورنہ اب تک وہ صرف زندہ لاش کی طرح ہی دکھائی دیتا تھا۔

نوکس کے بعد پیٹرک راہداری کے سرے پر بنے اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سارجنٹ فنلے کو رکھا گیا تھا۔

''ہیلو سارجنٹ... کیسے ہو؟'' کمرے میں داخل ہو کر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے پژمردہ لہجے میں جواب دیا۔ سارجنٹ گم صم بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ لگتا تھا کہ وہ مہینوں سے بیمار پڑا ہوا ہے۔ کافی دیر تک وہ اس کا معائنہ کرتا رہا مگر اس نے محسوس کیا کہ اس پر بے انتہا نقاہت طاری ہے۔ شاید یہ موت کا خوف اور اس جھوٹ کی سزا تھی جس کے ذریعے اس نے نہ صرف نوکس کو موت کی دہلیز تک پہنچایا تھا بلکہ کئی اور بے گناہوں کی موت کا بھی سبب بنا تھا۔

اگلے روز پیٹرک دوبارہ نوکس کے معائنے کے لیے پہنچا۔ گو کہ آج بھی وہ بدستور خاموش تھا لیکن اس کا چہرہ پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی پیٹرک وہاں سے اٹھ کر سارجنٹ کی کوٹھری میں چلا آیا۔ سارجنٹ کی حالت تو کل سے بھی بدتر تھی۔ پیٹرک کو چند روز پیشتر کا وہ سارجنٹ فنلے یاد آ گیا جو اپنے ہاتھوں سے نوکس کو گولیاں مارنے کے لیے خدمات پیش کر رہا تھا اور اب ایک یہ سارجنٹ فنلے تھا جو موت سے پہلے ہی مرا جا رہا تھا۔

☆☆☆

جس سہ پہر سارجنٹ فنلے اور لانس کارپورل نوکس کی سزائے موت پر عمل درآمد ہونا تھا، اس دن وہ صبح ہی صبح دونوں کے معائنے کے لیے جا پہنچا۔ آج پہلی بار نوکس کی طبیعت بہتر محسوس ہوئی۔ آج اس نے پہلی بار پیٹرک کی طرف دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر پیٹرک کا دل بھر آیا اور اس نے بمشکل تمام اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ نوکس کے سامنے میز پر جوس کا گلاس، دودھ کی بوتل اور ادھ کھایا دلیے کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔

'اس کا مطلب ہے کہ آج اس نے کئی دنوں کے بعد کچھ کھایا پیا ہے۔' پیٹرک نے برتنوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''مجھے افسوس ہے مسٹر نوکس کہ آج کے بعد ہماری ملاقات پھر کبھی یہاں پر نہیں ہوگی۔'' باہر نکلتے ہوئے اس نے نوکس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ یہ سن کر نوکس نے گردن گھمائے بغیر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ پیٹرک کافی دیر تک اس کرسی کی پشت پر کھڑا رہا جس پر نوکس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ کچھ بولے مگر وہ بدستور خاموش رہا۔

دن کے تین بجے ہوں گے جب کیپٹن پیٹرک کو میدان میں پہنچنے کا حکم ملا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو فائرنگ اسکواڈ تیار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں نوکس اور فنلے کو بھی لے آیا گیا۔ نوکس مسکراتا ہوا، بنا سہارے کے اپنے قدموں پر چلتا ہوا آ رہا تھا۔ گو کہ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے لیکن اس چال میں فوجی شان نظر آ رہی تھی۔ اس کے برعکس فنلے کو دو سپاہیوں نے بازوؤں سے پکڑ کر سہارا دیا ہوا تھا۔ وہ ان سپاہیوں کے سہارے گھسٹتا ہوا موت کے اس میدان میں داخل ہو رہا تھا۔

سزا پر عمل درآمد سے کچھ دیر قبل کیپٹن پیٹرک نے دونوں کا طبی معائنہ کیا۔ آج پہلی بار نوکس ہر لحاظ سے چاق و چوبند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں، نبض، سانس اور آنکھوں کی پتلیاں تک... سب ٹھیک ٹھاک کام کر رہی تھیں۔ یہ بات پیٹرک کے لیے حیران کن تھی کہ موت کے سامنے انسان کے اعصاب اتنے پُرسکون کیسے رہ سکتے ہیں؟ دوسری طرف فنلے کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، دل کی دھڑکن بہت کم ہو چکی تھی اور نبض ڈوب رہی تھی۔

''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔'' کیپٹن نے کرنل کے پاس پہنچ کر اپنے آخری طبی معائنے کی زبانی رپورٹ پیش کی۔ ''سزا پر عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔ مجرم پوری طرح ہوش و حواس میں ہیں۔''

اس کے بعد کرنل نے بہ آوازِ بلند اُلٹی گنتی شروع کی۔ جب وہ دو پر پہنچا تو نوکس نے بہ آواز بلند پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''فرانس زندہ باد!'' گرفتاری کے بعد سے یہ وہ پہلے لفظ تھے جو نوکس کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ نوکس کے لہجے میں زندگی کا ولولہ پنہاں محسوس ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ستون سے بندھے فنلے کی گردن موت کے خوف سے پہلے ہی ڈھلکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

اُلٹی گنتی جاری تھی۔

اگلے ہی لمحے کرنل نے کہا صفر... اور پھر اس کے ساتھ ہی سات رائفلوں نے ایک ساتھ گولیاں اُگلنا شروع کر دیں جن کا نشانہ نوکس اور فنلے نہیں بلکہ وطن پرستی اور ذات پرستی کی دو علامتیں تھیں۔

گواہی

بابر نعیم

ہر اتفاقیہ ملاقات خوشگوار ثابت نہیں ہوتی... کبھی کبھی اس کے اثرات بہت دور تک چلے جاتے ہیں... ایک معمولی نکتے سے جرم کے خفیہ گوشوں کو طشت ازبام کرتی پُرتجسس تحریر۔

ایک معمولی سراغ رساں کا معاملۂ زیست... وہ دیرپا شہرت کی خواہش مند تھی

وہ بار کے دروازے پر کھڑا متجسس نظروں سے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے اس کی شخصیت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ ویسے بھی وہ بار اس قابل نہیں تھا کہ وہاں کوئی ڈھنگ کا آدمی آتا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کاؤنٹر کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''مس!''

میں نے دائیں بائیں مڑ کر دیکھا۔ وہ نہ جانے کس کو مس کہہ کر بلا رہا تھا۔ کم از کم میں تو ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جنہیں کوئی مس کہہ کر بلائے۔ مجھے تو کسی نے جوانی میں بھی اس طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس لیے میرا حیران ہونا بجا تھا۔ وہ میری حیرانی کو بھانپ گیا اور بولا۔ ''مس! میں تم سے ہی مخاطب ہوں۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ میرا اصول تھا کہ بار میں کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ خوامخواہ لوگ نشے میں دھت ہو کر گلے پڑ جاتے ہیں۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے حق میں گواہی دے دو کہ واردات کے وقت میں تمہارے ساتھ تھا۔''

وہ اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ مجھ جیسی بوڑھی اور بدصورت عورت اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جائے گی۔

http://digestpk.blogspot.com/

''تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آ گئی... اور یہ بھی بتادو کہ تم کس وقت میرے پاس تھے؟''

''کل سہ پہر۔'' اس نے مختصراً کہا اور میرے مزید قریب ہو گیا۔

گزشتہ روز میں ایک ایسی مہم میں مصروف تھی جس کا چرچا اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو پر بھی ہو چکا تھا۔ کچھ بدمعاشوں نے میئر کی بیٹی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور غلطی سے اس کی سہیلی کو اٹھا لے گئے۔ عین اس وقت میں وہاں پہنچ گئی اور کسی نہ کسی طرح بچی کو ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی گو کہ میں اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے چکی تھی لیکن وہ لوگ خاصی دیر سے پہنچے۔ اس وقت تک میں بچی کو ایک محفوظ مقام تک لے جانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

''تم کل دوپہر کی بات کر رہے ہو نا؟'' میں نے اس لڑکے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میں ایک چھوٹی بچی، چار بدمعاشوں اور دس پولیس والوں کے ساتھ تھی اس لیے تمہارے حق میں گواہی نہیں دے سکتی۔''

اس نے برا سا منہ بنایا اور مایوسی کے انداز میں دوبارہ اپنی سیٹ پر چلا گیا جو بار کے آخری کونے پر تھی۔

بارٹینڈر ہماری باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے بھویں اٹھا کر مجھے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں اس احمق لڑکے کے بارے میں سوچ رہی تھی... اگر اسے میری گواہی کی ضرورت تھی تو وہ گزشتہ روز صبح میں میری خدمات حاصل کر سکتا تھا شاید وہ نہیں جانتا ہو گا کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی زندگی کتنی مصروف ہوتی ہے اور اسے آنے والے کسی بھی لمحے کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا۔

''کیا تم کسی ایسے شخص کا پتا بتا سکتی ہو جو کل دوپہر میرے ساتھ ہونے کی گواہی دے سکے؟'' وہ لڑکا ایک بار پھر میرے قریب آیا اور بولا۔

''نہیں، لیکن تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا بایاں کندھا اچکایا اور آہستہ سے بولا۔ ''کوئی خاص بات نہیں۔ سوائے اس کے کہ کل میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔'' اس نے نہایت اطمینان سے انکشاف کیا۔

ہماری زبان میں اسے اعتراف کہا جاتا ہے۔ مجھے اسی وقت پولیس کو فون کر دینا چاہیے تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ شاید اس لیے کہ مجھے اس لڑکے کی بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ شکل سے شریف نظر نہیں آ رہا تھا اور شاید اس وقت بھی سنجیدہ نہیں تھا لیکن بارٹینڈر کو اس کی باتوں میں سنجیدگی نظر آئی۔ اس نے ہماری گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم نے اپنی بیوی کو کس طرح قتل کیا؟''

''شاٹ گن سے۔'' اس شخص نے بہ بانگِ دہل کہا۔

اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی غیر سنجیدہ ہے لیکن بارٹینڈر نے اس کی بات سنتے ہی 9/11 کو فون کر دیا۔ پولیس نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی اور اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے گئی جبکہ ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ کیا واقعی اس شخص نے اپنی بیوی کو گولی ماری ہے اور اس کی بیوی مر چکی ہے۔ میں اتنا ہی سمجھ سکی کہ یہ بار کیونکہ ایک بہتر علاقہ میں واقع تھا اس لیے پولیس کو یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی جبکہ گزشتہ روز انہوں نے اغوا کنندگان تک پہنچنے میں بیس گنا زیادہ وقت لیا تھا۔

میں نے وہاں بیٹھ کر اس کا مزید آدھ گھنٹے تک انتظار کیا لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس کے معاملے کو صحیح طریقے سے ہینڈل نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے اپنی بیوی کو گولی نہ ماری ہو۔ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہا ہو کہ وہ گزشتہ سہ پہر اپنی بیوی کو تنہا چھوڑ کر گیا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں کسی نے اس کی بیوی کو گولی مار دی اور اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہو۔ نہ جانے میرے دل میں یہ خیال کیوں جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ ہم نے اس کی پوری بات نہیں سنی اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

اس وہم سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں نے اگلے دن بار کا رخ کیا۔ ویسے بھی اس روز میرے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا۔ وہی بارٹینڈر ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''مجھے پہچانتے ہو؟''

اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں نے کہا۔ ''جس شخص کو کل ہم نے پولیس کے حوالے کیا تھا، کیا تم نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا اس نے پولیس کے آنے سے پہلے ڈرنکس کی ادائیگی کر دی تھی؟''

''اس نے ڈرنک کا آرڈر دیتے ہوئے مجھے اپنا کریڈٹ کارڈ دیا تھا۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''تم اس شخص کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو جو موقع واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کے لیے تمہاری گواہی چاہ رہا تھا؟''

میں نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''میں...''

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''جانتا ہوں کہ تم ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہو۔'' اس نے بار میں لگے ہوئے ٹی وی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کل سے تم خبروں میں نظر آ رہی ہو۔''

میرے چہرے کی سرخی مزید گہری ہو گئی۔ میں پبلسٹی کی عادی نہیں تھی اور نہ ہی اسے پسند کرتی تھی اسی لیے میں نے اس لڑکی والے کیس میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی انٹرویو نہیں دوں گی کیونکہ یہ شہرت عارضی ہوتی ہے۔ جیسے ہی لاس اینجلس میں کوئی دوسرا واقعہ رونما ہوا، ٹی وی کے پردے پر اسی کی تفصیلات نظر آئیں گی اور لوگ پرانی باتیں بھول جائیں گے۔

''دراصل کل میں یہاں ایک مؤکل کا انتظار کر رہی تھی جو نہیں آیا پھر جب اس شخص نے مجھ سے گواہی کے لیے کہا تو مجھے خیال آیا کہ یہ بھی میرا کلائنٹ ہو سکتا ہے گو کہ اس نے مجھ سے مناسب طریقے سے بات نہیں کی تھی۔''

''تم ایک ایسے شخص کے لیے کام کرنا چاہتی ہو جس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے کہ میں اس کے لیے گواہی تو نہیں دے سکتی لیکن یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ وہ درحقیقت کیا چاہتا ہے۔''

''کیا تمہیں پچھتاوا ہو رہا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس نے حقیقت میں کیا کیا ہے۔''

''تم ان لوگوں میں سے ہو جو بال کی کھال نکالنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں، تم میرا شمار ان لوگوں میں کر سکتے ہو جو ایسے سوال تلاش کرتے ہیں جن کا جواب ضروری ہوتا ہے۔''

''تم اس کے کریڈٹ کارڈ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کا نام اور فون نمبر معلوم کرنا چاہتی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ ایک منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کریڈٹ کارڈ کی رسید تھی۔ اس نے با آوازِ بلند اس پر لکھا ہوا نام پڑھا۔

''اسٹینلے ڈونن۔''

''یہ تو ہالی ووڈ کے ڈائریکٹر کا نام ہے جس نے پچاس کی دہائی میں فلمیں بنائی تھیں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکا ڈونن کا بیٹا یا کوئی قریبی رشتے دار ہو؟'' بارٹینڈر نے خیال ظاہر کیا۔

''ممکن ہے۔ ڈونن کی آخری فلم 1984ء میں آئی تھی لیکن اس لڑکے کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ اس کا تعلق ہالی ووڈ سے ہو سکتا ہے۔''

''یہ جعلی نام تو نہیں ہو سکتا۔'' بارٹینڈر بولا۔ ''اس کی شناخت ہو چکی ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیونکہ اس کے بغیر کسی کو کریڈٹ کارڈ جاری نہیں ہوتا۔'' اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

☆☆☆

اس شخص نے پولیس اسٹیشن میں بھی اپنا یہی نام بتایا تھا اور جب پولیس اس کے بتائے ہوئے پتے پر گھر پہنچی تو وہاں ایک درمیانی عمر کی خوب صورت لڑکی موجود تھی جس نے بتایا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے شوہر کو ڈراما کرنے کا شوق ہے اور وہ لوگوں کو اسی طرح حیران کرتا رہتا ہے۔ اس کے بعد پولیس نے مزید تحقیقات نہیں کیں اور اسے وارننگ دے کر چھوڑ دیا گیا کہ وہ دوبارہ ایسی حرکت

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شایع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

http://digestpk.blogspot.com/

نہیں کرے گا۔

پولیس نے تو اپنے طور پر معاملہ ختم کر دیا لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں پولیس کے بتائے ہوئے پتے پر اس کی بیوی سے ملنے چل دی۔ وہ گھر بیورلے ہلز کے علاقے میں واقع تھا جہاں کسی چھوٹے مکان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے لمحہ بھر کے لیے شک گزرا کہ کہیں غلط جگہ پر تو نہیں آ گئی۔ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے وہ اسٹینلے ڈونن کا بیٹا ہی ہو اور اسے یہ مکان ورثے میں ملا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں کار کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے آگے کی جانب جھکی اور کمپیوٹر آن کر دیا۔ اسٹینلے ڈونن زندہ تھا لیکن اس کی موجودہ رہائش گاہ کے بارے میں معلومات نہیں تھیں۔ اس کے تین بیٹے تھے لیکن کسی کے نام کے ساتھ اسٹینلے نہیں لگا ہوا تھا گو کہ وہ سب اس جعلی اسٹینلے کے ہم عمر تھے لہٰذا اگر وہ اسٹینلے ڈونن کا بیٹا ہوتا تو اس کا نام بھی ڈیٹا بیس میں ہونا چاہیے تھا لہٰذا یہ تو طے ہو گیا کہ وہ جعلی نام استعمال کر رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے لاس اینجلس کاؤنٹی کی ویب سائٹ کھولی اور جائداد کی رجسٹری کے متعلق معلومات تلاش کرنے لگی۔ میں یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ یہ مکان کس کے نام پر ہے لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ میں نے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے فیصلہ کیا کہ خود ہی کاؤنٹی کے دفتر جا کر اس سلسلے میں معلومات حاصل کر لوں گی لیکن اس سے پہلے وہ کارروائی کرنا تھی جو کوئی پرائیویٹ سراغ رساں ہی کر سکتا ہے۔ میں نے اپنی گاڑی ڈرائیو وے میں پارک کی اور مکان کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھولنے والی ایک درمیانی عمر کی خوب صورت عورت تھی لیکن اس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اسٹینلے ڈونن اس گھر میں رہتا ہے پھر میں نے پولیس کا حوالہ دیا اور کہا کہ میں فون کر کے انہیں بلاتی ہوں تاکہ وہ تصدیق کر سکیں کہ یہ اسی اسٹینلے ڈونن کا گھر ہے جسے انہوں نے گزشتہ روز گرفتار کیا ہے۔ اس پر وہ عورت نرم پڑ گئی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ تحقیقات کے دوران میں پولیس کے سامنے جھوٹ بولنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

''اوکے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کا نام اسٹینلے نہیں ہے اور نہ ہی یہ مکان اس کا ہے۔''

میں یہ اندازہ تو کر سکتی تھی کہ اس کا نام اسٹینلے نہیں ہوگا لیکن مکان والی بات پر یقین کرنا ذرا مشکل تھا۔ میں نے اس سے کئی سوالات کیے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ بالآخر میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''پھر یہ مکان کس کا ہے؟''

''میرا۔'' اس نے جواب دیا۔

''صرف تمہارا؟'' میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''ہاں۔'' اس نے کچھ غصے سے جواب دیا۔

''اور تم خود کون ہو؟''

''میں تمہارے سوالوں کے جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے آگے بڑھ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور بولی۔

''میں یہ سب کچھ کاؤنٹی سے بھی معلوم کر سکتی ہوں۔ اس کے بعد میں پولیس کو لے کر آؤں گی اور پھر تم سب کچھ بتا دو گی۔''

اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے اپنا سر آہستہ سے ہلایا اور بولی۔ ''روکزین ونٹر بری۔''

مجھے یوں لگا جیسے یہ نام پہلے کہیں سن رکھا ہے لیکن میرے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کا نام اسٹینلے نہیں ہے؟''

''ہم دونوں ایک ہی جم جاتے ہیں۔ اس کا اصل نام ڈگلس سرک ہے۔''

میں یہ نام سن کر چونک گئی۔ ڈگلس سرک بھی ہالی ووڈ کا ایک ہدایت کار تھا گو کہ وہ اسٹینلے ڈونن کی طرح مشہور نہیں تھا لیکن اس نے بھی پچاس کی دہائی میں فلمیں بنائی تھیں... مجھے یاد نہیں کہ 1959ء کے بعد اس کی کوئی فلم ریلیز ہوئی ہو۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔

''تم اسے جانتی ہو؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''ذاتی طور پر تو نہیں جانتی لیکن کل جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں بات ضرور کرنا چاہتی ہوں۔''

''وہ محض ایک مذاق تھا لیکن الٹا اس کے گلے پڑ گیا کیونکہ کسی بارٹینڈر نے فون کر کے پولیس کو بلا لیا۔''

''یہ کیسا مذاق ہے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے...؟''

''لیکن گزشتہ روز تو وہ گرفتار ہو گیا۔''

''ہاں، بارٹینڈر کو یقین آ گیا تھا اسی لیے اس نے پولیس کو بلا لیا۔'' میں نے کہا۔

''جانتی ہوں۔ اگلی بار اس سے ملاقات ہوئی تو سمجھاؤں گی۔''

''تم نے اس کے لیے جھوٹ کیوں بولا؟''

''یہ بھی مذاق کا ایک حصہ تھا۔ شاید یہ اس کی عادت ہے۔ وہ خوب صورت عورتوں کے پاس جا کر یہی بات کہتا ہے کہ کیا تم میرے لیے گواہی دو گی اور جب وہ تیار ہو جاتی ہیں تو وہ سمجھا دیتا ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ بھی خوب صورت لڑکیوں سے دوستی کرنے کا ایک طریقہ ہے۔''

''اس نے تم سے یہ بات کب کہی تھی؟''

''تقریباً ایک ہفتہ پہلے۔''

''کیا تمہارے پاس اس کا فون نمبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہم روزانہ صبح میں ملتے ہیں۔''

''کیا آج صبح بھی اس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟''

''نہیں، آج مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ شاید وہ اس وقت تک جا چکا تھا۔''

''اس نے تم سے ایک ہفتہ پہلے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ اگر کوئی مجھ سے اسٹینلے ڈونن کے بارے میں پوچھے تو یہی کہوں کہ میں اس کی بیوی ہوں اور وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے لیکن یہ کہ اس وقت وہ میرے ساتھ ہی تھا جس کی وہ بات کر رہے ہیں۔''

''تم نے پولیس والوں سے بھی یہی جھوٹ بولا۔''

''ہاں، کیونکہ اس نے کہا تھا کہ یہ محض ایک تفریح ہے اور اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔'' روکزین نے کندھے اچکا کر کہا۔

''تم نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں نے پوچھا تھا اور اس نے یہی کہا کہ وہ دوستوں سے کھیل رہا ہے۔ وہ انہیں کوئی ایسی خطرناک بات بتائے گا اور جب وہ اس کی تصدیق کے لیے آئیں گے تو مجھے دیکھ کر مزید پریشان ہو جائیں گے۔''

''کیا ایسا ہی ہوا تھا؟''

''ہاں۔'' وہ دانت نکالتے ہوئے بولی۔ ''وہ پولیس والے پہلے تو ناراض ہوئے پھر مجھ سے معافی مانگ کر چلے گئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی بڑی بات ہے کوئی پولیس والا آپ سے معافی مانگے۔''

''ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ اچانک ہی خوف زدہ نظر آنے لگی۔ ''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟''

''تم نے تحقیقات کے دوران میں پولیس سے جھوٹ بولا جو تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر میں پلٹی اور اپنی کار کی جانب بڑھ گئی۔ میں جانتی تھی کہ اس نے ڈگلس سرک کے فون نمبر کے بارے میں بھی جھوٹ بولا ہے اور وہ اپنے دوست کو خبردار کر دے گی کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اگر وہ مجھے مل گیا تو اس سے کیا کہوں کہ وہ مشہور فلم ڈائریکٹرز کا نام استعمال کرنا چھوڑ دے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا اور میں واقعی جاننا چاہ رہی تھی کہ اس کھیل کی حقیقت کیا ہے؟

☆☆☆

وہ جم نہیں بلکہ ہیلتھ اور فٹنس کلب تھا اور اس میں داخل ہونے کی فیس ہی پچاس ڈالر تھی لیکن میرے پاس پرائیویٹ سراغ رساں کا لائسنس تھا اس لیے پچاس ڈالر کی بچت ہو گئی۔ اس کلب کا کاؤنٹر کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے استقبالیہ سے کم نہیں تھا۔ جہاں بہت سے کمپیوٹر رکھے تھے اور کاؤنٹر پر باوردی اسٹاف متعین تھا۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنا لائسنس دکھایا تو وہ مجھے اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ اس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا اور بولا۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''وہ مجھے اپنے شان دار آفس میں لے گیا اور بولا۔ ''مسز وِمبرے ونٹر بری کا فون آیا تھا۔''

میں اس سے آگے نہیں سن سکی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ روکزین کا نام کیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وِمبرے ونٹر بری ایک مہینا پہلے انتقال کر گیا تھا اور اپنے پیچھے جائداد چھوڑ گیا تھا۔ اس کے چھ بچے جو سابقہ بیویوں سے تھے، اس ورثے کے لیے لڑ رہے تھے جبکہ روکزین اس عالی شان مکان میں بے فکری سے رہ رہی تھی جو وِمبرے نے شادی سے پہلے اسے خرید کر دیا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ اس لیے معلوم تھا کہ اس طرح کی باتیں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں جبکہ یہاں تو معاملہ اربوں ڈالر کی جائداد اور اس کے دعوے داروں کا تھا پھر بھلا میں کیسے بے خبر رہ سکتی تھی۔

''مسٹر...؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''نیونس'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''مسٹر نیونس! میں مسٹر سرک کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ فرضی نام استعمال کر رہا ہے اور ڈگلس سرک اس کا حقیقی نام نہیں ہے؟''

http://digestpk.blogspot.com/

''نان سینس!'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہم مکمل طور پر اس کی شناخت کر چکے ہیں۔''

''تمہیں شناخت کے لیے کیا چیزیں درکار ہوتی ہیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس نے ہمیں اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھایا تھا اور پھر اس کا کریڈٹ کارڈ...''

مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ اس احمق کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا کتنا آسان ہے۔

''اسے یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''چھ مہینے۔'' نیونس نے جواب دیا۔

''اور تم ہر مہینے اس سے فیس وصول کرتے ہو؟''

''نہیں، ہم سالانہ فیس لیتے ہیں۔'' نیونس نے کہا۔

''کیا تم اس کے کریڈٹ کارڈ سے کچھ چارج کر سکتے ہو؟''

''ہم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ہم لوگوں کو کسی دوسرے کے کریڈٹ کارڈ سے پیسے نہیں دیتے۔''

''میں اپنے لیے نہیں مانگ رہی۔ صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ کارڈ اب بھی کام کر رہا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو تم یہ رقم واپس کر دینا ورنہ میں تم سے اس کے بارے میں مزید بات کروں گی اور تم مجھے وہ سب کچھ بتاؤ گے جو اس کی فائل میں موجود ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی غیر قانونی کام نہ ہوگا۔'' وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ کل وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار ہو گیا ہے اور روکزین ونٹربری نے گواہی دی کہ وہ اس کے ساتھ تھا۔ وہاں اس نے اپنا نام ڈگلس سرک نہیں بلکہ اسٹینلے ڈونن بتایا تھا۔''

''یہ تو کسی فلم ڈائریکٹر کا نام ہے۔'' نیونس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''اگر تم انٹرنیٹ پر تلاش کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ڈگلس سرک بھی ایک ڈائریکٹر کا نام ہے۔''

اس نے کی بورڈ پر کچھ نمبر پنچ کیے اور بولا۔ ''تمہارے خیال میں بیس ڈالر کافی ہوں گے؟''

''کافی ہیں۔ اسی سے ہمیں وہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا جو ہم جاننا چاہ رہے ہیں۔''

وہ کافی دیر تک مختلف نمبر پنچ کرتا رہا۔ اس کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جمی ہوئی تھیں پھر اس نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''مس سوئیٹ! میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا۔''

''ٹھیک ہے، جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ تو میں معلوم کر ہی لوں گی۔''

☆☆☆

اس پوری تگ و دو کے دوران وہ جو کچھ معلوم ہوا ان میں دو بوگس کریڈٹ کارڈ نمبر، ایک چوری شدہ ڈرائیونگ لائسنس کا نمبر، ایک ایڈریس اور ایک سیل فون نمبر شامل تھا۔ نیونس پولیس کو فون کرنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اسے روک دیا اور سمجھایا کہ جب تک میں اپنی تحقیقات مکمل نہ کرلوں، وہ پولیس کو نہ بلائے۔

یہ ثابت کرنا بہت آسان تھا کہ اس کی شناخت جعلی تھی۔ میں نے موٹر وہیکل ڈیپارٹمنٹ فون کر کے اس لائسنس نمبر کی تصدیق چاہی تو وہاں سے بتایا گیا کہ یہ نمبر اور نام دونوں مختلف ہیں۔ نیونس کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ وہاں سے آنے کے بعد میں نے پولیس میں اپنے ایک جاننے والے کو فون کیا اور کہا کہ وہ خاموشی سے معلوم کر کے بتائے کہ اس نمبر کا لائسنس کس کے نام پر جاری ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے بتایا کہ وہ لائسنس فریڈزن مین کے نام پر جاری ہوا تھا۔ اتفاق سے یہ بھی ایک فلم ڈائریکٹر ہی تھا جس کی آخری فلم 1982ء میں آئی تھی۔

اب میرے پاس تین جعلی نام، دو بوگس کریڈٹ کارڈ، ایک اصلی لائسنس نمبر، ایک سیل فون نمبر اور دو پتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر لائسنس نمبر اصلی ہے تو اس پر درج ایڈریس بھی اصلی ہی ہوگا۔ اب میری اگلی منزل انگلیو تھی جب کہ اس وقت مجھے اپنے گھر جانا چاہیے تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں مائیکل جیکسن کی وفات ہوئی تھی۔ اس علاقے میں بہت خوب صورت، بڑے اور مہنگے مکان تھے جہاں ہالی ووڈ اسٹارز اور انتہائی امیر لوگ رہا کرتے تھے۔ یہاں نسبتاً کچھ چھوٹے مکانات بھی تھے جن میں متوسط طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے۔

زن مین کا مکان جس علاقے میں تھا وہاں زیادہ تر بڑے گھر تھے۔ وہ مکان کافی پرانا تھا اور پہلی نظر میں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے رنگ و روغن کی ضرورت ہے بلکہ ضرورت تو اس پولیس ٹیپ کو بھی ہٹانے کی تھی جو مکان کے سامنے والے دروازے پر لگا ہوا تھا۔ وہ ٹیپ دیکھنے میں

http://digestpk.blogspot.com/

بالکل نیا لگ رہا تھا اور ابھی تک اس کا پیلا رنگ چمک رہا تھا۔ وہاں پولیس کی آمد کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس اس جگہ کی تصویریں لے چکی ہے لہٰذا میں نے ٹیپ کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی مشرقی حصے میں واقع کھڑکی تک پہنچ گئی۔ وہاں سے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں کوئی مجھے سڑک پر سے دیکھ تو نہیں رہا۔ درمیان میں بڑے بڑے درخت حائل تھے اس لیے میرے دیکھے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر مکان کے اندر جھانکا۔ وہاں خاصی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی تھی۔ لونگ روم کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ کاؤچ کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا گیا تھا جبکہ کافی کی میز الٹی پڑی تھی اور فرش پر کئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس سے بھی زیادہ بری حالت فرش اور دیوار میں لگے ہوئے کتابوں کے شیلف کے اوپری کنارے پر خون کے ساتھ ساتھ انسانی گوشت کے کچھ خشک لوتھڑے بھی موجود تھے۔ لگتا تھا کہ کسی کو اس کمرے میں گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ حالیہ دنوں میں یہاں کوئی ایسی واردات ہوئی ہو لیکن کچھ بھی ذہن میں نہیں آیا۔ میں یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ یہ مکان کس کی ملکیت ہے۔ کون اس قتل کی تحقیقات کر رہا ہے اور مرنے والا کون تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ معلومات حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا اور یہ خیال درست ثابت ہوا۔

میں اپنی کار میں آئی اور اس میں لگے ہوئے کمپیوٹر کے ذریعے انٹرنیٹ کنکشن آن کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے مطلوبہ خبر مل گئی جس کے مطابق اس مکان میں ایک عورت کا قتل ہوا تھا۔ بظاہر اس قتل کا کوئی محرک نہیں تھا۔ وہ اس گھر میں اکیلی رہتی تھی اور مرتے وقت بھی اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ اگر اس کا پڑوسی کھڑکی سے جھانک کر اس کی لاش نہ دیکھتا تو شاید کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ قتل کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلے اسی پڑوسی پر شبہ کیا گیا لیکن اس کا ریکارڈ بے داغ تھا... اگر اس نے قتل کیا ہوتا تو وہ پولیس کو فون نہ کرتا۔

اس عورت کا نام کیٹی ووئٹ تھا اور وہ دو سال پہلے لاس اینجلس آئی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی اور وہ فری لانس بک کیپر تھی۔ اس کا خاندان مڈ ویسٹ میں رہتا تھا اور ان سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ ایک نئی زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔ پڑوسیوں کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا جبکہ اس کے گاہک بھی اس کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ لاس اینجلس آنے کے بعد اس نے زیادہ دوست نہیں بنائے حالانکہ انٹرنیٹ پر اس کا ایک وسیع سوشل نیٹ ورک تھا۔

میں نے اپنا کمپیوٹر بند کیا اور اس مکان پر ایک نظر ڈالی جہاں ایک عورت قتل ہو چکی تھی۔ وہ زندگی میں اتنی مشہور نہیں تھی جتنی کہ مرنے کے بعد اسے شہرت ملی۔ لاس اینجلس کیا بلکہ ساری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ شہرت بھی ناپائیدار ہوتی ہے۔ روکزین ونٹر بری کو ایک بہت ... دولت مند سے شادی کرنے اور اس کی بیوہ ہونے کی وجہ سے شہرت ملی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ اس شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ عدالت میں وراثت کا مقدمہ شروع ہو چکا تھا جس میں وہ بھی ملوث تھی۔ اسی طرح چند روز پہلے مجھے بھی ایک بچی کو بچانے کی وجہ سے شہرت ملی۔ یہ بھی چند ہفتوں میں دھندلا جاتی لیکن اس کیس کی وجہ سے اس کا دورانیہ بڑھ سکتا تھا...

میں نے اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا جہاں انٹرنیٹ کی سہولت کے ساتھ بہترین کمپیوٹر موجود تھا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے برگر لیا اور گھر پہنچ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی جس کی بدولت دنیا آپ کی انگلیوں پر آجاتی ہے۔ میں سوچنے لگی کہ کاش پولیس بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوتی۔ میں نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں کیٹی ووئٹ کا ماضی کھنگال لیا۔ وہ پہلے ساؤتھ ڈکوٹا کے علاقے میں رہتی تھی۔ ایک حیرت انگیز انکشاف یہ ہوا کہ وہ اپنے کلائنٹس کے لیے کیٹی ووئٹ تھی لیکن ذاتی زندگی میں وہ کیٹی جانسن تھی۔ کینتھ جانسن کی بیوی، جو ایک مووی پیلس کا مالک تھا لیکن ملٹی پلیکس کی آمد، کرائے پر ڈی وی ڈی فلموں کی دستیابی اور بڑے اسکرین کے ٹی وی آنے کے بعد یہ مووی پیلس بند ہونا شروع ہو گئے۔ پھر اخبارات میں ان دونوں کی طلاق کی خبریں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ عدالت نے انہیں ایک دوسرے سے دور رہنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ کیٹی ووئٹ اپنا کاروبار ختم کر کے ریٹائرمنٹ لے رہی ہے۔ البتہ اس خبر میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ لاس اینجلس جا رہی ہے لیکن وہ اپنا کاروبار بند کر کے وہاں چلی گئی اور کینتھ بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے لاس اینجلس پہنچ گیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ بات مجھے کیسے معلوم ہوئی؟

ہوا یوں کہ انہی اخبارات نے کینتھ جانسن کی ایک تصویر چھاپی جب وہ اپنا مووی پیلس بند کرنے کا اعلان کر رہا

تھا۔ وہ مووی پیلس جو اس کی ملکیت تھا اور جسے وہ تمام تر کوششوں کے باوجود بند ہونے سے نہیں بچا سکا اور جو گزشتہ دس سال سے نقصان میں چل رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کیٹی جانسن کی بدانتظامی کی وجہ سے اسے یہ نقصان اٹھانا پڑا۔

یہ تصویر اس بہانے باز شخص کے ہر روپ سے بہت قریب تھی جس نے بار میں مجھ سے ایک بے ضرر سی جھوٹی گواہی دینے کی التجا کی تھی۔ جو شخص ایک عرصہ تک مووی پیلس کے مالک کے طور پر خبروں میں رہا، وہ ایک بار پھر اپنی بیوی کے پُراسرار قتل کی وجہ سے سرخیوں میں آ گیا۔ اس نے دوسرے لوگوں کو سامنے لانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کی مدد کریں۔ اس نے روکزین ونٹر بری کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے گھر میں اس کی موجودگی کی گواہی دے اور اس نے مجھے بھی اس راستے پر لگا دیا کہ میں اس کی بیوی تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس کی سابقہ بیوی یعنی روکزین کے گھر تک پہنچ گئی۔

☆☆☆

اس کی چالاکی یہ تھی کہ اس نے وہاں قیام کے دوران میں دہری شخصیت اختیار کر لی۔ اس نے حقیقت میں اپنی بیوی کو ہلاک کیا اور جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کی گواہی دلوانے کے لیے میرا انتخاب کیا۔ اس نے مجھے عام شکل وصورت کی کوئی گمنام عورت سمجھا تھا۔ اگر اسے علم ہوتا کہ میں غیر معروف سہی مگر ایک پیشہ ور سراغرساں ہوں تو وہ یہ غلطی کبھی نہ کرتا۔ وہاں اس نے اسٹینلے ڈونن کا کریڈٹ کارڈ استعمال کر کے اسے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ روکزین سے وہ ڈگلس سرک کی شناخت سے ملتا رہا اور اسے اپنی جعلی بیوی ہونے کی بے ضرر سی گواہی دینے پر آمادہ کر لیا... ہیلتھ کلب یا جم خانے میں وہ فریڈ زن مین کا مسروقہ لائسنس استعمال کر کے ایک بوگس گاڑی میں آتا جاتا رہا جبکہ اس گاڑی کا فریڈ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ سب حرکتیں کینتھ جانسن کی تھیں۔ اسے دکھ تھا کہ اس کے کاروبار کی بربادی اس کی بیوی، کیٹی کی حرکتوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ مووی پیلس بند ہونے کے بعد وہ مالی بدحالی اور گمنامی کے اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک طرف اپنی منحوس بیوی سے چھٹکارا حاصل کیا تو دوسری طرف فلمی دنیا کی معروف شخصیات کی شناخت مشتبہ انداز میں استعمال کرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ کیٹی کے قتل کے سلسلے میں اسٹینلے ڈونن، ڈگلس سرک اور فریڈ زن مین جیسے بڑے بڑے نام ملوث ہوں گے تو مقتولہ کے "مظلوم" شوہر کے طور پر ہر طرف اس کے نام کا چرچا ہوگا، اخبارات اور ٹی وی چینلز پر مہینوں تک اس کا نام آتا رہے گا، اس کے انٹرویو نشر ہوں گے اور اس شہرت کی وجہ سے اس کا ڈوبا ہوا کاروبار دوبارہ چمک اٹھے گا۔

لیکن ہونا کچھ اور ہی تھا۔ کیٹی کے قتل کے بعد اسے صرف ایک بار ٹی وی پر نمودار ہو کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع ملا... صرف پندرہ منٹ کے لیے... اس کے بعد اسے جعلی شناخت استعمال کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ شہرت کے حصول کے لیے اس نے جو جال پھیلایا تھا، اس میں وہ خود ہی پھنس گیا۔ اسے کیٹی کے قتل کا اعتراف کرنا پڑا۔

کینتھ جانسن کی ساری کوششوں کا بھرپور فائدہ مجھے حاصل ہوا۔ اس کی مظلومانہ شہرت صرف پندرہ منٹ بعد دم توڑ گئی لیکن اس کیس میں میری کارکردگی کو تمام اخبارات نے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ ہر چینل میرے انٹرویو، ماضی اور حال کے بارے میں پروگرام پیش کر کے دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں تھا۔

یہ سلسلہ چھ ماہ تک اسی زور شور سے چلتا رہا۔ بظاہر میں خوش تھی لیکن اندر سے مجھے کوئی خاص خوشی نہیں تھی۔ میں نے معمول کی رسمی کارروائیوں سے بڑھ کر کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر کینتھ نے اس سازش میں بڑے ناموں کو ملوث نہ کیا ہوتا تو میں بھی گمنام رہتی۔ میری ساری شہرت میری اپنی نہیں، کینتھ کی دلائی ہوئی تھی۔

کینتھ کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اس کا ڈوبا ہوا کاروبار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ وہ جیل کی کوٹھری میں چلا گیا مگر میرا کام چمک اٹھا۔ اب مجھے یعنی بلنڈا اسویٹ کو ہرا پرے غیرے کے کیس میں دلچسپی لینے کی ضرورت رہی، نہ آمدنی کی کوئی فکر ہے۔ میرے پاس بڑے بڑے کیس آنے لگے ہیں۔ فیسیں بہت آتی ہیں۔ میرے بینک والے حیران ہیں کہ مجھ پر ہُن کیسے برسنا شروع ہو گیا۔

میں ایک بات ہر وقت یاد رکھتی ہوں کہ شہرت اور اس کا نشہ عارضی ہوتا ہے۔ آج میری گواہی نے ایک قاتل کو سزایاب کرایا ہے تو کل شہر میں کوئی اور بڑا واقعہ ہوگا۔ ہر طرف اس کے چرچے ہوں گے اور لوگ مجھے بھول جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا وقت آنے تک میں اتنے اثاثے بنا چکی ہوں گی کہ بقیہ عمر کسی کیس کے بغیر بھی عیش سے گزار سکوں۔

بس برا یہ ہوا کہ اب کوئی کسی جھوٹی گواہی کے لیے مجھ سے رجوع نہیں کرے گا۔

☞

http://digestpk.blogspot.com/

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ...... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے ...... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان۔ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمحِ نظر مختلف ہے زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ...... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ...... ایک للکار ہے۔

گیارہویں قسط

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے واجی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر

http://digestpk.blogspot.com/

کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ ابرار صدیقی کے پاس ... چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ مجید مٹھو نامی شخص کی ہلاکت پر... شک کی بنا پر میڈم صفورا نے عمران کو اغوا کرالیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے صفورا کو قائل کرلیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمارہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سردمہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے ماردیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہوسکا۔ میری بے وقوفی، کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہلِ خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھگادیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کررہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کردیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش وحواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گرگیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ راستے میں ہاشونام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیرخوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور نل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی نل پانی میں آئی تھی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ میری غلط بیانی کی وجہ سے چھوٹے سرکار کے اہل کار سلطانہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعدازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم جی کے لوگوں کے حوالے کردیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے پگوڑا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کردیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچادیا گیا۔ وہاں مجھ سے اصطبل میں کام لیا جانے لگا۔ مجھ پر تشدد کرکے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رک گئی۔ پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ نے مجھے ہمت بخشی اور میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں نتائج سے بے پروا باہر کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ مسلح گھڑسوار میرے تعاقب میں تھے اور میں جنگل میں بھٹکتا رہا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن صبح اچانک میرا تعاقب کرنے والے آپہنچے۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے اچانک فائرنگ کردی۔ دو افراد فرار ہوگئے جبکہ دو موت کے گھاٹ اتر گئے۔ میں انہی افراد کے ایک گھوڑے پر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ مگر مجھے پھر اپنے تعاقب میں کچھ لوگ نظر آئے۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ اس کی حالت خراب تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا۔ مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کے بجائے حکم جی کے اہلکاروں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہاں فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم جی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی سہیلی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا، اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگالیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے کہیں بھی ٹریس کرلیا جاتا ہے۔ ماریا کے اغوا کی خبر ہم نے حکم جی کے اہلکاروں تک پہنچادی۔ غار کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور ہم ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ ادھر بارونداnامی عجیب الخلقت شخص نے مجھ پر کچھ باتیں عیاں کیں۔ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن تھا اور یہاں ماریا اور حکم جی کے گارڈز کو تربیت دینے آیا تھا مگر ایک ہندو لڑکی کے عشق نے اسے حکم جی کے عتاب کا شکار بنادیا اور وہ اپنی ٹانگ اور ایک ہاتھ گنوا بیٹھا۔ بارونداnے مجھے جوڈو کراٹے کے حوالے سے اہم باتیں بھی سکھائیں۔ دوسرے دن سرنگ کے دہانے پر ہنگامہ برپا تھا۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہوچکی تھی اور انور خاں اور حکم جی کے اہلکاروں میں بات چیت کے دوران مجھے ایک نام سنائی دیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا، انڈین اسپیشل فورسز کا سابقہ افسر جس نے مجسمے کی چوری پر ہمیں پاکستان سے پکڑ کر یہاں انڈیا میں قیدی بنالیا تھا... ادھر باروندا جیکی مجھے جوڈو کراٹے کے حوالے سے اہم گر سکھا رہا تھا۔ انور خاں کے رنجیت پانڈے وغیرہ سے مذاکرات ہورہے تھے تاہم وہ لوگ وقت گزاری کررہے تھے۔ پھر انہوں نے دھوکے سے غار پر ہلا بول دیا تاہم انہیں ناکامی ہوئی لیکن ہمارا ایک ساتھی فیروز اس حملے میں مارا گیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر اسحاق نے ماریا کی ایک انگلی کاٹ کر پانڈے کو بھیج دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہوگیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہمیں گھیر لیا گیا اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور مہیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ وہاں چوہان اور اسحاق میں بحث چلی کہ میری وجہ سے دشمن ان تک پہنچ جائیں گے۔ یہ سن کر میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن میں دوبارہ چل پڑا۔ چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر بیساکھی کے نشانات ملے اور میں اسے کھوجتا ہوا باروندا جیکی تک جاپہنچا۔ اس کا اس طرح ملنا میرے لیے حیرت ناک تھا۔ یہ ایک کھنڈر نما چوکی تھی۔ ابھی ہم باتیں کررہے تھے کہ کچھ آہٹ ہوئی۔ یہ رائفل کے کاک ہونے کی آواز تھی۔ یہاں دشمن درجنوں کی تعداد میں موجود تھا۔ ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔ میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ پھر میرے تصور نے مجھے اپنے ساتھ عمران کو دکھایا۔ اس کا تصور بھی میرے لیے کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

یکایک فائرنگ شروع ہوگئی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی... سیٹیاں بجاتی ہوئی چوکی کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ میں اوندھے منہ زمین پر گرگیا۔ میں نے اپنی رائفل سے چند جوابی فائر کیے۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا، نہ ہی مجھے ایسی شوٹنگ کے داؤ پیچ آتے تھے... میرے لیے اطمینان اور راحت کی بس ایک بات تھی۔ اس طرح درجنوں دشمنوں میں گھر کر اور موت کو اپنے روبرو دیکھ کر بھی میرے جسم اور دل و دماغ پر لرزہ طاری نہیں ہوا تھا۔ آج میں اس شخص سے بہت... بہت زیادہ مختلف تھا جس نے اپنے گھر کے سامنے چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج کے غنڈوں سے مار کھائی تھی اور پھر اپنے ہر جاننے والے سے منہ چھپاتا پھرا تھا۔ آج میں اپنے اندر مرنے کا حوصلہ پارہا تھا اور یہ حوصلہ بھی پارہا تھا کہ مرنے سے پہلے اپنے دس بیس دشمنوں کو موت کا مزہ چکھا دوں۔

ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ تڑتڑ کی زبردست آوازوں کے ساتھ چند برسٹ بھی چلے۔ گولیاں کھنڈر کی دیواروں سے ٹکرائیں اور ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ کسی درخت پر گھونسلے میں دبکا ہوا کوئی پرندہ گولی کھا کر ''دھپ'' سے میرے سامنے تاریکی میں گرا اور پھڑپھڑا کر ساکت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میگافون پر ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔ اس آواز کو سن کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ہمیں گھیرنے والوں میں رنجیت پانڈے بھی شامل ہے۔ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں پکار کر کہا۔ ''تم لوگن کے بچنے کا کوئی چانس ناہیں ہے۔ بہتر ہے کہ باہر آکر خود کو ہمارے حوالے کردو۔ ہم تمہیں وچن دیوت ہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ناہیں ہووے گی اور قانون کے مطابق سلوک ہووے گا۔''

میں خاموش رہا۔ قریباً ایک منٹ بعد میگافون پر پانڈے کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''تم جواب کیوں ناہیں دیوت ہو؟ اگر تم جواب ناہیں دوگے تو ہم سمجھیں گے کہ تمہیں یہ آفر منظور ناہیں ہے۔ ہم حملہ کرنے پر مجبور ہوجاویں گے...''

پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ چوکی کی اندرونی صورتِ حال سے باخبر نہیں ہے، صرف اندازے سے کام لے رہا ہے۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اندر زیادہ تعداد میں افراد موجود ہیں۔ اگر میں خود اس سے مکالمہ کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ میں سے کوئی یہاں نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں پانڈے اور اس کے درجنوں ساتھیوں کا حوصلہ مزید بڑھ جاتا۔

میری خاموشی طویل ہوئی تو درختوں میں یکے بعد دیگرے کئی ٹارچیں روشن ہوگئیں۔ ان ٹارچوں کی روشنی سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوگئی کہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے اس کھنڈر چوکی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ ایک ساتھ درجنوں ٹارچیں روشن ہونے کی وجہ سے کھنڈر کی اطراف روشن ہوگئی تھیں۔ کوئی اس کھنڈر میں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو فوراً نظر میں آجاتا۔

شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ انسان حالات سے سبق سیکھتا ہے، اس سے پہلے ہونے والے معرکے میں ماریا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ہی اپنی پناہ گاہ سے بھاگ نکلے تھے۔ پانڈے جیسا شخص یہ غلطی دوسری بار نہیں کرسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کھنڈر کے قرب وجوار کو حتی المقدور روشن کردیا تھا۔

میگافون پر پانڈے کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ ''ہم تمہیں دس منٹ کا وقت دیوت ہیں۔ اگر تم لوگن اس سمے کے اندر باہر ناہیں نکلے تو ہم فائر کھول دیویں گے۔ یاد رکھو، تم میں سے کوئی زندہ ناہیں بچے گا۔'' اس بار پانڈے کے لہجے میں مخصوص تپش موجود تھی۔ یہ تپش اس کے اندر کی بے پناہ سفاکی کو ظاہر کرتی تھی۔

میں بے آواز کھسکتا ہوا پیچھے آیا۔ جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی واحد ٹانگ سامنے کی طرف پھیلا رکھی تھی۔ بوتل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس میں سے مزید کافی ساری شراب اپنے اندر انڈیل چکا تھا۔ صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بہت اچھی طرح آچکی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ حکم اور جارج کے لوگوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ ''جیکی! میں آپ کے لیے مصیبتوں کی وجہ بنا ہوں۔ میں آپ کا کھوج لگاتا ہوا اس کھنڈر میں نہ آتا تو شاید آپ بچ جاتے۔''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ شاید بُری چیز ہے۔ اس لفظ کو اپنی باتوں میں آنے ہی نہیں دینا چاہیے۔ اگر اس لفظ کا ہی سہارا لینا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ شاید تم میری وجہ سے پھنسے ہو۔ شاید تم اس کھنڈر میں نہ آتے تو بچ بچا کر کسی طرف نکل جاتے اور شاید میں جارج کی بہن کو مارشل آرٹ سکھانے اس اسٹیٹ میں نہ آتا تو اب تک بھلا چنگا ہوتا... اور شاید میں اور شکنتلا ایک دوسرے کی نظر کا شکار نہ ہوتے اور جارج کی بہن ہماری مخبری نہ کرتی تو میں اس وقت اسٹیٹ کی فوج کا کمانڈر انچیف ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

http://digestpk.blogspot.com/

اس طرح تو بہت کچھ سوچا جاسکتا ہے دوست... لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم میرے لیے مصیبتوں کی وجہ بنے ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم نے میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''...میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا جیکی... آپ کو آپ کی کشتی سے نکال کر اس جنگل میں لانے کا ذمے دار کوئی اور نہیں صرف میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جس کی وجہ سے آپ یہاں موجود ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

''میرے ساتھی تو آپ کو اس کشتی میں چھوڑ کر آگئے تھے لیکن میں آپ کو وہاں نہ چھوڑ سکا... اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو آپ بے ہوش تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اسی طرح دم نہ توڑ جاؤ... لیکن زیادہ اہم وجہ دوسری تھی۔ مجھے آپ کی شکل وصورت میں اپنے بہت پیارے دوست کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ وہی دوست ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام عمران تھا۔ اس نے مجھے نئی زندگی دی اور تھوڑے ہی وقت میں مجھے اتنا عزیز ہوگیا کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ اور اگر بیان کروں گا تو شاید حق ادا نہ کر پاؤں گا۔''

میں نے اس بارے میں اسے تھوڑی سی تفصیل مزید بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''جو بھی ہوا اسے اب دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں... اور نہ ہی اسے دہرانے کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ بہرحال، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم لوگ مجھے وہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے تو یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوتا۔''

''میں اس کے لیے شرمندہ ہوں جیکی!''

''چلو... تم نے سچ تو بولا... اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ نیپالی میں ایک کہاوت ہے کہ سچ بولنے والے کی زندگی کا آخری مرحلہ آسان ہوجاتا ہے...''

میں نے دیکھا کھنڈر سے باہر ٹارچوں کے روشن دائرے اب پہلے سے بڑھ گئے تھے۔ موت کا گھیرا مکمل تھا۔ میں نے کہا۔ ''جیکی! ابھی میگافون پر ان لوگوں نے جو اعلان کیا ہے، آپ نے سنا ہے؟''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''شاید تم بھول رہے ہو کہ میں اردو اور ہندی نہیں سمجھتا۔''

''اوہ سوری۔'' میں نے کہا۔ ''یہ حکم اور جارج کا سب سے خطرناک ہرکارہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ ہمیں پیشکش کررہا تھا کہ اگر ہم ہتھیار ڈال کر باہر آجائیں تو ہمیں شوٹ نہیں کیا جائے گا اور ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔''

جیکی نے بوتل میں سے دو بڑے گھونٹ لیے اور ایک بار پھر زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''اس پانڈے کو میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ کسی بہت نیک ماں کا بچہ ہے۔ وہ خدا کی بندی ایسے تین چار پانڈے اور پیدا کردیتی تو پورا انڈیا شاید اس دنیا میں ہی سورگ بن جاتا۔ وہ میگافون پر جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیں بالکل شوٹ نہیں کریں گے اور ہمارے ساتھ سلوک بھی قانون کے عین مطابق ہوگا... لیکن یہاں کا قانون کیا ہے؟ یہ شاید تم نہیں جانتے۔''

''کیا قانون ہے؟''

''یہ تو طے ہے کہ میری اور تمہاری کم سے کم سزا موت ہوگی اور موت یہاں بڑے بُرے طریقے سے دی جاتی ہے۔ تمہیں پھانسی چڑھنے... اور سولی چڑھنے کا فرق معلوم ہے؟''

میں خاموش رہا۔

وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''پھانسی میں گلے میں رسّا ڈال کر لٹکایا جاتا ہے اور سولی میں مجرم کو لکڑی کے کراس پر کیل ٹھونک کر ٹانک دیا جاتا ہے... یوں کرکے۔'' اس نے اپنا اکلوتا بازو پھیلا کر کراس کی شکل بنانے کی ادھوری کوشش کی۔ پھر شراب کا ایک طویل گھونٹ بھر کر بولا۔ ''میں نے جارج کی جیل میں لوگوں کو سولی چڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی وہیں پر سولی چڑھایا جائے گا۔ وہ مرنے کے لیے بہت بُری جگہ ہے اور وہ طریقہ بھی بہت بُرا ہے... بہت ہی بُرا ہے۔''

اس نے ذرا توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''پرانے طریقے کے مطابق جلاد پہلے مجرم کے جسم کے جوڑ توڑتا ہے۔ یہاں سے... یہاں سے... اور یہاں سے...'' اس نے اپنے ٹخنے، گھٹنے، کولھے اور کہنی وغیرہ کے جوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر اس بدنصیب کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور بعض اوقات کان بھی کاٹ لیے جاتے ہیں۔ تب اسے لکڑی کے کراس پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھوں میں چھ لمبی میخیں گاڑی جاتی ہیں... اور اسے کھلی جگہ پر آخری سانسیں لینے کے لیے لٹکا دیا جاتا ہے۔''

جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، اس قسم کی بات میں نے دورانِ سفر حجام عبدالرحیم سے بھی سنی تھی۔ اس نے جارج کی جیل کا احوال سناتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں مجرموں کو بہت بُرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کے لیے عبرت کا سامان مہیا کرنے کے لیے ایسی تمام سفاکانہ سزائیں سرعام دی جاتی ہیں۔

''تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' میں نے باروندا جیکی

سے پوچھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ اب حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے... اور جب موت کشتی میں نہیں آنی تو پھر کہیں بھی آجائے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو آپ گرفتاری دینا نہیں چاہتے؟''

''ہرگز نہیں، اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو کرلو لیکن اس سے پہلے اپنی یہ رائفل مجھے دے دینا... تاکہ میں ان حرامیوں میں سے دو چار کو شوٹ کرکے خود کو گولی مار سکوں۔''

''میرے خیال میں، میں بھی لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کروں گا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔

اسی دوران میں میگافون پر منحوس آواز پھر سنائی دینے لگی۔ اس مرتبہ آواز میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔ پانڈے نے کہا۔ ''دس منٹ پورے ہوچکے ہیں۔ ہم تمہیں آخری بار باہر آنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔''

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''پانڈے! تم سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میرا ارادہ تھا کہ پانڈے کے سامنے آتے ہی دو چار گولیاں اس کے سینے میں ٹھونک دوں پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہونا ہے، ہوجائے۔

''تم کون ہو؟'' پانڈے نے پوچھا۔

''تم مجھے مہروز کے نام سے جانتے ہو۔ میں مختار راجپوت کا داماد ہوں۔''

چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ میری سمت حرکت کر آیا۔ پانڈے کی آواز گونجی۔ ''تم اپنی رائفل پھینک کر سامنے آجاؤ۔ پھر تم سے بات ہوسکت ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ پانڈے جیسا گھاگ شخص اتنی آسانی سے خود پر حملے کا موقع نہیں دے گا۔ عین ممکن تھا کہ میرے سامنے آتے ہی مجھے شوٹ کردیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی کھنڈر پر ہلّا بول دیا جاتا۔

میں نے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جو کرسکتا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آواز کے رخ پر گولی چلائی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی یہ امید کی کہ ایک آدھ گولی رنجیت پانڈے کو لگ گئی ہوگی۔

میری فائرنگ کے ساتھ ہی جیسے کسی طوفان کا بند ٹوٹ گیا۔ گولیاں مینہ کی طرح کھنڈر کے در و دیوار پر برسنے لگیں۔ میں ایک محفوظ آڑ میں تھا، جم کر جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ سچ کہتے ہیں کہ لڑائی کا انتظار لڑائی سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

ایک بار جب لڑائی شروع ہوجاتی ہے تو پھر وہ اتنی خوفناک اور تکلیف دہ نہیں رہتی۔ میں نے اپنی فائرنگ کے جواب میں ایک کرب ناک آواز سنی۔ یہ میرے مدمقابلوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی، جسے گولی لگی تھی۔ اس آواز نے میرے اندر چنگاریاں سی بھر دیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اس طرح کی مزید آوازیں سنوں۔

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ میرے حریفوں نے جتنی بار پیش قدمی کرنی چاہی، میں نے انہیں روک دیا۔ میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ اس کے باوجود دو تین افراد میری فائرنگ سے ''ہٹ'' ہوئے۔ اس دوران میں، میں نے تیزی سے پوزیشنیں بدلیں، رائفل کے میگزین تبدیل کیے اور جیکی سے گفتگو بھی جاری رکھی۔ وہ میرے لیے میگزین بھر رہا تھا۔ میگزین کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر وہ اس میں اپنے اکلوتے ہاتھ سے گولیاں ٹھونس سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اور اس کا اندازہ اس کی باتوں سے ہورہا تھا۔ فائرنگ کے سماعت شکن شور میں وہ پکار کر بولا۔ ''شاباش... لڑتے ہوئے مرنا ہے، ڈرتے ہوئے نہیں مرنا۔''

''آپ بے فکر رہو۔ آخری گولی تک لڑوں گا۔'' میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں... نہیں۔ آخری گولی تک نہیں۔'' جیکی کی آواز ابھری۔

''کیا مطلب؟''

''آخری دو گولیاں بچا کر رکھنی ہیں۔ ایک میرے لیے... اور ایک، چاہو تو اپنے لیے۔''

یکایک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ مجھے جیسے کسی مست ہاتھی نے ٹکر دے ماری تھی۔ میں اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ ٹرپل ٹو رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میرا سر بڑے زور سے پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ آنکھوں میں نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا، مجھے دستی بم سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اضطراری عمل کے تحت میں نے اپنے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ صرف ایک ران میں سے خون رس رہا تھا۔ بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسی۔

''جیکی! آپ ٹھیک ہو؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بُری طرح کھانسنے لگا۔ لگتا تھا کہ اس کی سانس رک رہی ہے۔

میں نے گہرے اندھیرے میں رائفل کے لیے دیوانہ وار ہاتھ چلائے۔ وہ مجھے چیتل کی لاش سے پانچ چھ فٹ کی

http://digestpk.blogspot.com/

دوری پر ملی۔ میں لیٹے لیٹے پیچھے کی طرف کھسک آیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی دیواروں اور درختوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ گولیاں میرا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتیں یا شاید کسی بھی شخص کی موت ان گولیوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ ان گولیوں کا خوف دل و دماغ سے بالکل نکل گیا تھا۔ ہاں... اس کی جگہ دستی بم کے خوف نے لے لی تھی۔ مجھے پتا تھا، دستی بم ہوا میں قوس بناتا ہوا آئے گا اور کھنڈر کے اندر تک نقصان پہنچائے گا۔ میں اپنی رائفل کے ساتھ کچھ اور پیچھے ہٹ آیا اور تب مجھے دوسرا شدید ذہنی دھچکا لگا۔ میری ٹرپل ٹو رائفل استعمال کے قابل نہیں رہی تھی اور ایسا دستی بم کے زوردار دھماکے کے بعد ہوا تھا۔ دھماکے کے بعد رائفل کی لبلبی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور اپنی جگہ سے ایک ''رَتی'' بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔

''فائر کیوں نہیں کر رہے ہو؟'' جیکی نے چلّا کر پوچھا اور ایک بھرا ہوا میگزین میری طرف اچھالا۔

میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ سارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ ٹارچوں کی چند ایک روشنیاں کھنڈر کے عین سامنے پہنچ گئی تھیں۔ وہ لوگ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پانڈے کے کچھ کمانڈوز نے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی ہیں۔ یہ خطرناک کمانڈوز کسی بھی لمحے ''چارج'' کر کے اندر گھس سکتے تھے۔

کچھ دیر پہلے جیکی نے مجھ سے کہا تھا کہ دو گولیاں بچا کر رکھنا۔ گولیاں تو بہت سی بچی ہوئی تھیں لیکن انہیں چلانے والا ہتھیار بیکار ہو چکا تھا۔

تو پھر اب کیا کرنا ہو گا؟ میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

میرا دھیان اپنے شکاری چاقو کی طرف چلا گیا۔ تو کیا اس چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دیوانہ وار اس کھنڈر سے نکلوں اور رائفل برداروں پر جا پڑوں۔ کسی کو مار تو شاید نہ سکوں لیکن اپنے مرنے کا حق تو ادا کر دوں؟ پھر ذہن جیکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا کیا بنے گا؟ کیا وہ زندہ پانڈے کے ہتھے چڑھ جائے گا؟ کیا اسے اس انجام سے بچانے کے لیے میں اسے اپنے اس چاقو سے قتل کر سکتا ہوں؟

بے شک... بے شک میں بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن ابھی اتنا تبدیل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جان سے مار سکوں جس کی میں دل سے عزت کرنے لگا تھا... اور جان سے مارنے کا کام مجھے کرنا بھی چاقو سے تھا۔

مجھے اپنی ہمت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیکی بھی بھانپ چکا تھا کہ میرے فائرنگ نہ کرنے کا سبب کوئی گڑبڑ ہے۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟ وہ لوگ... وہ لوگ اندر گھسنے والے ہیں۔''

جیکی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی سفاک آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے رائفل پھینک کر چاقو نکال لیا اور آخری لمحات کے لیے تیار ہو گیا۔ میری ران سے رستا ہوا خون میرے پاؤں تک پہنچ رہا تھا اور اس کی نمی مجھے اپنی جوتی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یکا یک فائرنگ دھیمی ہوئی اور پھر تھم گئی۔ مجھے کچھ دور افتادہ آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ شیشم، سفیدے اور بلوط کے دیو قامت گھنے درختوں میں چند افراد چلّا چلّا کر باتیں کر رہے ہیں۔

تب ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ کھنڈر سے باہر ہر طرف شعلے رقص کرنے لگے۔ در و دیوار کی کرچیاں اڑنے لگیں اور شاخیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اب فائرنگ کا آہنگ اور ہے۔ اب فائرنگ کا سارا زور ہماری دائیں جانب تھا... اور یوں لگ رہا تھا کہ دائیں جانب سے جوابی فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔ چاروں طرف ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' جیکی کی آواز سنائی دی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' دھماکوں کے بے پناہ شور میں جیکی کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔

میرے دل میں ایک دم نقارہ سا بجا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہمارے ساتھی یہاں موقع پر پہنچ گئے ہوں؟ مگر پھر فوراً میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ ہمارے ساتھی باقی ہی کتنے بچے تھے۔ انور خاں، چوہان، اسحاق اور جیل سے رہائی پانے والے دو بندے... یعنی کُل پانچ افراد! مگر یہاں جس طرح کی فائرنگ ہو رہی تھی، لگتا تھا کہ یکا یک دو ڈھائی سو افراد پوری طاقت کے ساتھ ایک دوجے سے بھڑ گئے ہیں۔ ہر طرف للکارے گونج رہے تھے اور ہتھیاروں کی کھٹا کھٹ سنائی دیتی تھی۔ زخمیوں کی پکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گولیوں کے سرلائے اور دستی بموں کے دھماکے... میدانِ جنگ کا سا منظر تھا۔ دستی بم کے ایک سماعت شکن دھماکے کے بعد ایک جسم اڑتا ہوا سا ہمارے جھونپڑے نما کمرے کے سامنے آن گرا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ششدر رہ گیا۔ یہ شخص سبز وردی میں تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر سے [...] اور گردن پر سے مٹھی بھر گوشت صاف اڑ گیا تھا۔ غالباً وہ یہاں گرنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

جیکی نے بھی سبز وردی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ پکار کر بولا۔ ''یہ تو نل پانی کے لوگ ہیں۔''

''اور کافی تعداد میں ہیں۔'' میں نے اس کے فقرے میں اضافہ کیا۔

میرے لیے سب سے خوش آئند چیز وہ رائفل تھی جو سبز وردی والے کے ساتھ ہی چیتل کی لاش کے پاس گری تھی۔ میں نے رائفل پکڑی اور سرکتا ہوا پیچھے آ گیا۔ یہ رائفل میرے لیے بالکل اجنبی تھی لیکن تیار حالت میں تھی۔ میں نے ٹریگر دبایا تو زبردست تڑتڑاہٹ سے ایک برسٹ، لکڑی کی بوسیدہ چھت میں جا لگا اور بہت سی مٹی ہمارے اوپر گری۔

میرے رگ و پے میں اعتماد اور جوش کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے رائفل پر گرفت مضبوط کر دی اور ایک دیوار کی اوٹ لے کر چوکس بیٹھ گیا۔

دو تین پکارتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ ان میں سے ایک منحوس آواز پانڈے کی بھی تھی۔ وہ سخت طیش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ غالباً میری فائرنگ اسے شدید نقصان پہنچانے سے قاصر رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں دو تین مختصر وقفوں کے سوا زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے پستول سے لے کر برسٹ مارنے والی بڑی رائفلوں تک ہر طرح کا ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ چوٹ برابر کی ہے بلکہ نل پانی سے آنے والوں کو کچھ برتری حاصل ہے... مگر ایک جگہ ایسی تھی جہاں سے پانڈے کے دو تین ساتھی بڑی مؤثر فائرنگ کر رہے تھے اور مخالف فریق میں سے کسی کو آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ یہ جگہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہاں تین افراد جی تھری گن کے ساتھ موجود تھے۔

جیکی کا خیال بھی یہی تھا کہ جب تک پانڈے کے بندے ٹیلے والی جگہ پر موجود ہیں، ان کا پلڑا بھاری رہے گا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں آئی کہ میں یہاں اس کھنڈر کی پناہ گاہ کو چھوڑ کر نکلوں اور بھاگتا ہوا اس ٹیلے پر پہنچ جاؤں۔ اندھا دھند گولیاں برساؤں اور اپنے سامنے آنے والے ہر ذی روح کو چھلنی کر دوں۔ پھر نل پانی والوں کو میری لاش ٹیلے کی بلندی پر سے ملے۔ میرے جسم پر گولیوں کے ان گنت زخم ہوں۔ وہ لوگ میری لاش کو نل پانی لے جائیں... اور... میرے کردار پر لگے ہوئے بزدلی و کم ہمتی کے سارے داغ

سوچنے اور عمل کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا لیکن عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے اندر انقلاب ضرور آیا تھا مگر ابھی یہ انقلاب اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ میں ایسا بڑا قدم اٹھا سکتا۔

اچانک فائرنگ دھیمی پڑ گئی اور یوں لگا کہ فائرنگ کا آہنگ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ درختوں میں حرکت کرتی ہوئی روشنیاں تیزی سے بائیں طرف ہٹنے لگیں۔ جیکی نے پکار کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ پانڈے کے لوگ بھاگ رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد مجھے بھی لگا کہ جیکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے دو گھوڑوں کو برق رفتاری کے ساتھ اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ ان پر سبز اور خاکی وردیوں کی جھلک نظر آئی۔ دائیں طرف سے ہونے والی فائرنگ ایک دم زور پکڑ گئی تھی۔ جو فائرنگ بائیں جانب سے ہو رہی تھی، وہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ دور بھی چلی گئی تھی۔

یکا یک کھنڈر کے بالکل سامنے سے ایک گرجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''تابش.. تابش! تم کہاں ہو؟''

میری رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک جوش کی ایک لہر چلی اور پھیل گئی۔ یہ ہمارے یارِ غار... شیر دل انور خاں کی آواز تھی۔

میں نے پکارا۔ ''میں یہاں ہوں انور بھائی۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔

انور خاں اور اسحاق عقابوں کی طرح جھپٹتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ سبز وردیوں والے چار پانچ مسلح افراد بھی تھے۔ انور خاں کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ سر تا پا ایک جنگجو پٹھان نظر آتا تھا۔ ہم بغل گیر ہو گئے۔ وہ میرا ماتھا چوم کر بولا۔ ''یار! ایک دم کہاں چلے گئے تھے تم؟ بڑا پریشان کیا تم نے۔''

اسحاق بھی مجھ سے بغل گیر ہوا۔

یہ تفصیلی بات کا وقت نہیں تھا۔ اِکّا دُکّا فائر ابھی تک ہو رہے تھے۔

دو مسلح افراد جیکی کے پاس رک گئے۔ ہم کھنڈر سے باہر نکل آئے۔ مجھے سامنے ہی درختوں کے نیچے پانچ چھ افراد کی لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے زیادہ تر زرگاں کے تھے۔ ایک بارشی گڑھے میں ایک گھوڑا بھی مردہ پڑا تھا۔ ٹیلے کے اردگرد بھی جانی نقصان ہوا تھا... دو تین لاشیں میں نے اپنی

http://digestpk.blogspot.com/

آنکھوں سے دیکھیں۔ سبز وردیوں والے افراد زخمیوں کو اٹھا رہے تھے اور یہاں وہاں بکھرے ہتھیار اور پگڑیاں وغیرہ اکٹھی کررہے تھے۔ ایک شخص جھکا اور اس نے خودرو گھاس میں سے، دھات کی بنی ہوئی کوئی چیز اٹھائی۔ انور خاں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ ایک آہنی راڈ تھا۔ اس پر افقی رخ پر تین چار چھوٹے راڈ لگے ہوئے تھے۔ عقب میں ایک گول جالی سی تھی۔ دیکھنے میں یہ ٹی وی انٹینا جیسا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بھاگنے والے دیگر کئی چیزوں کی طرح یہ آلہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔

اسی دوران میں کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ یہ زبردست دوستانہ گرفت تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ اس کا زخمی کندھا پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ فائرنگ تھم چکی تھی لیکن ایک گرم ماؤزر ابھی تک چوہان کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ سب کیا ہے چوہان؟ اتنے سارے لوگ تمہارے ساتھ؟ ہم تو صرف چھ بندے باقی بچے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہم چھ نہیں، صرف پانچ بچے تھے۔ تم تو جوہڑ کے کنارے پیشاب کرنے کے بہانے نکل گئے تھے اور جس وجہ سے نکلے تھے، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں... بہر حال... یہ جو کچھ ہوا ہے، تم اسے اللہ کی مدد کہہ سکتے ہو۔ حالات ایک دم بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ابھی تمہیں تفصیل بتاتے ہیں۔'' چوہان نے کہا۔ اس کی آواز میں ایک جوشیلی لرزش تھی۔

انور خاں اور دیگر افراد ٹیلے پر چڑھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ یہاں اب نل پانی کے مسلح سپاہیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ٹیلے پر دو تناور درختوں کی اوٹ میں گولیوں کے بے شمار خول پڑے تھے اور ایک بڑی گن تھی۔ انور خاں نے بتایا کہ یہ جی تھری ہے۔ یہاں اس منظر میں موجود سب سے اہم چیز دو انسانی لاشیں تھیں۔ یہ دونوں پانڈے کے ساتھی تھے۔ ان کی سبز اور خاکی وردیاں لہو رنگ تھیں۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ ان کے جسم پر گولیاں نہیں لگیں بلکہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیے گئے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جی تھری گن چلانے والے ان دو افراد کی ہلاکت کے بعد ہی لڑائی ختم ہو سکی ہے۔ انور خاں نے یہ شان دار گن اور اس کا سارا فالتو ایمونیشن اپنے قبضے میں لے لیا۔ دونوں افراد کی خونچکاں لاشیں وہاں سے اٹھوا دی گئیں۔

جلد ہی ہم بارو ندا جیکی کے پاس چوکی کے کھنڈر میں واپس آگئے۔ یہاں اب بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب نل پانی کے سپاہی تھے۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ رنگ تھا۔ وہ جیکی میں بہت دلچسپی ظاہر کررہے تھے۔ جیکی نشے میں اوٹ پٹانگ بولتا چلا جارہا تھا۔ میں نے چوہان سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ نل پانی کے سپاہی تو اس معاملے میں غیر جانب دار تھے۔ وہ اس لڑائی میں کیسے آگئے؟''

''بس آگئے... بلکہ کود پڑے... اور علی الاعلان کود پڑے۔'' چوہان کی آواز میں چھپا ہوا جوش نمایاں ہو گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

اس نے میرا کندھا دبایا۔ گرفت میں جذباتی کیفیت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''نل پانی والے میدان میں آگئے ہیں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں تین جگہ زبردست ٹاکرا ہوا ہے۔''

اس دوران میں انور خاں نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''تابش! آؤ تمہیں اپنے اس ساتھی سے ملواؤں جس کی وجہ سے ہم حکم کے کتوں کو یہاں سے بھگانے میں کامیاب ہوئے۔''

''کون ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو اپنی جان سخت خطرے میں ڈال کر ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے جی تھری چلانے والے دو سپاہیوں پر تلوار کے وار کیے اور ان کا قصہ پاک کیا۔''

انور خاں اور چوہان مجھے لے کر گھنے درختوں میں گھسے۔ یہاں ابھی تک دھواں اور بارود کی بو تھی۔ ایک جگہ خشک جھاڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یقیناً ایسا کسی دستی بم کے دھماکے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے قریب ہی زمین پر دو تین زخمی پڑے ہوئے تھے۔ انور خاں نے مجھے، چادر میں لپٹے ہوئے ایک زخمی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ایک نوجوان لڑکا اس زخمی کے پاؤں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ زخمی کوئی عورت ہے۔ اچانک وہ عورت حرکت میں آئی... اور میرے قدموں میں گر پڑی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کی آواز نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ کوئی اور نہیں سلطانہ تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن وہ میرے پاؤں سے لپٹی رہی۔

''مجھے معاف کر دو مہروج... مجھے معاف کر دو۔'' وہ بس یہی کہتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا منہ سر لپیٹ لیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اپنی شکل بھی دکھانا نہیں چاہ رہی تھی۔ چوہان نے نوعمر لڑکے کے بہ مشکل میرے قدموں سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلو کے بل ایک طرف جا پڑی۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں پوشیدہ تھا۔

انور خاں مجھے دلاسا دیتے ہوئے ایک طرف لے گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کیا ہے؟''

انور خاں نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تابی! ہمارے بعد نل پانی اور زرگاں میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ اس حرام زادی ماریا کے ہمارے ہاتھ سے نکلنے کے بعد حکم اور جارج ایک دم شیر ہو گئے ہیں۔ وہ بڑے جوش میں ہیں اور جوش میں بندے سے بے وقوفیاں بھی ہوتی ہیں۔ حکم جی نے کل دوپہر پورے بیس بندوں کو زرگاں کی جیل سے نکال کر سرِ عام سولی چڑھا دیا ہے۔ ان پر بغاوت اور غداری کے الزام لگائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے پچھلے بدھ کی صبح جارج کی رہائش گاہ پر حملہ کیا اور وہاں سے سلطانہ اور اس کے بچے کو نکالا۔''

''یہ تو واقعی ظلم ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''اس ظلم نے پوری اسٹیٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ نے اب تک بہت تحمل سے کام لیا ہے... لیکن اب حالات کو سنبھالنا ان کے بس میں بھی نہیں رہا۔ کل سہ پہر حکم جی کے کچھ سپاہی نل پانی کی ایک قریبی بستی میں گھس گئے۔ وہ وہاں اپنے دو مزدور قیدیوں کو پکڑنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مراد شاہ کا ہم زلف بھی ہے۔ اس واقعے کے بعد حکم جی اور چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں جھڑپ ہو گئی۔ یہ پہلی براہِ راست جھڑپ تھی اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے زوردار لڑائی میں بدل گئی۔ وہاں دونوں طرف کے کم از کم چالیس بندے مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو زبردست جھڑپیں اور ہوئی ہیں جن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے والی جھڑپ بھی شامل ہے۔''

یہ اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ سلطانہ آپ کو کہاں ملی؟''

''مراد شاہ کے حکم پر کچھ لوگ نل پانی سے ہمیں تلاش کرنے کے لیے نکلے تھے۔ سلطانہ بھی اصرار کر کے ان میں شامل ہو گئی۔ ساتھ میں جو نوعمر لڑکا ہے، وہ اس کا بھتیجا طلال ہے۔ ان لوگوں سے ہماری ملاقات وہیں جوہڑ کے کنارے پر ہو گئی جہاں سے تم پرسوں رات رفوچکر ہوئے تھے۔ سلطانہ کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ تم ہمارے ساتھ موجود نہیں ہو۔ ہم بھی تمہارے لیے پریشان تھے۔ ہم کل رات تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ پھر ہمیں خبر ملی کہ پانڈے اور اس کے ساتھ ستّر ساتھی پرانی چوکی پر موجود ہیں۔ انہوں نے چوکی کے گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پانڈے نے جس شخص کو گھیر رکھا ہے، وہ تم ہی ہو۔ جیکی کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ یہاں پہنچ گئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھا ہی ہے۔''

''بہت وقت پر پہنچے تم لوگ۔ میں تقریباً بے بس ہو چکا تھا۔ تم نے میری رائفل دیکھی ہی ہے، اس کا بیرل ہی بیکار ہو گیا تھا۔''

''شاید ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر لگتی لیکن یہاں پہلے سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ نے ہمیں راستہ دکھایا۔''

''سلطانہ کیسے زخمی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ہمیشہ کے لیے

ایک جگہ دعوت تھی۔ بہت سے مہمان جمع تھے۔ ان مہمانوں میں مارک ٹوئین اور ایک نوجوان مصنف بھی شامل تھے۔ جب سارے مہمان کھانا کھا چکے تو وہ گھر کی آرائش و زیبائش دیکھنے میں محو ہو گئے۔ نوجوان مصنف کی نظر کتابوں کی ایک خوب صورت الماری پر پڑی۔ وہ کتابیں دیکھنے لگا، اس کو چند کتابیں بہت پسند آئیں۔ اس نے میزبان سے کہا۔ ''جناب والا! کیا یہ چند کتابیں آپ کچھ دنوں کے لیے عاریتاً دے سکتے ہیں؟''

میزبان نے صاف انکار کر دیا۔ ''نہیں... ہرگز نہیں۔''

نوجوان مصنف کو بڑی تکلیف پہنچی۔ مارک ٹوئین نے اس کی یہ حالت جو دیکھی تو کہا۔ ''دوست! تمہیں میزبان کے انکار سے آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ کتابیں عاریتاً لے جاتے ہیں اور پھر واپس نہیں کرتے، ذرا خیال تو کرو، یہ ساری کتابیں ایسی ہی تو ہیں جنہیں ہمارے میزبان نے وقتاً فوقتاً عاریتاً حاصل کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس الماری میں جگہ پا گئیں۔''

نائلہ علی کی کراچی سے کاوش

http://digestpk.blogspot.com/

جیسے ایک بہادر سپاہی ہوتا ہے۔" انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑی انوکھی لڑکی ہے تابش! اور اس کا انوکھا پن پچھلے دو تین سالوں میں بہت دفعہ ثابت ہوا ہے۔ تم تو بہت سی باتیں بھول چکے ہو لیکن حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔"

"سلطانہ نے لڑائی میں حصہ لیا ہے؟"

"حصہ ہی نہیں لیا، لڑائی جیتی بھی ہے۔" وہ بہت جذباتی انداز میں بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ "یقیناً تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ جی تھری اور اس کو چلانے والوں کو سلطانہ نے ہی ٹھنڈا کیا ہے۔ لڑائی کے دوران میں پتا نہیں وہ کس وقت پیچھے سے آئی اور اپنے بھتیجے طلال راجپوت کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئی۔ دونوں کے پاس خاندانی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جی تھری چلانے والوں کو چیر کر رکھ دیا۔ پھر ہمیں آوازیں دیں کہ ہم ٹیلے پر آجائیں۔"

میں سناٹے میں تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ "وہ زیادہ زخمی تو نہیں؟"

"نہیں، پاؤں اور ٹانگ پر ایک دو زخم آئے ہیں۔ چوہان اسے سنبھال لے گا۔"

"اور بچہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ وہیں نل پانی میں... چاچا عبدالغنی کے پاس۔ سنا ہے کہ وہ اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی۔ وہ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اب ایک اور عورت اسے دودھ پلا رہی ہے۔"

میں کچھ نہیں بولا۔ انور خاں بھی خاموش رہا۔ کوئی زخمی بلند آواز سے چلّا رہا تھا۔ پس منظر میں گھوڑوں کی مضطرب ہنہناہٹ سنائی دیتی تھی۔ نل پانی کے باوردی سپاہی پوری طرح چوکس تھے۔ ان میں سے بیشتر کی رائفلیں ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھیں۔

انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اسے تمہاری بہت زیادہ ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ جو زخم اسے لگا ہے اسے صرف تم ہی بھر سکتے ہو۔"

"میں کیا کروں؟"

"میں اس بارے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ سلطانہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنے شوہر کو زبانی کلامی نہیں، واقعی مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ تم اگر ٹھان لو کہ تم نے اسے نارمل کرنا ہے تو یہ ناممکن نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، سیٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بار بار ابھر رہی تھی۔ پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ ایک باوردی شخص نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی پر ہلکے پیلے رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں اعلیٰ عہدہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی انٹینا نما شے تھی جو ٹیلے کے پاس جھاڑیوں سے ملی تھی۔ سیٹی یا بیپ کی آواز اسی میں سے آرہی تھی۔ اس باوردی شخص نے انور خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھائی! اس میں سے یہ آواز آرہی ہے۔ شاید اس کا کوئی کھٹکا دب گیا ہے۔"

آواز کے ساتھ ساتھ انٹینا پر ایک ننھا سا بلب بھی اسپارک کر رہا تھا۔ اسی دوران میں چوہان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انٹینے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چوہان نے باوردی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اجے! انٹینے کو لے کر ٹیلے کی طرف جاؤ۔"

اجے نامی وہ شخص انٹینے کے ساتھ ٹیلے کی طرف بڑھا۔ جب وہ پچاس ساٹھ قدم چلا گیا تو چوہان نے پکار کر پوچھا۔ "سیٹی کی آواز کم ہوئی؟"

"ہاں... لگت ہے کہ ذرا کم ہوگئی ہے۔" اجے نے بھی پکار کر کہا۔

"اب اور آگے جاؤ۔"

اجے پھر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد چوہان نے پھر بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ اس بار بھی اجے کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے کہا۔ "ہاں... کچھ اور کم ہوئی ہے۔"

چوہان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "کچھ سمجھ میں آیا؟"

میرے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ ایک دم میرا ذہن اصل صورتِ حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو یہی وہ ریسیور تھا جس کے ذریعے میرا کھوج لگایا جاتا تھا... اور یہی ریسیور پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو مقناطیس کی طرح یہاں اس کھنڈر چوکی تک کھینچ لایا تھا۔

اردگرد اور لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر اس بارے میں تبصرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اور چوہان ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

میرا بھوک سے بُرا حال تھا۔ دیکھا جاتا تو پچھلے تقریباً 48 گھنٹے سے میرے منہ میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں گیا تھا... انور خاں نے میری صورت سے ہی میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے فوری طور پر میرے لیے خشک گوشت اور پانی کا انتظام کیا۔ نمکین گوشت کے چند ٹکڑے کھا کر اور

ٹھنڈا پانی پی کر میرے جسم میں جیسے جان آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ بھوک اور ذائقے کا آپس میں کتنا گہرا اور حیرت انگیز تعلق ہے۔ بھوک نہ ہو تو فائیو اسٹار ہوٹل کا بوفے بھی بیکار اور بھوک ہو تو روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھی ہفت رنگ دسترخوان کی طرح۔

اجالا ہونے سے پہلے ہی ہم نل پانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیکی بھی ایک گھوڑے پر سوار ہمارے ساتھ تھا۔ پانڈے کے ساتھیوں میں سے تین افراد زخمی حالت میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی مشکیں کس کے انہیں اوندھے منہ گھوڑوں پر لاد دیا گیا تھا۔ اس خوں ریز لڑائی میں پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے چودہ ساتھی ہلاک ہوئے تھے۔ اجے اور انور خاں کے ساتھیوں میں سے آٹھ نو بندوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو بعدازاں چھکڑوں کے ذریعے وہاں سے ہٹایا جانا تھا۔ نو دس بجے کے قریب ہم نل پانی میں داخل ہو گئے۔ پہلی بار میں چند ہفتے پہلے سلطانہ اور رستم کے ساتھ اس خوب صورت بستی میں داخل ہوا تھا۔ اس بار بھی سلطانہ میرے ساتھ تھی لیکن کسی اجنبی کی طرح۔ راستے میں بھی وہ بالکل الگ تھلگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور منہ سر لپیٹے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ وہ بس اپنے بھتیجے طلال سے تھوڑی بہت بات کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں عجیب سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔

نیلی جھیل کے کنارے نل پانی کی بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ نیم پختہ راستوں پر گھوڑا گاڑیاں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ گھاگرے چولی والی عورتیں اور رنگ برنگی پگڑیوں والے مرد روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ سرسبز ڈھلوانوں پر بکریوں اور گائے بھینسوں کے ریوڑ چر رہے تھے۔ جھیل پر تیرتی کشتیوں کے پس منظر میں پُرشکوہ عمارتوں کے کلس سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ یہ واقعی ایک دلکش بستی تھی۔

نل پانی میں مجھے دو نئی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو ہر چہرے پر ایک جوش سا تھا۔ دوسرے میں نے کئی نوجوانوں کے کندھوں پر رائفلیں دیکھیں۔ مجھے لگا ایسا موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ ہم بستی کے بارونق علاقے میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔ کچھ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں بھی لوگ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور نعرے لگائے۔ ایک چوک میں کچھ جوشیلے نوجوانوں نے اجے کو گھیر لیا اور اس کے ساتھ انور خاں کو بھی۔ پھر ان دونوں کو کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔ صورتِ حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج رات کھنڈر کے سامنے والی بھڑپ اور جیت کی خبر عام لوگوں تک پہنچ چکی ہے۔

ہمیں سیدھا دیوان میں لے جایا گیا۔ دیوان کے صدر دروازے پر ہم نے جھومتے ہوئے ہاتھی دیکھے۔ دیوان، وہی وسیع و عریض عمارت تھی جس کے اندرونی حصے میں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ وغیرہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں، میں نے چھوٹے سرکار کی عدالتی کارروائی بھی دیکھی تھی۔ چوہان مجھے لے کر تین چار کمروں کی ایک خوب صورت رہائش گاہ میں آگیا۔

"سلطانہ کہاں ہے؟" میں نے چوہان سے پوچھا۔

"یہیں پر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

"لیکن مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ چاچا عبدالغنی کے گھر میں ہے؟"

"حالات خراب ہو گئے ہیں۔ عبدالغنی کے گھر میں اسے خطرہ ہو سکتا تھا۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر اسے یہاں لایا گیا ہے۔"

"اور بچہ؟"

اس سے پہلے کہ چوہان جواب میں کچھ کہتا، بچے نے خود ہی جواب دے دیا۔ اس کے رونے کی آواز آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک ملازمہ بچے کو گلے سے لگائے اس کی پیٹھ تھپکتی ہوئی برآمدے میں سے گزری۔

"یہی مسلمان عورت ہے جو تمہارے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ میرے خیال میں صفیہ نام ہے اس کا۔ اس کا اپنا بچہ بھی یہیں پر ہے۔"

اسی دوران میں عقبی کمرے سے سلطانہ کے کراہنے کی آواز آئی۔ چوہان مدھم آواز میں بولا۔ "سلطانہ کو معمول پر لانے کے لیے تمہارے پاس یہ بہترین موقع ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اسے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ تمہاری ہمدردی اس کے لیے مرہم کا کام دے گی۔ تمہاری خاطر اس نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں تابش! اب وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ سمجھو کہ نیم مردہ ہو گئی ہے۔ تم اسے سہارا دو گے تو پھر سے جی اٹھے گی۔"

چوہان نے اپنے بیگ میں سے چند دوائیں نکال کر مجھے دے دیں۔

بارونداجیکی کو بھی دیوان کے اندر ہی ایک دوسری جگہ رکھا گیا تھا۔ چوہان نے مجھے اس کے بارے میں تسلی دی کہ وہ بالکل خیریت سے اور محفوظ جگہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اسے وافر مقدار میں شراب بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ چوکی کے کھنڈر

http://digestpk.blogspot.com/

میں جیکی کے ساتھ اپنی ڈرامائی ملاقات کی تفصیل میں انور خاں اور چوہان کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔

اس گھر میں میرے، سلطانہ اور بالو کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔ ایک تو وہی صفیہ نامی عورت جو بالو کو دودھ پلا رہی تھی۔ دوسرا گونگا ملازم ہاشم اور تیسرا سلطانہ کا جواں سال بھتیجا طلال۔ طلال کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم کھلے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے وہ دو چار سال بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ اجلا اور آنکھوں میں دلیرانہ چمک تھی۔ وہ سلطانہ کو بڑی محبت سے چچی جی کہتا تھا۔ میں نے اسے بس دو چار دفعہ ہی بولتے سنا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں خاموشی سے سلطانہ کے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس چوہان کا دیا ہوا مرہم اور پٹی وغیرہ تھی۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ فرش پر کپاس کی پھول دار چٹائی بچھی تھی اور اس کے پھول لالٹین کی زرد روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے سرہانے دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ رہی تھی۔ اس کا زخمی پاؤں جس پر پٹی بندھی تھی، کمبل سے باہر تھا۔ میں نے پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے زخمی پاؤں کو چھوا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف، گریز، شرمندگی، بہت کچھ یکجا ہو گیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''مہروج... یہ... کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارے پاؤں پر دوا لگانے لگا ہوں۔''

''خدا کے لیے ناہیں... ایسا مت کرو... مجھے گناہ گار نہ کرو۔'' اس نے اپنا پاؤں سمیٹ کر کمبل میں کر لیا۔

''اس میں گناہ والی کیا بات ہے؟''

''ناہیں... تم میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگاؤ۔ اس سے مجھے گناہ لگے گا۔''

''کیوں؟ کیا اس لیے کہ میں تمہارا شوہر ہوں؟''

اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''تو اگر میں تمہارا شوہر ہوں تو تم مجھ سے دور کیوں ہو... میری بات کیوں نہیں مان رہیں؟''

''میں نے تمہیں کہا ہے نا، میں تمہارے قابل ناہیں۔ میری ناپاکی تمہیں بھی ناپاک کر دے گی۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں مہروج! میرے بچے کو لے کر مجھ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ میں ناہیں چاہتی کہ میری چھایا بھی تم دونوں پر پڑے۔''

''دیکھو سلطانہ! جو کچھ ہوا، وہ بُرا تھا لیکن جو کچھ تم اب کر رہی ہو یہ بہت ہی بُرا ہے۔ ایک طرف تم مجھے اپنا شوہر کہتی ہو، دوسری طرف تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میں دوا لگانے کے لیے ہی تمہارے جسم کو ہاتھ لگاؤں۔ تم اس معصوم بچے کو بھی بھوکا مار رہی ہو جس کی خوراک اللہ نے تمہارے جسم کے اندر رکھی ہے۔ تم دنیا میں کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کے ساتھ اس طرح کا ظلم ہوا ہے۔ بے شک وہ تکلیف دہ حادثہ تھا لیکن ایسے حادثوں کے بعد بھی لوگ سنبھلتے ہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہیں اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اب تک قصوروار نہیں سمجھا لیکن اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گی تو میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

اس نے سر جھکا لیا اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ کتنا فرق تھا اس سلطانہ میں اور اس سلطانہ میں جو کل رات کھنڈر کے سامنے اچانک اپنی خاندانی تلوار سونت کر نکلی تھی اور ٹیلے پر چڑھ گئی تھی۔ اس نے وہ کیا تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکا تھا۔ وہ واقعی انوکھی تھی۔

میں نے ذرا تحکم سے کہا۔ ''اپنا پاؤں باہر نکالو۔'' وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ''میں نے کہا ہے، پاؤں باہر نکالو۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

اس مرتبہ اس نے پاؤں سرکا کر کمبل سے باہر نکال دیا۔ میں نے اس کی وہ پٹی کھولی جو علی الصباح جنگل میں باندھی گئی تھی۔ اس کے پاؤں پر اوپر کی طرف زخم آیا تھا۔ غالباً دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا یہاں۔ میں نے چوہان کی ہدایت کے مطابق زخم کو روئی سے صاف کر کے مرہم لگایا اور تازہ پٹی باندھ دی۔ اس کی پیشانی اور رخساروں پر بھی نیل موجود تھے۔ دوسرا زخم اس کی کہنی پر تھا۔ میں نے یہاں بھی دوا لگائی اور پٹی باندھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ میں نے کچھ عرصے پہلے جب اسے پہلی بار ایک نیم تاریک کھوہ میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک نہایت مضبوط اور باہمت لڑکی نظر آئی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ شاید اس لڑکی کی آنکھ میں کبھی آنسو نہیں آیا ہوگا اور شاید اس نے کبھی آہ بھی نہ بھری ہوگی... اور آنے والے دنوں میں وہ واقعی ایسی ہی نکلی تھی۔ میں نے اسے کئی مشکلوں کا سامنا مردانہ وار کرتے دیکھا تھا لیکن یہ جو آخری آفت اس پر ٹوٹی تھی، اس نے اسے واقعی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے حصے میں آنے والے تمام آنسو انہی دو چار دنوں میں بہا دینا چاہتی ہے۔ کچھ احساسات پر انسان کا بس نہیں ہوتا، شاید سلطانہ بھی ایسے ہی احساسات کی زد میں تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھا رہا اور اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اس حوالے سے اس پر اپنی احسان مندی ظاہر کی کہ وہ کل رات میرے

لیے بہت نیک شگون ثابت ہوئی ہے... اور حقیقت بھی یہی تھی کہ کل رات کھنڈر کے سامنے ہونے والی خونی لڑائی میں سلطانہ کا انوکھا کردار پوری طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ اگر اپنے بھتیجے طلال کے ہمراہ دیوانہ وار ٹیلے پر نہ پہنچتی اور جی تھری چلانے والوں پر ٹوٹ نہ پڑتی تو شاید... صورتِ حال کیا سے کیا ہو جاتی... اور شاید میں بھی اس وقت یہاں اس آرام دہ کمرے میں زندہ سلامت موجود نہ ہوتا۔

وہ سب کچھ سنتی رہی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ بس اس کے کان سن رہے ہیں۔ اس کا باقی سارا جسم میرے الفاظ کی نرمی، شیرینی اور محبت سے لاتعلق ہے۔ وہ بس میری فرماں برداری کر رہی تھی کہ میرے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں چھ سات ماہ کے بالو نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا بلند ہوتا گیا۔ اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ ترس آنے لگا۔ جواں سال عورت صفیہ اسے شاید دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی... وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہوتا تھا پھر آہ و پکار شروع کر دیتا تھا۔

''یہ آواز سن کر تمہارا دل نہیں کانپتا سلطانہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے اِچ تو تمہاری منت کرتی ہوں کہ اسے مجھ سے کہیں دور لے جاؤ۔ جن بچوں کی مائیں ان کے جنم کے وخت اِچ مر جاتی ہیں، وہ بھی تو جندہ رہتے ہیں اور پل جاتے ہیں۔ یہ تو پھر چھ سات ماہ کا ہے۔''

''تم اتنی پتھر کیوں ہو گئی ہو سلطانہ! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔''

''میں کیا کروں مہروج! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے اپنے جسم سے گھن آتی ہے۔ میں اس قابل ناہیں ہوں مہروج کہ اپنے بچے کو اپنی گود میں لے کر پیار کروں۔''

''تم ہو... تم ہو اس قابل۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''اور تمہیں ایسا کرنا پڑے گا... اگر نہیں کرو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم میری بیوی نہیں ہو اور نہ میں تمہارا شوہر ہوں۔''

میرے لب و لہجے نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے عقب میں سرخ انگارہ تھیں۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں جا کر بالو کو لے آیا۔ اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا لیکن ننھا سا سینہ مسلسل ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔

میں نے اسے زبردستی سلطانہ کی گود میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لیے تو لگا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے گی لیکن پھر

[illegible]

سے اس نے اسے بانہوں میں لے لیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ اس کے اناروں جیسے رخسار زرد ہو چکے تھے۔ ہونٹ سفید تھے اور جسم کی لرزش کچھ اس طرح تھی جیسے اسے تپ لرزہ ہو گیا ہو۔

بالو اس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنی گول گول پیاری آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا گیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ جیسے کہہ رہا ہو... 'مجھ سے دور کیوں ہو گئی ہو؟ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔'

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بالو کو دودھ پلائے لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کر سکے گی یا نہیں۔ میں اس پر ایک دم زیادہ دباؤ بھی ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اور بچے کو ایک ساتھ چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو بالو ایک بار پھر زور و شور سے رو رہا تھا۔ اس وقت اس کے رونے میں ایک طرح کا درد بھی لہریں لے رہا تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر اٹھ کر سلطانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ بالو اور سلطانہ دونوں بستر پر موجود نہیں تھے۔ جواں سال ملازمہ صفیہ کمرے کے وسط میں پریشان کھڑی تھی۔

بالو کے رونے کی آواز غسل خانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں غسل خانے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا لیکن کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سلطانہ بالو کو نیم گرم پانی سے نہلا رہی تھی۔ وہ بالکل عریاں تھا اور اس کا سارا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سلطانہ ایک پتھر سے جسے جھانواں بھی کہا جاتا ہے، بالو کے نازک جسم کو رگڑ رہی تھی۔ وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں گرجا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے بالو کو اس کے صابن لگے ہاتھوں سے چھین لیا۔ وہ بیٹھ گئی اور دیوار سے سر ٹکا کر پھر رونے لگی۔

اس نے بالو کو اتنے زور سے رگڑا تھا کہ کئی جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ ''تم اپنے ہوش میں تو ہو... یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

''مہروج! تم نے بہت غلط کیا۔ اس کو میری گود میں ڈال دیا... تم کیوں اسے بھی میری طرح گلیج کر دینا چاہتے ہو؟''

میں نے سلطانہ کو چند جھڑکیاں دیں اور بالو کو تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا۔ سلطانہ نے غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ملازمہ صفیہ نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر

http://digestpk.blogspot.com/

اس نے نہیں کھولا۔ پہلے تو مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھے مگر پھر پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی نہا رہی ہے۔

ملازمہ صفیہ نے بچے کو اپنا دودھ پلایا اور میں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ میری نگاہ بار بار اس کے معصوم چہرے پر ٹک جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا یہ واقعی میرا بچہ ہے... میرا خون؟

سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے کوئی خاص لگاوٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ جس طرح معصوم بچے نگاہوں کو پیارے لگتے ہیں، یہ بھی مجھے پیارا لگتا تھا۔ بس... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

سلطانہ کا غسل طویل ہوتا جا رہا تھا۔ شاید وہ خود بھی کھرچ کھرچ کر نہا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ صفیہ کے آوازیں دینے پر ہی باہر نکلی۔ اس نے اپنا منہ سر اوڑھنی میں لپیٹ رکھا تھا۔ گیلے بال کمر پر جھول رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھے بغیر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ جب وہ کمبل اوڑھ رہی تھی، میں نے اس کے دونوں ہاتھ دیکھے۔ اس نے اپنے بدن کے ساتھ بھی بالو والی سختی روا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بازو جھانوے کی رگڑوں سے سرخ ہو رہے تھے۔ یقیناً یہی صورتِ حال اس کے پورے جسم کی رہی ہوگی۔ میرے ذہن میں پھر چنگاریاں سی بھر گئیں۔ جارج گورا کی منحوس صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ پتا نہیں اس رات اس خبیث نے سلطانہ کے جسم اور روح پر کتنے زخم لگائے تھے۔ یقیناً یہ اس رات کی تلخ یادیں ہی تھیں جنہوں نے اسے نیم دیوانہ کیا ہوا تھا۔

وہ لیٹ گئی تو میں نے بالو کو پھر اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ بس کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے دونوں ماں بیٹے پر کمبل اچھی طرح ڈال دیا۔ سلطانہ کے پاؤں کی پٹی بھیگ کر اتر چکی تھی۔ میں نے سلطانہ کے منع کرنے کے باوجود تازہ پٹی باندھی اور کہنی کی پٹی بھی بدل دی۔

اب صبح ہونے والی تھی۔ میں بستر پر چت لیٹا رہا اور سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے رویے میں تھوڑی سی نرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اگلے دو چار دن میں وہ خود کو مزید سنبھال لے۔ تاہم ڈاکٹر چوہان نے کہا تھا کہ سلطانہ کو مکمل طور پر نارمل کرنے کے لیے مجھے بہت تعاون کرنا ہوگا۔

ہماری میزبانی میں یہاں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جا رہی تھی۔ بہترین رہائش اور کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ شام کو میری ملاقات اپنے سابقہ میزبان چاچا عبدالغنی سے بھی ہوئی۔ ان سے اسٹیٹ کے ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملیں۔ کئی جگہ نل پانی اور زرگاں کے سپاہیوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں اور اب کسی بڑی لڑائی کی توقع کی جا رہی تھی۔ عبدالغنی نے یہ بھی بتایا کہ زرگاں میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے لوگوں کو موقع ملتا ہے، وہ زرگاں کو اور حکم جی کو چھوڑ کر نل پانی کی طرف آ جاتے ہیں۔

عبدالغنی صاحب سلطانہ کے بارے میں بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”وہ ایک خوددار اور غیور خاندان سے ہے۔ جارج گورا اس کی انا اور پندار کا دشمن تھا۔ آخرکار وہ اس کو رسوا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس واخعے (واقعے) نے سلطانہ کے دل پر ایک بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ مجھے ناہیں لگتا کہ یہ گھاؤ کبھی بھر سکیں گا۔“

میں سلطانہ کے والد اور بھائی سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ان دونوں سے تو فوری طور پر ملاقات نہیں ہو سکی تاہم رات کے کھانے کے فوراً بعد حجام عبدالرحیم ملنے کے لیے آ گیا۔ ماریا کے بدلے کُل سات افراد کو جارج کی جیل سے رہائی ملی تھی۔ ان سات میں سے صرف دو افراد جان بچا کر نل پانی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے اور عبدالرحیم ان دو خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔

چوہان نے عبدالرحیم کو وہ سب بتا دیا تھا جو میری یادداشت کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں، میں پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں فراموش کر چکا تھا۔ عبدالرحیم کو اس کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا تھا... کیا میں یہ بات بھی بھولا ہوا ہوں؟ کیا مجھے یہ واقعہ بھی یاد نہیں ہے؟ وہ مجھے میرے پرانے نام ”مہروز“ سے ہی مخاطب کرتا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ ”مہروز بھائی! وہ دن مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سلطانہ بی بی بہت خوش نظر آوت تھی۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہت تھی۔ اسے ڈر رہت تھا کہ تم کہیں گم نہ ہو جاؤ... پھر جارج گورا صاحب کے کارندوں میں سے کوئی تم کو نقصان نہ پہنچا دے۔ تم بولتے بھی تو بہت کم تھے۔ ہر وقت بس کھوئے کھوئے رہت تھے۔ یوں لگت تھا کہ ہر بات، کو ان سنی کر دیتے ہو۔ ایک دن سلطانہ بڑی گھبرائی ہوئی میری دکان میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ رحیم بھائی! آپ نے مہروز کو تو ناہیں دیکھا؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ اور بھی گھبرا گئی۔ بالکل جیسے تم کوئی چھوٹے سے بچے ہو۔ اس سے اپنی انگلی چھڑا کر بھاگ گئے ہو۔ وہ دیوانوں کی طرح تم کو ڈھونڈتی رہی۔ میں، طلال، ہاشم اور مختار صاحب بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ آخر تم دوپہر کے وقت ایک باغ سے ملے۔ تمہاری جھولی میں گیندے اور موتیے کے بہت سارے پھول تھے۔ تم نے یہ پھول سلطانہ کو دے دیے اور محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سلطانہ تمہیں دیکھ کر رونے لگت تھی۔ بعد میں پتا ہے اس نے کیا کیا تھا؟“

”کیا کیا تھا؟“

”اس نے ان سارے پھولوں کو دھاگے میں پرویا تھا۔ اس کے گجرے، بُندے اور ہار وغیرہ بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے یہ زیور پہنا تھا۔ اس نے کبھی کوئی زیور ناہیں پہنا۔ وہ پہلا زیور تھا جو اس نے تمہاری وجہ سے پہنا... اور بعد میں بھی وہ کبھی کبھی گیندے اور موتیے کا زیور پہنتی رہی۔“

مجھے یاد آیا کہ جب میں سلطانہ سے پہلی بار نیم تاریک کھوہ میں ملا تھا، تب بھی مجھے اس کے بالوں کے جوڑے میں موتیے اور گیندے کے پھول نظر آئے تھے۔

عبدالرحیم جذباتی انداز میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں پوجنے کی حد تک پیار کرنے لگت تھی۔ اس کو تمہارے علاوہ جیسے کوئی کام ہی ناہیں تھا۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا، تمہیں وقت پر دوا دینا بلکہ تمہیں نہلانا دھلانا تک اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جو کچھ تمہیں پسند ہووت تھا وہ خود بھی آنکھیں بند کر کے اسے پسند کرنے لگت تھی۔ لوگن کہوت ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد عورت کا پریم دو خانوں میں بٹ جاوت ہے۔ لیکن ہم سب جانت ہیں کہ کم از کم سلطانہ بی بی کے معاملے میں تو ایسا ناہیں ہوا۔ ایسا لگت تھا اور اب بھی لگت ہے کہ اس کا جینا مرنا صرف اور صرف تمہارے لیے ہے...“

عبدالرحیم باتیں کر رہا تھا مگر میں ابھی تک گیندے اور موتیے کے پھولوں میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے کچھ بہت پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ لاہور یاد آ رہا تھا، باغ جناح یاد آ رہا تھا اور ثروت یاد آ رہی تھی۔ گیندے اور موتیے کے پھول تو ثروت کو بھی پسند تھے۔ وہ ان کی مشترکہ خوشبو سے مدہوش ہو جایا کرتی تھی۔ یہ دونوں پھول اس پر علیحدہ علیحدہ تو کچھ خاص اثر نہیں کرتے تھے لیکن ان کی ”اشتراکی“ باس اس کے دل کی گہرائی میں اتر جاتی تھی۔ میں اس کے لیے جب بھی پھول لیتا تھا، وہ یہی دونوں ہوتے تھے... تو کیا میں دو ڈھائی سال کے عالمِ بے خبری میں بھی کچھ ایسے کام کرتا رہا ہوں جن کا تعلق ثروت اور اس کی محبت سے تھا؟

[illegible]
چلا گیا۔ نل پانی کی گلیوں میں گاہے بگاہے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آتی تھیں اور کچھ ایسے نعرے گونجتے تھے جن پر جنگی للکاروں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کی موجودہ کشیدہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ میں جیکی سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ بے شک یہاں پہنچتے ہی اسے وافر مقدار میں شراب مل گئی تھی اور اس حوالے سے وہ میرا محتاج نہیں رہا تھا... پھر بھی ہم دونوں کے درمیان ایک تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے سلطانہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ حسبِ معمول منہ سر لپیٹے لیٹی ہوئی تھی، تاہم یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ بالو اس کے پہلو میں تھا۔ میں بارونڈا جیکی کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا محلِ وقوع مجھے ڈاکٹر چوہان نے بتا دیا تھا۔ وہ دیوان خانے کے اندر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ایک باغیچے کی روش پر سے گزرا۔ یہاں چاندنی رات میں فواروں کا پانی چمک رہا تھا اور مصنوعی جھرنوں کی قلقل تھی۔ پھولوں کے تختوں کے آس پاس پتھریلی کرسیوں پر خوش لباس مرد و زن بیٹھے تھے۔ تاہم ہر چہرے پر سنجیدگی نظر آتی تھی۔ ایک دم میں چونکا۔ مجھے موتیے کی مسحور کن مہک محسوس ہوئی۔ میں نے ایک کیاری میں سے کچھ پھول توڑ لیے۔ ایک باوردی ملازم نے ادب سے پوچھا۔ ”میں جناب کی کچھ خدمت کر سکت ہوں؟“

”یہاں کہیں گیندے کے پھول بھی ہوں گے؟“

”یہاں تو ناہیں سرکار۔ ساتھ والی بڑی باغیچی میں ہوں گے۔ میں ابھی لا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ دو منٹ بعد وہ ایک گول طشت میں تازہ پھول لے آیا۔ میں نے اس طشت میں موتیے کے پھول بھی رکھے اور واپس جا کر خاموشی سے انہیں سلطانہ کے سرہانے رکھ دیا۔ وہ بے حرکت لیٹی رہی۔ تاہم چند سیکنڈ بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی لیکن پھر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ گڑبڑا گئی اور اخلاقی انداز میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

”نہیں... نہیں... تم لیٹی رہو۔ میں ویسے ہی آ گیا تھا۔“ میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے چلنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو رہی تھی۔ ران کے زخم میں غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے درد

http://digestpk.blogspot.com/

ہو رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں باروندا جیکی کے روبرو اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جیکی بدستور اپنے تہ در تہ لنگوٹ میں تھا۔ حالانکہ میزبانوں نے اس کے پاس ہی ایک صاف ستھرا لباس بھی رکھ دیا تھا۔ رات کا جو شان دار کھانا اسے پہنچایا گیا تھا، وہ بھی تقریباً جوں کا توں ایک طرف رکھا تھا۔ اس میں سے غالباً دو چار کباب لیے گئے تھے۔ جیکی شراب کی بوتلوں کے درمیان یوں بیٹھا تھا جیسے راجا اِندر حسین و جمیل عورتوں کے درمیان بیٹھتا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”تو آخر تم آگئے؟“ وہ شستہ انگریزی میں گویا ہوا۔

”مجھے تو کل ہی آجانا چاہیے تھا مگر پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا گیا ہے۔“

”یہ لوگ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں چڑیا گھر میں بند کوئی جانور ہوں... چھوٹے سرکار کے افسروں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ پلپلا کر دیا ہے... تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم نے کتنے دن جارج کی بہن کو سکھشا دی تھی؟ تمہیں کیسے غائب کیا گیا؟ تم کیسے رہا ہوئے وغیرہ وغیرہ۔“ بات کرتے کرتے وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”کوئی دوا وغیرہ بھی دی گئی ہے آپ کو یا نہیں؟“

وہ بولا۔ ”دوا کیا یہاں تو معالجوں کی پوری ٹیم آئی تھی۔ وہ میرا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے پھر سے بھلا چنگا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید انہیں پتا نہیں کہ مرض الموت کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوا مجھے تھوڑا بہت افاقہ دے سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔“ اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ”یہ دوا نہیں زہر ہے اور اسی نے آپ جناب کو اس حال تک پہنچایا ہے... اور دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ آپ ہر وقت مرنے کی بات کیوں کرتے ہو؟ آپ زندگی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ اپنے اندر جینے کی خواہش پیدا کر لو گے تو پھر حالات بھی بدلنا شروع ہو جائیں گے۔ حالات بدل سکتے ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر سنی ان سنی کر دی جیسے میری بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔ اس نے آتشیں سیال کا ایک طویل گھونٹ لیا اور اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ تب میری نظر پہلی بار ایک نیڈ بیگ پر پڑی۔ یہ نیڈ بیگ اس آرام دہ کمرے کے ایک گوشے میں جھول رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں حیران رہ گیا۔

”نیڈ بیگ کو تم نیڈ بیگ ہی کہو گے۔ پیراشوٹ یا ہیلی کاپٹر تو نہیں کہو گے۔“

”لیکن یہ یہاں کیسے آیا؟“

”میں نے منگوایا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم آج نہیں تو کل ضرور آؤ گے اور ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔“

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا معما تھا۔

یوں لگتا تھا کہ جس طرح میرے اندر یہ طلب پیدا ہو چکی ہے کہ میں جیکی سے زیادہ سے زیادہ سیکھوں، اس میں بھی یہ خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تھوڑے سے وقت میں مجھے بہت کچھ سکھا دے۔

میں نے کہا۔ ”کیا آپ میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”بالکل... ادھورے کام سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں نے اور تم نے شروع کیا ہے، وہ پورا ہو۔“

”میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کا شاگرد کہلواؤں۔ کیا آپ ایسا سمجھتے ہو؟“

”سچی بات یہ ہے کہ میں بھی ایسا نہیں سمجھتا... لیکن تمہارے اندر ایک تڑپ ضرور ہے اور اسی تڑپ نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ تمہاری یہ تڑپ آنے والے دنوں میں تمہارے بہت کام آسکتی ہے۔ اس کو اپنے اندر مرنے نہ دینا۔“

”آپ کس تڑپ کی بات کر رہے ہو؟ میری سب سے بڑی تڑپ تو یہی ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“

”میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن اس تڑپ کے پیچھے بھی تو کوئی وجہ ہے۔ وہی لڑکی جو تمہارے قریب آتے آتے تم سے بہت دور چلی گئی ہے۔ جس کو تم کھو چکے ہو لیکن بھولے نہیں ہو۔ شاید کبھی بھول بھی نہیں سکو گے۔“

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ ثروت اپنی تمام تر محبوبیت کے ساتھ میرے تصور میں آگئی۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں... یہ تو ہے لیکن... ڈھائی برس بیت چکے ہیں کہ اس کا کچھ پتا نہیں۔ اپنے آخری خط میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں جرمنی میں ایک یوسف نامی لڑکے سے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے... اب تک تو شاید... اب تک تو شاید...“

میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک گولا سا میرے گلے میں اٹک گیا۔ ثروت کے لیے اس طرح کی بات سوچنا بھی میرے لیے مشکل تھا۔

”میں تمہارے احساس کو سمجھتا ہوں۔ ان مرحلوں سے میں بھی گزرا ہوں۔ میری اور تمہاری کہانی میں فرق یہ ہے کہ... تمہاری کہانی میں، کنول جھیل میں گزرے ہوئے وہ سات دن نہیں ہیں۔ ہاں... وہ سات دن جن پر سات زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔“

”لیکن میں نے...“

”اچھا، یہ باتیں چھوڑو۔“ اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”اس وقت میں بہت سرور میں ہوں پھر یہ سرور غنودگی میں بدلنے لگے گا۔“

وہ میرا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لے کر نیڈ بیگ کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ریت سے بھرا ہوا تھیلا ہمارے درمیان تھا۔ بلب کی روشنی میں شفاف دیوار پر اس سارے منظر کا سایہ بن رہا تھا۔ اس ”دیوان“ نامی پوری عمارت میں جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی۔

”درد کیا ہے؟“ جیکی نے مسرور آواز میں کہا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے... یہاں۔“ اس نے انگلی سے اپنے سر کو ٹھونکا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے الفاظ کو دہراؤ۔ پوری توجہ اور پورے یقین کے ساتھ۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ”درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔“

وہ آنکھیں بند کیے بولا۔ ”درد کے ساتھ اندیشے اور واہمے شامل کر لیے جائیں تو درد بڑھ جاتا ہے... خالص درد کی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی اور اگر خالص درد کی گہرائی میں ڈوب کر اس کی اصلیت محسوس کی جائے تو یہ اور بھی کم ہونے لگتا ہے۔“

”جی۔“ میں نے کہا۔

”صرف ”جی“ نہیں۔ ان الفاظ کو دہراؤ۔ میری طرح۔ آنکھیں بند کر لو۔“ اس نے حکم دیا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے الفاظ دہرائے۔ وہ جب اس انداز میں سکھاتا تھا تو عجیب موڈ میں آجاتا تھا۔ وہ ایک ماسٹر فائٹر سے زیادہ ایک سائیکاٹرسٹ دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس روز باروندا جیکی نے مجھے نیڈ بیگ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت مشق کرائی۔ اتنی مشق جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی کھال چھل گئی۔ خون رسنے لگا اور قطرے سنگِ مرمر کے فرش پر گرنے لگے۔ میں ذرا سست

سگریٹ کا دھواں
تین سو اجزا کا مجموعہ

سگریٹ دیکھنے میں چھوٹی نازک اور دلکش ہوتی ہے مگر جب سائنس دانوں نے اس کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس کے دھوئیں میں تین سو اجزا شامل ہیں۔ یہ اجزا مختلف گیسوں اور رقیق مادوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو پھیپھڑوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں۔

یہ گیسیں چھوٹے چھوٹے قطرات سے مل کر بنتی ہیں جو انچ کے چالیس لاکھویں حصے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ قطرات پھیپھڑوں کی دیواروں کی جھلی اور گلے کی نالیوں پر جم جاتے ہیں اور ان کے لیے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ تمباکو میں بعض نشہ آور گیسیں بھی ہوتی ہیں، یہی سگریٹ نوشی کو عادت بنانے کا باعث ہوتی ہیں۔

کراچی سے امتیاز احمد کی گل پاشیاں

پڑتا تو وہ مجھے جھڑکتا اور بیساکھی سے میرے سر یا پیٹھ پر ضرب لگاتا۔ وہ جنونی موڈ میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا جنون برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ جنون جیسے میرے جنون سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یہ ایک تند و تیز لہر کی طرح مجھے اپنے ساتھ بہائے لیے چلا جا رہا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تکلیف میرے لیے مزہ بنتی جا رہی تھی... نشہ بنتی جا رہی تھی۔ میں جیکی کی ہدایات پر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ بالکل بے جان ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اگلی صبح سلطانہ کے بھائی اور والد سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ صبح سویرے سلطانہ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میں جاگا تو وہ جانے کے لیے تیار تھے لیکن جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ہماری ملاقات میرے کمرے میں ہوئی۔ سلطانہ کے والد مختار راجپوت کی عمر پچپن ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ کسی وقت وہ خاصے صحت مند رہے ہوں گے لیکن اب جیسے زندگی کے بوجھ نے انہیں نڈھال سا کر رکھا تھا۔ سلطانہ کا بھائی کافی کمزور تھا۔ جواں سالی میں ہی اس کے ہاتھ میں بیساکھی آگئی تھی۔ کمر کی تکلیف کے سبب وہ بہ مشکل چلتا پھرتا تھا۔

سلطانہ کے والد نے میرے سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور اسی گرم جوشی سے ملے جس سے کسی قریبی عزیز کو ملا جاتا ہے... جبکہ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں

http://digestpk.blogspot.com/

انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

مختار صاحب نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''مہروج! مجھے پورا یخین (یقین) ہے۔ اگر کوئی سلطانہ کو پھر سے سلطانہ بنا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ وہ تمہاری بڑی سے بڑی بات مان سکتی ہے... اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مان بھی رہی ہے۔ اب وہ پہلے سے کچھ اچھی نجر آ رہی ہے۔ خدا کے بعد اب تم اِچ ہمارا سہارا ہو مہروج!''

''میں اپنی کوشش کر رہا ہوں۔''

''لیکن... لیکن تم الگ کمرے میں کیوں سو رہے ہو؟ تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اسے تمہاری جرورت ہے مہروج... بہت جیادہ جرورت ہے۔''

میں اب اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں اس کا شوہر ہونے کے باوجود شوہر نہیں ہوں۔ میں نے اسے اپنے ہوش و حواس میں قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ کوئی ازدواجی تعلق رکھا ہے۔ وہ جو کچھ تھا، ایک عالم بے خبری کا دورانیہ تھا۔

دونوں باپ بیٹا بہت دکھی تھے۔ میں اس موقع پر کوئی ایسی ویسی بات کر کے انہیں مزید دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکے نبیل نے میرے ہاتھوں کی چھلی ہوئی کھال دیکھی اور بے تکلفی سے بولا۔ ''مہروج بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں، گر گیا تھا۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''آپ... آپ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں مہروج بھائی! چاچا غنی بتا رہے تھے کہ آپ پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں بھول چکے ہیں۔ یخین ناہیں آتا۔ کیا واخعی ایسا ہوا ہے؟''

مجھے ایسی باتوں سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ میرے چہرے پر الجھن دیکھ کر ہی شاید مختار صاحب نے جلدی سے مداخلت کی اور بولے۔ ''کوئی بات ناہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائیں گا۔ بس تم سے ایک ہی درخواست کرنی ہے... بلکہ ہاتھ جوڑ کر کرنی ہے۔'' انہوں نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''تم سلطانہ کا خیال رکھنا۔ اسے تمہاری بہت سخت جرورت ہے۔''

ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ سلطانہ کو میری ضرورت ہے اور میں خود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے سنبھالنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہوں... لیکن میں کیا کرتا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا میں ایک شوہر کی طرح اس کے قریب جا سکتا تھا؟ اسے پیار دے سکتا تھا؟

جب میں اس طرح سوچتا تھا تو ایک دم ثروت ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہتی تھی۔ بس تابی! اتنی ہی طاقت تھی میرے پیار میں؟ یہی تھا ہمارا اٹوٹ بندھن؟ یہی تھا تمہارا ختم نہ ہونے والا انتظار؟

میں ایک دوراہے پر تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ میں جسمانی طور پر سلطانہ کے قریب جائے بغیر بھی تو اسے سہارا دے سکتا تھا۔ جسمانی قربت تو میاں بیوی کی محبت کا آخری درجہ ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو کئی مدارج ہوتے ہیں۔ محبت سے بات چیت کرنا، اکٹھے کھانا پینا، دکھ سکھ بانٹنا۔

اس شام میں پھر سلطانہ کے لیے باغیچے سے گیندے اور موتیے کے تازہ پھول لے کر آیا... میں نے ایک باوردی باغبان سے کہا اور اس نے وہیں پر مجھے ایک گجرا بنا دیا۔ میں سلطانہ کے پاس واپس آ رہا تھا جب میری ملاقات اسحاق اور عبدالرحیم سے ہو گئی۔ اسحاق ہمیشہ کی طرح بہت سنجیدہ بلکہ مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے اشتعال کی وجہ ماریا فرگوسن ہی تھی۔ اس نے غم زدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ ''وہ حرام زادی بچ گئی ہے۔ تمہاری چلائی ہوئی گولی سے اس کی پنڈلی پر معمولی زخم آیا تھا۔ ابھی زرگاں سے آنے والے ایک بندے نے بتایا ہے کہ جارج گورا نے ماریا کے باڈی گارڈ کو گولی سے اڑا دیا ہے۔ یہ باڈی گارڈ اس گھر میں موجود تھا جہاں سے ہم نے ماریا کو اٹھایا تھا۔''

''زرگاں کی عام صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے اسحاق سے پوچھا۔

''حکم اور جارج گورا غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہووے گا کہ حکم نے بیس بے گناہ لوگن کو سرِعام سولی پر چڑھایا ہے۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے جارج کی وہ خبیث بہن خود بھی موقع پر موجود تھی۔ جارج نے سب لوگن کے سامنے اپنی بہن سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی ایک انگلی کے بدلے جب تک وہ انگلی کاٹنے والوں کے سر ناہیں کاٹے گا، چین سے ناہیں بیٹھے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا کوئی بڑی لڑائی ہوگی؟''

''ضرور ہوگی۔'' اسحاق نے یقین سے کہا۔ ''دونوں بھائی اب کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ زرگاں میں عام لوگن کو بھی اسلحہ دے کر لڑنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے سرکار نے آج دوپہر کو اعلان کیا ہے کہ اگر ہم پر حملہ ہوا تو پوری طاقت سے جواب دیویں گے۔ مراد شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جن لوگن کو ہم نے

پناہ دی ہے، ان کی حفاظت جان پر کھیل کر بھی کی جاوے گی۔''

گھڑسوار سپاہیوں کا ایک بڑا دستہ دیوان خانے کے سامنے سے گزرا۔ ان کے علم بیرونی دیوار کے اوپر سے دکھائی دیے۔

میں نے اسحاق سے کہا کہ وہ ذرا جا کر باروندا جیکی کی خبر لے لے۔ میں ابھی کچھ دیر میں اس کے پاس آؤں گا۔

عبدالرحیم نے کہا۔ ''وہ سہ پہر کے وقت بہت شور مچاوت تھا۔ اسے پھر اپنی کشتی میں واپس جانے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ بلند آواز میں چلا رہا تھا... پھر چلاتے چلاتے ہی سو گیا۔''

''میں نے تو ایک اور بات سنی ہے۔'' اسحاق نے قدرے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا؟''

''زرگاں سے بھاگ کر یہاں آنے والے لوگن میں راج بھون کی کچھ کنیزیں بھی شامل ہیں اور ان میں اشوک ساہنی کی بیٹی بھی ہے۔''

''کون اشوک ساہنی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی شکنتلا کا پتا... مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں پہنچنے والی عورتوں میں شکنتلا بھی ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ شکنتلا کے بارے میں، میں نے جیکی سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اسے دیکھے بغیر بھی میں اسے جاننے پہچاننے لگا تھا۔

''کیا... تم یقین سے... کہہ سکتے ہو کہ ان میں شکنتلا بھی ہے؟''

''پورے یقین سے تو ناہیں... لیکن سنا یہی ہے۔''

میں نے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''ایک کام کرو اسحاق... پتا کرو کہ واقعی ایسا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ یہاں آ گئی ہے؟''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہ ہو لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔''

اسحاق نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا۔

جیکی کی ساری کہانی اور اس کی ساری ذہنی کیفیت مجھے معلوم تھی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اب شکنتلا سے اس کی ملاقات دوبارہ ہوگی... لیکن اگر وہ واقعی یہاں آ گئی تھی تو پھر ایسا ہو بھی سکتا تھا... اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ باروندا جیکی کے لیے انتہائی سنسنی خیز واقعہ ہوتا۔ شکنتلا اور جیکی کے بارے میں سوچتا ہوا ہی میں واپس اپنی آرام دہ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

سلطانہ پھر غسل خانے میں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ روزانہ نہا رہی تھی اور اس کا غسل طویل تر ہوتا تھا۔

آج بھی اس نے باہر آنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور بازو پتھر کی رگڑ سے سرخ نظر آ رہے تھے۔

بالو رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے گود میں تو نہیں اٹھایا تاہم اتنی مہربانی کی کہ اسے دیکھنے لگی۔

''دودھ پلایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے مزید تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس نے دودھ نہیں پلایا تھا۔ وہ ابھی صفیہ کا دودھ ہی پی رہا تھا۔ میں ابھی اس صورتِ حال کو نظرانداز کرنا چاہتا تھا۔

''ہاتھ آگے کرو سلطانہ۔'' میں نے کہا۔

وہ ہاتھ کو بس تھوڑی سی حرکت دے کر رہ گئی۔

میں نے اس کا بھیگا ہوا سرخ ہاتھ پکڑا اور گجرا اس کی کلائی میں باندھ دیا۔ اس کا جسم پھر لرزنا شروع ہو گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی تھی یہ۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر لادا گیا ہو... اور اس بوجھ کے ساتھ اسے اونچے نیچے راستے پر چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اس کی ''سوچ کی کمر'' کانپ رہی ہو، بل کھا رہی ہو۔

''کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے سے اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو گرے مگر ان آنسوؤں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھوری چٹان کی سی سختی اور خاموشی تھی۔ اس سختی اور خاموشی کے پیچھے کیا پوشیدہ تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔ بالو بھی اٹھ گیا اور اس کی گود میں بیٹھ کر ہمکنے لگا۔ سلطانہ کا چہرہ زرد ہونے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اسے دھکیل کر پیچھے نہ ہٹا دے۔ میں نے بالو کو اپنی گود میں لے لیا۔

سامنے ایک منقش پلیٹ میں پھل رکھے تھے۔ چھری بھی پڑی تھی۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ ''ایک سیب کاٹو۔''

وہ شدید تذبذب میں نظر آئی لیکن جب میں نے دوبارہ کہا تو وہ لرزاں ہاتھوں سے سیب چھیلنے لگی۔ ایک دم تیز دھار چھری اس کی انگلی میں لگ گئی۔ خون بہنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی کو اپنے انگوٹھے سے دبا دیا۔ خون کا اخراج ذرا کم ہوا تو میں نے پٹی باندھ دی۔

''مہروج! مجھ کو معاف کرنا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

http://digestpk.blogspot.com/

رات کو میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھر باروندا جیکی کے پاس رہا۔ ہم نے مارشل آرٹ پر بہت سی باتیں کیں اور عملی مشق بھی کی۔ میرے کل کے زخموں کی وجہ سے جیکی نے آج مجھ پر زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ اگر ایک دن بہت سخت مشق ہو جاتی تھی تو اگلے روز ہاتھ تھوڑا سا ہلکا رکھتا تھا۔ آج وہ اپنی کشتی کے بارے میں واقعی بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے، آج کشتی بہت یاد آ رہی ہے؟“

”ہاں، جب کسی چیز کے دوبارہ ملنے کی امید کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس کی یاد زیادہ کٹھور ہونے لگتی ہے۔“

”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو جیکی؟“

”زرگاں اور نل پانی میں ٹھن گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں پھر زرگاں کی طرف جا سکوں گا اور کشتی تک پہنچ سکوں گا۔“

”کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اس کشتی سے بڑھ کر آپ کو کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔“

”ہاں، کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”کشتی والی بھی نہیں؟“ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس کے ہڈیوں بھرے چہرے پر کرب اور اداسی کے گہرے سائے پھیل گئے۔ وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ ”اس کی بات کیوں کرتے ہو؟ اس کی چاہت تو ہر پیمانے اور موازنے سے جدا چیز ہے۔ وہ تو ایک ایسی ہستی ہے جس نے مجھے تھوڑے سے وقت میں ہزار ہا برس کی پُر بہار زندگی کی راحتیں دیں اور جواب مجھے مرنے کا حوصلہ بھی بخش رہی ہے۔ اس کی بات مت کرو۔“

”آپ اسے ایک بار دوبارہ دیکھنے کی چاہت تو رکھتے ہوں گے؟“

”آج تم بے معنی سوال کر رہے ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہوا سے پوچھے کہ کیا تم چلنے کی چاہت رکھتی ہو۔ پانی سے پوچھے تم بہنے کی چاہت رکھتے ہو اور سرما کی طویل رات، گھونسلے میں گزارنے والے پرندے سے پوچھے... کیا تمہیں صبح کا انتظار ہے؟“

”ہاں، کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ واقعی شاعری کر سکتے ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی یادوں کو کچھ یادگار نغموں میں ڈھال دو۔“

”یہ ایک اور بے معنی بات۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تو کشتی پر واپس پہنچنے کی آس بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب تو میں کسی بھی وقت... کہیں سے بھی عالمِ بالا کی طرف رخصت ہو سکتا ہوں... یوں کر کے۔“ اس نے اپنے ہاتھ سے ہوائی جہاز کی طرح اڑنے کا اشارہ دیا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مارشل آرٹ کے آسمان کا تابندہ ستارہ تھا... اب آہستہ آہستہ مجھے اس کے بارے میں اور بھی کئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ تین چار سال پہلے اس نے ہانگ کانگ میں بنی ہوئی کسی فلم میں کام بھی کیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ عنقریب ہالی وڈ کی کسی بڑی فلم میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ غالباً کسی انگلش آرٹیکل میں، میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ فائٹ کے وقت جیکی کا جسم ہی نہیں، اس کی اسپرٹ بھی مقابلے میں حصہ لیتی ہے۔ وہ اپنے مدِمقابل کو مسمرائز کر دیتا ہے۔ اس کے ایک معروف برطانوی حریف نے اعتراف کیا تھا کہ وہ جب بھی جیکی سے مقابلہ کرتا ہے، اسے اپنی توانائی میں غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ایک جاپانی فائٹر نے لکھا تھا... حریف کو چوٹ لگا کر بھی اگر آپ اسے درد میں مبتلا نہیں کر پاتے تو آپ کا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے اور جیکی کے ساتھ لڑتے ہوئے یہی حوصلہ شکنی اعصاب کو جکڑ لیتی ہے۔ وہ چوٹ کو حیران کن صلاحیت سے جھیل لیتا ہے اور اگر اس نے اپنی یہ صلاحیت مزید پروان چڑھا لی تو بہت جلد... کوئی اس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا...

یہ... اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں کہی جا رہی تھیں لیکن پھر اچانک یہ ابھرتا ہوا ستارہ مارشل آرٹ کے اُفق سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس تیز رفتار دور میں کسی کو تا دیر کہاں یاد رکھا جاتا ہے۔ یقیناً جیکی کے بارے میں بھی چند ماہ تک مختلف خبریں گردش کرتی رہی ہوں گی۔ ایسی دو چار اڑتی اڑتی خبریں ہم نے بھی سنی تھیں۔ کسی نے کہا کہ جیکی کو اس کے مخالفوں نے ہنگری کے کسی نائٹ کلب میں قتل کر ڈالا ہے۔ ایک دفعہ یہ سنا کہ وہ شوبز اور فائٹنگ آرٹ سے بالکل کنارہ کش ہو کر بدھ مت کا پیروکار بن گیا ہے اور کسی اسٹوپا میں رہتا ہے... وغیرہ... وغیرہ...

آج... ماضی کا وہ معروف کردار یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دیوان خانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے ساتھ طوفانی عشق کی ایک حیران کن داستان نتھی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں وقت کی مہیب لہریں اس سے یوں ٹکراتی ہوئی گزری تھیں کہ وہ جسمانی اور روحانی طور پر تہ و بالا ہو کر نا قابلِ شناخت ہو گیا تھا۔

”کس سوچ میں کھو گئے ہو؟“ جیکی نے مجھے چونکایا۔

”آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”ماضی کے بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مستقبل کے بارے میں سوچو۔ میں اتنی بُری حالت میں بھی، تم پر محنت کر رہا ہوں۔ اس محنت کا چالیس پچاس فیصد تو تم میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اگر نہیں ہو گا تو میری روح بے چین رہے گی۔“

میں ابھی جیکی کو شکنتلا کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس بات کا انتظار کرنا تھا کہ اسحاق، شکنتلا کے بارے میں اصل صورتِ حال معلوم کر لے۔

اس رات جیکی پھر نشے کی حالت میں اپنا پسندیدہ نیپالی نغمہ گاتا رہا۔ اسے آج کافی تیز بخار بھی تھا۔ بخار کی مدہوشی، شراب کے نشے سے مل کر دو آتشہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لنگوٹ کی تہوں میں سے، کاغذ میں لپٹی ہوئی شکنتلا کی تصویریں نکال لیں۔ انہیں ان گنت بوسے دیے اور پھر انہیں دوبارہ لنگوٹ کی تہوں میں محفوظ کر کے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو ڈاکٹر چوہان آیا۔ اس نے بتایا کہ چھوٹے سرکار مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیوان کے مہمان خانے میں طلب کیا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں اس محل نما عمارت کے وسیع احاطے سے گزرا۔ یہاں مجھے شان دار ہاتھی ”بادل“ بھی نظر آیا۔ یہی بادل نامی ہاتھی تھا جس نے ایک مسلمان مزدور کو زخمی کیا تھا اور جس کی پاداش میں ہاتھی کا مالک یعنی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی آج کل باقاعدہ عمر قید کاٹ رہا تھا۔ میں عمارت کے عالی شان مہمان خانے میں پہنچا۔ ایک بلند و بالا محرابی دروازے سے گزر کر اور مخملی قالینوں پر پاؤں دھرتا ہوا میں ایک خوب صورت ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں وکٹوریہ طرز کی ایک شان دار کرسی پر چھوٹے سرکار اجیت رائے موجود تھا۔ وہ حسبِ سابق بند گلے کے کوٹ اور سفید پتلون میں تھا۔ سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی اور گلے میں بیش قیمت مالائیں۔ اس کی بارعب شخصیت نے جیسے اس سارے کمرے کو چکا چوند سے بھر دیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چند اور کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کرسیوں پر انور خاں اور کپتان اجے بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونا کسی مہاراجا کے دربار میں داخل ہونے کی طرح سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف شیشے کی اٹالین تپائی پر چند جدید رائفلیں اور ان کے لوازمات رکھے تھے۔ شاید میرے یہاں آنے سے پہلے اس اسلحے پر ڈسکشن ہو رہی تھی۔

میں نے ادب سے سلام کیا۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں قدرے جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد چھوٹے سرکار نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔ ”ہمیں مراد شاہ اور ڈاکٹر چوہان سے تمہارے بارے میں کافی جان کاری مل چکی ہے۔ تمہاری روداد کافی انوکھی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ مختار راجپوت کی بیٹی نے زرگاں میں تمہارا جیون بچانے کے لیے وہ انگوٹھی استعمال کی تھی جو ہمارے سورگ باشی پتا نے اس کے پریوار کو بخشی تھی۔ یہ ایک بڑا بلیدان ہے۔ اس لڑکی نے دوسرا بلیدان کچھ ہی دن پہلے دیا ہے۔ اسے جارج کے ستم کا شکار ہونا پڑا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کے لیے ہم بھی ذمے دار ہیں۔ ہمارا دوش یہ ہے کہ ہم نے اس لڑکی کی فریاد کے باوجود اسے اور تمہیں زرگاں واپس بھیج دیا... ہم اس کے لیے شرمندہ ہیں۔“

میں چونک کر چھوٹے سرکار کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی شرمساری نظر آ رہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ اس دور میں کوئی چھوٹا موٹا افسر یا زمیندار وغیرہ بھی اپنی انا کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے۔ چھوٹے سرکار ایک وسیع اسٹیٹ کا مختارِ کُل تھا اور وہ مجھ جیسے ادنیٰ شخص کے سامنے شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ”چھوٹے سرکار! یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو دوشی کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تو موہن کمار وغیرہ نے آپ کے سامنے ثابت کر دیا تھا کہ سلطانہ ہی ہارون کی قاتلہ ہے۔“

”پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سے جلد بازی ہوئی۔ اس کے لیے ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ تمہاری پتنی کو صحت دیوے اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں سپھل ہو جاوے۔ ہم نے یہاں اجے کو ہدایت

نام

ایک نوجوان نے جھجکتے ہوئے اپنی محبوبہ کے باپ کو ٹیلی فون کیا۔

”کیا میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کر سکتا ہوں؟“

باپ نے جواب دیا: ”ضرور، ضرور۔ نام کیا ہے تمہارا؟“

ناصر علی کی جرأت مندی ضلع صوابی سے

http://digestpk.blogspot.com/

دے دی ہے کہ تمہارے سمیت مختار راجپوت کی فیملی کی سیکیورٹی کا پورا انتظام کیا جاوے۔ ہم نے مختار کے بیٹے کے علاج کے لیے بھی خاص ہدایات دی ہیں۔"

"بہت شکریہ، چھوٹے سرکار۔" میں نے کہا۔

اجیت رائے کچھ دیر تک بغور میری طرف دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت و چمک تھی۔ اس کے تیکھے خدوخال والے چہرے پر ناک کا اونچا بانسہ بے حد نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولا۔ "مجھے انور خاں اور چوہان نے بتایا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں تم بہت زیادہ بدل گئے ہو۔ تم نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالا ہے اور رائفل اٹھانا سیکھ لیا ہے۔" میں جواب میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ سنسار کمزور کو دباتا چلا جاوت ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے ساتھ زمین کر دیوت ہے۔ سر اٹھا کر جینا ہی جینا ہے اور اس کے لیے بلیدان دینے پڑتے ہیں۔"

انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔ "چھوٹے سرکار! تابش کے لیے جارج گورا کی قید کایا پلٹ ثابت ہوئی ہے۔ یہ بڑی دلیری کے ساتھ جارج کے گھر سے نکلا ہے۔ کئی لوگوں کو اب بھی یقین نہیں کہ یہ کسی کی مدد کے بغیر جارج کا کڑا پہرا توڑ کر آیا تھا۔ بعد میں یہ ان تین لڑکوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے جارج کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ بھی بڑی جرأت والی کارروائی تھی۔ ان چار لڑکوں میں سے صرف دو زندہ بچے ہیں۔ بے شک یہ لڑکے ناکام ہوئے سرکار! مگر یہ جارج کی خودسر بہن کو سخت حفاظت کے باوجود اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔"

چھوٹے سرکار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "پتا چلا ہے کہ تم ایک ایسے نیپالی کو اپنے ساتھ لائے ہو جس کا ایک بازو اور پاؤں کٹا ہوا ہے۔ اور یہ وہی ہے جو کچھ برس پہلے زرگاں میں جارج کی بہن کا ٹیچر بن کر آیا تھا؟"

"جی سرکار! یہ وہی ہے... باروندا اجیکی... زرگاں میں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تین ماہ اسٹیٹ میں رہ کر واپس چلا گیا تھا لیکن وہ جارج گورا کی حبسِ بے جا میں تھا۔ پھر وہاں سے فرار ہوا اور گارڈز سے بچ کر چھوٹی ٹندی کے کنارے ایک جنگل میں چھپا رہا۔"

"وہاں اس نے بہت سا عرصہ ایک فش بوٹ میں گزارا ہے سرکار! تابش وغیرہ نے اس فش بوٹ میں ہی اسے دیکھا تھا۔" انور خاں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹے سرکار نے زرنگار کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی شفاف ٹھوڑی کھجائی اور بولا۔ "کیا واقعی... یہ شخص اشوک ساہنی کی بیٹی کے عشق میں گرفتار تھا؟"

"بے شک چھوٹے سرکار! ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ وہ اب بھی گرفتار ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ وہ بہت بیمار ہے۔ کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن اسے اپنی موت کا بھی کوئی غم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے عشق نے اس کے لیے مرنا بھی آسان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ..."

ایک دم مجھے شکنتلا والی بات یاد آئی اور میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "چھوٹے سرکار! اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہولے سے مسکرایا۔ "پوچھو۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بولنے کا پڑھا لکھا انداز اسے متاثر کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "سرکار! مجھے پتا چلا ہے کہ زرگاں کے راج بھون سے کچھ لوگ بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ ان میں ساہنی صاحب کی بیٹی شکنتلا بھی ہے؟"

چھوٹے سرکار نے کہا۔ "ہاں، کسی نے مجھے یہ بات بتائی تو تھی۔ بعد میں ہم نے اس لڑکی کو پیش کرنے کا حکم دیا لیکن وہ ملی ناہیں۔ اس کے ساتھ راج بھون سے آنے والی تین چار اور عورتیں بھی ناہیں تھیں۔ دراصل زرگاں سے آنے والے لوگن جانت ہیں کہ نل پانی میں زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ اس لیے وہ یہاں آ کر اِدھر اُدھر روپوش ہو جانا بہتر سمجھت ہیں۔"

باوردی اجے نے چھوٹے سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! اگر آپ حکم دیویں تو میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرت ہوں؟"

"ہاں ضرور کرو... بلکہ ہم تو چاہت ہیں کہ اگر وہ مل جاوے تو اسے خاص حفاظت میں رکھا جاوے۔ وہ راج بھون کی فیریز (پریوں) میں سے ہے... اور بھائی صاحب (حکم جی) کے جاسوس اس کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں گے۔"

ہماری بات چیت کے دوران میں ہی فوجی افسروں اور انتظامی عہدے داروں کا ایک وفد چھوٹے سرکار سے ملنے پہنچ گیا۔ میں اور انور خاں چھوٹے سرکار سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔

☆☆☆

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ حالات میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ دونوں طرف جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری

تھا۔ میری اور باروندا اجیکی کی ملاقات روز ہو[illegible] گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھ پر فائٹنگ آرٹ کے نئے عقدے کھل رہے تھے۔ حقیقت ہے کہ میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص محسوس کر رہا تھا... میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بھی شاید نہ کر سکوں۔

سلطانہ کی کیفیت میں بھی معمولی تبدیلی آئی تھی۔ تاہم وہ اب بھی بالکل الگ تھلگ اور گم صم رہتی تھی۔ کوئی اس سے اظہارِ ہمدردی کی کوشش کرتا تو وہ غصے سے پھٹ پڑتی لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ بہت نرم اور اطاعت گزاری والا ہوتا تھا۔ وہ الگ کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس نے ابھی بالو کو اپنا دودھ پلانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

ایک رات میں اسے دیکھنے اس کے کمرے میں گیا تو وہ ریشمی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے پر تھیں۔ بالو اس کے پہلو میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر ایک صحت مند و توانا کشش تھی۔ جیسے کوئی خودرو پودا یا جنگلی پھول۔ اور وہ میری بیوی تھی۔ میں قریباً ڈیڑھ سال تک اس کے قریب رہا تھا اور ہماری قربت کی نشانی یہ بچہ تھا۔

مجھے سلطانہ کے ریشمی تکیے کے نیچے ایک ابھار سا محسوس ہوا۔ میں نے آگے جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ ایک چھوٹی تلوار کا دستہ تھا۔ یہی وہ تلوار تھی جس سے سلطانہ نے چند دن پہلے مردانہ وار کام لیا تھا۔ اس نے ٹیلے پر "جی تھری" چلانے والوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے اور یہ تلوار وہ اب بھی تکیے کے نیچے رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔

میں نے بہت آہستگی کے ساتھ یہ چھوٹی تلوار اس کے تکیے کے نیچے سے نکال لی... میری احتیاط کے باوجود وہ جاگ گئی۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر رکھ لی۔

"یہ تلوار نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ب... بس یونہی۔" وہ ہکلائی۔

"تمہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے... شاید صرف ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نگاہوں میں وہ ناقابلِ فراموش منظر گھوم گیا جب جارج گورا نے میرے گلے میں ذلت کا ہار پہنایا تھا اور سلطانہ نے میری بے مثال بے

[illegible]

پھر سلطانہ نے نگاہ جھکا لی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ! میں جانتا ہوں کہ میرے اوپر تمہارے کچھ قرض ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں اتارنا آسان نہیں ہے... لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اس رات کے بعد میں بتدریج تبدیل ہوا ہوں۔ میرے اندر بہت کچھ بدلا ہے سلطانہ... جس طرح جارج کا نام تمہارے ذہن میں گڑا ہوا ہے، میرے ذہن میں بھی گڑا ہے۔"

وہ دل دوز انداز میں سر جھکا کر رہ گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سوئے ہوئے بالو کا ماتھا چوما اور تلوار سمیت باہر آ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ریشمی پردے والے جھروکے میں سے آتش بازی کے مناظر دکھائی دیے۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور چھوٹے بڑے پٹاخے چل رہے تھے۔ اسی دوران میں حجام عبدالرحیم بھی آ گیا۔ میں نے اس سے آتش بازی کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ "اس کی ایک ناہیں دو وجہ ہیں مہروز بھائی... مم... میرا مطلب ہے تابش بھائی۔"

"وہ کون سی؟"

"پہلی وجہ تو شب برات کا تہوار ہے۔ کل یہاں اسٹیٹ کے مسلمان شب برات منائیں گے۔ دوسری وجہ کا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا ہے۔ نل پانی اور زرگاں کے درمیان لڑائی وقتی طور پر ٹل گئی ہے۔ ہمری جان کاری کے مطابق کل نل پانی اور زرگاں کے خاص خاص لوگن میں بات چیت ہوئی ہے جس میں دونوں طرف سے تھوڑی اور سوچ وچار کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

میں اور عبدالرحیم جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر آتش بازی کا نظارہ کرتے رہے... نل پانی کا کافی بڑا حصہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ جھیل کا ایک حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے کی آبادی میں سے گاہے بگاہے ہوائیاں چھوٹتی تھیں اور ان کے رنگ آسمان پر بکھرنے کے ساتھ ساتھ جھیل میں بھی منعکس ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ خوب صورت لگتا تھا۔

عبدالرحیم نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ "تابش بھائی! کیا واقعی... تم کو... کچھ یاد ناہیں؟ پچھلی شب برات کی کوئی بات بھی تمہارے دماغ میں ناہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے تمہارے گھر میں کھانا کھایا تھا۔ سلطانہ بی بی نے بڑے پیارے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر

http://digestpk.blogspot.com/

مہندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے یہ مہندی تم نے ہی لگائی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی کہ تم نے اسے مہندی لگائی ہے۔ بے ڈھنگی سی مہندی تھی، پر وہ اتنی خوش تھی کہ کچھ ناہیں پوچھو... اور پھر ہم اوپر چھت پر چلے گئے تھے۔ آتش بازی دیکھتے رہے تھے... اور تم نے سلطانہ بی بی کے ساتھ مل کر درجنوں موم بتیاں روشن کی تھیں... کچھ تو یاد ہوگا تمہیں؟''

مجھے الجھن ہونے لگی۔ ''نہیں... مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے رحیم نے بھی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

تاہم اس کے جانے کے بعد میں اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ کل شب برات کا تہوار تھا۔ اس موقع کو سلطانہ کو نارمل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز سلطانہ کو مجبور کیا کہ وہ نیا لباس پہنے۔ میں اس کے لیے گیندے اور موتیے کے بہت سے پھول اور گجرے لایا۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ آج مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلائے۔ میری اس فرمائش نے اس کا چہرہ زرد کر دیا۔ بہرحال، میرے اصرار کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ وہ جھلمل کپڑوں میں ملبوس پہلی بار گھر کے باورچی خانے میں گئی تو ملازمائیں اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ خوش گوار ٹھنڈک والی ایک خوشبودار شام تھی۔ سلطانہ نے لکھنوی طرز کے چاول بنائے اور بادام کشمش والا زعفرانی حلوہ پکایا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر پہلی بار ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جھروکوں سے باہر تاروں بھرا آسمان تھا اور آتش بازی کے رنگ تھے۔ کہتے ہیں کہ ننھے بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک نادیدہ رابطہ ہوتا ہے۔ جب والدین خوش ہوں تو وہ بھی سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔ بالو کی آنکھوں میں بھی آج مسکراہٹ تھی۔ اس شام مجھے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے حادثے کے بعد سلطانہ نارمل زندگی کی طرف آسکتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے زہرناک مایوسی کے بادل چھٹ سکتے ہیں۔

لیکن میں غلط تھا۔ جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ ہونے والا نہیں تھا... اور وہ ہونے والا تھا جو اس شام میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں نے سلطانہ اور بالو کو کمرے میں چھوڑا اور اپنے کمرے میں واپس آکر سو گیا۔

میری آنکھ صبح سویرے ایک تیز آواز سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ملازمہ صفیہ برآمدے میں کھڑی چلا رہی تھی۔ ''سلطانہ بی بی... سلطانہ بی بی...!''

پھر وہ میری طرف مڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مالک! سلطانہ بی بی کمرے میں ناہیں ہیں۔ وہ کہیں بھی ناہیں ہیں۔''

''غسل خانے میں دیکھا؟''

''جی مالک...''

میں صفیہ کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ کل رات میرے اصرار پر جو لباس سلطانہ نے پہنا تھا، وہ ایک طرف فرش پر پڑا تھا۔ پھولوں کے سارے گہنے بھی ٹوٹے پھوٹے ایک طرف دھرے تھے۔ بالو بستر کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ باقی بستر پر بہت کم سلوٹیں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ سلطانہ اس پر تھوڑی دیر کے لیے ہی لیٹی ہے۔

''کہاں جا سکتی ہے وہ؟'' میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

''کچھ پتا ناہیں جی! بی بی کا بھتیجا طلال بھی ناہیں ہے۔ لگت ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئی ہیں۔''

ایک دم میرا دھیان اس چھوٹی تلوار کی طرف گیا جو میں نے ایک دن پہلے سلطانہ کے تکیے کے نیچے سے نکالی تھی۔ میں نے وہ ساتھ والے اسٹور نما کمرے کی الماری میں رکھی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ تلوار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

میں تیزی کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے باہر آیا۔ میں نے باوردی پہرے داروں سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان سلطانہ بی بی اپنے نوعمر بھتیجے طلال کے ساتھ یہاں سے گزری تھی۔ اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی اور چہرہ بھی نصف چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شدید بخار میں ہے اور چھوٹے سرکار نے اس سے کہہ رکھا ہے کہ وہ جب چاہے، ان کے ذاتی معالج کو دکھا سکتی ہے۔

میں پہرے داروں سے بات کر ہی رہا تھا جب چوہان اور رحیم بھی وہاں آگئے۔ ہم فوراً چھوٹے سرکار کے ذاتی معالج حکیم خدا بخش کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حکیم صاحب دیوان کے اندر ہی ایک رہائشی حصے میں رہتے تھے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو میرے دل میں چھپا ہوا اندیشہ درست نکلا۔ سلطانہ اور طلال رات کو یہاں آئے ہی نہیں تھے...

چوہان نے کہا۔ ''وہ دیوان کے شمالی گیٹ کی طرف گئے ہوں گے۔''

ہم شمالی گیٹ پر پہنچے۔ ابھی رات کی ڈیوٹی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہی پہرے دار موجود تھے جنہوں نے رات بھر اس گیٹ کی نگہبانی کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس راستے سے کوئی باہر نہیں گیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ابھی دیوان کی چار دیواری میں ہی ہیں۔'' رحیم نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔'' چوہان پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''اس کی نگاہیں دور ایک سرخ رنگ کے بند پھاٹک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ نل پانی کے سرکاری اصطبل کا پھاٹک تھا اور یہ اصطبل دیوان خانے کے اندر ہی تھا۔ پھاٹک کے سامنے ایک دو گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''اگر وہ دونوں، رات کو حکیم خدا بخش صاحب کی طرف نہیں گئے اور نہ ہی اس گیٹ سے باہر نکلے ہیں تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اصطبل کی طرف گئے ہوں۔''

''مطلب؟''

چوہان نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے انچارج پہرے دار سے پوچھا۔ ''رات کو یہاں سے گھوڑا گاڑیاں گزرتی رہی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' پہرے دار نے جواب دیا۔ ''تین چار گزری ہیں۔ چھوٹے سرکار کے کچھ مہمان تھے جو آدھی رات کے بعد واپس گئے۔ ایک دودھ لانے والی گاڑی تھی... ایک شاید اور تھی۔''

''تم اندر آنے والی گاڑیوں کو ہی چیک کرتے ہو یا باہر جانے والی گاڑیوں کو بھی؟''

''اندر آنے والیوں کو ہی چیک کیا جاتا ہے جی... یا پھر کوئی خاص آرڈر ہو تو...''

چوہان نے ایک گہری سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے تابش... سلطانہ اب ہمیں یہاں نہیں ملے گی۔ پھر بھی ہم تسلی کے لیے چیک کر لیتے ہیں۔''

... چوہان نے بالکل درست کہا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا... سلطانہ کے غائب ہونے کی خبر پورے دیوان میں پھیل چکی تھی۔ ہر جگہ ہلچل نظر آرہی تھی۔ سلطانہ دیوان کی عمارت میں کہیں نہیں تھی۔

اب اس کی تلاش کا سلسلہ دیوان کی عالی شان عمارت سے باہر شروع ہوا۔ مراد شاہ کے فوری حکم کے تحت گھڑ سواروں کی ٹولیاں اردگرد کے علاقے میں پھیل گئیں اور خاص و عام سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔

میں شدید شاک کی کیفیت میں تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ کل رات تک وہ بہت نارمل نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہتری کی طرف اس کا سفر شروع ہو

زبان کے ذریعے مصوری

ہانگ ارنان دنیا کا وہ واحد مصور تھا جو زبان سے تصویریں بناتا تھا۔ وہ اپنے منہ کو ٹیوب اور زبان کو برش کی طرح استعمال کرتا تھا۔ ہانگ ارنان ایک میز پر جھک کر ریشم کے بڑے سے ٹکڑے پر خوب صورت پھول، مناظر اور تتلیاں بناتا تھا۔ اس نے اسی طرح شاہکار چینی تصاویر بنائی ہیں، دنیا کا یہ منفرد اور عجوبہ روزگار آرٹسٹ منہ میں باری باری مختلف رنگ بھر لیتا تھا اور انہیں زبان کے ذریعے تصویر میں منتقل کر دیتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ طریقہ بہت ہی فرحت بخش اور دلچسپ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں رنگوں کا ذائقہ محسوس کر کے مصوری کرتا ہوں۔

حنا دل پذیر کا انتخاب واہ کینٹ سے

جائے گا لیکن اب وہ منظر سے اوجھل تھی۔ اس کے اوجھل ہونے کا انداز ذہن میں مزید اندیشے ابھارتا تھا۔

چوہان کے ذہن میں بھی ایسے ہی اندیشے تھے۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''تابش! مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرے پیدا کرے گی۔''

''دوسروں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''جارج گورا اور اس کے قریبی ساتھی... وہ جارج گورا کو معاف نہیں کر سکی۔ وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ آن پر مر مٹنے والے لوگ ہیں۔ حاکم لوگ پیار سے ان کی جان بھی لے لیں تو دے دیتے ہیں مگر ان کو سر جھکا کر جینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ راجپوت برادری کی وہ لڑکی ہے جو انگریزوں کے دور میں حیدرآباد دکن سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ فن سپاہ گری میں ہمیشہ سے تاک ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں بھی تلوار کی دھنی ہوتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اور طلال یہاں سے نکل کر زرگاں کی طرف گئے ہوں گے؟''

''یہ ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عزت کے لٹیرے کے لیے سراپا قہر ہے۔ ایسے میں وہ راستے کی مشکلوں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچے گی۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے۔ اسے پتا ہوگا کہ عام حالات میں بھی جارج گورا کے

http://digestpk.blogspot.com/

گرد سخت حفاظتی حصار ہوتا ہے۔ ان حالات میں تو اس کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہوگی۔ وہ اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پائے گی۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ فوری طور پر زرگاں کی طرف نہ جائے۔ ابھی یہیں کہیں نل پانی میں چھپ کر لائحہ عمل بنائے... طلال اس کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی برادری کے کچھ اور افراد کی مدد لینے کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہے۔"

"ایسی سوچ بچار تو ٹھنڈے دل و دماغ سے کی جاسکتی ہے تابش! وہ جس طرح یہاں سے گئی ہے، لگتا ہے کہ اس کے اندر ایک آگ ہے۔ یہ آگ اسے شاید ہی کہیں رکنے دے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق مراد شاہ صاحب نے راستے کی چوکیوں کو خبردار کردیا ہے۔ اگر وہ زرگاں کے رخ پر گئی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اسے راستے میں کہیں ٹریس کرلیا جائے۔"

"یہ بات وہ بھی تو سوچ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ فوری طور پر زرگاں کا رخ نہ کرے..."

اسی دوران میں اجے تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے دو باوردی ماتحت تھے۔ ماتحت دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ اجے نے اندر آکر ہمیں بتایا۔

"اندرونِ شہر سے اطلاع ملی ہے کہ اسلحے کی ایک دکان پر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو ایک اکیلا لڑکا تھا۔ وہ ایک رائفل، ایک پستول اور کچھ ایمونیشن لوٹ کر لے گیا ہے... دکان دار کے بازو پر تلوار کا زخم آیا ہے۔ تفتیش کرنے والے تھانے دار نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ لڑکا، سلطانہ بی بی کا ساتھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال، اس حوالے سے وشواس سے کچھ ناہیں کہا جاسکتا۔"

یہ اہم اطلاع تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور فوراً اجے کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی میں ہم دیوان کی عالی شان عمارت سے نکلے اور اندرون شہر کی طرف چل دیے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ نل پانی کے گلی کوچوں میں زندگی معمول کے مطابق رواں تھی۔ جنگی تناؤ وقتی طور پر ختم ہوگیا تھا اور اس تبدیلی کے آثار لوگوں کے چہروں پر بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ بازاروں میں خریداروں کا رش تھا۔ باغوں اور دیگر تفریح گاہوں میں بھی رونق تھی۔ بہرحال، لوگوں کے ذہنوں میں یہ شک بھی موجود تھا کہ اس صورتِ حال کے پیچھے زرگاں والوں کی کوئی سازش نہ ہو۔

گھوڑا گاڑی ایک ایسی آبادی میں پہنچی جہاں پرانی طرز کی دو تین منزلہ گنجان عمارتیں تھیں۔ یہاں گلیاں تنگ اور راستے پیچ دار تھے۔ ایک جگہ گاڑی سے اترنے کے بعد ہم پیدل ہی ایک بازار میں داخل ہوئے۔ ایک دکان کے سامنے پولیس کے باوردی سپاہی موجود تھے۔ پولیس کی وردی یہاں، انڈیا کی عام پولیس سے ملتی جلتی تھی۔ بس پگڑی کا اضافہ تھا۔

پولیس والوں نے اجے کو فوجی افسر کا پروٹوکول دیا۔ اسے سیلیوٹ کیا گیا اور بڑے احترام سے موقعِ واردات پر پہنچایا گیا۔ زخمی دکان دار مدن لال دکان میں ہی موجود تھا۔ اس کے بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور فربہ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

تھانے دار کے اشارے پر اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ "جناب! دوپہر کے سمے گاہک وغیرہ کی آشا کم ہی ہووت ہے۔ بھوجن کے بعد میں ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا... ملازم لڑکا سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے ہی سویا تھا کہ ایک دم آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ پر کالا نقاب اور ہاتھ میں دو فٹ لمبی تلوار تھی۔ اس نے تلوار یہاں... میری گردن پر رکھ دی اور کہا کہ میں بولا تو وہ گلا کاٹ دیوے گا۔ اس نے مجھ سے شوکیس کی چابی مانگی۔ میں چابی لینے کے بہانے تھوڑا سا آگے گیا اور پھر میں نے جلدی سے باہر نکلنا چاہا۔ وہ میرے وچار سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے تلوار چلا کر میرا بازو گھائل کردیا... میں یہاں گر پڑا، اس کرسی کے پاس۔ یہ دکان کا پچھلا کمرا ہے۔ بازار سے گزرنے والے کسی بندے کو پتا بھی ناہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ اس نے شوکیس کی چابی مجھ سے لی۔ بڑے سکون کے ساتھ شوکیس کھولا۔ اس میں سے ایک سات ایم ایم رائفل اور ایک کولٹ پسٹل نکال لیا۔ رائفل کے کوئی دو سیکڑے راؤنڈ بھی وہ خبیث اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے جاتے جاتے ہم کو دھمکی دی کہ اگر ہم نے زبان کھولی تو وہ پھر آوے گا اور تب ہماری ہتھیا کیے بنا ناہیں جاوے گا..."

دکان دار نے اپنی ساری بپتا ایک ہی سانس میں کہہ ڈالی۔

"جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، تمہارا ملازم کہاں تھا؟" اجے نے پوچھا۔

"اس غریب کو اس نے یہ سامنے والے غسل خانے میں بند کر چھوڑا تھا جی۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے آواز تک ناہیں نکالی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ ذرا کمزور دل کا ہے جی۔" تھانے دار نے کہا۔ "اس کو بے ہوشی ہو رہی تھی۔ اسے ساتھ والے اسپتال میں بھرتی کرایا ہے۔"

ہمارے یہاں آنے سے پہلے تھانے دار محمود نے تفتیش

کا کچھ کام کیا تھا۔ ... اجے اور تھانے دار محمود کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ یہاں گھوڑوں کے بھی نمبر ہوتے ہیں اور یہ نمبر ان کی پیٹھ پر بڑے اہتمام سے داغے جاتے ہیں۔ ان نمبروں کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو عام جگہوں پر گاڑیوں کے نمبروں وغیرہ کی ہوتی ہے۔ ایک قریبی دکان دار نے بتایا تھا کہ واردات کرنے والا گھوڑے پر آیا تھا۔ اس گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر بھی اس دکان دار کو کسی حد تک یاد تھا۔ اجے نے اس دکان دار کو طلب کیا۔ وہ مزید گواہوں کے بیان بھی سننا چاہتا تھا۔ میں اس طویل تفتیشی کارروائی سے اکتا کر گھوڑا گاڑی میں آبیٹھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ سلطانہ اور اس کا بھتیجا کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ایک آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

فوجی گاڑی اندر سے بہت آرام دہ تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مخملی پردے پڑے ہوئے تھے۔ تاہم ان پردوں کی جھریوں میں سے باہر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ بازار کی گہما گہمی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک منظر نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ ایک تیئس چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے ایک ڈبّی دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ایک ٹھیلے والے کے عقب میں کھڑا وہ کھوجی نظروں سے فوجی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز مشکوک تھا لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا، وہ اس کی صورت تھی۔ میری نگاہوں میں وہ مناظر گھوم گئے جب اپنے ہوش و حواس میں واپس آنے کے بعد میں نے پہلی بار اسٹیٹ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ مجھے جنگل سے پکڑ کر واپس لائے تھے۔ ان واقعات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے ان سب لوگوں کے چہرے یاد تھے۔ یہ شخص بھی ان میں سے تھا... میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ لیکن یہ شخص زرگاں سے کوسوں دور یہاں نل پانی کے اس بازار میں کیسے موجود تھا؟ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ مضطرب نظر آتا تھا۔

میں گھوڑا گاڑی سے باہر آگیا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ مجھے دیکھ کر وہ گہرا سانولا شخص بُری طرح بدکا اور ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مڑا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میں نے اس کا پیچھا شروع کردیا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ واضح طور پر بوکھلا گیا۔ اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ میں نے بھی رفتار تیز کردی۔ یہ گنجان بازار تھا۔ وہ کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل ہوسکتا تھا۔

وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس بازار میں زیادہ تر خواتین ہی خریداری کررہی تھیں۔ کپڑوں، چوڑیوں اور گہنوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف برقعے یا رنگ دار چادریں دکھائی دیتی تھیں۔ میں دوڑا تو مرد و زن سے میرا تصادم شروع ہوگیا۔ کئی خواتین میرا دھکا لگنے سے گریں اور چلّائیں۔ ایک فربہ اندام قلفی فروش میری ٹکر لگنے سے آرائشی سامان کی ایک دکان میں جا گرا اور وہاں کھلبلی مچ گئی۔ مجھے اردگرد کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہ بس بھاگنے والے شخص پر تھی اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک جگہ وہ ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا کر گرا اور پھر فوراً اٹھ کر ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں گیا۔ یہ کوئی مرچ مسالے کا بازار تھا۔ ہر طرف مسالوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

"پکڑو... پکڑو۔" میں نے پکارنا شروع کیا۔

میری پکار پر کسی نے فوری عمل تو نہیں کیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مجھے ہجوم میں سے بھاگنے کے لیے نسبتاً آسانی سے راستہ ملنے لگا۔

... اگلے دو منٹ میں اندرونِ شہر کی ان بھری پُری گلیوں میں یہ اندھا دھند تعاقب جاری رہا۔ اس دوران میں کئی خوانچے الٹے اور کئی مرد و زن کو چوٹیں وغیرہ سہنا پڑیں۔ وہ شخص بھاگتا بھاگتا ایک سہ منزلہ پرانی عمارت میں داخل ہوگیا۔ دو تین سیکنڈ بعد میں بھی عمارت کے اندر تھا۔ ایک عجیب سی تلخ، جھلّاہٹ مجھ پر سوار تھی۔ اس کے علاوہ ایک ترنگ سی بھی تھی۔ یہ ترنگ کیا تھی؟ شاید خود کے اندر ہونے والی اہم تبدیلیوں کے بعد میں لاشعوری طور پر کہیں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا تھا۔ کسی سے ٹکرانا چاہتا تھا، نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

... اور اس عمارت میں گھسنے کے بعد یہ موقع مجھے مل گیا بلکہ اتنی شدت سے ملا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔

دو ہٹے کٹے افراد تیزی سے میرے سامنے آئے۔ وہ بھی سانولے تھے اور صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندو ہیں۔

"اوئے... کون ہو؟" ان میں سے ایک نے ہراساں آواز میں کہا پھر وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔

میں نے ایک کے چہرے پر کہنی کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر گرا اور وہاں رکھے تاش کے پتے چاروں طرف بکھر گئے۔

میں نے دوسرے شخص کی ناف میں گھٹنا مارا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں دو افراد

http://digestpk.blogspot.com/

سیڑھیوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے آگئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کا پیچھا کر کے میں یہاں پہنچا تھا۔ اب اس شخص کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کا خوفناک پھل چمک رہا تھا مگر وہ مجھے کسی کھلونے کی طرح لگی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کلہاڑی مجھے خراش تک نہیں پہنچا سکتی۔ شاید یہی وہ اعتماد تھا جسے میں آج تک تلاش کرتا رہا تھا... اور یہی وہ اعتماد تھا جس کے بارے میں بارونداجیکی کہتا تھا کہ جب یہ بندے کے پاس ہو تو پھر اسے لڑنے اور جیتنے کے لیے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی۔

کلہاڑی کا اندھا دھند وار جو میرے سر پر کیا گیا تھا، میں نے آسانی سے بچایا اور کلہاڑی بردار کے جبڑے پر ٹانگ رسید کی۔ جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح اور شفاف تھی۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب اس گھر کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے کھلا۔ اس مرتبہ اندر داخل ہونے والے میرے ہی ساتھی تھے... چوہان اور کپتان اجے وغیرہ...

اجے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے عقب میں اس کے باوردی سپاہی تھے۔ ''خبردار... خبردار!'' اجے گرجا۔ ''گولی ماردوں گا۔''

یکایک ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے پاس سے سرگوشی کرتی گزر گئی۔ یہ فائر زمین پر گرے ہوئے اسی بندے نے کیا تھا جس کا اندھا دھند تعاقب مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کلہاڑی کی جگہ پستول نظر آرہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری مرتبہ مجھے نشانہ بناتا، اجے کی چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔

گولی لگنے سے اس کے جسم نے جھٹکا کھایا مگر اس نے پستول پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ تڑپ کر اس نے پستول کا رخ اجے کی طرف کیا۔ تب اجے نے پھر ٹریگر دبایا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور یہ دوسری گولی اس شخص کے جسم کے اسی حصے میں لگی جو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یعنی اس کا جبڑا۔ وہ ایک کرب ناک کراہ کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

اجے کے سپاہیوں نے رائفلیں سونت لی تھیں۔ ان کے خطرناک تیور دیکھ کر باقی افراد ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ ان کے رنگ اڑ گئے اور جانیں بچانے کے لیے انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔ شوٹ ہونے والے شخص کا خون تیزی سے اس کی ڈبی دار چادر کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔

عمارت سے باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ ہجوم ہر لمحے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز نے اس گنجان علاقے میں ہر طرف سنسنی

چوہان نے مجھے ٹٹولا اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا تابش؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان اور اجے وغیرہ کی چڑھی ہوئی سانسیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ میرے پیچھے ہی پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

اجے کے سپاہیوں نے مرنے والے کے ساتھیوں کو ایک قطار میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ سپاہی عمارت میں پھیل گئے اور دیگر افراد کو تلاش کرنے لگے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' اجے نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''باقیوں کا تو پتا نہیں... مگر اس بندے کو میں کسی حد تک جانتا ہوں۔'' میں نے ٹائل دار فرش پر مردہ پڑے گہرے سانولے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''کون ہے یہ؟'' اس مرتبہ چوہان نے پوچھا۔

''حکم کا ایک قریبی ساتھی۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو گا لیکن تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ جب مجھے اور سلطانہ کو یہاں نل پانی سے واپس زرگاں بھجوایا گیا تو یہ شخص موہن کمار کے ساتھیوں میں شامل تھا...''

چوہان نے چونک کر مردہ شخص کا خونچکاں چہرہ دیکھا۔ پھر شاید اس نے بھی کسی حد تک اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔

''تم نے اسے کہاں دیکھا؟'' چوہان نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل بتا دی۔ اس دوران میں اجے کے ماتحت افراد عمارت کے مختلف حصوں سے قریباً پانچ مزید افراد کو ہانک کر گراؤنڈ فلور پر لے آئے تھے۔ یہ سارے افراد کٹر ہندو لگتے تھے۔ یہ سب کے سب جواں سال تھے۔ اس عمارت کی مختلف دیواروں پر تلواریں، کلہاڑیاں اور رائفلیں آویزاں تھیں۔ بجرنگ بلی، ہنومان اور کالی ماتا کی مورتیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک دو جگہ ہندی کے کچھ پوسٹر بھی نظر آئے۔ پوسٹروں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ یہ عسکری نوعیت کے ہیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جگہ جوشیلے ہندو نوجوانوں کی ایک بیٹھک ہے۔ اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک بڑا جمنازیم تھا۔ وہاں جسمانی کسرت کی جاتی تھی اور لڑائی بھڑائی کے گر بھی سیکھے جاتے تھے۔ عمارت میں موجود پوسٹرز سے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ مسلمان مخالف پروپیگنڈے کا اڈا بنی ہوئی ہے۔

http://digestpk.blogspot.com/

کپتان اجے کی ہدایت پر تھانے دار محمود نے مرنے والے شخص کی لاش کو قبضے میں لے لیا اور عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کرلیا۔ امید تھی کہ گرفتار ہونے والوں کے ذریعے مزید انکشافات ہوں گے۔

''تمہاری پنڈلی پر چوٹ آئی ہے۔'' چوہان کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے دیکھا، واقعی پنڈلی پر ایک گہرا کٹ آیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں کوئی آہنی شے لگی تھی۔ خون بہہ کر ٹخنے تک جارہا تھا مگر یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ اس چوٹ نے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں دی تھی۔ اپنا بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھے پریشانی کے بجائے عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ شاید جیکی کی تربیت نے مجھ پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کردیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم دیوان میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں سلطانہ اور اس کے بھتیجے کی گمشدگی سب سے اہم موضوع تھی۔ ہر کوئی اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اجے کو امید تھی کہ اگلے چوبیس گھنٹے میں کوئی نہ کوئی کھوج ہاتھ آجائے گا۔ یہ بات تو اب تقریباً ثابت ہوچکی تھی کہ آج سہ پہر اسلحے کی دکان پر واردات کرنے والا سلطانہ کا بھتیجا طلال ہی تھا۔ یہاں گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر سامنے آیا تھا۔ اجے کو یقین تھا کہ اس نمبر کے ذریعے پیش رفت ہوگی۔

رات کو باروندا جیکی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کمزور تر ہوتا جارہا تھا۔ گاہے بگاہے اسے تیز بخار بھی ہوجاتا تھا لیکن وہ اپنا ہر دکھ درد شراب میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی خوش طبعی بھی برقرار رہتی تھی۔

میں نے اسے سہ پہر والی کارکردگی بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یہ ہندوا کھاڑے کے لوگ تھے۔ یہ تو کافی سخت جان ہوتے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ پرانے ہتھیار چلانے کی بھی انہیں مہارت ہوتی ہے۔ اگر تم نے انہیں نیچا دکھایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میری محنت بالکل ہی بیکار نہیں جارہی۔''

''بالکل ہی بیکار نہیں جارہی... سے کیا مطلب؟ کیا آپ میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو؟''

''مطمئن تو ہوں لیکن پوری طرح نہیں۔'' اس نے کہا پھر میری پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا باندھ رکھا ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا، یہاں چوٹ لگی ہے۔ کافی خون بہا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ تم چوٹ کو چوٹ سمجھ رہے ہو۔ تم اس سے خوف زدہ ہو۔ تم نے اسے چھپا دیا ہے، باندھ دیا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی جنگلی جانور، تیر، چیتے، ٹائیگر وغیرہ کے بارے میں کبھی سنا ہے کہ اس نے زخم پر پٹی باندھی، دوا لگائی؟ حالانکہ انہیں زخم لگتے ہی رہتے ہیں اور ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت خود سب سے بڑا مرہم ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''اگر سمجھنا چاہتے ہو تو آہستہ آہستہ سمجھ میں بھی آنے لگے گا۔'' اس نے کہا اور میری پنڈلی کی پٹی اپنے ہاتھ سے کھول دی۔

اس دن مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ زخمی پنڈلی کے ساتھ ہی میں نے اور جیکی نے سخت ترین مشق کی۔ میرے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔ میرا پاؤں لہورنگ ہوگیا۔ زخم پر لگنے والی پہلی ایک دو ضربوں نے مجھے تکلیف دی لیکن پھر یہ تکلیف ایک طرح کی توانائی میں بدلنے لگی۔ ہر بار جب زخم پر چوٹ لگتی تو میرے اندر ایک ہیجان سا پیدا ہوتا۔ ایک تلخ لہر ابھرتی اور آتش بن کر میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔ میں درد اور برداشت کے نئے پہلوؤں سے آشنا ہورہا تھا۔

اس رات باروندا جیکی کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ یوں لگا کہ اس کی سانس رک جائے گی۔ اس کا ہڈیوں بھرا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ میرا دل چاہا کہ جیکی تک وہ اطلاع پہنچادوں جو میں نے کئی دن سے خود تک محدود رکھی ہوئی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جیکی کو اضافی دکھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی تک کپتان اجے کو نل پانی میں شکنتلا کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ بہرحال، وہ تن دہی سے اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

...اگلے تین دن تک سلطانہ اور طلال راجپوت کی تلاش شد و مد سے جاری رہی مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ گھوڑے پر داغے ہوئے نمبر سے بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ اس سلسلے میں تین مختلف افراد مشکوک قرار دیے گئے تھے اور ان سے پوچھ گچھ ہورہی تھی۔

اکھاڑے سے جو نوجوان پکڑے گئے، انہوں نے کئی انکشافات کیے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور جارج وغیرہ کو نل پانی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہم آہنگی ایک آنکھ نہیں بھارہی۔ نل پانی میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس کے باوجود وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری سے رہ رہے تھے۔ اس رواداری اور ہم آہنگی کو ختم کرنے کے لیے حکم نے اپنے سازشی عناصر یہاں چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک مثال چار دن پہلے اکھاڑے میں ہلاک ہونے والا شخص ستیش آنند تھا۔ یہ شخص ہندو نوجوانوں میں مراد شاہ وغیرہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کررہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مراد شاہ اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار پر حاوی ہوچکے ہیں اور وہ عنقریب اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان عالموں کے پاس بیٹھتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں دن بہ دن مسلمانوں کے ساتھ بڑھتی جارہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سلطانہ کی گمشدگی نے مجھے ازحد مضطرب کر رکھا تھا۔ مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اچانک اس کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر آجائے گی۔ اس کی تلاش میں چھوٹے سرکار کے ہرکارے دور دور کی خاک چھان رہے تھے۔ میں خود بھی دیوان سے باہر نکل کر اس تلاش میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن چوہان نے مجھے سختی سے منع کردیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم ایک بات بھول رہے ہو تابش! تم آزاد ہوکر بھی آزاد نہیں ہو۔ تمہارے اندر ''چپ'' موجود ہے اور یہاں نل پانی میں حکم کے بہت سے جاسوس موجود ہیں۔ وہ تمہیں کسی بھی وقت ٹریس کرسکتے ہیں۔'' اس نے مجھے انٹینا والی بات بھی یاد دلائی اور کہا کہ اب مجھے اس بارے میں کوئی شک شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

وہ تو اس بات پر بھی ناخوش تھا کہ میں نے تین چار دن پہلے بازار میں اچانک ستیش کو دیکھ کر اس کا اندھادھند تعاقب شروع کردیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سیکیورٹی کے بغیر بالکل دیوان کی عمارت سے باہر نہ نکلوں۔

ننھا بالو بھی آج کل بہت مضطرب تھا۔ ماں کی دوری اکثر اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز رکھتی تھی۔ وہ اسے بانہوں میں نہیں لیتی تھی، اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی لیکن اس کے قریب تو رہتی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں لیٹنے کی اجازت تو دیتی تھی مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کی گود میں بلکتا رہتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کچھ کررہا تھا۔ اس کی دردبھری آواز سن کر میں اس کے پاس چلا گیا۔ صفیہ اسے بانہوں میں لیے برآمدے میں چکرا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ لاڈ بھرے انداز میں اسے پچکار رہی تھی۔ ''کاکے کی امی جان آئے گی... کاکے کو گانا سنائے گی... کاکے کو جھولا جھلائے گی... کاکے کو دودھ پلائے گی... کاکے کی امی آئے گی۔''

وہ واقعی چپ ہوگیا۔ اپنی اشک بار معصوم آنکھوں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی ساری بات سمجھ رہا ہو۔ اس دوران میں صفیہ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے اپنی اوڑھنی درست کرنے لگی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بالو کو اٹھالیا۔ مجھے اس سے انس محسوس ہوا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے، اس کا نم گال چوما۔ اس کا ننھا سینہ اب بھی چھوٹی چھوٹی ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کی ہر ہچکی میں ممتا کی تلاش تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چوہان تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ''خیریت ہے چوہان؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولا۔ ''پرانے شہر سے ایک لاش ملی ہے۔''

''کس کی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ایک جواں سال عورت ہے۔ چہرہ بری طرح مسخ ہے... پہچانا نہیں جارہا۔ اجے کو شک ہے کہ...'' چوہان کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کے ادھورے فقرے کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے دہل کر کہا۔ ''وہ کوئی اور ہوگی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ تم شناخت میں مدد دے سکتے ہو۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے بچہ واپس صفیہ کی گود میں دیا اور ڈاکٹر چوہان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جب میں نے سلطانہ کو آخری بار دیکھا تو اس نے کون سے کپڑے پہن رکھے تھے... اس کی جوتی کون سی تھی؟ وہ زیور تو سرے سے پہنتی ہی نہیں تھی۔ اسے لباس وغیرہ سے ہی شناخت کیا جاسکتا تھا۔

ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور شہر کے بارونق راستوں سے گزرتے ہوئے پرانی آبادی میں پہنچ گئے۔ اب شام ہوچکی تھی۔ گھروں میں چراغ، لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہوچکے تھے۔ کہیں کہیں کسی خوش حال فیملی کی چار دیواری میں جنریٹر کی برقی روشنی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں بائیسکلوں پر لیمپ روشن کرنے کا رواج تھا۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں وغیرہ کی دونوں سائڈز پر بھی کیروسین آئل کے لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔

ہم ایک تین چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچے۔ بالکونیوں اور محرابی دروازوں والی اس عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کے سپاہی اس ہجوم کو موقع واردات سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اجے بھی یہیں موجود ہے۔

میں چوہان کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر ایک لاش سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ چادر پر سر کی طرف خون کے بڑے

http://digestpk.blogspot.com/

بڑے داغ نظر آرہے تھے۔ میری رگوں میں خون کی گردش عروج پر پہنچ گئی۔ کیا اس چادر کے نیچے سلطانہ تھی؟

اجے کے حکم پر باقی افراد کمرے سے باہر نکل گئے... تھانے دار محمود بھی چلا گیا۔ اب صرف ڈاکٹر چوہان، اجے اور میں کمرے میں تھے۔ اجے کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''چہرہ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ شاید کلہاڑی کے وار کیے گئے ہیں... دل کڑا کر کے دیکھنا پڑے گا۔''

چوہان نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اجے نے لاش کے چہرے پر سے خون آلود چادر ہٹائی اور اسے کندھوں تک کھسکا دیا۔ واقعی کچھ نظارے آنکھوں کے لیے سخت اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ میں اندر تک لرز گیا۔ قاتل نے بڑی بے رحمی سے چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ اس نے کلہاڑی وغیرہ سے پے در پے وار کر کے سر اور چہرے کی ہڈیاں چُور کر ڈالی تھیں۔

کپتان اجے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''نہیں۔ چہرے سے تو کوئی اندازہ نہیں ہو رہا۔'' میں نے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

چوہان نے بھی میری تائید کی۔

''کپڑوں سے کچھ پتا چل رہا ہے؟'' اجے نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، کپڑوں سے بھی نہیں۔''

''لیکن یہ اسی طرح کے کپڑے ہیں جیسے سلطانہ بی بی پہنتی تھی۔'' اجے بولا۔ اس نے لاش کا چہرہ تو ڈھکا رہنے دیا لیکن پہلو سے چادر ہٹا کر ایک بار پھر مقتولہ کے خون آلود کپڑے ہمیں دکھائے۔

میں نے کپڑوں کو دھیان سے دیکھا۔ یہ اسی طرح کی چیک دار... فراک نما قمیص تھی جو سلطانہ پہنتی تھی۔ زیریں جسم پر تنگ موری کا پاجامہ تھا۔ میں نے ہاتھوں اور بازوؤں کی ساخت دیکھی لیکن ایک بار پھر کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اجے بولا۔ ''ابھی تھوڑے سمے پہلے سلطانہ بی بی کے پتا مختار صاحب بھی یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چند سیکنڈ سے زیادہ دیکھ ناہیں سکے۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ ویسے انہوں نے بھی پہچانا ناہیں ہے۔''

چوہان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے تابش... کہ سلطانہ تمہاری بیوی ہے۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ سب سے نزدیکی ہوتا ہے۔ ایک شوہر کی حیثیت سے تم اسے اس کی کسی جسمانی نشانی کی وجہ سے بھی پہچان سکتے ہو۔'' چوہان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ یوں تو ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے بھی معلوم تھا کہ میرا کیس کتنا مختلف ہے۔ پچھلے دو ڈھائی سال کا عرصہ میرے ذہن میں ایک بالکل صاف سلیٹ کی طرح تھا۔ اس پر کوئی نقش کوئی یاد موجود نہیں تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں بے طرح چونک گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اجے یا چوہان کے ذہن میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید سلطانہ کے والد کے ذہن میں۔ کبھی کبھی یوں ہو جاتا ہے۔ کسی واقعے پر غور کرتے ہوئے نہایت دانا بینا لوگ بھی بالکل سامنے کے نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

ہم واپس کمرے میں پہنچے جہاں مسخ لاش رکھی تھی۔ دراصل مجھے کچھ روز پہلے کا وہ خون ریز واقعہ یاد آ گیا تھا جب نل پانی کے نواحی جنگل میں ''کھنڈر چوکی'' پر پانڈے اور اجے کے بندوں میں زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ سلطانہ نے بھی اس لڑائی میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اور ٹیلے پر چڑھائی کرتے ہوئے اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہو چکا تھا۔ یہاں دستی بم کا کوئی چھوٹا ٹکڑا لگا تھا۔

اب یہی زخم سلطانہ کی شناخت بن سکتا تھا۔ میں لکڑی کے بوسیدہ تخت پر پڑی لاش کی طرف بڑھا تو میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ یہ بڑا جگر پاش مرحلہ ہوتا ہے۔ چادر اٹھا کر لاش شناخت کرتے ہوئے دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور سینے پھٹ جاتے ہیں۔ کیا اگلے چند سیکنڈ میں، میں اس اندوہناک خبر سے آگاہ ہونے والا تھا کہ میری مبینہ بیوی اور بالو کی ماں کبھی ہمارے درمیان واپس نہ آنے کے لیے جا چکی ہے۔

میں نے لاش کے خون آلود پاؤں پر سے چادر ہٹائی۔ میری نگاہ دھندلا گئی۔ اس دھندلائی ہوئی نگاہ نے دیکھا کہ لاش کے پاؤں پر زخم نہیں تھا۔ یہ سلطانہ کی لاش نہیں تھی۔

''نہیں چوہان۔'' میں نے بدنصیب مقتولہ کے پاؤں دوبارہ چادر سے ڈھک دیے۔ ''یہ سلطانہ نہیں ہے۔''

چوہان اطمینان کی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ خود بھی اس بات پر بھونچکا رہ گیا کہ یہ بنیادی بات اس کے اور اجے کے ذہن میں کیوں نہیں آسکی۔

''شدید تشویش میں اس طرح کی غلطیاں ... ہیں۔'' اجے نے کہا۔

میں نے تائید کی اور پوچھا۔ ''یہ لاش ملی کیسے؟''

اجے نے بتایا۔ ''یہ مکان کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ مالک مکان نئے شہر میں جا چکا ہے۔ آج دوپہر کو بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ ان کی گیند ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے اندر چلی گئی۔ دو بچے گیند لینے کے لیے اندر گئے تو انہیں یہ تازہ لاش نظر آئی۔ انہوں نے شور مچا دیا۔''

''یہ کسی مسلمان لڑکی کی لاش ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''اور خاص بات یہ ہے کہ یہ جگہ اس گلی سے زیادہ دور نہیں جہاں تین چار دن پہلے ہندوا کھاڑے میں ستیش آنند کو گولی لگی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس قتل کا تعلق اکھاڑے والے واقعے سے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میں لاش والے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دل کی دھڑکنیں ابھی تک زیروزبر تھیں۔ اگر یہ سلطانہ کی لاش ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس کا جواب کافی تکلیف دہ تھا... تو کیا میں لاشعوری طور پر سلطانہ سے وابستگی محسوس کرنے لگا تھا؟ اس کی زندگی اور موت میرے لیے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی؟

لاش میں سے اب ہلکی ہلکی بو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اس بو سے گھبرا کر باہر گلی میں نکل آیا۔

ایک گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ اجے کے ماتحتوں میں سے تھا۔ یقیناً اس کے پاس اجے کے لیے کوئی خاص خبر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اجے کے پاس پہنچ گیا۔ اس ماتحت نے سیلیوٹ کرنے کے بعد کپتان اجے کو اطلاع دی۔ ''جناب! شہر کے شمالی برج کے پاس ایک لڑکی کا کھوج لگا ہے۔ وہ ایک چھوٹی بگھی پر سوار تھی اور اسے خود ہی چلا رہی تھی۔ اسے ایک ناکے پر روکا گیا لیکن وہ رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ گنجان علاقے میں چلی گئی اور پھر بگھی چھوڑ کر ایک گودام میں گھس گئی۔ وہ اب بھی اسی تین منزلہ گودام میں ہے۔ ہمرے ساتھیوں نے گودام کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

''تو اس کو پکڑا کیوں ناہیں؟'' کپتان اجے نے چیخ کر پوچھا۔

''اس گودام میں بہت سا آتش گیر مادہ پڑا ہے جی۔ گندھک اور سلفر وغیرہ۔ اگر لڑکی کے پاس کوئی ہتھیار ہے

''وہ اکیلی ہے؟'' اجے نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ہمرے سامنے تو اکیلی ہی اندر گھسی ہے۔ اگر اندر پہلے سے اس کا کوئی ساتھی وغیرہ ہو تو کہا ناہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔'' اجے نے کہا۔

تھانے دار محمود کو لاش کے حوالے سے ضروری ہدایات اور مشورے دینے کے بعد اجے میرے اور چوہان کے ساتھ فوجی گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم تیز رفتاری سے نل پانی کے شمالی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ زیادہ تر گلیاں اور سڑکیں نیم تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

کہاں تو سلطانہ کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی اور کہاں اب اوپر نیچے اطلاعات مل رہی تھیں۔ راستے میں اجے نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ ''تم نے لڑکی دیکھی ہے؟''

''جی جناب! لیکن بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑی تھی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔ نقاب میں سے بس آنکھیں ہی نظر آوت تھیں۔ وہ کافی ہوشیار اور دلیر لگت ہے جی۔ اس نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے کوئی تین میل تک دوڑایا ہے...''

اسی گفتگو کے دوران میں ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ نسبتاً کشادہ علاقہ تھا۔ یہاں درخت وغیرہ بھی تھے۔ دائیں طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ یقیناً اس طرف نل پانی کی بڑی جھیل تھی۔ یہاں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک سراسیمگی سی پائی جارہی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں نے گودام کی عمارت کو گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ تماشائی دور گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں پر موجود تھے۔

اجے نے بڑی بڑی مونچھوں والے اس پولیس افسر سے بات کی جس نے لڑکی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس نے دور کونے میں کھڑی ایک چھوٹی بگھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس پر آئی تھی جی۔ ہم نے روکا تو یہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ اس نے کالے رنگ کا برقع پہنا ہوا ہے... اور بالکل نڈر لگت ہے۔''

''تمہیں یہ کیسے شبہ ہوا کہ یہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سلطانہ بی بی کے ساتھ اس کا نوعمر بھتیجا بھی ہے۔ ہمرے خیال میں اس بگھی میں بھی ایک لڑکا موجود تھا لیکن وہ راستے میں کہیں اترا اور تنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔''

''کسی نے اس لڑکے کو دیکھا؟'' کپتان اجے نے

http://digestpk.blogspot.com/

پوچھا۔

''ناہیں، صاف تو ناہیں دیکھ سکے... بس کشمیری دروازے کے پاس اس کی ایک جھلک دیکھی گئی ہے...''

کچھ دیر صلاح مشورہ ہوا۔ میں نے اجے سے کہا۔ ''اگر اندر سلطانہ ہی ہے تو پھر اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ میں اندر جاؤں... اور اکیلا ہی جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنی بات سننے پر مجبور کرلوں گا۔''

''اس کام میں بہت احتیاط کرنا پڑے گی جی۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''وہ کسی کی بات ناہیں سن رہی۔ آتما ہتھیا کی دھمکیاں بھی دے رہی ہے۔''

''کیا کوئی اس سے پہلے گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

موچھیل پولیس افسر نے ایک پٹھان چوکیدار کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ درمیانی عمر کے اس شخص کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ بھی نظر آتا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہی لڑکی گودام کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''بی بی اوپر کی منزل پر دائیں طرف والے کمرے میں ہے جی۔ اس کمرے کا ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتا ہے۔ ام اوپر گیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ام سے کہا کہ اگر ام آگے آیا تو وہ کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دے گا۔ ام ذرا سا اور آگے گیا تو اس نے اپنا پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کودنے کے لیے ایک دم تیار ہوگیا... وہ بہت خطرناک نظر آرہا ہے جی۔''

''کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہے اس کے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''ام بھروسے سے کچھ نئیں کہہ سکتا جی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔''

میں نے اجے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں اندر جاتا ہوں۔''

اس معاملے پر تھوڑی سی بحث ہوئی پھر اجے اور چوہان نیم رضامند ہوگئے۔ چوہان نے کہا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے، اسے سب سے پہلے یہ بتا دو کہ یہاں بہت سا آتش گیر سامان پڑا ہے۔ اگر اس کے پاس ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلانے کی غلطی کی تو سب کچھ دھماکے سے اڑ جائے گا...''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وہی میٹھی میٹھی لہر جواب مجھے خطرے سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ گودام میں گہری تاریکی تھی۔ بس ایک دو کمروں میں لالٹین یا گیس لیمپ کی روشنی موجود تھی۔ میں صرف ایک ٹارچ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ایک پستول بھی میرے لباس میں موجود تھا لیکن یہ پستول مجھے صرف اسی وقت استعمال کرنا تھا جب کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رہتا۔

گودام کے اندر گھستے ہی مجھے ایک ہال کمرے میں لکڑی کی بہت سی پیٹیاں نظر آئیں... یہاں گندھک کی بو صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں تاریک سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی اور پھر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے آواز دی۔ ''سلطانہ... سلطانہ... کہاں ہو تم؟''

جواب ندارد۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ چند آخری سیڑھیوں پر رک کر میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں پھینکا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں، یہاں سے کسی طرح نکلنے میں تو کامیاب نہیں ہوگئی۔ میں نے پھر آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ جو تم کہو گی ویسا ہی ہوگا لیکن پتا تو چلے کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم کہاں ہو؟''

اس بار بھی جواب میں مکمل خاموشی رہی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں پر اور گرد آلود فرش پر پھینکا۔ زنانہ قدموں کے نشان واضح طور پر نظر آئے۔ ان نشانات کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جس کا ذکر پٹھان چوکیدار نے کیا تھا۔ مجھے چوہان والی بات یاد آئی اور میں نے بہ آوازِ بلند پکار کر کہا۔ ''دیکھو... تم جو کوئی بھی ہو... ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہاں ان کمروں میں بہت سا بارود پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی گولی وغیرہ چلی یا اس طرح کی کوئی اور بے احتیاطی ہوئی تو سب کچھ ختم ہوسکتا ہے۔ میں بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ تم میرے سامنے آؤ اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟''

نیم روشن کمرے میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں... بس مجھے یہاں سے چلے جانے دو۔ خدا کے لیے...'' اس کی آواز بھرّا گئی۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ یہ سلطانہ کی آواز نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھی لیکن ابھی میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں آواز دوبارہ سننا چاہتا تھا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تم سامنے تو آؤ۔''

''مم... میں... سامنے آنا ناہیں چاہتی۔ کچھ لوگن کی طرف سے... میرے جیون کو خطرہ ہے... وہ مجھے مار دیویں گے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ وہ سلطانہ نہیں تھی۔ وہ بات

جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھ کو جانے دو۔ میں بالکل ... ہوں۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں...''

میں نے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ کمرے میں اس کا ہیولا نظر آیا۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ وہ ادھ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور کسی سہمے ہوئے جانور کی طرح لگتی تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا رویّہ جارحانہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس خوف زدہ تھی اور اس خوف کی وجہ سے خودکشی کی دھمکی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز سن کر مجھے لگا کہ وہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا جو وہ خود کو سپاہیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی جان دینا زیادہ آسان محسوس کررہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں تمہیں ہر طرح کی تسلی دیتا ہوں۔ اگر تم بغیر کچھ بتائے یہاں سے جانا چاہتی ہو تو بھی جا سکتی ہو لیکن اگر تم اپنا کوئی مسئلہ بتانا چاہتی ہو تو ہم اس کے لیے بھی حاضر ہیں۔ میں تمہاری مدد کے لیے کسی زنانہ پولیس افسر کو بلا لیتا ہوں...''

''ناہیں، میں کسی سے کچھ کہنا ناہیں چاہتی۔ میں بس یہاں سے جانا چاہت ہوں۔''

میں ذرا آگے بڑھا تو وہ ایک دم کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کا سراپا یکسر دھمکی آمیز دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک لڑکی کے عقب میں واقع ایک کھڑکی کے شیشے زوردار چھناکے سے ٹوٹے اور ایک پرچھائیں برق رفتاری سے لڑکی پر جھپٹی۔ لڑکی بلند آواز سے چلّائی۔ دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ شومئی قسمت، گرتے وقت لڑکی پر جھپٹنے والے شخص کا سر دیوار سے ٹکرایا، اس کی گرفت ایک سیکنڈ کے لیے لڑکی پر کمزور پڑی۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔ وہ اندھا دھند کھڑکی کی طرف بڑھی۔ انداز سے عیاں تھا کہ وہ نتیجے سے بے پروا ہو کر چھلانگ لگا دے گی۔ میں اس سے قریباً پانچ میٹر کی دوری پر تھا۔ یہ حتی الامکان تیزی سے حرکت میں آنے کا وقت تھا... اور میں نے حرکت کی۔ اپنی ٹانگوں کی پوری طاقت سے میں نے لڑکی کی طرف ''رش'' کیا۔ یہ سیکنڈ کے ایک مختصر ترین حصے کا کھیل تھا۔ وہ جب کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ چکی تھی، میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا اور پھر پلٹ کر کمرے میں پھینک دیا۔ اس کے برقعے کا بالائی حصہ اتر کر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی

اچھلنے والے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی۔ دو کرسیاں دھڑ ادھڑ جلنا شروع ہوگئیں۔ یہ سنگین ترین صورتِ حال تھی۔ ہم بارود کے ڈھیر پر تھے اور چنگاری کے بجائے پورا الاؤ روشن ہوگیا تھا۔ اس الاؤ کی روشنی میں مجھے دو چہرے نظر آئے۔ ایک تو اس شخص کا چہرہ جو کھڑکی توڑ کر لڑکی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ کپتان اجے تھا۔ دوسرا لڑکی کا چہرہ۔ وہ میری گرفت میں تھی۔ بالائی برقع اترنے سے اس کے بال کھل چکے تھے۔ یہ بہت لمبے بال تھے... غیر معمولی حد تک لمبے۔ میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی... ہرگز نہیں تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے اس حسین لڑکی کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ شکنتلا تھی۔ باروندا جیکی کی گمشدہ محبوبہ۔ وہ بہت حد تک میری دیکھی ہوئی تصویر سے مل رہی تھی۔

اس بارے میں زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

''دروازہ بند کردو اجے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اجے خود بھی محسوس کرچکا تھا کہ آگ کو محدود رکھنے کے لیے دروازہ بند کرنا ضروری ہے۔ اس نے لپک کر دروازہ بند کردیا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور دونوں جلتی ہوئی کرسیاں یکے بعد دیگرے کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دیں۔ اس کا یہ اقدام اس کی حاضر دماغی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ آگ ایک دم سمٹ گئی۔ اگلے چند سیکنڈ میں اجے نے اسے مکمل طور پر بجھا دیا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بم کا سلگتا ہوا فیتہ کاٹ کر اسے پھٹنے سے روک دیا جائے۔ اجے کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

لڑکی ابھی تک میرے بازوؤں میں دبی ہوئی تھی اور خود کو چھڑانے کے لیے اندھا دھند زور لگا رہی تھی۔ اجے کے جوان دندناتے ہوئے سیڑھیوں پر نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھ سے بربرپیکار ماہ جبیں کو سنبھال لیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لمبے ریشمی بال بار بار چہرے کو چھپا رہے تھے۔ وہ چلّا رہی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے... مر جانے دو مجھے...''

میں حالات کی دھما چوکڑی پر حیران ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سلطانہ کے شبہے میں پہنچے تھے۔ یہ خیال تو ذہن میں موجود تھا کہ جو لڑکی یہاں موجود ہے، شاید وہ سلطانہ نہ ہو... لیکن یہ خیال ہرگز ذہن میں نہیں تھا کہ سلطانہ کی تلاش تو ناکام رہے گی لیکن ایک اور تلاش کامیاب ہو جائے گی۔ اجے اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار کے حکم پر کئی روز سے شکنتلا کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے اور اب وہ کسی حد تک مایوس

http://digestpk.blogspot.com/

بھی ہو چکے تھے... لیکن آج شب اس گودام میں بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی لڑکی سامنے آگئی تھی جو میرے اندازے کے مطابق شکنتلا ہی تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبے بال اس کی شناخت کو معتبر کر رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ اہم ترین اندازہ درست ثابت ہو گیا کہ آج رات اس گودام میں ہم اتفاقیہ طور پر شکنتلا کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ شکنتلا ساہنی ہے۔

وہ واقعی حسین تھی۔ اس کی خوبرو پیشانی پر پسینا موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بند کمرے میں میرے، اجے اور چوہان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ ”میں تمہاری منت کرت ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں جانت ہوں، چھوٹے سرکار اگر مجھ سے ملنا چاہت ہیں تو میری بھلائی کے لیے ہی چاہت ہوں گے... لیکن میں یہ بھی جانت ہوں کہ ان کی یہ کرپا مجھ کو مہنگی پڑے گی۔“

”کیوں مہنگی پڑے گی؟ کیا آپ کو چھوٹے سرکار پر اور ہم سب پر وشواس ناہیں ہے؟“ اجے نے تنک کر پوچھا۔

”میں وشواس کی بات ناہیں کرتی... لیکن میں یہ بھی ناہیں چاہتی کہ آپ لوگن کو میرے کارن کسی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ سب جانت ہیں کہ نل پانی میں بھی حکم جی اور جارج کے جاسوس موجود ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکت ہیں۔“

”آپ بے فکر رہیں۔“ اجے نے رعب سے کہا۔ ”آپ کو چھوٹے سرکار کی خاص حفاظت میں دیوان کے اندر رکھا جاوے گا۔“

”کچھ لوگن تو یہ کہت ہیں کہ دیوان کے اندر بھی حکم جی کے بندے موجود ہیں۔“ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ وہ واضح طور پر بہت خوف زدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ نل پانی میں گمنام رہے۔

”آپ کو ضرورت سے زیادہ ڈرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے افسوس ہے کہ آپ دیوان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔“ اجے نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم شکنتلا کو خاص فوجی گھوڑا گاڑی میں سوار کر کے دیوان کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میری نگاہیں اس کے سراپا پر اور اس کے سیاہ آبشار جیسے طویل بالوں پر جمی تھیں... تو یہ زرگاں کے شاہی محل کا وہ نو دمیدہ پھول تھا جس نے بارونداجیکی جیسے مضبوط شخص کو عشق میں دیوانہ کیا تھا... اور کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ میری نگاہوں میں بارونداجیکی کا چہرہ گھومنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں اسے شکنتلا کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دوں گا تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ کہیں وہ شادی مرگ کا شکار تو نہیں ہو جائے گا؟

راستے میں شکنتلا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ نل پانی میں آنے کے بعد وہ جان بوجھ کر اوجھل ہوئی ہے۔ وہ یہاں ایک متوسط آبادی میں اپنی ایک پرانی سہیلی کی ملازمہ کے پاس قیام پذیر تھی۔ نوراں نامی یہ لڑکی اور اس کا خاوند چینی کے برتنوں پر نقش نگاری کا کام کرتے تھے۔ آج وہ دونوں میاں بیوی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کچھ کام کر رکھا تھا جو بازار میں دے کر آنا ضروری تھا۔ مجبوراً شکنتلا نے نوراں کے ملازم کو ساتھ لیا اور بازار میں برتن دے کر آئی۔ واپسی پر پولیس والے پیچھے لگ گئے۔ شکنتلا ہرگز ان پر اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے بگھی دوڑا دی۔ راستے میں جو بندہ خوف زدہ ہو کر بگھی سے اترا، وہ نوراں کا ملازم ہی تھا۔ وہ بھی چینی کے برتنوں پر پھول بوٹے بنانے کا کام کرتا تھا۔ میں نے شکنتلا کی باتوں میں حکم کے خطرناک ہرکارے رنجیت پانڈے کا نام بھی سنا۔ وہ اس شخص سے خاص طور پر خوف زدہ نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ میں بارونداجیکی کے پاس اس کے کمرے میں موجود تھا۔ جھروکوں سے باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ دیوان کے کسی اندرونی حصے میں کوئی ستار نواز بڑے میٹھے سروں میں ستار بجا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سنگت میں ہارمونیم کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔

جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا۔ ”کیا خیال ہے، آج آرام نہ کریں؟“ جیکی نے کہا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اس طرح کی بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو چھٹی کی بات پر آگ بگولا ہو جاتا تھا اور اپنا پسندیدہ فقرہ دہراتا تھا... وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ تم ہڈحرامی دکھاؤ گے تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

”کیا بات ہے جیکی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں، ایک دم فرسٹ کلاس ہوں۔ بس دوپہر کو بخار نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی تھی اور ایک سو دو سے ایک سو چار پر چلا گیا تھا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں تو یہ میرے ساتھ کرتا ہی رہتا ہے۔ شام کو کھانے کے بعد کھانسی کا دورہ پڑا اور ناک سے تھوڑا سا خون بھی آیا۔ لگتا ہے کہ خون کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے میرے اندر۔“ وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں

http://digestpk.blogspot.com/

بولا۔

”آپ دوا بھی تو نہیں کھاتے ہو۔ حالانکہ...“

”چھوڑو دوست!“ اس نے میری بات کاٹی۔ ”جب دوا کھا کر بھی مرنا ہے تو پھر کیوں نہ دوا کے بغیر ہی یہ گھاٹی پار کرلی جائے۔“

آج وہ واقعی تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا۔ ”آپ مرنے کی باتیں نہیں چھوڑو گے اور ہم آپ کو مرنے کے لیے نہیں چھوڑیں گے... آپ جو مرضی کرلو، ہم آپ کو کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئیں گے۔“

”بہت مشکل ہے۔“

”آپ خود ہی تو کہتے ہو، مشکل کو آسان کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ میں نے کل ہی انور خاں اور مراد شاہ صاحب سے بات کی ہے۔ ہم آپ کے لیے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا انتظام کررہے ہیں۔ اس جاپانی ڈاکٹر کو مقامی لوگ بہت مان رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ کو اسٹیٹ سے باہر بھی بھجوائیں گے۔“

”اسٹیٹ سے باہر جا کر کیا کرنا ہے؟ میری روح اسٹیٹ کے اندر ہے۔ میں یہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔“

اس نے آتشیں سیال کے کئی تلخ گھونٹ بھرے اور ترنگ میں آگیا۔ تکیہ اپنی کمر کے ساتھ رکھ کر وہ نیم دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنا پسندیدہ نیپالی گیت گانے لگا۔

اس کی آواز دل سوز تھی۔ اس میں درد لہریں لیتا تھا اور ”سوچ کی گہری نیلی جھیلوں“ میں سنہری دھوپ کے اندر یادوں کی کشتیاں ڈولتی تھیں۔

وہ گاتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”جیکی! آپ جس کو دن رات یاد کرتے ہو... وہ آپ کے سامنے آجائے تو پھر؟“

”کس طرح؟“ اس نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

”جس طرح کوئی انہونی ہوتی ہے... جس طرح کالی سیاہ رات کے اندر سے سورج نکلتا ہے... جس طرح دم گھونٹنے والا حبس، بارشوں کو کھینچ کر لاتا ہے... جیسے تپتی ریت کے اندر سے چشمہ پھوٹتا ہے۔“

اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور مجھے قدرے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ”آج تو تم بھی شاعری کررہے ہو۔“

”آپ کی صحبت کا اثر ہے جیکی... لیکن... آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اگر آپ کی شکنتلا ایک بار پھر آپ کے سامنے آجائے تو...“

”ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن سے میرا درد بڑھ کر ناقابلِ برداشت ہوجائے۔“

”میں صرف بات نہیں کررہا۔ میں آپ سے ایک سنجیدہ سوال پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم بُری طرح چونک گیا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ وہ چند سیکنڈ تک تحیر کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا پھر لرزاں ہونٹوں کے ساتھ بولا۔ ”کیا... تم نے... اسے کہیں دیکھا ہے؟“

میں نے اس کا اکلوتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور دبے دبے جوش سے کہا۔ ”ہاں، میرے محترم استاد! میں نے اسے دیکھا ہے... اور دیکھا ہی نہیں... وہ میرے ساتھ ہے... اسی چار دیواری میں... اسی چھت کے نیچے۔“

فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں... وہ ہکلایا۔ ”دیکھو... ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔“

”میں آپ سے مذاق کی جرأت نہیں کرسکتا...“

”تو پھر... یہ کیا ہے؟“

”آپ کی طلب کا صلہ۔ آپ کے دکھ درد کا مداوا۔ آپ کے انتظار میں اتنی شدت تھی کہ کوئی کھنچ کر آپ کی طرف آگیا۔ ہاں جیکی... وہ یہاں ہے۔ ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ آپ کی شکنتلا ہی ہے۔ وہ کئی دوسری عورتوں کے ساتھ زرگاں کے راج بھون سے بھاگ نکلی ہے...“

جیکی پر واقعی شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے راکھ کے ڈھیر تھے۔ اب وہاں عجب سی چمک نظر آنے لگی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیساکھی اپنی بغل کے نیچے رکھ لی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انتہائی اضطراب سے بولا۔ ”وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ... وہ کہاں ہے؟“

”یہیں پر ہے۔ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔“

”تم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہے؟“ وہ لرزاں آواز میں بولا۔

”نہیں، ابھی کچھ نہیں۔“

”وہ شکنتلا ہی ہے نا؟ میرا مطلب ہے، تم نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے نا؟“

”ایک سو ایک فیصد۔“

”مم... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے تابی کی انتہا کو چھونے لگا۔

اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ دروازے تک پہنچ کر وہ یک لخت رک گیا۔ اس کے اندر کی چکاچوند جیسے ایک دم تاریکی میں بدل گئی۔ کوئی چیز بجھ گئی اس کے اندر۔ میں نے محسوس کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا، تب بے دم سا ہو کر وہیں دہلیز کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ایک کندھا آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ٹیک دیا۔ ”کیا ہوا جیکی؟“ میں نے اس کا دوسرا کندھا تھام کر پوچھا۔

اس کا سر گھٹنوں کی طرف جھکتا چلا جارہا تھا۔ اس نے یہ جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔ تب وہ نقاہت بھری دل دوز آواز میں بولا۔ ”نہیں... تابش... اگر وہ واقعی یہاں ہے تو بھی... میں اس سے مل نہیں سکتا۔ میں ایسی بُری حالت میں اس کا سامنا نہیں کرسکتا۔ ہم نے بہت اچھے دن دیکھے ہیں... جب دونوں خوب صورت تھے۔ دونوں کے چہرے گلاب تھے۔ اب نہیں... اب نہیں... میں اسے اپنی بدبودار... برباد زندگی کا تماشا نہیں دکھا سکتا۔“ اس کی آواز بھیگتی چلی جارہی تھی۔

”آپ ایسا کیوں کہتے ہو جیکی... جو کچھ بھی ہے لیکن آپ جیکی ہو۔ جس طرح آپ نے اسے چاہا ہے، اس نے بھی چاہا ہے۔ اور جو چاہتے ہیں وہ ظاہری حالتوں پر نہیں جاتے۔ وہ جا ہی نہیں سکتے۔“

”نہیں تابش، نہیں۔“ اس نے سر جھکائے رکھا اور اسے مسلسل نفی میں ہلاتا رہا۔ اس کے لمبے جھاڑ جھنکاڑ بال اس کے چہرے پر جھولتے رہے۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ بلب کی روشنی میں جیسے ہر جاندار و بے جان شے محوِ حیرت دکھائی دیتی تھی۔ جھروکوں سے باہر سرو اور سفیدے کے بلند درختوں پر چاندنی اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ دیوان کی بلند و بالا بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جیکی کے سراپا میں ایک نئی طرح کی ترنگ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا گرد آلود سر اٹھایا اور میرا بازو تھام کر بولا۔ ”تابش! میں نے تمہیں آج تک جو کچھ دیا ہے اس کے بدلے میں تم سے ایک چیز... صرف ایک چیز مانگتا ہوں۔ کیا تم... دو گے؟“

”آپ نے جو کچھ دیا ہے جیکی... وہ اَن مول ہے۔ پلیز! آپ اس کو بیچ میں نہ لاؤ۔ آپ صرف یہ کہو کہ آپ کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

اس نے کانپتے ہاتھ اور ہانپتی سانسوں کے ساتھ وسکی کے دو بڑے بڑے گھونٹ لیے۔ وسکی کے قطرے اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں چمکنے لگے۔ وہ نم ناک لہجے میں بولا۔ ”تابش! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں... لیکن... لیکن اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔“

”مگر جیکی آپ...“

”نہیں تابش! اب کچھ نہیں کہنا۔ میں نے یہی چیز تم سے مانگی ہے، یہ مجھے ویسے ہی دے دو، جیسے میں چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ نہ کوئی دلیل دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کی۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکا۔ وہ عجیب موڈ میں تھا۔ اس کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش طاری تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی کہ شکنتلا سے میری ملاقات کیسے اور کیونکر ہوئی۔ میں نے اسے کافی کچھ بتا دیا... پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ شکنتلا کو کہاں اور کیسے دیکھے گا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات کو تفصیل میں جا کر سوچ رہا تھا اور اپنی سوچ میں مجھے بھی شریک کررہا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں سب کچھ طے ہوگیا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی سوچ بھی انوکھی تھی۔

پروگرام کے مطابق مجھے کل شام کے وقت جیکی کو اس کمرے میں لے جانا تھا جہاں میں سوتا تھا۔ یہ کمرا سلطانہ کے کمرے کے ساتھ واقع تھا۔ شکنتلا چونکہ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی، لہٰذا جیکی کے لیے ممکن تھا کہ وہ میرے کمرے سے اسے تسلی کے ساتھ دیکھ سکے۔ پروگرام کے مطابق میرے کمرے میں بالکل تاریکی رہنی تھی اور دونوں کمروں کی ایک درمیانی جالی دار کھڑکی کو میں نے تھوڑا سا کھول دینا تھا۔ جیکی کو گاہے بگاہے کھانسی بھی ہونے لگتی تھی۔ اگر کہیں ایسا کچھ ہوجاتا تو وہ کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں گھس سکتا تھا۔

اگلی صبح شکنتلا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب کافی حد تک نارمل تھی۔ ایک وحشت زدہ ہرنی کی سی کیفیت جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی، اب معدوم ہو چکی تھی۔ چھوٹے سرکار سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی اور اس نے اپنی گفتگو سے شکنتلا کی تشویش کافی حد تک دور کردی تھی۔ صفیہ سمیت تین ملازمائیں ہمہ وقت شکنتلا کی خدمت پر مامور کردی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ شکنتلا کی اضافی تسلی کے لیے قیام گاہ کے باہر گارڈ بھی بٹھا دیا گیا تھا۔

شکنتلا نہایت نفیس مزاج کی مالک تھی۔ لباس اور خوشبو

http://digestpk.blogspot.com/

وغیرہ کے معاملے میں اس کا انتخاب بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں وہ شاہانہ رکھ رکھاؤ تھا جس کا تعلق یقیناً راج بھون کے ماحول سے تھا۔

شکنتلا میرے بارے میں فقط اتنا جانتی تھی کہ میں ان افراد میں سے ہوں جو ماضی میں بدھا کا مقدس مجسمہ چوری کرنے کے الزام میں پاکستان سے پکڑ کر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں لائے گئے تھے... اور بعد میں مختار راجپوت کی بیٹی نے خود کو "راج بھون کی فیری" بننے سے بچانے کے لیے مجھ سے شادی کرلی تھی۔

وہ پاکستان کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی۔ خاص طور سے کھلاڑیوں اور اداکاروں کے بارے میں۔ اس نے مجھ سے لاہور، انارکلی، کلفٹن اور موہنجوداڑو جیسی جگہوں کے متعلق دلچسپی سے سوالات کیے۔ اپنی ہندی میں وہ انگریزی کے الفاظ بھی روانی سے استعمال کرجاتی تھی۔

وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھی۔ اس کی سفید رنگت میں گلابی پن کی آمیزش تھی اور خدوخال سے خاندانی نجابت جھلکتی تھی۔ راج بھون میں یقیناً اسے حکم جی کی دراز دستیوں اور من مانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس اکھاڑ پچھاڑ نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کچھ زیادہ گہنایا نہیں تھا۔

وہ ذرا کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ "مجھے ایک بات بتاؤ تابش! کیا رات کو یہاں کوئی گا رہا تھا؟"

میں چونک گیا۔ تاہم اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "مہمان خانے کی طرف ہارمونیم بج رہا تھا لیکن گانے کا تو پتا نہیں۔"

"ہارمونیم تو میں نے بھی سنا تھا لیکن... یہ اور آواز تھی۔ اور یہ زیادہ دور سے بھی نہیں آوت تھی۔"

"کس طرح کی آواز تھی؟" میں نے تفصیل چاہی۔

اس کے چہرے پر شدید الجھن نظر آئی۔ وہ درودیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کوئی بہت مدھم آواز میں گا رہا تھا۔ پتا نہیں کون سی زبان تھی لیکن... طرز... کچھ سنی ہوئی سی لگت تھی۔"

"یہاں بہت سے گانے والے ہیں۔ چھوٹے سرکار خود بھی اچھی موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔ شام کے بعد اکثر راگ رنگ کی محفل جمتی ہے۔"

"ناہیں، یہ محفل والا میوزک ناہیں تھا۔" وہ بدستور الجھن زدہ تھی۔

میں کچھ دیر تک شکنتلا کے ساتھ موجود رہا۔ ملازمہ صفیہ بھی بالو کو لے کر وہاں آگئی۔ شکنتلا نے بالو کو اٹھا کر پیار کیا۔ وہ سلطانہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے سلطانہ کی ساری روداد معلوم ہوچکی تھی۔ وہ بھی اس خبر پر پریشان تھی کہ سلطانہ کسی خطرناک ارادے کے ساتھ دیوان کو چھوڑ چکی ہے۔ شکنتلا کا دھیان بھی سیدھا جارج کی ستم ظریفیوں کی طرف ہی جارہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سلطانہ، جارج سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گی اور یہ کوشش خود سلطانہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

وہ بالو کو پیار کرتی رہی۔ مجھ سے سلطانہ کی تلاش کے بارے میں باتیں بھی کرتی رہی اور صفیہ کو چھوٹی موٹی ہدایات بھی دیتی رہی لیکن اس کے چہرے پر الجھن کی لکیریں موجود رہیں۔

اس کی الجھن کی وجہ تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس نے کل رات جیکی کو گاتے سنا تھا۔ یقیناً وہ نیپالی گیت پہلے بھی کبھی اس کے کانوں میں پڑچکا تھا۔ اب وہ آواز اس کے دل و دماغ میں ماضی کا کوئی نقشہ کھینچ رہی تھی۔ یہ تو وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی کہ جیکی زندہ حالت میں یہاں اس چاردیواری میں موجود ہوگا... مگر بھولی بسری آواز نے اسے پریشان ضرور کیا تھا۔

شام کو میں نے ایک بار پھر شکنتلا کو الجھن زدہ حالت میں دیکھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ ایک اندرونی روش پر ٹہل رہی تھی۔ وہ اس سے باتیں بھی کررہی تھی۔ ایک دو جملے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ صفیہ سے پوچھ رہی تھی۔ "دیوان کے اس رہائشی حصے میں کتنے گھر ہیں؟"

"دس بارہ تو ہوں گے جی۔ ایک دو بڑی کوٹھیاں بھی ہیں۔"

"یہاں کون کون رہتا ہے؟"

"زیادہ تر تو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ جی کے مہمان ہی ہووت ہیں۔ ان میں سے دوچار ایسے بھی ہیں جو زرگاں سے آپ کی طرح جیون بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔" وہ دونوں باتیں کرتے کرتے آگے نکل گئیں۔

صفیہ اور دیگر ملازموں کو جیکی کے بارے میں کچھ خاص معلوم نہیں تھا۔ انہیں بس یہ پتا تھا کہ کوئی سخت بیمار، شرابی شخص یہاں آیا ہے۔ کسی لڑائی میں اس کی ایک ٹانگ اور بازو جسم سے علیحدہ ہوچکے ہیں۔

... وہ شام میرے لیے ایفائے وعدہ کی شام تھی۔ آج میں نے اپنے محسن بارونداجیکی کے لیے کچھ ایسا انتظام کرنا تھا کہ وہ اپنی گمشدہ محبت کو جی بھر کر دیکھ سکے... پوری تسلی کے ساتھ اس چہرے کا دیدار کرسکے جس کی یاد وہ کئی موسموں سے اپنے فگار سینے میں چھپائے پھرتا ہے۔ شکنتلا مجھ سے وہ ساری روداد پوچھنا چاہتی تھی جب میں جارج گورا کے محل نما گھر سے نکلا تھا اور چھپتا چھپاتا انور خاں وغیرہ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام کو اس کے پاس آؤں گا اور سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ میرے اس وعدے کے پیچھے دراصل بارونداجیکی سے کیا ہوا وعدہ ہی تھا۔

شام کے بعد میں تھوڑے سے تناؤ میں تھا لیکن سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہی ہوا۔ میں جیکی کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں پہنچا چکا تھا۔ شکنتلا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ باتیں تو میرے ساتھ کررہی ہے لیکن اسے دیکھ کوئی اور رہا ہے۔ اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ، اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز سب کچھ کسی کی بے حد مشتاق نگاہوں کے گھیرے میں تھا۔ آج وہ کچھ زیادہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ شاید یہ شام کچھ زیادہ حسین تھی یا پھر اس کی اپنی ذات کی وجہ سے شام کا حسن بڑھ گیا تھا۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے گلابی آنچل کے نیچے اس کے طلائی جھمکے دمکتے تھے اور اس کی صراحی دار گردن کے پس منظر میں اس کے بے مثال بالوں کا آبشار نظر آتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ دو آنکھیں اس کے سراپا کو پلکوں سے چوم رہی ہیں۔

ہاں... وہ بڑی رومانی شام تھی۔ لیکن اس شام میں جس طرح کا رومان ہورہا تھا، وہ عام ڈگر سے بہت مختلف تھا۔ کوئی سراپا شوق تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کوئی سراپا غفلت تھا اور اسے دیکھا جارہا تھا۔

ہماری نشست ختم ہونے کے قریب تھی جب قریبی کمرے سے کھانسی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یہ جیکی کی آواز ہی تھی۔ کھانسی شروع ہونے کے فوراً بعد اس نے شاید اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" شکنتلا نے قدرے چونک کر پوچھا۔ اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

"کوئی ملازم ہے شاید۔" میں نے کہا اور اٹھ کر جالی دار کھڑکی کا آدھ کھلا پٹ بند کردیا۔

کچھ دیر بعد میں شکنتلا سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

جیکی اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ جیکی ہی کا کمرا تھا۔ جیکی کے بیمار جسم کی ہلکی سی باس کمرے میں رچی بسی تھی۔ جیکی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان آنکھوں میں تشکر، خوشی، حسرت اور ممنونیت کے جذبات گڈمڈ تھے۔

"مجھے لگتا ہے کہ اب میرے لیے مرنا اور آسان ہو گیا۔" وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

"آپ پھر وہی بات کررہے ہو... اب تو آپ کو جینے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

دسمبر 2010

جاتے سال کے آخری رنگ

الجھی ڈور

ریاکاری کی بساط پر سچ کی بازی لگانے والے چند سرپھروں کی داستان۔ آخری صفحات پر

ہمایوں بلگرامی کا ایک خوبصورت انداز

بخت گزیدہ

ابتدائی صفحات کے رنگ...... سازشوں، قتل و غارت گری کے فتنوں کے درمیان گھری زندگی کا احوال

حضرت زکریا علیہ السلام

آپؑ کی زندگی کے عبرت اثر حقائق...... جنہیں بے موسم پھل عنایت کرکے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کبریائی کا جلوہ دکھایا

اس کی خاطر

محبت میں جب کسی کی خاطر بنا سوچے سمجھے قدم اٹھالیا جائے تو یہی انجام ہوتا ہے......

ملک صفدر حیات کی اگلی معرکہ آرائی

اس کے علاوہ انا ڑی، محفل شعروسخن، آپ کے خط

مزید نجمہ مودی، منظر امام، مختار آزاد اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

http://digestpk.blogspot.com/

کی بات کرنی چاہیے اور آپ کو کرنی پڑے گی۔ بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے، اب آپ کو بھی تبدیل ہونا پڑے گا۔ ہم نے اب آپ کو بھلا چنگا کر کے چھوڑنا ہے۔ کل بہت اچھے ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔"

اس نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو چھت کی طرف اٹھایا اور کھانستے ہوئے بولا۔ "میں بہت سا سفر طے کر چکا ہوں۔ اب مجھے واپس بلانے کی باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔"

"اب آپ کو واپس آنا پڑے گا جناب... کیونکہ اب واپسی کی نہایت خوب صورت اور شان دار وجوہات موجود ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"اب ایسا نہیں ہو سکے گا تابش! اب تو زندگی کی شام گہری ہو چکی ہے۔"

"یہ شام نہیں تھی جناب! بس بادل تھے جن کی وجہ سے آپ نے دوپہر کو شام سمجھ لیا تھا۔ بہت جلد آپ کی زندگی کا سورج نصف النہار پر چمکے گا۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا رہا پھر بولا۔ "میں ایک بار پھر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں غلطی سے بھی شاکن (شکنتلا) کو میرے سامنے مت لانا۔ یہ میرے لیے اتنا ہی سخت ہو گا جتنا ایک ہزار بار جان کنی کے عذاب میں سے گزرنا۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری اپنی سوچ جو بھی ہو، میں وعدے کی پابندی کروں گا۔ اس کی مرضی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اس رات جیکی نے معمول سے زیادہ پی۔ اس کی گندی خودرو داڑھی تربتر ہو گئی۔ وہ اپنی آنکھیں بہت کم کھول رہا تھا۔ جیسے وہ شکنتلا کے دیدار کی راحت کو اپنی پلکوں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ مجھے اس کی باتوں سے شک ہو رہا تھا کہ وہ اب کسی طرح یہاں سے نکل جانے کا سوچ رہا ہے... اس کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ موسم میں اب کافی خنکی آچکی تھی۔ غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ میں کمبل لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نظر کھڑکی سے گزر کر اس رہائشی پورشن کی طرف گئی جہاں جیکی قیام پذیر تھا۔ یہ پورشن باقی حصے سے علیحدہ تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ایک خم دار گلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ مجھے جیکی کے کمرے کی طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ یہ خلافِ معمول تھا۔ وہ تاریکی میں سونا پسند کرتا تھا۔ میں کمرے سے نکلا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ بس کہیں کہیں بوجھل آنکھوں والے پہرے دار منڈلا رہے تھے۔ میں خم دار گلی سے گزر کر جیکی کے کمرے تک پہنچا۔ یہ دیکھ کر مجھے شاک پہنچا کہ جیکی کے کمرے کا تالا کھلا ہوا ہے۔ اندر نیلگوں بلب کی ہلکی سی روشنی تھی۔ میں دروازہ کھولنے کے بجائے کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کے ایک نیم وا پٹ میں سے میں کمرے کا وسطی منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ اس منظر نے میرے پاؤں زمین میں گاڑ دیے اور میں جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ میں نے کمرے کی خاموش نیلی روشنی میں شکنتلا کو دیکھا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کے بال اس کی گود میں کنڈلی مارے ہوئے تھے۔ شکنتلا کے سامنے جیکی تھا۔ وہ گہرے نشے میں بے سدھ پڑا تھا۔ بس اس کی سانس کی آمد و رفت سے پتا چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے سنولائے ہوئے جسم پر بس وہی ایک لنگوٹ تھا۔ اس کی ایک ایک پسلی اور ہڈی علیحدہ سے گنی جا سکتی تھی۔ اس کا چہرہ خستہ جانی کی بدترین مثال تھا۔

شکنتلا یک ٹک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں سے تواتر کے ساتھ پانی کے موتی گر رہے تھے۔ میں تحیر کے عالم میں دیکھتا چلا گیا۔ شکنتلا کے چہرے پر محبت کسی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ اس کے نازک نتھنے جذبات کی شدت سے بے ساختہ پھڑک رہے تھے۔ پھر میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ جیکی کی حالت اور بدبو کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھی۔ جیکی کے سرہانے کی طرف بیٹھ کر اس نے جیکی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ "جیکی... جیکی...!" شب کے جادوئی سناٹے میں اس کی جذباتی سرگوشی گونجی۔ یہ سرگوشی محبت کے اس عظیم رشتے کی گواہ تھی جو بظاہر کچے دھاگے سے بھی کمزور ہوتا ہے لیکن جس کی طاقت دو انسانوں کو اس طرح باندھتی ہے کہ جبر و ستم کی سخت ترین آندھیاں بھی انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ حکم اور جارج گورا جیسے ہزار ہا لوگ اس نازک دھاگے کو توڑنے کے لیے ہر زمینی حربہ آزماتے رہے ہیں لیکن ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ بے شک وہ پیار کرنے والوں کو مارنے میں کامیاب ہوئے لیکن پیار کو نہ مار سکے۔ ہاں... یہ وہی پیار بھری سرگوشی تھی۔

اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے اس کے گرد آلود بال سہلائے، اس کے گال تھپتھپائے۔ اسے کئی بار ہولے ہولے جھنجوڑا۔ "جیکی... جیکی... آنکھیں کھولو۔" اس نے اس کا سر اپنی بانہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی گھنی زلفوں نے بکھر کر جیکی کا سر اور کندھے ڈھانپ لیے۔ وہ اسے چومنے لگی، ہولے ہولے پکارنے لگی۔ پھر میں نے جیکی کے جسم میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا بیدار ہو رہا تھا...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

موقع شناس مجرموں کی عیاریاں...... جہاں ہر ذرّہ آفتاب تھا

غلط دھندوں سے کمائی گئی دولت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا کہ کب ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں چلی جائے۔ چند ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی پُر فریب کہانی...... وہ پرائی دولت کو اپنا بنا لینے کے سُنہرے خوابوں میں مدہوش تھے۔

پروانۂ زر

محمد عفان آزاد

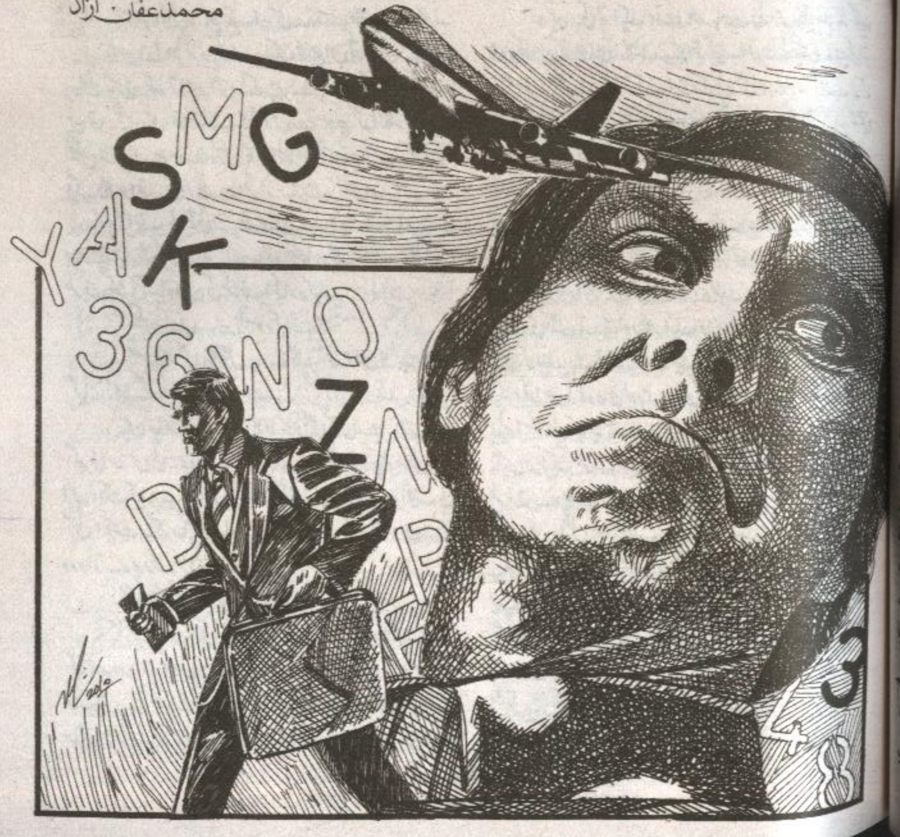

شین مائیکل ائرپورٹ سے نکل رہا تھا۔ اس کا سامان آچکا تھا اور اب وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھا لیکن وہاں تمام ہی ٹیکسیاں مصروف تھیں... کیونکہ اس سے پہلے ہی مسافروں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ شین کے پاس ایک سوٹ کیس اور ایک سفری بیگ تھا جو اس کے شانے سے لٹکا ہوا تھا جبکہ اس کے ہاتھ میں اس کا لیپ ٹاپ تھا۔ اس کا خاصا وزن تھا لیکن وہ اسے نیچے رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ یہ خاصا قیمتی اور نازک تھا۔ اور گرنے یا جھٹکا لگنے سے نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ شین چار سال بعد واشنگٹن آیا تھا اور یہاں آمد کا مقصد کسی سے ملاقات تھی۔

ایک ہفتہ پہلے ایک شخص نے اسے ای میل کی تھی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ شین نے جوابی میل میں اس کا مقصد پوچھا۔ اس شخص راجر بینٹ نے مقصد بتانے سے انکار کر دیا لیکن وہ اس معاملے میں اتنا سنجیدہ تھا کہ اس نے شین کو اسپین سے واشنگٹن کا ریٹرن ٹکٹ اور ایک ہفتے کے لیے ایک ہزار ڈالرز کی پیش کش کی تھی۔ یہ معاوضہ کام کے علاوہ تھا۔ شین

http://digestpk.blogspot.com/

نے سوچا اور مان گیا۔ اگرچہ اسے مالی پریشانی نہیں تھی۔ اسپین کے ایک حسین ساحل پر اس کا ذاتی بنگلا تھا اور میڈرڈ کی ایک الیکٹرانک کمپنی میں اس کے معقول شیئرز تھے جن سے اس کا گزارہ ہوتا تھا لیکن اضافی آمدنی کی کسے ضرورت نہیں ہوتی؟ کیونکہ برا وقت بتا کر نہیں آتا۔ اگر کمپنی دیوالیا ہو جاتی تو اس کے شیئرز بھی ڈوب جاتے۔ آج کل اچھی خاصی بڑی کمپنیاں بھی دیوالیا ہو رہی تھیں۔ اس نے پیش کش قبول کرلی۔

شین نے اس شخص سے ملاقات پر آمادگی ظاہر کردی۔ اس نے شین کو واشنگٹن بلایا تھا۔ چار سال پہلے وہ واشنگٹن سے ہی بعض خدشات کی بنا پر نکلا تھا اور اسپین میں مقیم ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے خدشات درست نہیں تھے کیونکہ ایف بی آئی یا کسی ایجنسی نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ واشنگٹن جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ مقررہ تاریخ کو وہ واشنگٹن کے ایئرپورٹ پر اترا اور اب اسے ٹیکسی کی تلاش تھی جو اسے کسی ہوٹل تک لے جاتی۔

''مسٹر مائیکل!'' اچانک ہی کسی نے اسے عقب سے پکارا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک نوجوان تھا جس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پر ایک مخصوص کھردرا پن تھا۔ شین کا ماتھا ٹھنکا۔ پہلے اس نے سوچا کہ انکار کردے لیکن اسے اپنے سوٹ کیس کا خیال آیا جس پر اس کے نام کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ مجبوراً اسے اقرار کرنا پڑا۔ ''یس۔''

''ایف بی آئی۔'' نوجوان نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کیا۔ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس نے ایک طرف کھڑی سیاہ وین کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن کیوں... میرا قصور کیا ہے؟''

''قصور کا بھی پتا چل جائے گا۔'' نوجوان کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''بھاگنے کا سوچنا بھی مت۔''

شین جانتا تھا کہ اس کا فائدہ بھی نہیں ہے۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ جس لمحے سے ڈر رہا تھا، وہ چار سال بعد اس وقت آیا جب وہ اس کی توقع نہیں کررہا تھا۔ وہ ایف بی آئی ایجنٹ کے ساتھ سیاہ وین کی طرف بڑھا۔ وین کے دروازے پر رک کر اس نے کہا۔

''کیا مجھے گرفتار کیا جارہا ہے؟''

''نہیں لیکن اس کا امکان ہے۔'' نوجوان ایجنٹ نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ اندر ایک سیاہ پوش پہلے سے موجود تھا۔ اس نے کھسک کر شین کے لیے جگہ بنائی اور وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نوجوان اس کے برابر میں آیا اور فوراً ہی وین ایک جھٹکے سے روانہ ہوگئی۔ یہ حصہ بالکل بند تھا اور یہاں سے باہر دیکھنا ممکن نہیں تھا اس لیے شین نہیں جان سکا کہ اسے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ اس کا پہلی بار ایف بی آئی سے واسطہ پڑا تھا اس لیے اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے مطلوب افراد کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ ایف بی آئی کے بارے میں اس کا سارا علم فلموں اور اخباروں تک محدود تھا۔

شین سوچ رہا تھا کہ کیا ایف بی آئی کو اس کی آمد کا علم تھا یا یہ سارا چکر ہی ایف بی آئی کا تھا... لیکن اسے یہ بات عجیب سی لگی تھی کہ جو کام سرکاری طریقے سے بہ آسانی کیا جا سکتا تھا اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ اسے باقاعدہ ٹکٹ اور الاؤنس دے کر بلایا جائے۔ اس کے برابر میں بیٹھے ایجنٹس بالکل خاموش تھے۔ یہ سفر کوئی چالیس منٹ جاری رہا۔ اس کی نہ تو تلاشی لی گئی تھی اور نہ ہی اس سے کوئی چیز یا اس کا سامان لیا گیا تھا۔ اس کا سوٹ کیس اس کے ساتھ موجود تھا جبکہ ہینڈ بیگ اور اس کا لیپ ٹاپ بھی اس کے پاس تھے۔

وین رکی تو ایک منٹ بعد باہر سے اس کا سلائڈنگ ڈور کھلا اور نوجوان ایجنٹ نیچے اتر گیا۔ اس نے شین سے کہا۔

''مسٹر مائیکل! نیچے اتر آؤ۔ اپنا سامان بھی لے لو۔''

شین اپنا سامان لے کر خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے دیکھا، یہ کسی عمارت کی زیر زمین پارکنگ تھی اور وہاں کوئی نصف درجن گاڑیاں مزید کھڑی تھیں۔ وہ ایک لفٹ تک آئے جس کے باہر مسلح گارڈ موجود تھا۔ وہ لفٹ میں سوار ہوکر دوسری منزل تک آئے۔ شین کے ساتھ وین میں سفر کرنے والے دونوں ایجنٹس بھی تھے۔ وہ لفٹ سے نکل کر ایک وسیع راہداری میں آئے اور پھر ایک دروازہ کھول کر انہوں نے شین کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ شین نے اندر دیکھا، یہ ویسا کمرا تھا جیسا کہ عام طور سے زیر تفتیش افراد سے ملاقات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک میز اور دو عدد کرسیاں تھیں۔ ایک طرف دیوار میں شیشہ لگا تھا جس کے دوسری طرف سے یقیناً اس.... کمرے میں دیکھا جاسکتا تھا۔ جیسے ہی شین اندر داخل ہوا، عقب سے دروازہ بند ہوگیا۔ اس نے گہری... سانس لی۔ سوٹ کیس اور بیگ ایک طرف فرش پر رکھا اور لیپ ٹاپ میز پر رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کہ معمولی سے لالچ میں مارا گیا۔ وہ پُرسکون زندگی گزار رہا تھا اور اسے لالچ میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اب تو وہ مشکل میں پڑ ہی گیا تھا اور اسے صبر و تحمل سے اس صورتِ حال کا سامنا کرنا تھا۔

شین کو سارینا کا خیال آیا۔ سارینا اس کی سابق بیوی اور اس کے بیٹے کی ماں تھی۔ شین کا بیٹا مائن، سارینا کے پاس تھا اور اب وہ یقیناً سات سال کا ہوگیا ہوگا۔ شین نے اسے بھی چار سال سے نہیں دیکھا تھا۔ سارینا سے رابطہ نہ کرنے کی بڑی سادہ سی وجہ تھی۔ اس نے شین کو دھمکی دی تھی۔ ''اگر اب مجھے تمہاری صورت دکھائی دی تو میں ایف بی آئی کو تمہارے کرتوتوں سے آگاہ کردوں گی۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں سارینا نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ تو نہیں پہنا دیا۔ اگرچہ چار سال بعد یہ کام کچھ بعید از قیاس تھا کیونکہ اس دوران میں شین نے سارینا سے نہ تو کسی قسم کا رابطہ کیا تھا اور نہ ہی کسی اور طرح سے اس کے لیے مسئلہ بننے کی کوشش کی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے کہا کہ اس معاملے میں سارینا ملوث نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور نوجوان ایجنٹ اندر آیا۔ اس نے شین کے سامنے ایک پلاسٹک کی ٹرے رکھی جس میں ایک چیز برگر، کچھ فرنچ فرائز اور ایک کافی کا کاغذی کپ تھا۔

''یہ تمہارا لنچ ہے۔'' اس نے کہا۔

''سنو، مجھے کب بتایا جائے گا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''اتنی جلدی مت کرو اور لنچ کرلو۔ اس کے بعد تم سے ملاقات ہوتی ہے۔'' نوجوان ایجنٹ نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شین ٹرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اس لیے اس نے برگر اور فرنچ فرائز کے ساتھ انصاف کیا اور آخر میں کسی قدر ٹھنڈی پڑ جانے والی کافی بھی حلق سے اتارلی۔ اب اسے انتظار تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ کوئی مزید نصف گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آئے۔ ان میں سے ایک خاصا عمر رسیدہ تھا۔ اس کی عمر شاید ساٹھ سال تھی۔ اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور اپنے حلیے اور انداز سے کسی بڑی کمپنی کا سربراہ لگتا تھا۔ دوسرا ایک نسبتاً جوان آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا سوٹ بھی قیمتی اور حلیہ کمپنی ایگزیکٹو کا تھا اور وہ چالاک آدمی لگ رہا تھا۔

بوڑھا آدمی شین کے سامنے کرسی پر آبیٹھا جبکہ جوان آدمی اس کے پیچھے مستعد کھڑا ہوگیا۔ بوڑھے نے جیب سے سگار باکس نکالا اور اس میں سے ایک نفیس ہوانا سگار نکال کر سلگایا۔ شین خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ ''مسٹر شین مائیکل... تم چار سال بعد واشنگٹن میں موجود ہو۔''

''میں اس ملاقات کی وجہ جاننے سے قاصر ہوں۔''

''وجہ بھی تمہیں بتادی جائے گی۔'' معمر آدمی نے کہا۔

''ایف بی آئی کو مجھ سے کیا دلچسپی ہے جبکہ میں بالکل خاموش زندگی گزار رہا ہوں۔''

''یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایف بی آئی کو تم سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔'' معمر آدمی نے معنی خیز انداز میں کہا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی فائل نکالی اور اسے کھولا۔ پھر اس نے اوپری جیب میں لگی عینک بھی اپنی آنکھ پر جمالی۔ یہ ایک سنہری زنجیر سے بندھی تھی جو شاید سونے کی تھی۔ ''مسٹر مائیکل! آج سے بارہ سال پہلے تم پہلی بار اس وقت منظر عام پر آئے جب بینکوں سے ڈیٹا چوری کا ایک کیس ایف بی آئی کے پاس آیا۔ چوری کی ان وارداتوں میں تمہارا نام شامل تھا لیکن تمہاری خوش قسمتی کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا اور تم چھوٹ گئے۔''

شین کی پیشانی پر پسینا آنے لگا لیکن اس نے بغیر کسی گھبراہٹ کے کہا۔ ''ظاہر ہے، میں بے گناہ تھا تب ہی تو چھوٹ گیا۔''

''اس کے چند مہینے بعد بڑے پیمانے پر جعلی کریڈٹ کارڈز کا اسکینڈل سامنے آیا۔ تم بعض مجرم لوگوں کے ختم ہو جانے والے کریڈٹ کارڈز لے کر ان میں دوسروں کے اکاؤنٹ ڈیٹا ڈال کر انہیں سمندر پار استعمال کررہے تھے۔ جیسے ہی معاملہ کھلا، اس اسکینڈل کے اصل ملزمان فرار ہوگئے

http://digestpk.blogspot.com/

اور کچھ افراد گرفتار ہوئے جن میں ایک نام تمہارا بھی تھا۔"

شین کی پیشانی اب زیادہ بھیگ گئی تھی۔ وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی کمزور تھا۔ "مجھے بلاوجہ اس معاملے میں ملوث کیا گیا تھا اور میرے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔"

"لیکن تمہیں دو مہینے کی سزا ہوئی تھی۔"

"وہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی۔" شین نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ اس قسم کے جرائم میں اتنی کم سزا نہیں ہوتی۔"

معمر آدمی فائل کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے صفحے پلٹے۔ "تیسرا واقعہ زیادہ سنگین ثابت ہوا جب چین اور روس کے لیے جاسوسی کرنے والے ایک سائبر نیٹ ورک کا پتا چلا اور یہاں بھی تمہارا نام سامنے آیا۔"

"اس بار مجھ سے تفتیش کی گئی تھی لیکن مجھے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔"

"کیونکہ ایف بی آئی کے پاس تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کم سے کم اس وقت نہیں تھا لیکن تین سال بعد یہ کیس ری اوپن ہوا اور اس بار تمہیں گرفتار کیا گیا تھا۔"

"ہاں مگر عدالت نے ناکافی ثبوتوں کی بنا پر مجھے چھوڑ دیا تھا۔"

"اس کے بعد تم امریکا چھوڑ کر اسپین چلے گئے جہاں تم نے ایک ساحلی بنگلا جس کی مالیت ایک ملین ڈالرز کے برابر ہے، خریدا اور اس کے علاوہ تمہارے پاس ایک کمپنی کے ایک ملین ڈالرز کے شیئرز ہیں۔ آخر یہ رقم کہاں سے آئی جبکہ... بظاہر تمہارا کوئی ذریعۂ آمدنی بھی نہیں ہے؟"

"یہ رقم... میں نے کمائی ہے۔" شین نے آہستہ سے کہا۔ "کیا تم نے مجھے میرے جرائم کی روداد سنانے کے لیے یہاں بلایا ہے؟"

"جب تم یہاں سے نکل گئے تو تمہارا ایک اور جرم سامنے آیا۔ ایک بینک میں اکاؤنٹس کی انٹرنیٹ کے ذریعے کی جانے والی ٹرانزکشن میں بے قاعدگیاں سامنے آئیں اور بہت سارے لوگوں کے اکاؤنٹس سے رقم غائب ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے ایک ویب سائٹ کو ادائیگی کے لیے اپنا اکاؤنٹ استعمال کیا تھا۔ یہ ویب سائٹ لوگوں کو رقم کے عوض نئی ریلیز شدہ فلمیں بغیر کسی کاپی رائٹ کے ادائیگی کے ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت مہیا کرتی تھی۔ جب اس سائٹ کو چلانے والے افراد کو گرفتار کیا گیا تو انہوں نے انکشاف کیا کہ اس کے خالق اصل میں تم تھے اور تم ہی لوگوں کے اکاؤنٹس سے رقم غائب کرنے کے ذمے دار تھے کیونکہ یہ سارا سسٹم تم نے ترتیب دیا تھا۔ انہوں نے ویب سائٹ چلانے اور کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کا اقرار ضرور کیا تھا لیکن انہوں نے اپنے کسٹمرز کے اکاؤنٹس کو چھیڑنے سے انکار کردیا۔"

"اور تم نے ان لوگوں کی بات مان لی؟"

"ہاں کیونکہ انہوں نے ہمیں کچھ ایسے آڈیو اور ویڈیو کے ثبوت فراہم کیے جو واضح اشارہ کرتے ہیں کہ تم اس کام میں ان کے ساتھ شامل تھے۔"

"وہ بکواس کرتے ہیں۔ میں نے انہیں صرف اکاؤنٹس سے رقم حاصل کرنے کا سسٹم بنا کردیا تھا۔ اگر انہوں نے بعد میں لوگوں کے اکاؤنٹس پر ڈاکے مارنا شروع کردیے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کا ذمے دار ہوں۔"

"اگر ان کی ویب سائٹ تم نے بنائی تھی تو تم نے اس پر اپنا نام کیوں نہیں دیا؟"

"کیونکہ یہ ایک غیر قانونی کام کرنے والی سائٹ تھی جو کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کررہی تھی... اور دوسرے یہ کہ میں نے پوری ویب سائٹ نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصہ بنایا تھا۔"

"لیکن تم اس جرم میں شامل تو تھے۔" معمر آدمی نے اصرار کیا۔

شین نے صرف شانے اچکائے، جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ وجہ ہے جو اسے یوں اسپین سے امریکا بلوایا گیا ہے مگر اس کیس میں کوئی جان نہیں تھی۔ ایک زمانے میں شین نے اس قسم کے بہت کام کیے تھے کیونکہ اس میں دولت بہت تھی۔ اس نے کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کرنے والی اور لوگوں کو آن لائن جوا کھلوانے والی ویب سائٹس تیار کی تھیں جہاں لوگ سامنے آئے بغیر اور اپنا اصل نام ظاہر کیے بغیر جوا کھیل سکتے تھے اور اس میں اپنی وہ دولت استعمال کرسکتے تھے جسے اپنے ٹیکس فارم میں ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح شین نے پورنو مواد رکھنے والی بے شمار سائٹس تیار کی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے پوری طرح ہاتھ پاؤں بچا کر کام کیا تھا اور اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ ان دنوں اس نے بہت کمایا لیکن بینک والے معاملے سے نکلنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔ وہ کافی رقم کما چکا تھا اور پھر سارینا سے بھی اس کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ شین کو اپنے بیٹے مائن سے بے پناہ محبت تھی لیکن وہ اسے حاصل نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کے لیے عدالت میں جانے کی صورت میں سارینا اس کے کرتوتوں کا انکشاف کرسکتی تھی۔

شین سوچ رہا تھا پھر اس نے گہری سانس لی۔ "تو تم لوگوں نے اس لیے مجھے دھوکا دے کر بلوایا ہے؟"

"نہیں مسٹر مائیکل!" معمر آدمی نے فائل میز پر رکھ دی۔ "ہم نے تمہیں چارج کرنے کے لیے نہیں بلکہ مدد کے لیے بلایا ہے۔"

شین چونکا۔ "کیسی مدد... کیا تمہارا تعلق ایف بی آئی سے نہیں ہے؟"

"نہیں بلکہ ہمارا تعلق ایک اور وفاقی ایجنسی سے ہے۔" شین کو تعجب ہوا۔ وہ اتنا اہم نہیں تھا اور نہ اس کے سائبر جرائم اتنے گمبھیر تھے کہ ان کے لیے دو دو وفاقی ایجنسیاں حرکت میں آتیں۔ پھر اس آدمی نے اس پر چارج نہیں لگایا تھا بلکہ وہ اس سے کسی قسم کی مدد چاہتا تھا۔

"کس قسم کی مدد؟"

"اس قسم کی مدد جیسی تم رقم کے عوض لوگوں کی کرتے آئے ہو۔" معمر آدمی ذرا آگے ہو کر بولا۔

شین نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "وہ سارے کام دو نمبر تھے اور میں وہ سب چھوڑ چکا ہوں۔"

معمر آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے کام نہیں چھوڑے بلکہ تم ان دنوں بھی ہاتھ پاؤں بچا کر یہ کام کررہے ہو۔ اس کا ثبوت یہاں تمہاری موجودگی ہے۔"

شین سوچ میں پڑ گیا۔ یہ اس سے کیا کام کروانا چاہتے تھے۔ وفاقی ایجنسیوں کے پاس کام کے آدمیوں کی کمی نہیں ہوتی اور اس جیسے دس ہر وقت ان کی دسترس میں رہتے ہیں پھر اتنی دور سے اسے بلانے کی کیا تک بنتی تھی پھر اس کے ذہن میں کچھ سوال اور بھی آئے۔ اس نے کہا۔ "مجھے لانے والے شخص نے مجھے اپنا ایف بی آئی کا کارڈ دکھایا تھا؟"

"اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق ایف بی آئی سے ہے۔ تمہیں قابو کرنے کے لیے ہم نے ایف بی آئی سے مدد لی ہے۔" معمر آدمی نے وضاحت کی۔

"اوکے!" شین نے گہری سانس لی۔ "اگرچہ میں سمجھ نہیں سکا ہوں کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں لیکن اس چکر سے نکلنے کے لیے مجھے تمہارا کوئی کام کرنا پڑا تو میں اس کے لیے راضی ہوں۔"

"گڈ! اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" معمر آدمی اٹھتے ہوئے بولا۔

اس بار شین کو باقاعدہ ہتھکڑی پہنا کر اور اس سے اس کا موبائل لے کر اسے اسی سیاہ وین میں بٹھایا گیا۔ وہ اکیلا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا کیونکہ اس وین کے دروازے بھی باہر سے کھلتے تھے اور اس کے شیشے بالکل سیاہ تھے۔ ان سے باہر کا منظر نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وین رکی اور اسے اتار کر اس بنگلے کے اندر لے جایا گیا جس کے گیراج میں وین رکی تھی۔ کئی کمروں سے گزرنے کے دوران اسے اندازہ ہوا کہ یہ خاصی بڑی عمارت ہے لیکن یہ کسی بنگلے کی طرز پر تھی.... ہر کمرے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جنہیں گتے لگا کر بند کردیا گیا تھا اور وہاں صرف ضرورت کا سامان نظر آرہا تھا۔ وہ معمر آدمی اور اس کے جوان ساتھی کے ہمراہ آیا تھا۔ یہاں بنگلے میں اسے تین افراد دکھائی دیے۔ معمر شخص اسے ایک بڑے کمرے میں لایا جہاں شدید ٹھنڈک تھی اور وہاں ایک بڑا سا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ کمپیوٹر کے لیے کمرے میں بڑا اے سی سسٹم لگا ہوا تھا اور اس نے کمرے کا درجۂ حرارت صفر تک پہنچا دیا تھا۔

شین کمپیوٹر اور آئی ٹی کا ماہر تھا اس لیے اس نے دلچسپی سے کمپیوٹر کو دیکھا۔ یہ منی کمپیوٹر یا مین فریم کمپیوٹر تھا جو پی سی سے کہیں زیادہ تیز رفتار اور طاقت ور ہوتا ہے۔ اس میں ایک کے بجائے کئی پروسیسر ہوتے ہیں اور یہ روایتی پروگرامنگ سے آزاد ہوتا ہے۔ مشین بڑی ہونے کی وجہ سے یہ حرارت زیادہ پیدا کرتا ہے اس لیے اسے کولنگ سسٹم میں رکھنا پڑتا ہے۔ ایک میز پر نیم دائرے میں کوئی نصف درجن ایل سی ڈی مانیٹرز رکھے تھے۔ یہ بہت مہنگا سسٹم تھا اور اس کی مالیت یقیناً لاکھوں ڈالرز میں تھی۔ معمر آدمی اسے دیکھ رہا تھا، اس نے پوچھا۔ "اچھی مشین ہے نا؟"

"ہاں، زبردست ہے۔" شین نے سر ہلایا۔ "اسپین میں میرے پاس ایک پرانا مین فریم ہے لیکن یہ اس سے کہیں آگے کی چیز لگ رہا ہے۔"

"یہ اس سے کہیں آگے کی چیز ہے۔" معمر آدمی نے فخر سے کہا۔ "تم اسے استعمال کرکے دیکھ سکتے ہو۔"

شین کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے کمپیوٹر کی کمانڈز کی تفصیل معلوم کی۔ چند بٹن دباتے ہی کمانڈز کیز سامنے آگئیں لیکن یہ نامکمل تھیں۔ اس کمپیوٹر کو استعمال کرنے کے لیے یقیناً کہیں زیادہ کمانڈز کی ضرورت تھی۔ اس نے تیزی سے سسٹم کا جائزہ لیا۔ یہ سادہ حالت میں تھا اور اس میں ضروری سافٹ ویئرز کی کمی تھی۔ شین نے معمر شخص کی طرف دیکھا۔

"یہ بالکل سادہ حالت میں ہے۔ کیا تم لوگ اس سے کام نہیں لیتے؟"

"یہ تمہارے لیے ہے۔" معمر آدمی بولا۔

http://digestpk.blogspot.com/

''میرا لیپ ٹاپ والا بیگ منگوا دو۔'' شین نے مطالبہ کیا تو اس کی فوراً تکمیل ہوئی۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اسے آن کر کے ایک پورٹ کی مدد سے مین فریم سے جوڑ دیا۔ اس کے لیپ ٹاپ میں سافٹ ویئرز موجود تھے۔ یہ کوڈز لگائے بغیر نہیں کھلتا تھا اور وہ چاہتا تو صرف ایک بٹن دبا کر اسے دوبارہ لاک کر سکتا تھا۔ اس کے بعد کوئی لاکھ سر توڑ کوشش کرتا لیکن اس کا کمپیوٹر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مین فریم میں ضروری سافٹ ویئر انسٹال کرنا شروع کیے۔ اس دوران میں اس کی انگلیاں کی بورڈ پر اتنی تیزی سے چل رہی تھیں کہ معمر شخص اور اس کا ساتھی کوشش کے باوجود نہیں دیکھ سکے تھے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اصل میں شین کمانڈز کی کمی پوری کر رہا تھا۔ جب تک سافٹ ویئرز انسٹالیشن مکمل ہوتی، وہ کمانڈز پوری کر چکا تھا بلکہ اس نے کچھ ایسی کمانڈز بھی ڈال دی تھیں جو سسٹم پر ظاہر نہیں ہوتی تھیں اور جنہیں صرف وہی استعمال کر سکتا تھا۔

''اب تم مجھے کام بتا سکتے ہو... میں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے معمر آدمی کی طرف دیکھا۔

''یہ ایک انٹرنیٹ ایکسیز کوڈ ہے۔ سائٹ بھی ہے... تمہیں اس کے متوازی کوڈز معلوم کرنے ہیں اور وہ بھی صرف آدھے گھنٹے میں۔'' معمر شخص نے ایک پرچی اس کے سامنے رکھ دی۔ شین نے دیکھا تو اس کے ماتھے پر شکن آگئی۔ کمپیوٹر کے ساتھ انٹرنیٹ بھی تھا۔ یہ ایک سوئس بینک اکاؤنٹ کا کوڈ تھا۔ اس نے بینک کی سائٹ کھولی اور کوڈ ڈالا۔ اس سے اکاؤنٹ نمبر اور اس کا پاس ورڈ پوچھا گیا۔ اس نے معمر شخص کی طرف دیکھا۔

''اکاؤنٹ نمبر اور پاس ورڈ؟''

وہ مسکرایا۔ ''اگر یہ معلوم ہوتا تو تمہاری کیا ضرورت تھی۔''

شین نے گہری سانس لی۔ ''تم جانتے ہو، یہ جرم ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو... مجھے یہ اکاؤنٹ اوپن کر کے دکھاؤ۔''

شین یہ کام کر سکتا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن پکڑ میں آجاؤ گے کیونکہ آج کل کام کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کام کر کے اپنا نشان مٹانا۔''

''میں یہی تو دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم پکڑے جاتے ہو یا نہیں۔''

شین کی بورڈ پر جھک گیا۔ اس کی انگلیاں ایک بار پھر کی بورڈ پر رقص کرنے لگیں۔ وہ بینک کا حفاظتی سسٹم بائی پاس کر رہا تھا۔ اس کے لیے اسے ایک طویل طریقۂ کار اپنانا تھا۔ خوش قسمتی سے کمپیوٹر بہت تیز رفتار تھا اور جو کام اس کا مین فریم دس منٹ میں کرتا تھا، یہ ایک منٹ میں کر رہا تھا۔ اس وجہ سے وقت کی بچت ہو رہی تھی۔ اس نے پہلے بینک کے مرکزی کمپیوٹرائزڈ سسٹم سے رابطہ کیا۔ یہ رابطہ اتنا آسان نہیں تھا، اگر اس کے پاس کچھ مخصوص ذرائع نہ ہوتے۔ پھر اس نے اکاؤنٹس کے کوڈز حاصل کیے جو اصل میں یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ پر مشتمل تھے اور بائیس منٹ میں اس نے مذکورہ اکاؤنٹ کھول کر دکھا دیا۔ معمر آدمی نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔

''اب اس میں موجود رقم ایک دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کرو۔''

یہ کام بہت آسان تھا لہٰذا ایک منٹ میں ہو گیا۔ شین کو حیرت ہوئی، اکاؤنٹ میں کل رقم ایک ہزار ڈالرز تھی۔ وہ اس نے معمر آدمی کے بتائے ہوئے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔ لیکن معمر آدمی نے اگلی فرمائش کر کے اسے پریشان کر دیا۔ ''اب بینک کے سسٹم سے اس ٹرانزیکشن کا ریکارڈ ختم کر دو۔''

''یہ بہت مشکل کام ہے۔'' شین نے کہا۔

''تمہیں اسی مشکل کام کے لیے بلایا گیا ہے۔'' معمر آدمی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''پہلے دو کام تو آج کل بچے بھی کر رہے ہیں۔''

شین نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی لمبے چکر میں پھنستا جا رہا ہے۔ مجبوراً اس نے یہ کام بھی شروع کیا۔ یہ واقعی مشکل کام تھا کیونکہ بینکوں کا مرکزی ڈیٹا بہت حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور اس تک رسائی کے لیے ایسے پیرالل کوڈز استعمال ہوتے ہیں جنہیں توڑنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ سوئس بینک تھا جس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ محفوظ بینکوں میں ہوتا ہے۔ اس نے کام شروع کیا۔ مرکزی سسٹم تک اس کی رسائی تھی لیکن اس کام کے لیے اس کا سسٹم منیجر بننا ضروری تھا۔ ہر کمپیوٹر نیٹ ورک سسٹم میں ایک سسٹم منیجر ہوتا ہے جس کے پاس تمام معلومات اور کوڈز ہوتے ہیں۔ مین فریم میں موجود کمانڈز اس کے کام نہیں آرہی تھیں اس لیے اسے نئی کمانڈز بنانی پڑیں اور تقریباً چالیس منٹ بعد اس نے کامیابی حاصل کر لی۔ وہ سسٹم منیجر بن گیا اور اس نے اکاؤنٹ ٹرانزیکشن کی انٹریز اڑا دیں۔ یہ کام کر کے اس نے معمر آدمی کی طرف دیکھا۔

''کام ہو گیا ہے۔''

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''تم واقعی اپنے کام کے ماہر ہو۔''

''شکریہ۔'' شین نے خشک لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ بات چھپ نہیں سکتی۔ میں نے صرف سوئس بینک کے سسٹم سے یہ معلومات اڑائی ہیں۔ جس بینک میں رقم گئی ہے، اس کے پاس اس کا ریکارڈ ہوگا اور اسی طرح درمیان میں جو ذریعہ ہے اس کے پاس بھی ریکارڈ ہوگا۔ سوئس بینک کو وقت لگے گا لیکن وہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ رقم کس بینک اکاؤنٹ میں گئی ہے۔''

''بینک کو معلوم کرنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''تقریباً تین سے چار دن۔'' شین نے جواب دیا۔ ''اس قسم کی تمام معلومات مینول طریقے سے لی اور دی جاتی ہیں۔''

معمر آدمی نے سر ہلایا۔ ''تین سے چار دن... میرا خیال ہے کہ ہمارا کام ہونے میں اتنی مہلت کافی ہوگی۔''

شین چونکا۔ ''تو کیا کوئی اور کام بھی ہے؟''

معمر آدمی نے اسے بدمزگی سے دیکھا۔ ''یہ تو معمولی سا کام تھا... اس کے لیے تمہیں اتنی دور سے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔''

شین کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگی۔ اسے پہلے سے زیادہ شدت سے احساس ہونے لگا کہ یہ معاملہ وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس میں بہ ظاہر حکومت ملوث نظر آتی تھی لیکن اس بات کا کوئی ثبوت اس کے سامنے نہیں آیا تھا کہ وہ جن اداروں سے خود کو ظاہر کر رہے تھے، درحقیقت انہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ حکومتیں اس قسم کے کام اس انداز میں نہیں کراتیں لیکن فی الحال وہ مجبور تھا کیونکہ ان لوگوں کے قبضے میں تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ معمر آدمی نے اس سے کہا۔

''ابھی تم آرام کرو... رات کو کھانے کے بعد تم سے ملاقات ہوگی۔''

جوان آدمی اسے ایک کمرے تک لایا جو اندر سے پرتعیش انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہاں ایک بار بھی تھا جس میں مختلف اقسام کی اعلیٰ درجے کی بے شمار شرابیں موجود تھیں۔ جہازی سائز بیڈ کے سامنے بڑی اسکرین کا ایل سی ڈی ٹی وی اور اس کے نیچے سپر ڈی وی ڈی پلیئر تھا۔ ساتھ ہی ریک میں متعدد ڈی وی ڈیز موجود تھیں۔ اس کا سامان پہلے سے وہاں موجود تھا۔ لیپ ٹاپ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ جوان آدمی نے اسے خبردار کیا۔

''اس کمرے سے آگے جانے کی مت سوچنا۔ یہاں تمام ضروری چیزیں ہیں لیکن پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر کہہ دینا۔''

''میرا موبائل مل سکتا ہے؟'' اس نے کہا۔

''نہیں، تم کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے۔'' اس نے انکار کیا اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔ شین دھڑام سے دبیز گدے پر گر گیا۔ پچھتانے کا وقت گزر گیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس چکر سے کیسے نکلے؟ اسے شک تھا کہ یہ لوگ وہ نہیں جو خود کو ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ کسی خاص مقصد کے تحت اسے یہاں لائے تھے اور عین ممکن تھا جب ان کا مطلب نکل جاتا تو وہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے۔ اچانک شین کو رونگٹے کھڑے کر دینے والا خیال آیا۔ کہیں اسے اسی لیے تو اسپین سے نہیں لایا گیا تھا...؟ اس کے گم ہونے پر کسی کو تشویش نہ ہوتی اور نہ ہی امریکا میں پولیس یا کوئی ادارہ اس کے غائب ہونے پر کارروائی کرتا۔ اگر یہ کسی مقامی شخص کو اس طرح ہائر کرتے تو کوئی نہ کوئی اس کی کمی محسوس کر لیتا۔

شام کو جب اسے کمرے سے نکال کر ڈائننگ ہال میں لایا گیا تو شین نے وہاں معمر شخص کے ساتھ ایک کم عمر لڑکی کو دیکھا۔ اس کی عمر شاید بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ خوب صورت تھی لیکن اس وقت اس کی خوب صورتی کچھ مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ایک کانٹے سے کھیل رہی تھی۔ معمر آدمی نے اس کا استقبال کیا۔

''آؤ مسٹر شین! اس سے ملو... یہ فلورا پابیلا ہے۔''

شین کو پابیلا نام سنا ہوا لگا لیکن اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے کہاں سنا ہے۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہیلو۔'' لیکن لڑکی اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی شین کی طرف نہیں دیکھا۔ شین اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔ جوان آدمی بھی آگیا اور ان چاروں نے کھانا شروع کر دیا۔ شین نے کہا۔ ''کیا بہتر نہیں ہوگا کہ ہم آپس میں متعارف ہو جائیں؟''

معمر آدمی چونکا پھر اس نے کہا۔ ''تم مجھے کورمین کہہ سکتے ہو۔''

جوان آدمی بولا۔ ''مجھے ایلن کہتے ہیں۔''

صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے غلط نام بتا رہے ہیں۔ وہ اس سے اپنی شناخت چھپا رہے تھے اور اس سے شین کو کسی قدر حوصلہ ہوا کہ وہ اس کے بارے میں قاتلانہ عزائم نہیں رکھتے... ورنہ وہ اسے اپنے اصل نام بھی بتا سکتے تھے۔ اس

http://digestpk.blogspot.com/

نے لڑکی کی طرف دیکھا۔اس کا نام اصل لگ رہا تھا۔ پابیلا نام اسے پھر جانا پہچانا لگا .... کھانے کے بعد کافی آئی اور اس کے بعد کورمین نے شین سے کہا۔ ”آؤ، ذرا تم سے بات ہو جائے۔“

وہ اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے سٹنگ روم میں آیا۔ ایلن ان کے ساتھ تھا لیکن وہ اندر نہیں آیا بلکہ دروازے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ شین نے اس کی طرف اشارہ کر کے کورمین سے کہا۔ ”اگر یہ تمہارا باڈی گارڈ ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مار دھاڑ والا آدمی نہیں ہوں۔“

”یہ میرا نائب ہے۔“

”معاف کرنا... لیکن تم لوگوں کا رویہ ایجنسی والوں جیسا نہیں ہے۔“

”اس کی وجہ ہے۔“ کورمین بولا۔ ”ہم جو کام کر رہے ہیں، وہ خفیہ ہے اور سرکاری سطح پر کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا جائے گا۔“

”تب اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم حقیقت میں سرکاری ایجنٹ ہو؟“ شین نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

”تمہیں ثبوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ کورمین کا لہجہ خشک ہو گیا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ وہ ان کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے۔

”ویسے تم انکار کر کے دیکھو، تمہیں خود پتا چل جائے گا۔“ ایلن نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

شین نے گہری سانس لی۔ ”میں انکار نہیں کر رہا، صرف اپنے شک کا اظہار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے تم حقیقت میں فیڈرل ایجنٹس ہو لیکن مجھے تم لوگوں کا انداز سرکاری نہیں لگ رہا۔“

”تمہیں جلد اس کا پتا چل جائے گا۔“ کورمین نے کہا۔ ”اب اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔ تم نے موریان پابیلا کا نام سنا ہے؟“

شین کو فوراً یاد آ گیا۔ پابیلا کا نام اتنی دیر سے اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا لیکن جب کورمین نے اس کا پورا نام لیا، تب اسے یاد آیا۔ موریان پابیلا ایک ڈرگ اسمگلر تھا۔ کیلیفورنیا میں پیدا ہونے والا اسپینش نژاد پابیلا شروع سے جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ معمولی حیثیت سے ترقی کر کے وہ جلد ایک بڑے منشیات کے اسمگلر کے طور پر سامنے آیا۔ اینٹی نارکوٹکس والے گزشتہ بیس سال سے اس کے پیچھے تھے لیکن وہ اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اگرچہ انہوں نے متعدد بار اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ اس کے گروہ کے افراد گرفتار ہوتے رہے تھے لیکن کسی ایک نے بھی پابیلا کا نام نہیں لیا تھا۔ پھر ایک دن پابیلا اپنے محافظوں سمیت ایک سنسان شاہراہ پر اپنی کار میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ اسے اس کے تین محافظوں سمیت شدید فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ قاتلوں کی بے رحمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پابیلا کو سو سے زائد گولیاں ماری تھیں حالانکہ وہ چند گولیوں میں ہلاک ہو گیا تھا مگر قاتلوں کی اس سے کچھ ایسی دشمنی تھی کہ چند گولیوں سے ان کی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ میڈیا نے اس قتل کو منشیات کے بڑے مگرمچھوں کی آپس کی لڑائی قرار دیا تھا۔ دو مہینے پہلے پابیلا کا ایک حریف بالکل اسی انداز میں موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ حریف کے گروہ نے اپنے باس کا بدلہ چکا دیا تھا۔

”تو یہ ماریان پابیلا کی بیٹی ہے؟“ شین نے کورمین سے پوچھا۔

”بالکل... اور اس کی تمام دولت اور جائداد کی اکلوتی وارث بھی۔“

”تب یہ تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہے؟“

”تم نے لنک بینکس کے بارے میں سنا ہے؟“ کورمین نے اس کا سوال نظرانداز کر کے پوچھا۔

شین نے سر ہلایا۔ ”سنا ہے... یہ بذاتِ خود بینک نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنے گاہکوں کے اکاؤنٹ دوسرے بینکوں میں کھلواتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ خود دوسرے بینکوں کے کلائنٹ بن جاتے ہیں اور ان کے جو کلائنٹ ہوتے ہیں، ان کے نام کسی کو معلوم نہیں ہوتے۔“

”گڈ... گویا تم لنک بینک کے کردار سے واقف ہو۔“

شین ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ وہ خود ان لنک بینکس کے لیے کام کرتا رہا تھا لیکن اس نے یہ بات ان لوگوں کو نہیں بتائی۔ اس نے محتاط انداز میں کہا۔ ”نہیں، پوری طرح تو نہیں جانتا لیکن ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔“

”واقعی۔“ کورمین کا لہجہ مذاق اڑانے والا ہو گیا۔ ”تم جیسے شخص نے لنک بینکس کے بارے میں صرف سن رکھا ہے۔ امریکا اور یورپ میں جابس کا بحران آیا ہوا ہے اور دوسرے شعبوں سے تجربہ کار لوگوں کو نکالا جا رہا ہے لیکن آئی ٹی اور نیٹ ورکنگ کے ماہرین خود جابس چھوڑ کر جا رہے ہیں کیونکہ لنک بینکس انہیں بہت پُرکشش معاوضے پر اپنے ہاں ملازم رکھ رہے ہیں تاکہ ان کا کمپیوٹر سسٹم ہر طرح سے محفوظ رہے۔“

کورمین درست کہہ رہا تھا۔ شین خاموش رہا۔ کورمین نے سگار سلگایا اور اس کا کش لے کر بات جاری رکھی۔ ”پابیلا نے پچیس برسوں کے دوران کئی ارب ڈالرز کی رقم کمائی لیکن یہ رقم کہاں ہے، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔“

”اس کی بیٹی کو بھی نہیں؟“

”نہیں، اسے بھی معلوم نہیں ہے۔ سرکاری ایجنٹس نے جب اس بارے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ پابیلا گزشتہ چار سال سے کیوبا میں قائم ایک لنک بینک کا گاہک رہا ہے۔“

”کیوبا!“ شین کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ ”وہاں تک تم لوگوں کی پہنچ نہیں ہے۔“

”ہاں، یہی وجہ ہے کہ امریکیوں کے لیے کام کرنے والے اکثر لنک بینک کیوبا میں ہیں... کیونکہ وہ صحیح معنوں میں بینک کا کام نہیں کرتے اور نہ ہی وہ مقامی معیشت پر کوئی اثر ڈالتے ہیں اس لیے کیوبا کی حکومت کو ان کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”پابیلا اس لنک بینک کے ذریعے اپنی بلیک منی دوسرے بینکوں میں بھجواتا تھا۔“

شین کی سمجھ میں آنے لگا کہ وہ اس سے کیا چاہتے ہیں لیکن اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ”اگر پابیلا لنک بینک سے یہ کام کراتا رہا ہے تو ان بینکوں کے بارے میں معلوم ہونا ناممکن ہے جہاں اس کی بلیک منی موجود ہے۔“

”تمہارا کام اسی ناممکن کو ممکن بنانا ہے۔“ کورمین نے کہا۔ ”ہم نے پابیلا کے اکاؤنٹنٹ کو قابو کر لیا ہے لیکن وہ ان اکاؤنٹس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ پابیلا نے چار سال میں پونے دو ارب ڈالرز کی رقم ان اکاؤنٹس میں بھیجی ہے۔“

شین دنگ رہ گیا۔ ”پونے دو ارب ڈالرز!“

”یہ کم سے کم رقم ہے۔“ کورمین نے سر ہلایا۔ ”ایک سال پہلے وفاقی حکومت نے ایک ٹاسک فورس بنائی ہے جس کا کام کسی بھی طرح بینکوں میں موجود بلیک منی کو اپنے قابو میں لینا ہے۔“

”تمہارا تعلق اسی ٹاسک فورس سے ہے؟“

”تم درست سمجھے۔“ کورمین نے جواب دیا۔

”لیکن حکومت کے پاس کام کرنے کے لیے ماہرین اور ذرائع کی کوئی کمی نہیں ہے... پھر مجھے کیوں اس طرح بلایا گیا ہے؟“

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

http://digestpk.blogspot.com/

''اس پر بعد میں بات کریں گے جب تم یہ کام کرلو گے۔ اور تم اطمینان رکھو، تم سے یہ کام بلا معاوضہ نہیں لیا جائے گا بلکہ تمہیں ایک لاکھ ڈالرز کی ادائیگی کی جائے گی۔''

شین کا شک مزید پختہ ہوگیا۔ حکومت عوام کا پیسا اتنی بے دردی سے نہیں اڑاتی کیونکہ اسے ایک ایک ڈالر کا حساب دینا پڑتا ہے۔ شین نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں لیکن اس کام میں کتنا وقت لگے گا، میں نہیں کہہ سکتا۔ لنک بینکوں کے سسٹم سیکیورٹی کے لحاظ سے پینٹا گون اور ناسا کے سسٹم سے کم نہیں ہوتے اور انہیں بریک کرنا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا ہے۔''

''لیکن ناممکن نہیں ہے۔'' کورمین نے زور دے کر کہا۔

''کم سے کم میں نے آج تک نہیں سنا کہ کسی لنک بینک کا سسٹم توڑا گیا ہو۔'' شین نے نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن تمہیں یہ کام کرنا ہے۔'' اس بار کورمین کا لہجہ بدل گیا۔ ''اگر لمبے عرصے کے لیے جیل جانے سے بچنا چاہتے ہو تو...''

''تم مجھے عدالت کے سامنے پیش کردو، میں خود اپنی صفائی پیش کردوں گا۔''

کورمین اسے زہریلی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے غرا کر کہا۔ ''اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ تمہیں فوراً عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ ہم تمہیں تفتیش کے نام پر طویل عرصے کے لیے اپنی قید میں رکھ سکتے ہیں اور اس دوران میں تمہارے خلاف ایسے ثبوت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے جن کی بنیاد پر عدالت تمہیں کم سے کم دس پندرہ سال کے لیے جیل بھیج دے۔''

شین خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ تذبذب میں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں، وہ کر بھی سکتے ہیں اور دوسری طرف اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کام کرا کے بھی اسے آزاد نہیں کریں گے... کیونکہ یہ کام وہ امریکا کی حکومت کے لیے نہیں کر رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم لوگ کام ہو جانے کے بعد مجھے آزاد کردو گے اور میرا معاوضہ بھی دو گے؟''

''اس کے لیے تمہیں ہماری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا۔ یہ پروجیکٹ خفیہ ہے اور اس کا عوام کے سامنے آنا ریاست کے مفاد میں نہیں ہے۔'' کورمین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اب بولو... کیا کہتے ہو؟ ہمارے لیے کام کرو گے یا ساری عمر جیل میں گزارو گے؟''

شین نے سرد آہ بھری۔ ''تم لوگوں نے میرے پاس کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا ہے۔''

کورمین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''تم عقل مند آدمی ہو اور یقین کرو تم خسارے میں نہیں رہو گے۔'' کورمین کھڑا ہوگیا۔ ''اس بنگلے میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے لیکن تم یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ سٹنگ روم سے نکل گیا۔

''تم کل سے کام کا آغاز کردو۔'' اس بار ایلن نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہارے پاس لامحدود مدت نہیں ہے۔ تمہیں بہرصورت کامیابی حاصل کرنی ہے ورنہ...'' وہ بولتے بولتے رکا پھر کہا۔ ''ورنہ تمہارے ساتھ وہی ہوگا جو کورمین نے کہا ہے۔''

شین اپنے کمرے میں آیا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا، فلورا کو وہاں موجود پا کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی اور اس کا موڈ بہتر ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''تم یہاں...؟''

فلورا نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ ''مسٹر مائیکل! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کرو۔'' وہ بار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے برانڈی کی ایک بوتل اور دو گلاس اٹھائے۔ آئس کیوب اسے چھوٹے سے فریزر میں مل گئے۔ اس نے دو گلاس تیار کیے اور ایک فلورا کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے گلاس لے لیا۔

''تم کورمین کے لیے کام کرنے کو تیار ہو؟''

''ظاہر ہے، میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''تم جانتے ہو کہ یہ ساری دولت میرے باپ کی ہے۔''

''ہاں جو اس نے لوگوں کی رگوں میں منشیات اتار کر کمائی ہے۔'' شین نے طنز کیا۔

''اس سے قطع نظر کہ میرے باپ نے یہ دولت کس طرح کمائی ہے، اس پر صرف میرا حق ہے۔''

''یہ بات تمہیں کورمین یا امریکی حکومت سے کرنی چاہیے۔'' شین نے خلوص سے کہا۔ ''ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔''

''اس صورت میں تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے۔'' فلورا سرگوشی میں بولی اور اس کے پاس آگئی۔ ''اس ساتھ کے بدلے میں، میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شین کے ساتھ بالکل چپک گئی۔ اس کا اشارہ واضح

تھا۔ فلورا کے گداز وجود نے شین کو زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو فلورا کمرے سے جا چکی تھی۔ شین نے ایک سگریٹ سلگائی اور حالات پر غور کرنے لگا۔ اسے فلورا کی بات سے حیرت ہوئی تھی، وہ تو سمجھ رہا تھا کہ فلورا بھی اس کی طرح کورمین کی قیدی ہے لیکن اس کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ کورمین کی قید میں بھی تھی، تب بھی اسے کچھ نہ کچھ آزادی حاصل تھی۔ اس نے رات کو ایک وعدے پر خود کو شین کے حوالے کیا تھا۔ لیکن شین جانتا تھا کہ وہ اس وعدے پر عمل نہیں کر سکتا۔ اسے وہی کرنا تھا جو کورمین چاہتا تھا۔ وہ فلورا سے معذرت کر سکتا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں اس کے لیے افسوس کر رہا تھا۔

اگلے دن صبح سویرے ایلن نے اسے اٹھا دیا۔ ناشتے کے بعد وہ اس کے ساتھ کمپیوٹر والے کمرے میں آیا۔ اس نے شین سے کہا۔ ''آج سے تم کام کا آغاز کر سکتے ہو... اور یاد رکھنا، ہمیں دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ ہمیں پتا چل جائے گا اور پھر تم جانتے ہو تمہارا کیا حشر ہوگا۔''

''میرا کسی کو دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس عورت کی باتوں میں بھی مت آنا۔'' ایلن نے اسے خبردار کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''وہ تمہیں استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جب اس کا مطلب نکل جائے گا تو وہ تمہیں ٹشو پیپر کی طرح پھینک دے گی۔''

''میں تمہارے قبضے میں ہوں۔'' شین نے کہا۔ ''اب تم مجھے دھمکانے کا سلسلہ بند کرو تاکہ میں کام شروع کرسکوں۔''

شین سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے کمرے کو بگ کیا گیا تھا اور ان لوگوں کو علم تھا کہ فلورا نے اس سے کیا کہا ہے؟

''تم کام شروع کر سکتے ہو۔'' ایلن نے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن خیال رہے، کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ میں یہیں تمہارے سر پر رہوں گا اور مجھے اس بارے میں بہت کچھ پتا ہے۔''

شین نے اپنا کام شروع کیا۔ درحقیقت یہ آسان کام نہیں تھا۔ لنک بینک دنیا کے بہترین پیشہ ور ماہرین کی پوری ٹیم رکھتے تھے جو ان بینکوں کی سیکیورٹی کو مستقل بہتر بناتے رہتے تھے اور ان کے سسٹم کو توڑنا ناممکن حد تک دشوار کام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بلیک منی اور ٹیکس چوری کرنے والے کاروباری حضرات میں لنک بینک دیکھتے ہی دیکھتے بے حد مقبول ہوگئے تھے۔ یہ آف شور بینک تھے اس لیے امریکی حکومت بھی ان کا

کرکٹر کی نوبیاہتا بیوی اسپورٹس گڈز کی دکان میں پہنچی اور اُسے بتایا کہ وہ ایک سینچری خریدنا چاہتی ہے۔

''جی... سینچری۔'' دکان دار ششدر رہ گیا۔

''جی ہاں، آج میرے شوہر کی سالگرہ ہے، وہ ہمیشہ روتے رہتے ہیں کہ انہیں کسی طرح سینچری ہی نصیب نہیں ہوتی۔''

□□□□□□□□□□□□□□□□□

کلب سکریٹری نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ''ڈاکٹر... جلدی آئیے، اسکورر نے فاؤنٹین پین نگل لیا ہے۔''

''میں فوراً آرہا ہوں، یہ بتائیں کہ آپ اس دوران کیا کریں گے؟''

''پینسل ہی استعمال کرنی پڑے گی۔'' سکریٹری نے افسردگی سے کہا۔

□□□□□□□□□□□□□□□□□

کیپٹن اپنی ٹیم کی فیلڈنگ کی طرف سے سخت مایوس تھا۔ ہر میچ میں وہ کیچ پر کیچ گراتے رہے۔ آخر ننگ آکر اُس نے تمام کھلاڑیوں کو اکٹھا کیا۔ ''ہم سب مچھلی کے شکار پر چل رہے ہیں۔''

''آخر کیوں؟'' کھلاڑیوں نے احتجاج کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس سیزن میں تم کچھ نہ کچھ پکڑلو۔''

http://digestpk.blogspot.com/

کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

اگر کوئی ناواقف کمپیوٹر ہیکر لنک بینک کے معاملے میں پڑتا تو اسے یقیناً ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ لیکن شین لنک بینکوں کے لیے کام کر چکا تھا اور اسے ان کے سسٹم کا تجربہ تھا۔ وہ چاہتا تو چند دن میں یہ کام کر سکتا تھا لیکن ابھی وہ اس معاملے کو طول دینا چاہتا تھا۔ وہ اس معاملے کو جاننا چاہتا تھا۔ آخر یہ لوگ اس سے یہ کام کیوں لے رہے تھے جبکہ حکومت کے پاس کام کرنے والے ماہرین کی کمی نہیں تھی؟ دوسرے اگر یہ کام حکومت کے لیے نہیں ہو رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ خطرے میں ہے۔ پونے دو ارب ڈالرز کی رقم کے لیے تو قتلِ عام کیا جا سکتا تھا، وہ تو پھر بھی ایک آدمی تھا جسے نہایت آسانی سے صفحۂ ہستی سے مٹایا جا سکتا تھا... اور خاص بات یہ تھی کہ اس کے خون کا دعویٰ بھی کوئی نہ کرتا کیونکہ وہ نہ تو امریکا میں رہتا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی دیکھ بھال کرنے والا تھا۔

دو دن وہ صبح سے شام تک کمپیوٹر کے ساتھ لگا رہا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ بالکل ہی سستی نہیں دکھا رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ ایلن اس کے پاس رہتا تھا، اس نے اپنے لیے ایک الگ مانیٹر حاصل کر لیا تھا جس پر وہ شین کی تمام سرگرمیاں دیکھتا رہتا تھا... کیونکہ کمپیوٹر میں جو ہو رہا ہوتا تھا، وہ اس اسکرین پر بھی آ جاتا تھا۔ دن میں کھانے کے وقفے میں وہ شین سے بات کرتا اور اسے اکساتا کہ وہ اپنی رفتار تیز کرے۔ ایک بار لنچ کے وقفے میں شین نے اسے سمجھایا۔

"تم اسے کام مت سمجھو، یہ اصل میں شطرنج کا کھیل ہے جس میں سوچ سمجھ کر چال چلنی پڑتی ہے۔"

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" ایلن نے سرد لہجے میں کہا۔ "شاید اب تمہیں ایک ہفتے سے زیادہ کی مہلت نہ ملے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں۔"

ایلن نے درست کہا تھا۔ اس سے اگلے روز کورمین آ گیا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے شین سے کہا۔ "اب زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔"

"حکومت کو وقت کا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟" شین نے پوچھا۔

"بکومت۔" کورمین کا موڈ خراب ہو گیا۔ "تم ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔" شین تیز لہجے میں بولا۔

"تمہارے پاس صرف چھ دن کی مہلت ہے اگر اس دوران میں تم نے کام کر لیا تو ٹھیک ہے، ورنہ تم خود کو لمبے عرصے کے لیے جیل جانے پر تیار کر لو۔"

شین کوشش کر رہا تھا لیکن جب کورمین نے اسے آخری وارننگ دی تو پہلی بار اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا۔ لنک بینکوں کے کمپیوٹر سسٹم میں سب سے بڑی مشکل اس میں پیرالل کوڈز کا ہونا تھا اور یہ کوڈز ہر گھنٹے بعد تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ کورمین نے جس لنک بینک کا بتایا تھا، اس میں یہی سسٹم تھا اور اس کا مطلب تھا کہ اس سسٹم کے الگ الگ چوبیس سسٹم منیجرز تھے جو ہر گھنٹے بعد بدل جاتے تھے۔ ان کے کوڈز بھی بدل جاتے تھے۔ اس کا طریقۂ کار کچھ یوں تھا کہ بینک کا ایک گاہک اپنے اکاؤنٹس کے بارے میں جاننے کے لیے بینک سے رابطہ کرتا تو یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ استعمال کرنے کے بعد بینک کی جانب سے اس آنے والے گھنٹے کو کوڈ ای میل کیا جاتا۔ وہ ای میل سے کوڈ نکال کر اسے بینک کے سسٹم میں ڈالتا تو اس کا اکاؤنٹ پیج کھل جاتا اور وہ اپنا اکاؤنٹ اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا تھا۔

ماریان پابیلا کے اکاؤنٹ کی یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ صرف اس کے ذہن میں محفوظ تھا اور وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ یہ معلومات اس نے اپنی بیٹی کو بھی نہیں دی تھیں۔ کورمین، فلورا سے معلوم کر چکا تھا۔ گویا شین کو جو کرنا تھا، اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔

یہ بنگلا کوئی ہزار گز پر تھا اور اس کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی جس پر خاردار تاریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ عمارت اتنی بڑی نہیں تھی۔ وہاں ایلن کے علاوہ بھی دو افراد مستقل نگرانی پر رہتے تھے۔ ہر بارہ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ البتہ ایلن اسی بنگلے میں موجود رہتا تھا۔ کورمین صرف ایک بار آیا تھا۔ شین کو لان میں جانے کی اجازت تھی لیکن اس دوران میں کوئی نہ کوئی اس کے آس پاس موجود رہتا۔ فلورا بس ایک رات رہی تھی، اس کے بعد وہ بھی بنگلے میں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی حرکت کی وجہ سے اسے وہاں سے لے جایا گیا تھا۔ اس نے ایلن سے فلورا کے بارے میں پوچھا تو اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا تمہیں اس کی یاد آ رہی ہے؟"

"ہاں... کیا میں ایک بار اس سے مل سکتا ہوں؟" شین نے ہچکچا کر کہا۔ ایلن نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اسی رات فلورا پھر اس کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ جس طرح

شین سے لپٹی تھی، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے بے تاب ہے۔ لیکن صبح ہونے پر وہ پھر جا چکی تھی۔ شین نے محسوس کیا کہ یہ لڑکی اس کی زندگی میں خاص اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ البتہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ لڑکی کے نزدیک اس کی کیا اہمیت ہے۔ وہ اسے پسند کرنے لگی تھی یا صرف مطلب برآری کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

اب اس کے پاس صرف تین دن کی مہلت رہ گئی تھی۔ اس رات کورمین بھی آ گیا۔ اس نے شین سے پوچھا۔ "کام کہاں تک پہنچا؟"

"کہیں تک بھی نہیں۔" شین نے جواب دیا۔

کورمین کا موڈ خراب ہو گیا۔ "کیا مطلب؟"

"یہ کوئی انجینئرنگ کا کام نہیں ہے جو طویل عرصے تک جاری رہے۔ منٹوں کا کام ہے بشرطیکہ سسٹم ٹوٹ جائے۔ میں کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ کوشش کامیاب ہو گی یا ناکام، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

کورمین نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، کوشش کرتے رہو۔"

دو دن بعد شین نے ایلن سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں کامیاب ہونے والا ہوں۔"

ایلن نے کورمین کو کال کی اور وہ ایک گھنٹے بعد وہاں آ گیا۔ "تم نے سسٹم توڑ لیا؟" اس نے شین سے پوچھا۔

"تقریباً... لیکن یہ بتا دوں کہ معاملہ صرف ایک گھنٹے بلکہ آدھے گھنٹے کا ہے کیونکہ پھر کوڈز بدل جائیں گے اور اس دوران میں رقم ٹرانسفر نہیں ہو سکی تو درمیان میں رہ جائے گی۔"

کورمین معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے... رقم کی منتقلی میں کتنا وقت لگے گا؟"

"کم سے کم بیس منٹ... اگر رقم دو ارب ڈالرز کی ہے تو..."

"ٹھیک ہے۔" کورمین نے کہا۔ "میں ایک اکاؤنٹ بتا رہا ہوں، اسے اوپن کرو۔"

شین نے کورمین کا بتایا ہوا اکاؤنٹ اوپن کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ اس کا اپنا اکاؤنٹ ہے۔ "اب اس میں رقم منتقل کر دو۔"

"پہلے مجھے ماریان کا اکاؤنٹ کھولنا پڑے گا۔" شین نے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد ہی رقم ٹرانسفر ہو سکے گی۔"

سب کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ "اس میں کتنی دیر لگے گی؟"

"بس پندرہ سے بیس منٹ۔" شین نے کہا۔ اس کی انگلیاں بدستور چل رہی تھیں۔ کورمین اور ایلن پُرجوش ہو رہے تھے۔ اس کا پتا ان کے چہروں کی سرخی سے چل رہا تھا۔ ظاہر ہے پونے دو ارب ڈالرز کم رقم نہیں ہوتی۔ بالآخر شین نے ماریان کا اکاؤنٹ کھول لیا اور اس میں موجود رقم بھی سامنے آ گئی۔ یہ کل سوا دو ارب ڈالرز کی بھاری رقم تھی۔ کورمین بے تابی سے ہاتھ ملنے لگا۔ اس نے کہا۔

"اسے فوراً میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دو۔"

"تمہارے اکاؤنٹ میں؟" شین چونکا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں..."

اچانک کوئی سرد سی چیز شین کے سر سے آ لگی اور ایلن کی آواز آئی۔ "جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔"

ایلن نے شین کے سر سے پستول لگا رکھا تھا۔ کورمین مسکرانے لگا۔ "وہ سب بکواس تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جائے گی۔ اب شروع ہو جاؤ۔"

مجبوراً شین نے چند بٹن دبائے اور رقم کی منتقلی کورمین کے بتائے ہوئے اکاؤنٹ میں شروع ہو گئی۔ ہندسے بے پناہ رفتار سے بدل رہے تھے۔ ہر منٹ میں سو ملین ڈالرز کی رقم کورمین کے اکاؤنٹ میں جا رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کی بے تابی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پستول کی نال بدستور شین کے سر سے لگی تھی۔ آخر کار اکیسویں منٹ میں تمام رقم کورمین کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گئی۔ اسکرین پر دیکھنے کے باوجود اسے شک تھا۔

"کیا رقم واقعی منتقل ہو گئی ہے؟"

"تم دیکھ سکتے ہو اور چاہو تو اپنا اکاؤنٹ آپریٹ بھی کر سکتے ہو۔" شین نے کی بورڈ اس کی طرف سرکا دیا۔

کورمین نے اپنا اکاؤنٹ چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر اسے بند کر دیا۔ "ٹھیک ہے مسٹر مائیکل! میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"لیکن افسوس کہ ہم تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔" ایلن نے کہا۔ اس وقت شین کی بورڈ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ ساکت ہو گیا۔ "کھڑے ہو جاؤ۔" ایلن نے اسے حکم دیا۔

"تم وعدہ خلافی کر رہے ہو۔" شین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک بٹن دبایا تو کمپیوٹر خود بہ خود بند ہو گیا اس لیے کوئی بھی اسکرین پر نمودار ہونے والا آخری منظر نہیں دیکھ سکا۔

"کیسا وعدہ اور کیسی وعدہ خلافی؟" کورمین مسکرایا۔ "دولت کے سامنے زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"

''ٹھیک ہے، تم مجھے مار دو گے لیکن کیا اس طرح تم لوگ خود بچ جاؤ گے؟''

شین کی بات نے انہیں چونکا دیا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں نے ساری روداد نیٹ پر اپنے ایک اکاؤنٹ میں محفوظ کر دی ہے اور ایک مقررہ مدت میں میں نے اپنا اکاؤنٹ نہیں کھولا تو یہ ساری معلومات خود بہ خود ان ای میلز ایڈریس پر چلی جائیں گی جو میں نے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔''

''بکواس... جب تم کام کرتے تھے تو میں یہاں موجود ہوتا تھا۔'' ایلن غرایا۔

لیکن کورمین پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے ایلن کو روکا اور بولا۔ ''اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے حقیقتاً ایسا ہی کیا ہے؟''

''تمہارے اس آدمی کو کمپیوٹر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اگر اس کی جگہ تم کسی ماہر کو بٹھاتے تو وہ مجھے پکڑ سکتا تھا۔ اب تم نے مجھے مارنا ہے تو شوق سے مار دو یا قید رکھو... لیکن اتنا یاد رکھنا کہ بچو گے تم بھی نہیں۔''

''تم نے کتنا وقت رکھا ہے؟'' کورمین نے پوچھا۔

''ممکن ہے ایک گھنٹا ہو اور ممکن ہے، دس گھنٹے ہوں... لیکن یاد رکھنا، ایک دن سے زیادہ کا وقت نہیں ہوگا۔''

''اوکے... ایلن! اسے چھوڑ آؤ۔'' کورمین نے حکم دیا۔

''لیکن...'' ایلن نے احتجاج کرنا چاہا۔

''ایلن!'' کورمین کا لہجہ درشت ہو گیا۔ پھر اس نے شین سے کہا۔ ''ایک بات یاد رکھنا... اگر تمہارے منہ سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نکلا تو تم اس دنیا میں کہیں بچ نہیں سکو گے۔''

''میں سمجھتا ہوں، منہ کھول کر میں خود بھی پھنس جاؤں گا۔ حکومت مجھے کوئی انعام نہیں دے گی۔''

''چلو۔'' ایلن نے اسے دھکا دیا۔

''ایک منٹ!'' شین نے کہا۔ ''میرا معاوضہ۔''

کورمین نے اپنے بریف کیس سے ایک لاکھ ڈالرز کے نوٹ نکال کر اس کی طرف اچھال دیے۔ ''اب دفع ہو جاؤ۔''

اس کے دو دن بعد شین ائرپورٹ پر تھا اور اس کی فلائٹ کا وقت ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ فلورا اس کے برابر میں آ بیٹھی۔ اس نے بال رنگ رکھے تھے اور جسم پر لانگ کوٹ تھا۔ ''ہیلو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''تم نے اپنا اکاؤنٹ چیک کر لیا؟''

''ہاں، رقم موجود ہے۔''

''اسے جتنی جلدی ممکن ہو کسی مینول سوئس اکاؤنٹ میں منتقل کر دو۔''

''یہ کام میں کر چکی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے معاوضہ پیشگی ادا کر دیا تھا اور پھر میرے اکاؤنٹ میں بھی دو ملین ڈالرز آ گئے ہیں۔''

''پھر بھی میں نے سوچا کہ ایک بار تم سے مل لوں۔'' فلورا نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ شین نے گہری سانس لی۔ کورمین نے فلورا کو اس سے ملا کر غلطی کی تھی کیونکہ فلورا نے پہلی رات اسے اپنی ایک نیٹ آئی ڈی بتا دی تھی اور پھر شین، ایلن کے ہوتے ہوئے بھی اس سے چیٹ کرتا رہتا تھا۔ اس نے شین کو پیش کش کی کہ اگر وہ اس کے باپ کی دولت بچالے تو وہ اسے دو ملین ڈالرز دے گی۔ اسی نے ماریان کے اکاؤنٹ کی یوزر آئی ڈی مہیا کی تھی۔ پاس ورڈ اسے بھی نہیں معلوم تھا لیکن پاس ورڈ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔

پھر اس نے اکاؤنٹ تک رسائی کا طریقہ تلاش کر لیا اور اس سے رقم کورمین کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی۔ پھر جب کورمین نے اصلیت دکھائی اور اسے مارنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے صفائی سے ایک بٹن دبا دیا۔ اس بٹن پر بیک وقت دو کمانڈز تھیں۔ ایک تو کمپیوٹر بند کرنے کی کمانڈ تھی اور دوسرے گزشتہ ایک گھنٹے میں جو کام کیا گیا تھا، یہ اسے الٹا کر دیتا۔ کمپیوٹر بند ہونے سے پہلے کورمین کے اکاؤنٹ سے رقم کی واپس ماریان کے اکاؤنٹ میں منتقلی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن کمپیوٹر بند ہونے کی وجہ سے کورمین یا ایلن ٹرانزیکشن کی واپسی دیکھ نہیں سکے تھے۔

اس سے اگلے دن ایف بی آئی نے چھاپا مار کر ایف بی آئی اور ایک وفاقی ایجنسی کے بعض اعلیٰ افسران کو گرفتار کر لیا تھا لیکن ان کے نام، عہدے اور گرفتاری کی وجہ راز میں رکھی جا رہی تھی۔ فلائٹ کا اعلان ہوا تو شین چونکا پھر اپنا بیگ اور لیپ ٹاپ سنبھالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

http://digestpk.blogspot.com/

''میں فردِ جرم پیش کرنے کے لیے ڈائس کی طرف جانے والا ہوں۔'' یہ بات ایوان گورڈن نے میک بین سے کہی۔ اس وقت وہ دونوں سان فرانسسکو کنٹری جیل کے اٹارنی کے دفتر کے باہر بنے ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''وہاں کوئی ڈائس موجود نہیں جس کے سامنے کھڑے ہو کر تم فردِ جرم پیش کر سکو۔'' میک بین، ایوان کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

فردِ جرم کی دستاویز دونوں کے سامنے موجود تھی۔ پولیس کی تفتیشی رپورٹ بھی اس میں موجود تھی جس میں دو گواہوں کے بیانات بھی شامل تھے۔ ویگن نمبر پلیٹ کا ایک جزوی حصہ اور ساتھ ہی ایک شاٹ گن بھی تھی۔ پولیس افسر راجر اپنے سامنے یہ ثبوت رکھے ہوئے سماعت کا منتظر تھا۔ وہ ان دونوں وکیلوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔

میک بین گزشتہ بارہ برس سے سرکاری وکیل کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ایوان حیران تھا کہ وہ مقدمے میں اپنے دلائل پیش کرنے کے سلسلے میں لیت و لعل سے کیوں کام لے رہا ہے؟ مقدمہ بہت زیادہ پیچیدہ نہیں تھا اور اگر سماعت ہوتی رہتی تو جلد ہی فیصلہ ممکن تھا مگر میک بین ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر سماعت کو ملتوی کروا دیتا تھا۔ یہ ایوان کے لیے سخت تعجب کی بات تھی۔

دو وکیلوں کے مابین ہونے والی باہمی جرح و بحث کے دلچسپ کمالات

دولت کی چکا چوند سے چندھیائی ہوئی آنکھیں بعض اوقات رشتوں کی پہچان کھو بیٹھتی ہیں اور کبھی کبھی قانون کے رکھوالے بھی جرائم کی پرورش کرنے لگتے ہیں ...... جرم ...... رشتے اور قانون کی مثلث

تیسرا آدمی

ثمر عباس

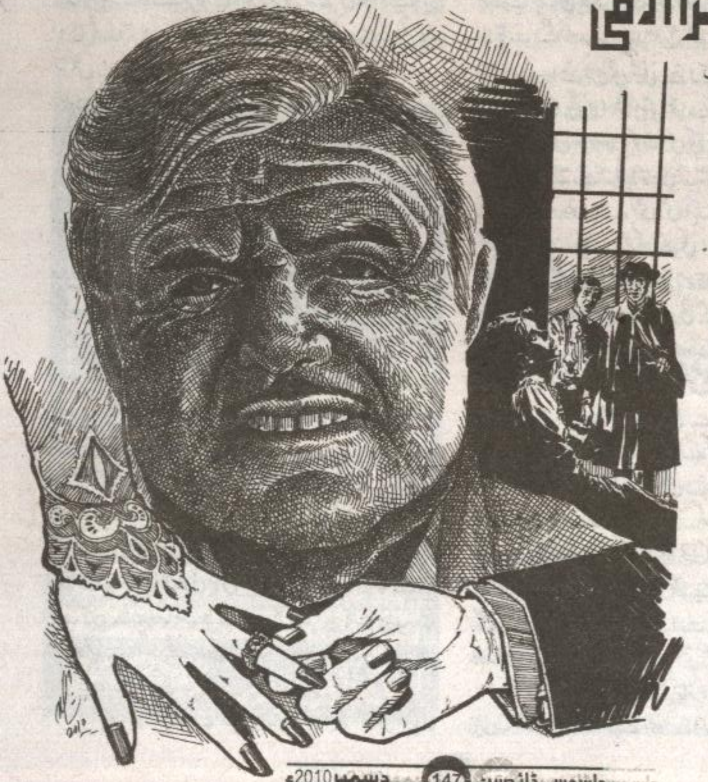

http://digestpk.blogspot.com/

ایوان گورڈن پرائیویٹ وکیل کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر جرائم کے مقدمات لڑا کرتا تھا۔ اس کی ہمیشہ سے کوشش ہوتی تھی کہ مقدمات جلد از جلد اپنے منطقی انجام تک پہنچیں۔ اس لیے وہ اس مقدمے میں بھی جان توڑ کوشش کررہا تھا لیکن میک بین مختلف حیلے بہانوں سے کام لے رہا تھا جس کی وجہ سے مقدمہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ اٹارنی کے سامنے اپنے مؤکل کے حق میں دلائل دینے کے بجائے ہر پیشی پر ایک ایسا نیا بہانہ گھڑ لیتا تھا جس کی وجہ سے مقدمے کی سماعت کے لیے ایک بار پھر اگلی تاریخ پڑجاتی تھی۔ یوں تین مہینے گزر گئے مگر مقدمے کی پیروی شروع نہ ہوسکی۔ ایوان، میک کے اس رویّے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔

میک بین کے تاخیری حربوں کے سبب ایوان جان چکا تھا کہ وہ اس وقت تک مقدمے کی سماعت میں تاخیر کروانا چاہتا ہے جب تک یا تو مقدمے کے گواہان کی یادداشت میں واقعات دھندلے پڑ جائیں یا شہادتیں بڑی حد تک ناکارہ ہوجائیں۔ ایوان جانتا تھا کہ اس طرح کے تاخیری حربوں سے کام لینے والے سرکاری وکیل سرکار سے بھی تنخواہ لیتے ہیں اور تاخیری حربوں سے مقدمہ کمزور کرنے کے لیے جرائم پیشہ مؤکل سے بھی مال اینٹھتے ہیں۔

آج بھی وہ دونوں اٹارنی کے دفتر میں موجود تھے۔ ایوان گورڈن اپنے ساتھ فردِ جرم پیش کرنے کے لیے گواہان کی فہرست و تفصیلات... نیز اپنے مؤکل کے حق میں کئی ثبوت لے کر پہنچا تھا۔ اب اسے سماعت کے لیے بلائے جانے کا انتظار تھا۔ میک بین بھی موجود تھا۔ وقت گزاری کے لیے یہ دونوں باتیں کررہے تھے۔ ایوان کو خدشہ تھا کہ اس بار بھی میک بین کوئی بہانہ پیش کرکے سماعت کو اگلی تاریخ تک ملتوی کروانے کی کوشش کرے گا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ مقدمے کی سماعت میں تاخیر کے سبب پیک کتنے ذہنی دباؤ میں ہے؟'' ایوان نے باتوں باتوں میں میک بین سے کہا تو وہ چڑ گیا۔

''اس کو مظلوم بنا کر پیش نہ کرو۔ اصل میں تو پیک ظالم ہے۔ اس مقدمے کے متاثرین... یعنی سوزا جو بیچاری اپنی جان سے گئی اور اب اس کا اپنا سگا بھائی اس قتل کے جرم میں اندر ہے۔ ذرا بتاؤ، کوئی یوں اپنی بہن کو گولی مار سکتا ہے؟'' میک بین نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بدبخت پیک نے جو کچھ کیا ہے، اگر مجھے موقع ملے تو اسے گولی ماردوں۔'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اچھا تو تمہارے خیال میں سوزا کا قاتل پیک ہے؟'' ایوان نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' میک نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''تو پھر تم مقدمہ چلنے کیوں نہیں دے رہے؟'' ایوان نے سرد لہجے میں کہا۔

''میں تاخیر کا ذمے دار نہیں۔ مجھے اپنے مؤکل کو بچانے کے لیے مقدمے کی تیاری کا بھرپور موقع ملنا چاہیے۔ یہ میرا اور میرے مؤکل کا قانونی حق ہے۔ تم مجھ پر الزام لگارہے ہو۔'' میک کے لہجے میں غصہ تھا اور اس کی آواز بھی بلند تھی۔ اس سے پہلے کہ دونوں میں تلخ کلامی کی نوبت آتی، انہیں کمرائے عدالت میں پہنچنے کا بلاوا آگیا۔

☆☆☆

یہ ویلنٹائین ڈے کی سرد رات تھی جب پیک ٹرنر اپنی محبوبہ کو پارٹی میں ساتھ لے جانے کے لیے اس کے گھر پر پہنچا۔ سوزا، پیک کے ساتھ ہی ایک ایڈورٹائزمنٹ کمپنی میں کام کرتی تھی۔ دونوں کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ وہ خاصے سلجھے خیالات کی مالک تھی۔ پیک بھی شائستہ اور مہذب انسان تھا۔ بہت جلد دونوں قریب آگئے۔ ان کی ملاقات کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ جب ویلنٹائن ڈے آیا۔ اس رات ان کی کمپنی نے اپنے کلائنٹس کے لیے ایک بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ پیک ٹرنر کا خیال تھا کہ وہ اس پارٹی میں ہی سوزا کو شادی کی پیشکش کرے گا۔ اگرچہ دونوں جانتے تھے کہ وہ شادی کرلیں گے لیکن آج تک اس بارے میں دونوں نے کبھی بھی ایک لفظ اپنی زبان سے ادا نہیں کیا تھا۔ پیک کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک چھوٹی سے مخملی غلاف کی ڈبیا موجود... تھی جس میں ہیرا جڑی شان دار انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔ پارٹی میں ان کے سارے مشترکہ دوست موجود ہوتے۔ پیک کا خیال تھا کہ شادی کی پیشکش اور منگنی کی انگوٹھی سوزا کی انگلیوں میں پہنانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔

پیک پہلے بھی کئی بار سوزا کے گھر آچکا تھا۔ رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا جب اس نے اپنی گاڑی سوزا کے گھر کے دروازے کے سامنے روکی۔ گھر کے اندر لائٹ روشن تھی۔ وہ پہلے ہی سوزا کو بتا چکا تھا کہ پارٹی میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے وہ آٹھ بجے اُس کے گھر پہنچ جائے گا۔ گھر کے اندر روشنی دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ سوزا تیار ہورہی ہوگی۔

''افوہ... یہ لڑکیاں بھی تیار ہونے میں کتنی دیر لگاتی ہیں۔'' گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

ابھی وہ دروازے کی بیل بجانے والا تھا کہ اچانک اندر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ گولی چلنے کی آواز دو بار آئی۔ یہ سنتے ہی پیک کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ دروازے سے ہٹ کر تھوڑا سا سائڈ میں ہوگیا۔

''اوہ میرے خدا!'' فائر کی آواز سنتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا سمجھتا، اچانک اندر سے ایک شخص دوڑتا ہوا نکلا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔

''کیا ہوا؟'' پیک نے بنا کچھ سوچے سمجھے زور سے کہا تو برونی یک دم رک گیا مگر اگلے ہی لمحے وہ آگے کی طرف بھاگا۔

پیک کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ اسی عالم میں وہ گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ سامنے فرش پر سوزا اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ کمرے میں سامان اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ سوزا کے سامنے ہی ایک جیولری باکس بھی گرا ہوا تھا اور اس میں رکھے ہوئے زیورز مین پر بکھرے ہوئے تھے۔

پیک نے آگے بڑھ کر اس کو سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ سیاہ لباس خون سے چپچپا ہورہا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی نبض ٹٹولی لیکن وہ بند ہوچکی تھی۔ پیک نے سوزا کی ناک کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کو محسوس کرنا چاہا لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھ چکی تھیں اور جسم آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑتا جارہا تھا۔

'سوزا مرچکی ہے۔' یہ خیال دماغ میں آتے ہی وہ زور سے چیخا۔

''اوہ میرے خدا... یہ کیا ہوگیا۔''

وہ چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ بتیس سالہ پیک کی زندگی میں یہ پہلی بار ہوا تھا جب اس نے کسی لڑکی کو ٹوٹ کر چاہا اور اس کو اپنی بیوی بنانے چلا تھا... مگر جب منزل قریب تھی، عین اس وقت بندوق سے نکلی گولی نے پیک سے اس کی محبت کو چھین لیا تھا۔

سوزا کو پلٹنے اور اس کی نبض وغیرہ دیکھنے کے دوران پیک کے ہلکے سرمئی سوٹ اور سفید شرٹ پر جگہ جگہ خون کے دھبّے لگ گئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ سوزا کی موت کا یقین ہونے پر وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس کا موبائل فون گاڑی میں رکھا ہوا تھا۔ پیک نے یہاں آتے ہوئے اسے گاڑی کے چارجر پر لگا دیا تھا کیونکہ فون کی بیٹری بالکل ختم ہوچکی تھی۔ وہ گاڑی میں سے اپنا موبائل فون نکال کر پولیس کو اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن اس نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا، اچانک پولیس سائرن کی آوازیں گونجنے لگیں اور پھر پولیس نے خون میں لتھڑے پیک کو گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے گرفتار کرلیا۔

پولیس کے مطابق ملزم کو واردات کے بعد فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس نے اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے وہ شاٹ گن بھی برآمد کرلی تھی جس سے چلائے گئے دو کارتوس سوزا کی موت کا سبب بنے تھے۔

پولیس کو واردات کی اطلاع برونی نے دی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کرکے بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن سوزا سے ملنے کے لیے اس کے گھر آیا تھا۔ عین اس وقت جب وہ ڈور بیل بجانے والا تھا، اس نے گھر کے اندر دو بار گولیاں چلنے کی آواز سنی جس پر اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا تو وہاں ایک شخص ہاتھ میں شاٹ گن لیے کھڑا تھا اور سوزا فرش پر خون میں لت پت تھی۔ وہ یہ منظر دیکھتے ہی دوڑ پڑا اور گھر سے دور آکر پولیس کو اطلاع دے رہا ہے۔ ملزم اس وقت گھر کے اندر موجود ہے۔

پیک کے ہاتھوں کو پیچھے کرکے جب ہتھکڑیاں لگائی جارہی تھیں تو اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ہر نیا مجرم پہلی واردات کے بعد اسی طرح شرمندگی کے

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹس	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	ایئر ٹکٹنگ	بوتیک فیشن	آٹو سروسنگ
ریڈیو ٹی وی وی سی آر مکینک	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈرائنگ پینٹنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹوگرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
امپورٹ ایکسپورٹ / شمسی توانائی	مُہر سازی	سلمنگ بیوٹی	حکمت / اردو ادیب
موٹیویٹیکل مرمت / لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (ہیلتھ)	میڈیکل ایڈ	آئل پینٹنگ	ڈینٹل ٹیکنیشن
پولٹری ڈیری فارمنگ	نیوز رپورٹر	فلاور میکنگ	پبلک ہیلتھ آفیسر

یہ تمام کورسز اردو میں ... تصاویر ... کے ساتھ ... ڈاک ... گھر پر کرسکتے ہیں کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی ... ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237 جی پی او اسلام آباد

http://digestpk.blogspot.com/

ٹسوے بہاتا ہے۔ اب چپ کر جاؤ۔ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' پولیس افسر جوناتھن نے نہایت سفاکی سے کہا۔

''یہ ندامت کے نہیں، بے گناہی کے آنسو ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ اب چپ کرو۔ عدالت میں اپنے آنسو بہانا۔ ہوسکتا ہے کہ جیوری ارکان میں سے ایک آدھ کو تمہاری حالت پر رحم آجائے۔'' جوناتھن نے پیک کا سر پکڑ کر اسے جھکایا اور پولیس کار میں بٹھادیا۔

واردات کے بعد پولیس نے جائے وقوع کو دو دن تک سیل کر کے تمام شواہد۔۔۔ اکٹھا کیے۔ گھر کے باہر پارکنگ سے پولیس کو ایک بڑے سے پتھر کے قریب گاڑی کی ٹوٹی ہوئی نمبر پلیٹ ملی جس پر آخر کے صرف دو نمبر تھے۔ کارتوس کے خالی خول اور شاٹ گن کے فرانزک لیبارٹری ٹیسٹ سے ثابت ہوگیا کہ فائر اسی سے کیے گئے تھے... مگر حیرت انگیز طور پر شاٹ گن پر کسی شخص کے فنگر پرنٹس موجود نہیں تھے۔ اس پر خون کا بھی کوئی دھبا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ جس وقت پیک کو گرفتار کیا گیا، اس کے ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے تھے اس لیے شاٹ گن کے دستے پر خون کے نشانات ہونا لازمی تھے۔

گاڑی کے اگلے دروازے پر خون کے نشانات تھے۔ اگلی سیٹ پر بھی یہ نشانات موجود تھے، تاہم حیرت انگیز طور پر پچھلی سیٹ... جس کے نیچے سے شاٹ گن برآمد ہوئی تھی، اس پر خون کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ یہی نہیں، گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں کے ہینڈل پر بھی صرف پیک ہی نہیں، کسی شخص کے بھی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ رومال سے اچھی طرح صاف کر کے انگلیوں کے نشانات کو مٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر پولیس کو محسوس ہوا کہ ہوسکتا ہے کہ پیک قاتل نہ ہو اور کسی نے اس کو پھنسایا ہو۔ تاہم پولیس اس بات پر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھی کہ پیک اس قتل سے مکمل طور پر بری الذمہ ہے۔ اب سچ کیا ہے، اس بات کا فیصلہ تو عدالت نے ثبوتوں اور گواہوں کے بیانات کو سامنے رکھ کر کرنا تھا... لیکن پولیس نے پیک کے بیان کی روشنی میں برونی کو بھی گرفتار کرلیا تھا۔

اپنی گرفتاری پر برونی بہت جز بز ہوا تھا۔ اس نے چلّا چلّا کر کہا کہ پولیس اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔ وہ اپنی سگی بہن کو کس طرح ہلاک کرسکتا ہے؟ لیکن پولیس کو اس کی دُہائی سے زیادہ پیک کے بیان کی روشنی میں عمل کرنا تھا۔

برونی بچپن سے ہی مجرمانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ جوئے، ڈکیتی اور رقم لے کر لوگوں کو قتل کرنے سمیت وہ کئی سنگین جرائم کر چکا تھا۔ وہ کئی بار پکڑا گیا تھا لیکن وہ واردات اس عمدگی سے کرتا کہ پیچھے کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا تھا۔ یوں عدم ثبوت کے باعث وہ ہر بار سزا سے صاف بچ جاتا تھا۔

برونی کے والدین بھی سان فرانسسکو شہر میں ہی رہتے تھے لیکن جرائم پیشہ بیٹے سے وہ زندگی بھر دور رہے۔ البتہ سوزا... جو برونی سے دو برس بڑی تھی، وہ ہمیشہ بھائی سے رابطے میں رہتی تھی۔ اکثر جب برونی پکڑا جاتا تو وہ جیل میں جا کر اس سے ملاقات بھی کیا کرتی تھی۔ سوزا نے کئی بار مختلف معاملات میں برونی کی مدد کی تاکہ وہ مصیبت سے نکل سکے۔ برونی ہر بار اپنی بہن سے وعدہ کرلیتا تھا کہ اگر اس بار بچ گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے مجرمانہ زندگی سے تائب ہوجائے گا... مگر ہر بار بچ جانے کے بعد وہ دوبارہ جرم کے راستے پر چلنا شروع کر دیتا تھا۔

سوزا نیک دل لڑکی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو جرم کی دلدل سے نکالنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی رہی لیکن برونی جرم کی دلدل میں گلے تک دھنس چکا تھا۔ برونی نے اس وقت کے بعد ہی اپنے والدین کا گھر چھوڑ دیا تھا، جب وہ پہلی بار گرفتار ہوا۔ اس کے بعد والدین نے بھی مرتے دم تک اس سے کبھی، کسی بھی قسم کا کوئی تعلق باقی نہیں رکھا تھا۔

برونی چھ فٹ، چار انچ قد والا کیم تحیم آدمی تھا۔ اس کے پورے جسم پر ٹیٹو کندہ تھے۔ وہ مزاج ہی نہیں، حلیے سے بھی جرائم پیشہ دکھائی دیتا تھا۔ جب پیک نے پولیس کو بتایا کہ اس نے فائرنگ کے فوراً بعد سوزا کے گھر سے باہر نکلتے ہوئے جس شخص کو دیکھا، وہ وہی برونی ہے جو سوزا قتل کیس کا مدعی بنا ہوا ہے... اسی کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی جسے پولیس نے اس کی کار سے برآمد کیا ہے، تب پولیس کو اس بات میں اس لیے زیادہ وزن محسوس ہوا کہ پیک کی گاڑی کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے ملنے والی شاٹ گن بالکل بے داغ تھی اور کار کے ہینڈل رومال سے صاف کر دیے گئے تھے... جس کی وجہ سے وہاں پر انگلیوں کے نشانات بھی نہیں تھے۔

یوں پولیس نے سوزا قتل کیس میں دونوں ملزموں کو گرفتار کرلیا تھا۔ آلۂ قتل موجود تھا۔ جائے وقوع سے شواہد اکٹھے کر لیے گئے تھے لیکن ایک بات معما تھی کہ سوزا کو کس نے قتل کیا؟ شاٹ گن پر انگلیوں کے نشانات ہوتے تو یہ قتل کا سیدھا سادہ کیس تھا مگر آلۂ قتل بالکل صاف تھا۔ اس لیے گرفتار کیے گئے دونوں اشخاص میں سے قاتل کون تھا؟ پولیس نے دونوں ملزمان سے یہ بات اُگلوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کوئی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پولیس نے اقبالِ جرم کا ہر حربہ آزما لیا مگر ہنوز یہ بات راز تھی کہ قاتل کون ہے؟

پولیس نے جب عدالت کے سامنے مقدمہ پیش کر دیا تو پیک اور برونی کو سان فرانسسکو کنٹری جیل منتقل کر دیا گیا، تاہم جج کے حکم پر برونی کو تو عام قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا لیکن پیک کو خصوصی حفاظتی سیل میں رکھا گیا۔ جج نے مقدمہ جیل میں ہی چلانے کی ہدایت کی تھی تاکہ عدالت میں پیشی پر لانے، لے جانے کے دوران کوئی موقع دیکھ کر برونی یا پیک کو نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔ برونی عادی مجرم تھا۔ اس لیے جج کو خدشہ تھا کہ وہ پیک کی جان لینے کی کوشش کرسکتا ہے کیونکہ وہ اسے اپنی اکلوتی بہن کا قاتل قرار دے رہا تھا۔

☆☆☆

جیل میں سوزا قتل کیس کی سماعت شروع ہوئے تین ماہ سے زائد ہوچکے تھے۔ عدالت نے سرکاری وکیل میک بین کو برونی کا وکیلِ صفائی مقرر کیا تھا۔ ایوان گورڈن کو پیک کی ایڈورٹائزنگ کمپنی نے بھاری مشاہرے پر پیک کا وکیلِ دفاع مقرر کیا تھا۔ ایوان گورڈن اس طرح کے بظاہر سیدھے سادے لیکن الجھے مقدمات کی عدالت میں تشریح کے حوالے سے خاصا معروف تھا۔ میک بین گو کہ سرکاری وکیلِ صفائی تھا لیکن اس کے باوجود ایوان محسوس کر رہا تھا کہ ہر بار وہ کیس میں ایسی کوئی تاویل پیش کرتا جس کے باعث جج مقدمے کی سماعت کے لیے اگلی تاریخ دے دیتا تھا۔

ایوان گورڈن کے لیے یہ بات بہت تشویش ناک تھی۔ مقدمے کی سماعت میں تاخیر سے سب سے بڑا نقصان گواہوں کے بیانات میں ردّوبدل کی صورت میں ہوتا ہے۔ مقدمہ جتنا تاخیر کا شکار ہوتا ہے، اتنا ہی گواہوں کی یادداشت پر سے جائے وقوع کا منظر نامہ دھندلانے کا خدشہ بڑھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر گواہان عدالت میں جرح کے دوران ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو پولیس کو دیے گئے ان کے پہلے کے بیانات سے متصادم ہوتی ہیں۔ یوں ان کا بیان مشکوک ہوجاتا ہے اور اس تضاد کا سراسر فائدہ ملزم کو ہوتا ہے۔

سوزا قتل کیس میں دو ملزم نامزد تھے اس لیے دونوں کو وکیلِ صفائی کی سہولت حاصل تھی مگر ایک بات انوکھی تھی... وہ یہ کہ ایک ملزم پیک اس بات پر مُصر تھا کہ قتل اس نے نہیں کیا بلکہ قاتل برونی ہے۔ اس لیے ایوان کو اپنے موکل کے لیے نہ صرف بطور وکیلِ صفائی بلکہ دفاعی وکیل کے طور پر بھی فرض نبھانا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن میک بین مقدمے کو مستقل طول دینے کے موڈ میں تھا۔

اُس دن بھی ایوان اور میک، جج اور سہ رکنی جیوری ٹیم کے سامنے مقدمے کی سماعت کے لیے آئے تھے۔ ایوان کو امید تھی کہ ہوسکتا ہے اس بار میک بین مقدمے کو غیر ضروری تاخیر کا شکار بنانے کی کوشش نہ کرے مگر اسے مایوسی ہوئی۔ میک بین آج بھی جس انداز میں باتیں کر رہا تھا، اس سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ حسبِ سابق آج بھی کچھ نئی تاویل پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو میک بین اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جنابِ عالیٰ... اگرچہ یہ مقدمہ سیدھا سادہ نظر آرہا ہے لیکن فردِ جرم عائد کیے جانے سے پہلے ہمیں ملزم کا تعین کرنا ہوگا۔ اگرچہ مبینہ قاتل پیک نے سوزا کا قتل کیا ہے لیکن وہ اس قتل کا الزام مقتولہ کے سگے بھائی پر لگا رہا ہے۔ میرا موکل بے قصور ہے لیکن اس کے دفاع میں دلیل دینے سے قبل مجھے مقدمے کے سلسلے میں مزید تیاری کی ضرورت ہے۔ اس لیے فردِ جرم عائد کرنے سے مکمل دلائل دینے کے لیے مجھے مزید کچھ وقت دیا جائے۔''

جج کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ وکیلِ صفائی کی استدعا کو مسترد کردے۔ یوں ایوان کے کچھ بولنے سے قبل ہی جج نے میک کی درخواست قبول کرتے ہوئے سماعت کو اگلے دو ہفتوں تک کے لیے ملتوی کردیا۔

استدعا منظور ہوتے ہی میک، ایوان کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرادیا۔ ایوان ہر پیشی پر مکمل تیاری کے ساتھ آتا مگر ہر بار میک مقدمے کی سماعت میں روڑے اٹکا دیتا تھا۔ اس بار بھی حسبِ سابق میک نے ایک اور نئی چال چلی اور کامیاب بھی ہوگیا۔ اس بات پر ایوان گورڈن کا تن بدن سُلگ اٹھا۔

'بس! بہت ہوچکا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس قتل میں خود میک کسی نہ کسی صورت ملوث ہے، ورنہ آج تک اس نے کسی بھی مقدمے کی سماعت میں اتنی رکاوٹیں کھڑی نہیں کی ہیں... جتنی رکاوٹیں وہ اس بار ڈال رہا ہے۔' ایوان دل ہی دل میں ایک نئے زاویے پر سوچ رہا تھا۔

ایوان پیشہ ورانہ طور پر میک کو جانتا تھا لیکن وہ اس کی نجی مصروفیات اور نجی زندگی سے قطعی لاعلم تھا۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ میک اور برونی کے درمیان ایسا کیا تعلق ہے جس کی وجہ سے وہ مقدمے کو کمزور کرنے کے لیے تاخیری حربے استعمال کر رہا ہے۔

عدالت کی جانب سے سماعت ملتوی کرنے کے فیصلے کے بعد پولیس افسر نے برآمد کی گئی شاٹ گن، خون آلود لباس، ٹوٹی ہوئی نمبر پلیٹ اور دیگر کاغذات اٹھائے اور ایوان

http://digestpk.blogspot.com/

کی طرف دیکھ کر کہا۔
''چلیے... ملتے ہیں اگلی پیشی پر!''

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ ایوان گورڈن دفتر میں سوزا قتل کیس کی فائل کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ سنجیدگی سے گواہوں کے بیانات پر غور کر رہا تھا۔ یہ گواہ تھے... سوزا کے پڑوسی مسٹر اینڈ مسز اسمتھ!

دونوں ریٹائرڈ اسکول ٹیچرز تھے اور سوزا کے گھر سے متصل ان کا گھر تھا۔ جس وقت فائرنگ کی آواز آئی' اس وقت وہ دونوں اپنے لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر کی طرف کھلنے والی ان کی کھڑکی پر پڑے پردے اٹھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے شیشے سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات انہوں نے پولیس اور خود ایوان کو بھی بتائی تھی۔

ان دونوں میاں بیوی نے پولیس کو بتایا کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا، وہ لیونگ روم میں بیٹھ کر ایک اخباری مضمون پر بحث کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ فائرنگ کے بعد ایک شخص بھاگتا ہوا باہر آیا اور سامنے کھڑی ویگن کی طرف گیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی میں منہ ڈال کر شاید اس نے کچھ کہا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔ وہ آدمی جیسے ہی ویگن کی کھڑکی سے دور ہوا، اس کے فوراً بعد گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی ریورس کی۔ جب گاڑی ریورس ہو رہی تھی تو اچانک ایسی آواز سنائی دی جیسے گاڑی کا عقبی حصہ کسی بڑے پتھر سے ٹکرایا ہے لیکن ڈرائیور نے اس بات کی پروا کیے بغیر نہایت تیز رفتاری سے گاڑی کو تھوڑا آگے کیا اور اتنی رفتار سے سڑک کی طرف بڑھا کہ وہ ڈر گئے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہی شخص جو پک اپ ویگن کی طرف گیا تھا، وہ پارک کی ہوئی دوسری کار کی طرف بڑھا۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اس میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص کار سے باہر نکلا اور ایسا لگا جیسے وہ اپنی شرٹ کے دامن سے کار کے دروازے کے ایک حصے کو صاف کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ صرف دو چار منٹ میں ہی ہوا۔ اس کے بعد وہ فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس آدمی نے فون جیب میں رکھا۔ ہم سہمے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اصل میں ہم فائرنگ کی آواز سن کر ہی خوف زدہ ہو گئے تھے۔ باہر خاصا اندھیرا تھا اس لیے باتیں کرنے والے شخص کو صاف طور پر نہیں دیکھ سکے تھے۔ اس لیے یقین سے کچھ کہنے سے قاصر ہیں کہ وہ شخص کون تھا۔ ابھی ہم اس واقعے کے بارے میں کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ پولیس کار کے سائرن سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ آواز سن کر ہم بھی گھر سے باہر آئے، تب پتا چلا کہ سوزا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔

پولیس تفتیش کے ساتھ عدالت میں جمع کروائے گئے اس بیان کو ایوان نے کئی بار پڑھا۔

''یہ تیسرا شخص کون ہے؟ اگر اس تیسرے نامعلوم شخص کا پتا چل جائے تو پھر نہ صرف یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ برونی قاتل ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قتل کا محرک کیا تھا؟'' اس نے سر اٹھا کر اپنی سیکریٹری لورنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لورنا قانون کی طالب علم بھی تھی اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم نوکری کر رہی تھی۔

''میرے خیال میں آپ کی بات میں وزن ہے۔'' لورنا نے آہستگی سے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میک بین جو چاہے کرے لیکن اگلی پیشی پر میں اسے یہ موقع ہرگز نہیں دوں گا کہ وہ مقدمے کی سماعت میں رخنہ ڈالے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنی نجی ٹیلی فون ڈائریکٹری کھول کر کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔

''ہیلو جارج... کیا حال ہیں... میں ایوان بول رہا ہوں۔''

''ہاں... کہو کیسے یاد کیا؟ بڑی مدت کے بعد تمہاری آواز سنی ہے۔''

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بتاؤ کل صبح نو بجے میرے آفس پہنچ سکتے ہو؟''

''ہاں ہاں... کیوں نہیں۔'' ایوان کی بات سن کر جارج خوش دلی سے بولا۔

''تو ٹھیک ہے کل صبح ملتے ہیں... بائے۔''

''بائے ایوان۔''

''چلو لورنا... آفس بند کرتے ہیں۔'' ایوان نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا اور اپنا بیگ تھام کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

جارج وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ ایوان اس کا ہی منتظر تھا۔

''کہو کیسے یاد کیا؟'' دفتر میں داخل ہوتے ہی بنا علیک سلیک کے جارج نے ایوان کو مخاطب کیا۔

''یار! تم بھی کمال ہو۔ اتنے دنوں کے بعد ملے ہو، نہ سلام نہ دعا... چھوٹتے ہی مطلب کی بات!''

''بھئی اپنا تو اصول ہے پہلے کام پھر سلام۔''

''تو ٹھیک ہے۔ بیٹھو اور کام کی بات سنو۔''

جارج پہلے پولیس کے محکمۂ تفتیش سے وابستہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک سراغ رساں کمپنی سے منسلک ہو گیا۔ جب وہاں دل نہ لگا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنا دفتر قائم کیا۔ محکمۂ پولیس سے لائسنس حاصل کیا اور اب نجی طور پر سراغ رسانی کا کام کرتا تھا۔ اس نے پہلے بھی کئی بار متعدد مقدمات میں ایوان گورڈن کی مدد کی تھی۔

''اچھا... یہ بات ہے۔'' جارج نے سوزا قتل کیس کی تمام تر تفصیلات سننے، پولیس کی تفتیش اور پوسٹ مارٹم رپورٹ... پڑھنے کے بعد گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''تمہاری بات درست ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوزا کو پیک نے قتل کیا یا برونی نے؟ اس بات کا انحصار قتل کے محرک پر ہے اور وہ اب تک معلوم نہیں۔ ایک بات جو پیک کے خلاف ہے وہ یہ کہ سوزا سے اس کی قربت کو سب جانتے تھے۔ اس لیے اگر پیک نے یہ قتل کیا تو وہ کسی بات پر اشتعال کا ردعمل ہو سکتا ہے۔ اب یہ بات عدالت تسلیم کر لے تو بھی عدالت کو یہ بات تسلیم کروانا بہت مشکل ہے کہ جس شاٹ گن سے قتل ہوا، وہ پیک نے اپنے ہاتھوں سے ہی گاڑی کی پچھلی نشست پر چھپائی تھی۔ اس نے شاٹ گن پر سے اپنے فنگر پرنٹ صاف کیے۔ پھر کار کے ہینڈل کو صاف کیا۔ اس نے اپنی ہی کار پر سے، اپنے ہی فنگر پرنٹس کیوں صاف کیے؟ یہ وہ سوال ہے جو اس بات کو تقویت بخشتا ہے کہ پیک بے قصور ہے اور قتل کسی دوسرے شخص نے کیا ہے۔ اب گواہوں کے بیان کی روشنی میں جائزہ لیں تو وہ شخص برونی ہو سکتا ہے۔ یہاں سادہ سا سوال یہ ہے کہ برونی اپنی ہمدرد بہن کو کیوں قتل کرے گا؟ اس کے قتل کے پیچھے کیا جواز ہو سکتا ہے؟'' جارج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو کچھ سمجھ سکا تھا، اس سے ایوان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، پر ایک بات بھول رہے ہو۔'' ایوان نے جارج کو مخاطب کر کے کہا۔

''وہ کیا؟''

''وہ ہے نامعلوم تیسرا شخص... جو نہ تو پولیس کی تفتیش میں ہے اور نہ ہی مقدمے میں کہیں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ ماسوائے مسٹر اینڈ مسز اسمتھ کے اس بیان کے... جس میں انہوں نے گاڑی میں موجود تیسرے شخص کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ ہے جو قتل کے بعد منظر نامے سے فرار ہو گیا تھا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' جارج نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''پیک کی بے گناہی کا دارومدار اس تیسرے شخص کی گرفتاری پر ہے۔ ہو نہ ہو، یہ تیسرا شخص قتل کے محرک اور پیک کے قید خانے کے تالے کی چابی ہے۔ جب تک یہ چابی نہیں ملتی، جیل میں پیک کے کمرے کا تالا نہیں کھل سکتا۔''

''مجھے اس چابی کی تلاش ہے۔'' ایوان نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ تم یہ پتا کرو کہ وہ تیسرا شخص کون ہے۔''

''یہ پتا چلایا جا سکتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ تین ماہ ہو چکے ہیں۔ میک بین ہر پیشی پر عذر تراش کر، سماعت کو ملتوی کرواتا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلی پیشی پر کیس کے نئے زاویے پیش کر کے جج کو قائل کر لوں کہ وہ میک کو مزید مہلت نہ دے۔'' جارج، ایوان کی بات سن رہا تھا۔

''میک بین، برونی کا وکیل ہے؟'' جارج نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ عدالت نے سرکاری خرچ پر میک کو برونی کا وکیل صفائی مقرر کیا ہے۔'' ایوان نے تفصیل سے بتایا۔ ''مگر جب سے پولیس نے مقدمہ عدالت میں پیش کیا ہے، وہ سماعت میں تاخیر کے لیے ہر مرتبہ نئے حربے استعمال کر رہا ہے۔'' ایوان نے یہ بات ایسے کہی جیسے وہ میک کے آگے خود کو بے بس محسوس کر رہا ہو۔

''تم مجھے برونی کی کوئی تصویر دے سکتے ہو؟''

''ہاں ہاں... کیوں نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ایوان نے فائل میں لگی برونی کی تصویر نکال کر جارج کو دے دی۔ جارج غور سے برونی کی تصویر دیکھنے لگا۔

''تم مجھے اس کیس کی تمام تر دستاویز کی فوٹو کاپی کروا کر فائل دے دو۔ میں آرام سے اسے پڑھ کر کیس پر غور کرنا چاہتا ہوں۔''

تھوڑی ہی دیر میں ایوان نے ساری دستاویز.... کی فوٹو کاپی کر کے انہیں ایک فائل کور میں لگایا اور اسے جارج کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ لو اور پڑھ لو۔ مگر یاد رہے کہ آج سے ٹھیک پندرہویں دن مقدمے کی سماعت ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تب تک نہ صرف اس تیسرے شخص کا پتا چلا لیا جائے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا جائے کہ اس ٹوٹی ہوئی نمبر پلیٹ والی گاڑی کا مالک کون ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نمبر پلیٹ کا یہ ٹکڑا اس تیسرے شخص تک پہنچنے میں ہماری مدد کرے گا۔'' ایوان نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اسی ٹکڑے سے تلاش شروع کروں گا مگر کیس کی پوری تفصیلات پڑھنے کے بعد... تاکہ کوئی بھی بات نظر انداز نہ ہونے پائے۔'' جارج نے ایوان

http://digestpk.blogspot.com/

کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''بس جارج...! تم یہ کام کردو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پیشی پر جج کے سامنے یہ نیا زاویہ پیش کروں تاکہ عدالت خود میک کے رویّے کا نوٹس لے۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ میری فیس کون دے گا؟'' جارج نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں منہ مانگی فیس ملے گی۔'' ایوان نے کہا۔ ''یہ فیس میں نہیں، پیک کی کمپنی ادا کرے گی۔ اس کمپنی کے مالک مسٹر جیمس کا کہنا ہے کہ پیک ان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے اور باعزت بری کروانے کے لیے ہر قسم کے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم اگلے ہفتے ملتے ہیں۔ امید ہے کہ تیسرے شخص کا پتا چل جائے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے رابطے کی ضرورت پیش آئے گی۔'' جارج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''شاید سوزا کے بینک اکاؤنٹ، کریڈٹ کارڈ وغیرہ کی تفصیلات جاننے کی ضرورت پڑے۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہیں جب ضرورت محسوس ہو، مجھے فون کرلینا۔''

''تو پھر میں چلتا ہوں۔'' جارج نے میز پر سے فائل اٹھائی اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

تقریباً چوتھے روز ایوان کو جارج کا فون موصول ہوا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''مجھے سوزا کے بینک اکاؤنٹ اور کریڈٹ کارڈ کی تفصیل چاہیے... کل شام تک۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہیں مل جائے گی۔ یہ بتاؤ تم کہاں تک پہنچے؟''

''سمجھو بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔ جس دن مقدمے کی سماعت ہوگی، وہ تیسرا شخص جج کے سامنے ہوگا۔''

''واہ... مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب مکھن لگانا بند کرو اور جو چیزیں مانگی ہیں ان کا بندوبست کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔

ایوان نے فوراً مسٹر جیمس کا نمبر ملایا اور ان سے سوزا کے بینک اکاؤنٹ اور کریڈٹ کارڈ کی تفصیل فراہم کرنے کو کہا۔ مسٹر جیمس کی کمپنی ان چند بڑی کمپنیوں میں سے ایک تھی جس کے بینک اکاؤنٹ حاصل کرنا ہر بینکار کی خواہش ہوتی ہے۔ سوزا کا اکاؤنٹ بھی اسی بینک میں تھا جس میں اس کی کمپنی کا اکاؤنٹ تھا۔ وہ کریڈٹ کارڈ بھی اسی بینک کا استعمال کیا کرتی تھی۔

اکاؤنٹ اور کریڈٹ کارڈ کی تفصیلات شام تک ایوان کو موصول ہوگئیں جسے اس نے فوراً جارج کے گھر کے باہر لگے لیٹر بکس میں ڈال کر اسے فون پر مطلع کردیا۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا لیکن پھر ایوان کو کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ جارج کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ اس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جارج تجربے کار آدمی ہے۔ وہ جب بھی آئے گا، کیس کو حل کرکے ہی اس کے پاس آئے گا۔

مقدمے کی سماعت میں ابھی دو دن باقی تھے جب ایوان کو جارج کا فون موصول ہوا۔

''کام ہوگیا ہے۔ میں آج شام تمہارے دفتر پہنچ رہا ہوں... پر ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ تم مجھے شان دار ڈنر کرواؤ گے۔''

''منظور ہے۔'' ایوان نے کہا۔

''تو پھر شام چھ بجے کا انتظار کرنا شروع کردو۔''

شام کے چھ بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے جب جارج ایوان کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی بغل میں خاکی رنگ کا ایک پھولا ہوا لفافہ دبا ہوا تھا۔

''یہ لو جی... تمہاری مشکل ہوئی آسان!'' یہ کہتے ہوئے جارج نے لفافہ ایوان کے سامنے پٹخ دیا۔

ایوان نے بے چینی سے لفافہ دیکھا اور اس میں موجود کاغذات کو ایک کے بعد ایک کرکے پڑھنا شروع کردیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک رنگ جارہا تھا۔

''تو یہ ہے حقیقت۔'' کافی دیر بعد سارے کاغذات واپس لفافے میں رکھتے ہوئے ایوان نے گہری سانس لے کر کہا۔

''جی ہاں۔ امید ہے کہ مقدمے کی سماعت میں اب تاخیر نہیں ہوگی۔''

''چلو، اب اس کنٹریکٹ پر دستخط کردو تاکہ تمہیں فیس بھی مل جائے۔'' یہ کہتے ہوئے ایوان نے تحریر شدہ ایک کاغذ میز کی دراز سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اتنی دیر میں لورنا ان کے لیے کافی بنا کرلے آئی۔ کافی پیتے ہوئے بھی ان کی گفتگو کا محور کیس کا یہ نیا موڑ تھا۔

☆☆☆

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد اس نے جارج کو خدا حافظ کہا اور سیدھا پولیس اسٹیشن چلا آیا۔ وہ سوزا قتل کیس کی تفتیش کرنے والے پولیس افسر راجر سے ملنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ وہیں موجود تھا۔

''مجھے اس تمام جیولری کی تفصیلات درکار ہیں جو سوزا کے گھر سے ملی تھیں۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد وہ مطلب کی بات پر آگیا۔

''مل جائیں گی۔'' راجر نے خوش دلی سے کہا اور اٹھ کر فائل ریک کی طرف بڑھ گیا۔ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ اس کی ورق گردانی کررہا تھا۔

''یہ لو، پڑھ لو۔'' راجر نے کھلی ہوئی فائل کے ایک کاغذ پر انگلی رکھتے ہوئے اسے ایوان کے سامنے رکھا۔

''کیا اس کی تصدیق شدہ نقل مل سکتی ہے؟'' ایوان نے فائل راجر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں۔ تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔''

تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب ایوان دفتر لوٹ رہا تھا تو خاصا خوش تھا۔ وہ گنگناتا ہوا دفتر میں داخل ہوا تو لورنا اس کی منتظر تھی۔

''معاف کرنا۔ آج تمہیں میری وجہ سے کچھ دیر ہوگئی۔ چلو دفتر بند کرلو۔''

یہ سنتے ہی لورنا کمرے کی لائٹس آف کرنے لگی۔

''ارے! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ایک منٹ رکو۔ میں ذرا ضروری کاغذات تو اٹھا لوں۔'' وہ لورنا کے مستعدی سے حکم بجالانے پر مسکرادیا۔

چند منٹ بعد ایوان گھر کی طرف جارہا تھا۔

رات کے ڈھائی بجے کا وقت ہوگا جب ایوان نے کمپیوٹر بند کیا۔ وہ اس پیشی پر جج کے سامنے پیش کیے جانے والے ان ثبوتوں کی بنیاد پر ایک دستاویز تیار کرچکا تھا جو پیک کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے نہ صرف کافی تھی بلکہ اس سے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والا تیسرا شخص بھی قانون کے شکنجے میں جکڑ جاتا۔

اگلا سارا دن اس نے دفتر میں گزارا۔ وہ دن بھر کیس کی تیاری کرتا رہا۔ شام کو جب وہ کچھ ہی دیر میں دفتر سے جانے والا تھا تو مسٹر جیمس بن بلائے تشریف لے آئے۔

''بھئی کیا ہورہا ہے؟ تین ماہ ہوگئے... میں سخت مشکل میں ہوں۔ پیک کے نہ ہونے سے کمپنی کو شدید مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد جیمس نے ایوان سے کہا۔

''جہاں تین مہینے گزرے، وہیں کل کا دن بھی گزرنے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کے اور پیک کے مصیبت بھرے دن ختم ہونے والے ہیں۔'' ایوان نے نہایت اعتماد سے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟'' یہ سن کر جیمس چونک پڑا اور حیرت سے پوچھا۔

''سو فیصد سچ۔ کل کی تاریخ پر کیس نیا موڑ لے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کل ہی جج اور جیوری ارکان مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی پیک کو نہ صرف باعزت طور پر بری کردیں گے بلکہ اسے بیجا قید میں رکھنے کے ذمے دار کو ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔''

''ایسا ہوا تو میں تمہارے اعزاز میں شان دار پارٹی دوں گا۔'' جیمس نے خوش دلی سے کہا۔ ''بھئی کیا کروں۔ پیک ہے ہی اتنا قابل مالیاتی مشیر کہ اس کے بغیر مجھے کمپنی کے مالی معاملات سنبھالنے میں سخت مشکلات پیش آرہی ہیں۔''

''تو سمجھیں آج آپ کی مشکلات کا آخری دن ہے۔'' ایوان نے اس کی ہمت بندھائی۔

☆☆☆

ایک بار پھر میک بین اور ایوان گورڈن سان فرانسسکو کنٹری جیل میں اٹارنی کے ملاقاتی دفتر میں بیٹھے ہوئے سوزا قتل کیس کی سماعت شروع ہونے کا انتظار کررہے تھے۔

''اور سناؤ... اس بار تو تم نے مکمل تیاری کرلی ہوگی؟'' ایوان نے مسکراتے ہوئے میک بین سے کہا۔

''ہاں، کسی حد تک۔ شاید تمہیں علم نہیں۔ میں پچھلے ہفتے کافی بیمار رہا ہوں۔ اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مکمل تیاری کرلی ہے۔'' میک بین نے بیزاری سے جواب دیا۔

''ہونہہ... تو اس بار موصوف یہ بہانہ لے کر آئے ہیں۔'' ایوان دل ہی دل میں ہنسا اور سنجیدگی سے کہا۔ ''بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔ ویسے اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''کافی بہتر محسوس کررہا ہوں لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ مجھے کم سے کم دو ہفتے کے لیے آرام کرنا چاہیے۔'' میک نے منہ بنا کر کہا۔ ''اب تم ہی بتاؤ، ان عدالتی معاملات کے دوران آرام کیسے کیا جاسکتا ہے؟''

ایوان اس کی نئی چال کو سمجھ چکا تھا۔ اب تک وہ نہایت شائستگی سے کام لیتا رہا تھا لیکن اس بار وہ مقدمے میں میک کے تمام تاخیری حربوں کو ناکام بنانے کے لیے مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں تفتیشی پولیس افسر راجر بھی تمام تر ثبوتوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ ان تینوں کو انتظار تھا کہ کب انہیں مقدمے کی پیروی کے لیے اندر جانے کی اجازت ملتی ہے۔

مقدمے کی سماعت اٹارنی کے دفتر میں کی جارہی تھی۔ اس کمرے کو ہمیشہ جیل کے اندر مقدمات کی سماعت کے لیے

http://digestpk.blogspot.com/

بطور کمرائے عدالت استعمال کیا جاتا تھا۔ جج کی آمد سے قبل میک بین، ایوان گورڈن اور راجر کو اندر بلا لیا گیا۔

جج اور جیوری کے ارکان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو جج نے سماعت شروع کرنے کا اعلان کیا۔ یہ سنتے ہی میک بین اپنی نشست سے اٹھنے لگا۔ وہ اس طرح اپنی کرسی پر سے اٹھ رہا تھا کہ جسے دیکھ کر دوسروں کو یہ لگے کہ وہ جسمانی طور پر خاصا کمزور اور بیمار ہے۔ اسی اثنا میں ایوان تیزی سے کھڑا ہوا اور جج کو مخاطب کر کے کہا۔

''جنابِ عالی... گزشتہ تین ماہ سے یہ مقدمہ تاخیر کا شکار ہے۔ اب تک ملزمان پر نہ تو فردِ جرم عائد کی جا سکی ہے اور نہ ہی مقدمہ آگے بڑھا ہے۔ پولیس تفتیش کی اب تک کی رپورٹ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس میں بھی کئی سقم محسوس ہوتے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد کیس کی از سرِ نو تفتیش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنے مؤکل مسٹر پیک ٹرنر کا وکیلِ صفائی ہوں اور اس صورتِ حال کے باعث میرے بے گناہ مؤکل کو جس ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس بارے میں عدالت کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ فاضل عدالت اس بات کو محسوس کر سکتی ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' جج نے ایوان کو مخاطب کر کے کہا۔ اس وقت میک کی حالت دیکھنے والی تھی۔

''میں عدالت کے سامنے کچھ ایسے شواہد پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں دیکھنے کے بعد، مجھے یقین ہے کہ مقدمہ چلے یا نہ چلے مگر میرے مؤکل کو بے گناہ قرار دے کر فوراً بری کر دیا جائے گا۔''

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں تو ہم کسی بھی بے گناہ کو ایک لمحے کے لیے بھی جیل میں رکھنے کے حق میں نہیں۔ آپ ثبوت پیش کیجیے۔'' جج نے ایوان کو اجازت دی۔

''لیکن جنابِ عالی... میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' میک نے جلدی سے جج کو مخاطب کیا۔

''آپ کو جو کہنا ہے، وہ بعد میں کہیے گا۔ فی الحال ایوان گورڈن اپنے ثبوت عدالت کے سامنے پیش کریں گے۔ اس کے بعد آپ کو بولنے کا موقع دیا جائے گا۔'' جج نے میک بین کو روکتے ہوئے کہا۔

''مسٹر ایوان! آپ ثبوت پیش کیجیے۔''

جج کا حکم سنتے ہی ایک پیش کار اس کی طرف بڑھا۔ میک ایک بڑے سے لفافے کو کھول کر اس میں سے کاغذات کا پلندا باہر نکال رہا تھا۔

''جج صاحب کے ملاحظے کے لیے اصل ثبوت ہیں جبکہ تینوں ارکانِ جیوری اور میک بین کے لیے دستاویز... کی نقول موجود ہیں۔'' ایوان نے دستاویز... کا پلندا پیش کار کو تھماتے ہوئے کہا۔

جج اور جیوری ارکان نے دستاویز... کے صفحے الٹنا شروع کر دیے۔ پیش کار جب میک بین کے پاس پہنچا تو اس نے جلدی سے دستاویز جھپٹ لی اور بے صبرے پن سے صفحات الٹنے لگا۔ اس وقت اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔

''جیل اٹارنی کو حکم دیا جاتا ہے کہ پولیس کی اضافی نفری کو فوراً اندر طلب کیا جائے اور کمرائے عدالت کو باہر سے لاک کر دیا جائے۔ کوئی شخص نہ تو اندر سے باہر جائے گا اور نہ ہی طلب کی گئی پولیس نفری کے سوا کوئی اندر داخل ہو سکے۔''

جج کے حکم پر پولیس کی اضافی نفری کچھ ہی دیر میں کمرے کے اندر پہنچ گئی جس کے بعد کمرے کو باہر سے لاک کر دیا گیا۔ اس پوری کارروائی میں بمشکل پانچ منٹ صرف ہوئے ہوں گے۔

''عدالت اور جیوری ارکان برابر کے کمرے میں مشاورت کے لیے جا رہے ہیں اور تا حکمِ ثانی اس کمرے سے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے جج اور جیوری ارکان برابر کے کمرے میں چلے گئے۔

اس وقت سخت پہرے میں پیک اور برونی بھی کمرے میں موجود تھے۔ دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑی لگائی گئی تھی جبکہ ان کے پاؤں میں ہتھکڑی لگا کر کرسی کے ساتھ لاک کر دیا گیا تھا۔ ان کے پیچھے مسلح پولیس اہلکار چوکس کھڑے ہوئے تھے۔

صورتِ حال غیر معمولی تھی۔ جج، جیوری ارکان، میک بین اور ایوان کے علاوہ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ ان دستاویز... میں ایسے کون سے غیر معمولی ثبوت تھے جن کی وجہ سے جج نے یہ غیر معمولی احکامات صادر کیے تھے۔ پیک کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ برونی بھی جج کا حکم سننے کے بعد پریشان دکھائی دے رہا تھا اور میک بین اپنی کرسی پر یوں ڈھیر ہو چکا تھا جیسے وہ مر چکا ہو۔ پورے کمرے میں ایوان گورڈن واحد شخص تھا جس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

تقریباً پون گھنٹے کے بعد جج اور جیوری کے ارکان واپس کمرائے عدالت میں پہنچے۔ جج نے دوبارہ کارروائی شروع

کرنے کا اعلان کیا۔

''مسٹر میک بین! عدالت جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے مسٹر ایوان گورڈن کی جانب سے پیش کی گئی دستاویز کا مطالعہ کر لیا اور یہ کہ اس بارے میں آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں۔ میں نے دستاویز پڑھ لی ہے اور اس موقع پر میں اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ مجھے جواب کے لیے مہلت درکار ہے۔''

''آپ کو پورا وقت دیا جائے گا لیکن وکیلِ صفائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ بطورِ ملزم۔''

''کیا...'' یہ سنتے ہی میک بین کے منہ سے چیخ نکلی۔

''مسٹر میک بین پر سوزا قتل کیس میں ملوث ہونے کا الزام ہے۔ اس حوالے سے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان پر مجرمانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام ہے۔ اس لیے پولیس کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ انہیں گرفتار کر لے۔''

جج کا حکم سنتے ہی دو پولیس والے آگے بڑھے اور انہوں نے میک بین کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

''سوزا قتل کیس کی تفتیش کرنے والے پولیس افسر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ میک بین کو ملزمان کی فہرست میں شامل کرے۔ نیز ان پر جو دیگر الزامات لگائے گئے ہیں، اس حوالے سے ایک نیا مقدمہ درج کر کے تفتیش کی جائے اور تفتیش کے بعد مقدمہ عدالت میں پیش کیا جائے۔ عدالت مسٹر ایوان گورڈن سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس حوالے سے تفتیش میں پولیس کی معاونت کریں۔ پولیس کی معاونت کے لیے ان کی خدمات کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔''

پولیس افسر راجر کا خیال تھا کہ پچھلی کئی بار کی پیشیوں کی طرح اس بار بھی نئی تاریخ ملے گی مگر آج تو مقدمے کا رخ ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ اس حیرت انگیز عدالتی احکامات پر کمرائے عدالت میں موجود ہر شخص حیرت کا شکار تھا۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جو بالکل مطمئن دکھائی دے رہا تھا... اور وہ تھا ایوان گورڈن...!

پیک کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ اس شریف آدمی نے زندگی بھر کبھی جیل اور کچہری کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ حیرت کے مارے اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

عدالت میں لوگوں کی چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ جج نے میز پر ہتھوڑا مارا۔

''آرڈر۔ آرڈر!''

اس کے ساتھ ہی کمرائے عدالت میں خاموشی چھا گئی۔

''اگرچہ پولیس نے مسٹر پیک ٹرنر کو جائے وقوع سے خون آلود لباس کے ساتھ گرفتار کیا تھا اور ان کی کار سے ہی قتل میں استعمال ہونے والی شاٹ گن برآمد کی گئی تھی، تاہم آلۂ قتل کی برآمدگی اس بات کو ثابت نہیں کرتی کہ اسے چلایا بھی پیک ٹرنر نے تھا۔ نیز عدالت نے اب تک ان پر فردِ جرم بھی عائد نہیں کی۔ یوں وہ اب تک صرف مشتبہ کی حیثیت سے قید میں تھے۔ تاہم ان کے وکیلِ صفائی کی جانب سے پیش کردہ ثبوتوں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پیک ٹرنر اس قتل میں ملوث نہیں۔ اس لیے عدالت انہیں اس مقدمے میں بطور مشتبہ شخص رہا کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو پولیس پر ہرجانے کا دعویٰ دائر کر سکتے ہیں۔ جیل اٹارنی کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کی رہائی فوری عمل میں لائی جائے۔''

جج کا حکم سنتے ہی جیل اٹارنی نے پولیس والوں کو پیک کی ہتھکڑیاں کھولنے کا حکم دیا۔ جس وقت اس کی ہتھکڑیاں کھولی جا رہی تھیں، وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ایوان اس کا سر سہلاتے ہوئے اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

دوپہر کا ایک بجا ہو گا جب ایوان گورڈن، پیک ٹرنر کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں۔'' راستے میں پیک نے ایوان کو مخاطب کر کے کہا۔

''ابھی یقین آ جائے گا۔ یہ لو میرا موبائل فون اور مسٹر جیمس سے بات کرو۔'' ایوان نے ڈیش بورڈ پر سے اپنا موبائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''میں رہا ہو گیا ہوں اور ایوان کے ساتھ اپنے گھر جا رہا ہوں۔'' پیک نے فون اٹینڈ ہوتے ہی کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون ایوان کی طرف بڑھا دیا۔ ''مسٹر جیمس آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیوں... ٹھیک کہا تھا نا کہ آج آپ کی مصیبت کا آخری دن ہے؟ بس آپ پارٹی کا انتظام کریں۔'' ایوان نے چھوٹتے ہی فاتحانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اگلے چند روز ایوان کے لیے بہت مصروفیت کے تھے۔ جیمس کئی بار فون کر کے اس سے پارٹی کے لیے ٹائم لینے کی درخواست کر چکا تھا لیکن ہر بار وہ اپنی مصروفیات کے سبب اسے انکار کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ پولیس نے میک بین کے خلاف مجرموں کی غیر قانونی مدد، چوری کا مال فروخت کرنے، قتل جیسے سنگین جرم کی پردہ پوشی اور اپنے سرکاری عہدے کے غلط استعمال کے الزامات میں مقدمہ درج کر کے،

http://digestpk.blogspot.com/

تفتیش میں مدد کے لیے عدالتی احکامات کے تحت ایوان کی معاونت حاصل کرلی تھی۔ ساتھ ہی سوزا قتل کیس کی بھی ازسرِ نو تفتیش جاری تھی۔ ایسے میں ایوان کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ سو وہ پارٹی کے لیے وقت کہاں سے نکال سکتا تھا؟

تفتیش کے لیے میک بین اور برونی کو جیل سے پولیس اسٹیشن منتقل کردیا گیا تھا جہاں پر برونی نے اعتراف کیا کہ سوزا کو اس نے ہی قتل کیا تھا۔ قتل کا سبب ہیرے کا وہ نیکلس تھا جسے چند روز پہلے ہی سوزا نے چیک کے ذریعے ادائیگی کر کے شہر کی معروف جیولری شاپ سے خریدا تھا۔ برونی کا کہنا تھا کہ اس ہیرے کے نیکلس کی چوری پر اسے میک بین نے اکسایا تھا۔ اگرچہ وہ سوزا کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جب وہ اس کے گھر میں داخل ہوا تو وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہورہی تھی۔ اسی دوران برونی نے وہ نیکلس اڑالیا لیکن ایسا کرتے ہوئے سوزا نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے برونی کو بُرا بھلا کہا تو وہ برداشت نہیں کرسکا اور اس پر گولی چلادی۔ اس وقت میک بین باہر گاڑی میں بیٹھا ہوا برونی کا منتظر تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے چوری کیے ہوئے مال کو ففٹی ففٹی کمیشن کی بنیاد پر فروخت کرتا تھا۔ آج وہ برونی کے ساتھ اس لیے آیا تھا کہ وہ نیکلس چوری کر کے اس کے حوالے کردے تاکہ وہ اسے فروخت کرسکے۔ جب وہ سوزا کو گولیاں مار کر باہر نکلا تو اسے پیک نظر آیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی پیک اندر چلا گیا تھا۔ برونی کے مطابق جب اس نے گاڑی میں بیٹھے میک بین کو یہ حالات بتائے تو اس نے مشورہ دیا کہ نیکلس میرے حوالے کرو اور یہ شاٹ گن اس کی گاڑی میں ڈال کر پولیس کو فون کر کے بتاؤ کہ کسی شخص نے تمہاری بہن کا خون کردیا ہے۔ سو برونی نے ایسا ہی کیا۔

سوزا قتل کیس کی تمام تر تفصیلات مقامی اخبارات میں شائع ہورہی تھیں۔ اخبارات کے ذریعے ہی پیک کو برونی کے اعترافِ جرم اور میک بین کے مکروہ کردار کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی تھی لیکن وہ ابھی تک یہ معما حل نہیں کرسکا تھا کہ آخرکار ایوان سچائی تک کیسے پہنچا؟ اور اس دن عدالت کے سامنے اس نے جو ثبوت پیش کیے، وہ کیا تھے؟ نیز اس دستاویز میں کیا لکھا ہوا تھا جس کے سبب عدالتی کارروائی نے غیر معمولی رُخ اختیار کرلیا تھا؟

☆☆☆

آخرکار پولیس نے سوزا قتل کیس اور میک بین کے حوالے سے تفتیش مکمل کرلی۔ یوں کہیں دو ہفتوں کے بعد ایوان گورڈن کی جان اس مقدمے سے چھوٹی۔

سہ پہر کا وقت ہوگا جب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ ایوان اس وقت قانون کی ایک کتاب کا مطالعہ کررہا تھا۔

”ہیلو... ایوان بول رہا ہوں۔“

”گڈ آفٹر نون۔ میں جیمس بات کررہا ہوں۔“

”اوہ... کیسے مزاج ہیں آپ کے۔“ ایوان خوش دلی سے بولا۔

”امید ہے کہ اب آپ کو فرصت مل گئی ہوگی؟ آج کے اخبار میں رپورٹ تھی کہ سوزا قتل کیس اور میک بین کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوگیا ہے۔“

”بہت خبر رکھتے ہیں آپ ہم سب کی۔“ ایوان نے جیمس کی بات سن کر ہنستے ہوئے کہا۔

”تو کہیے... کب رکھیں پارٹی؟“

”اس سنیچر کی رات کو۔“ ایوان نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بِنا کہا۔

”یہ ٹھیک ہے... تو پھر ملتے ہیں پارٹی میں لیکن اس سے پہلے میں آؤں گا آپ کے پاس دعوت نامہ لے کر۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ ایوان نے خوش مزاجی سے کہا۔ پیک کے سلسلے میں جس طرح جیمس پریشان تھا، اس سے ایوان کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کامیاب بزنس مین کے علاوہ ہمدرد انسان بھی ہے۔ ایوان اس کی اس خوبی کی دل سے قدر کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

جیمس نے یہ پارٹی شہر کے ایک مہنگے ہوٹل میں منعقد کی تھی۔ پارٹی میں شہر بھر کے بزنس مین جمع تھے۔ پارٹی میں جیمس کی کمپنی میں کام کرنے والے تقریباً سب ہی لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر شرکا کو مخاطب کر کے جیمس نے سوزا کی یاد میں مختصر تقریر کی اور اس کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ پارٹی کے اختتام سے کچھ دیر پہلے جیمس نے تمام شرکا کو متوجہ کیا۔

”یہ پارٹی آج جس شخص کے اعزاز میں دی گئی ہے، ان کا نام ہے ایوان گورڈن اور ان سے مسٹر پیک ٹرنر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“

جیمس کی بات ختم ہوتے ہی پیک ٹرنر کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ ”میں آج آپ کے درمیان موجود ہوں تو اس کا سبب ہیں ایوان۔ میں آج تک حیران ہوں کہ اس دن انہوں نے عدالت میں جج کے سامنے ایسے کون سے ثبوت پیش کیے تھے کہ آناً فاناً مقدمے کا رُخ ہی بدل گیا۔ میں آج ان سے درخواست کرتا ہوں کہ کیس کے اس رُخ سے پردہ اٹھائیں جس کے پیچھے موجود حقائق اب تک سامنے نہیں آسکے۔“

پیک ٹرنر کے خاموش ہونے پر ایوان آگے بڑھا۔

”خواتین و حضرات... میں نے جو کچھ کیا، وہ میرے فرائض کا حصہ تھا لیکن پیک ٹرنر مجھ سے کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں کہ وہ کیا حقائق تھے جن کی بنیاد پر مقدمے نے ڈرامائی موڑ لیا۔ چونکہ اب یہ معاملہ سلجھ چکا ہے تو اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میں آج وہ تمام تر حقائق بیان کردوں جن کی بنیاد پر نہ صرف مسٹر پیک رہا ہوئے، اصل مجرم گرفتار ہوا بلکہ وہ تیسرا شخص بھی اپنے انجام کو پہنچا جو واردات کے وقوع پذیر ہونے کا محرک تھا۔“ ایوان نے بات شروع کی تو سب دم سادھ کر کھڑے ہوگئے۔

”ہوا یوں کہ شروع شروع میں تو مجھے سو فیصد یقین نہیں تھا کہ پیک بے گناہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مؤکل اپنے وکیل کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے لیکن جب میک بین نے تین ماہ تک مقدمے کی سماعت میں جان بوجھ کر روڑے اٹکائے، تب مجھے شک ہوا کہ بات کچھ اور بھی ہے۔ بس اس شک کی بنیاد پر جب تفتیش کی تو اصل حقیقت سامنے آگئی۔“

”ہم وہی حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔“ جیمس نے لقمہ دیا۔

”میں نے وعدہ کیا ہے تو بتاؤں گا ضرور۔“ ایوان، جیمس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”تو ہوا یہ کہ جب مجھے میک بین کے تاخیری حربوں پر شک ہوا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے، تب میں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی مدد حاصل کی جس کی تفتیش سے علم ہوا کہ میک بین کے نہ صرف جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں بلکہ وہ ان کی قانونی اور غیر قانونی، دونوں طریقوں سے مدد بھی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مقتولہ سوزا کا بھائی برونی بھی میک بین کا قریبی دوست تھا۔ جس رات سوزا کا قتل ہوا، اس شام غروبِ آفتاب کے وقت ان دونوں کو ایک پرانی فورڈ ویگن میں اکٹھا جاتے ہوئے بھی دیکھا گیا تھا۔“

پارٹی میں شریک افراد اس طرح غور سے ایوان کی باتیں سن رہے تھے جیسے وہ کوئی دلچسپ قصہ بیان کررہا ہو۔

”مسٹر اینڈ مسز اسمتھ نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ انہوں نے فائرنگ کے بعد دیکھا تھا کہ ایک آدمی پرانی ویگن کے ڈرائیونگ سیٹ والے حصے کی کھڑکی میں منہ ڈالے کسی سے بات کررہا تھا۔ اس کے بعد وہ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور جب ریورس ہوئی تو وہ کسی پتھر سے ٹکرائی۔ یہ بیان اس لیے بالکل درست تھا کہ نمبر پلیٹ کا جو ٹکڑا سوزا کے گھر کے باہر سے ملا تھا، اس کے برابر ایک بڑا سا پہاڑی پتھر موجود تھا۔ مسٹر اینڈ مسز اسمتھ نے ریورس کے دوران گاڑی ٹکرانے کی بات کی تھی۔ تو یہ وہی پتھر تھا جس سے گاڑی ٹکرائی تھی۔ اب ہوا یہ کہ نمبر پلیٹ کا جو حصہ ملا، وہ زنگ آلود لوہے کا ٹکڑا تھا۔ جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ گاڑی بھی بہت پرانی ہوگی۔ اس ٹکڑے پر صرف آخر کے دو نمبر تھے۔ جب موٹر رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ سے رابطہ کیا گیا تو کئی روز کی تحقیق کے بعد پتا چلا کہ پورے سان فرانسسکو میں ایسی صرف چار گاڑیاں ہیں جن کے آخر کے دو نمبر اس ٹکڑے پر لکھے نمبروں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ یہ نمبر تیس برس پہلے الاٹ ہوئے تھے۔ اس وقت الاٹ کیے گئے نمبروں میں سے زیادہ تر گاڑیاں کباڑ کا حصہ بن گئی ہیں۔ اس لیے جب مزید تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے دو گاڑیاں اسکول وین کے طور پر کام کررہی ہیں۔ ایک خیراتی ادارے کی ایمبولینس میں تبدیل کی جاچکی ہے۔ صرف ایک گاڑی ایسی ہے جو نجی ملکیت میں ہے۔ حیرت انگیز طور پر ریکارڈ میں اس گاڑی کے مالک کا نام میک بین تھا۔ مزید تفتیش پر پتا چلا کہ یہ میک بین وہی ہیں جو برونی کے وکیلِ صفائی ہیں۔ سراغ رساں نے جب ان کے گیراج میں کھڑی ویگن کا جائزہ لیا تو اس کے عقب پر بڑا سا ڈینٹ پڑا ہوا تھا اور نمبر پلیٹ بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ سراغ رساں نے اس حصے کے فوٹو بنالیے۔ اب ایک بات باقی تھی کہ برونی کو اس نے واردات پر کس طرح آمادہ کیا؟“ یہ کہہ کر ایوان کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا اور پانی پی کر گویا ہوا۔

”برونی اکثر پولیس کے ہاتھوں پکڑا جاتا تھا اور سرکاری وکیلِ صفائی کے طور پر میک بین اس کا وکیل بنتا تھا۔ اسی وجہ سے دونوں میں آشنائی ہوئی۔ ویسے بھی میک بین کے لیے ایسے مجرم دولت کمانے کا ذریعہ بھی تھے۔ وہ سرکار سے تو پیسا لیتا ہی تھا لیکن ان مجرموں سے بھی رقم اینٹھتا تھا کہ وہ ان کی پیروی ایسے کرے گا کہ کیس کمزور ہوجائے۔ یہ واردات سے دس بارہ روز پہلے کی بات ہے کہ سوزا کو لاٹری میں دو لاکھ ڈالرز کا انعام ملا تھا۔ سوزا کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ اس کی ہمیشہ سے آرزو تھی کہ وہ ہیرے کا نیکلس خریدے۔ چنانچہ اس نے کسی شخص کو نہیں بتایا کہ اسے لاٹری میں اتنا بڑا انعام ملا ہے۔ جس دن لاٹری کمپنی کی طرف سے اس کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل ہوئی، اسی دن اس نے شہر کی سب سے بڑی جواہرات کی دکان سے ایک لاکھ ڈالرز کا ہیروں کا نیکلس خریدا۔ اس نے چیک کے ذریعے رقم ادا کی۔ جس

http://digestpk.blogspot.com/

وقت وہ چیک دے رہی تھی، عین اس وقت میک بین بھی کاؤنٹر پر موجود تھا۔ وہ ہیرے کی ایک انگوٹھی فروخت کرنے کے لیے آیا تھا۔ اگرچہ سوزا اسے نہیں پہچانتی تھی تاہم میک جانتا تھا کہ وہ اس کے دوست برونی کی بہن ہے۔ اس بات کو چار پانچ دن گزرے ہوں گے کہ میک کی ملاقات ایک بدنام بار میں برونی سے ہوئی۔ برونی اس وقت نہایت تنگ دست تھا۔ اس نے میک سے بھی اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا جس پر میک نے اس کو بتایا کہ اس کی بہن نے ایک لاکھ ڈالرز مالیت کا ہیروں کا نیکلس خریدا ہے۔ اگر وہ اسے چوری کرلے تو فروخت کی ذمے داری میری۔ بس تھوڑا سا کمیشن دینا ہوگا۔ برونی یہ سن کر رضامند ہوگیا۔ سوزا اکثر رات گئے گھر لوٹتی تھی۔ برونی کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ چنانچہ قتل والی شام جب وہ میک کی ویگن میں بیٹھ کر اپنی ہی بہن کے گھر چوری کرنے کے لیے پہنچا تو خلافِ معمول سوزا اس وقت گھر پر تھی اور کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس کا جیولری بکس کھلا ہوا تھا اور میز پر ہیروں کا قیمتی نیکلس جگمگا رہا تھا۔ برونی کئی بار ہیروں کے زیورات چرا چکا تھا۔ اسے اصلی ہیرے کی پہچان تھی۔ چنانچہ اس نے سوزا کو باتوں میں لگا کر نیکلس اڑا لیا لیکن عین اس وقت سوزا نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے لعن طعن کی تو وہ سخت اشتعال میں آگیا اور شاٹ گن سے دو فائر کر کے اسے ہلاک کردیا۔ شاٹ گن برونی کی پہچان بن چکی تھی۔ سوزا بھی یہ بات جانتی تھی۔ اکثر سوزا کے ہاں بھی وہ شاٹ گن لے کر آتا تھا۔ اس دن بھی اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی لیکن سوزا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ برونی اس کی لعن طعن سن کر اتنا دلبرداشتہ ہو جائے گا کہ اس پر گولی چلا بیٹھے گا۔ باقی تو آپ اخبارات میں پڑھ ہی چکے ہیں کہ کس طرح میک بین نے پیک کو پھنسانے کے لیے برونی کو پٹی پڑھائی تھی۔ ہاں، ایک بات جو اخبارات میں نہیں شائع ہوئی، وہ یہ کہ میک بین نے واردات کے دوسرے دن یہ نیکلس اسی دکان پر قدرے کم قیمت پر فروخت کردیا جہاں سے اسے سوزا نے خریدا تھا۔ ہمیں سوزا کا لاٹری کا انعام ملنے اور نیکلس خریدنے کا پتا اس کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات سے ملا تھا۔ جب ہم نے بینک سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں جیولری شاپ سے پتا کیا تو انہوں نے فروخت کی بھی تصدیق کی اور بتایا کہ کچھ عرصے پہلے میک بین نامی شخص نے اس نیکلس کو انہیں بیچ دیا ہے۔ اس خرید و فروخت کا ثبوت یہ ہے... جس شاپ سے نیکلس خریدا گیا تھا، وہ ہیروں کی خرید و فروخت کرنے والی ایک بڑی کمپنی کی ملکیت ہے۔ یہ کمپنی ہر نیکلس کی ڈوری کے ساتھ ایسے سیریل نمبر چھاپتی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتے لیکن فروخت کرتے وقت خریدار کے نام کے ساتھ اس نمبر کا اندراج بھی کمپیوٹر ریکارڈ میں کیا جاتا ہے۔ اگر وہی زیور کبھی فروخت کے لیے ان کے پاس آئے تو اس نمبر کو دوبارہ خریداری کے کھاتے میں بیچنے والے شخص کے نام اور پتے کے ساتھ لکھ لیا جاتا ہے۔ گاڑی کے بعد یہ ایک اہم ترین ثبوت تھا کہ میک بین کس طرح جرائم پیشہ افراد کی مدد کیا کرتا تھا۔ ویسے ایک دلچسپ بات بتاؤں... وہ یہ کہ تفتیش کے دوران برونی نے بتایا کہ میک نے نیکلس چالیس ہزار ڈالرز کا فروخت کیا ہے جس میں سے تیس ہزار میرے اور باقی اس کے ہیں۔ لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ وہ نیکلس پچاسی ہزار ڈالرز میں فروخت ہوا ہے تو یہ سن کر وہ آگ بگولا ہوگیا۔ مجھے یقین ہے کہ جیل میں میک بین اس کے ہاتھوں بُری طرح پٹے گا۔"

یہ داستان سن کر پورے مجمع نے ایوان پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانا شروع کردیے۔

"یہ جو باتیں میں نے بیان کی ہیں، ان میں سے زیادہ تر پراغ رساں کے ذریعے سے ہمارے علم میں آئیں اور سوزا قتل کیس کے نئے رخ کی بنیاد بنیں۔ بعض باتوں کا علم پولیس تفتیش میں معاونت فراہم کرنے کے دوران ان دونوں کی زبانی ہوا۔" ایوان نے پیشہ ور قصہ گو کی طرح کہنا شروع کیا۔ "البتہ ایک بڑی عجیب بات ہوئی۔"

"وہ کیا؟" پارٹی میں شریک تمام مردوں اور عورتوں نے یک زبان ہوکر پوچھا۔

"میں اب تک غیر شادی شدہ ہوں اور اس کیس کے دوران ہیرے کی دکان کے اتنے چکر لگائے کہ مجھے بھی ایک ہیرا جڑی انگوٹھی خریدنا پڑ گئی۔ اب میں ہیرے کی اس انگوٹھی کے لیے لورنا سے اس کا ہاتھ مانگتا ہوں۔"

لورنا فائنل ائیر کا امتحان دے چکی تھی اور نتیجے کی منتظر تھی۔ وہ بھی ایوان کو پسند کرتی تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے پروپوز کردے گا۔ اس پارٹی میں لورنا بھی ایوان کے ساتھ ہی آئی تھی۔ جب اس نے لورنا کا ہاتھ مانگنے والی بات کہی تو سب نے 'لورنا لورنا' پکارنا شروع کردیا۔ آخر ایوان آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل اس کے آگے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ہیرا جڑی انگوٹھی تھی۔ جب اس نے تالیوں کی گونج میں لورنا کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے خاموش پیار کا مقدمہ جیت لیا ہے۔

زن گزیدہ

رضوانہ منظر

وقتی جذباتی ابال کبھی کبھی ایسے دوراہے پر پہنچا دیتا ہے ...... جہاں سے زندگی کی راہیں ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جاتی ہیں۔

اس شخص کا فسانہ جو ارتکاب جرم کا واحد گواہ تھا

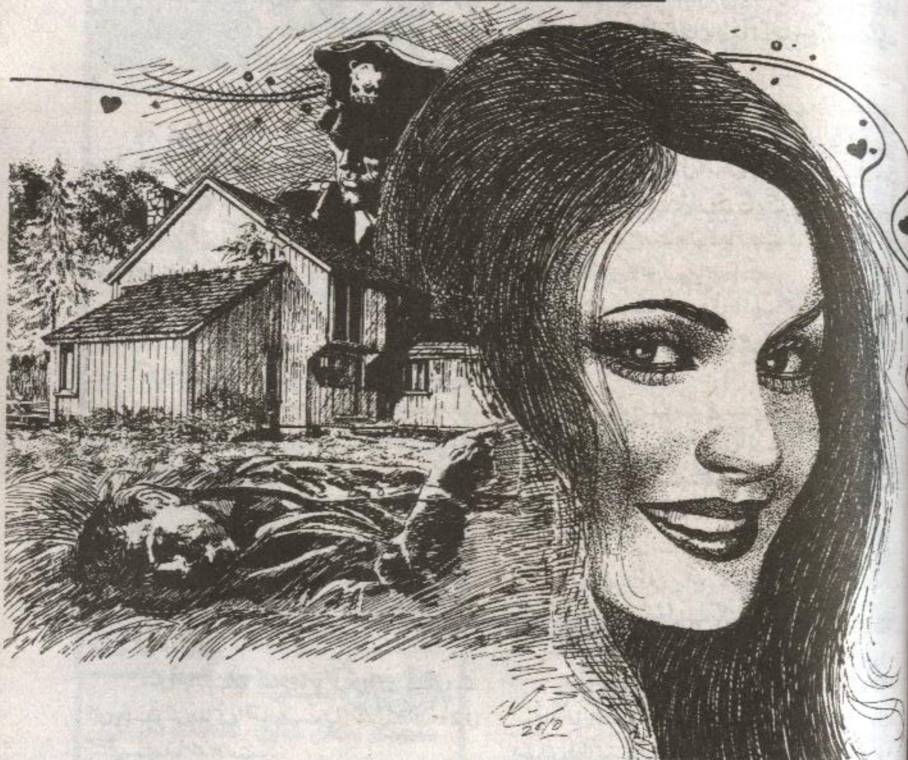

جونی نے میز پر نصب آرا مشین کا سوئچ آف کردیا اور تحسین آمیز نظروں سے اس لکڑی کی تراش کا جائزہ لینے لگا جو اس نے ابھی ابھی آرا مشین کی مدد سے کی تھی۔

"اس سے عمدہ تراش تو فیکٹری میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔" وہ ستائشی لہجے میں بڑبڑایا۔

پھر وہ اس خانے دار الماری کی جانب بڑھ گیا جسے وہ بنا رہا تھا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ دیوار پر لگی گھڑی پر ڈالی۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

شاید آج رات وہ فون نہیں کر سکے گی... جونی نے سوچا۔

ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ اس کی جیب میں رکھے ہوئے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ایک جھٹکے سے فون نکال کر اپنے کان سے لگالیا۔ "ہے بے بی! کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا تم بات کر سکتے ہو؟"

"ہاں، میں گھر سے باہر اناج کوٹھی میں ہوں۔" جونی ٹہلتا ہوا دروازے تک چلا گیا اور اپنے گھر پر نظریں جما دیں۔ باہر مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ "سارہ نے وائن کا گلاس پیا ہے، لہٰذا وہ جلد ہی بے سدھ ہو جائے گی۔" بیبی نے کہا اور پھر جونی کو مزید تفصیلات بتانے لگی۔

http://digestpk.blogspot.com/

''ڈینس کو کام پر طلب کر لیا گیا تھا۔ وہ چلا گیا ہے۔ کیا تم ملاقات کے لیے تیار ہو؟''

''تم تو جانتی ہو کہ میں ملنے کے لیے کتنا بے چین رہتا ہوں۔'' جونی نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

''میں دس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔ تم وہیں موجود رہو۔''

خوشی کے مارے جونی کا سینہ پھول گیا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور وہ اناج کوٹھی سے نکل کر باہر کھلے میدان میں آگیا۔ یہ اس کے مکان کا عقبی حصہ تھا جہاں درختوں کی بہتات تھی۔

باہر چودھویں کے چاند کی روشنی تھی اور درختوں کے درمیان دھندلے راستے پر چلنا دشوار نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک بے چینی سے وہیں ٹہلتا رہا۔

تب درختوں کے سائے میں سے ایک ہیولا آتا دکھائی دیا۔ وہ بیسی ہیرنگٹن تھی۔

''تم بہت جلدی آگئیں۔'' جونی نے حیرت کا اظہار کیا۔

بیسی دوڑتی ہوئی اس کے نزدیک آگئی اور اس کے سینے سے لپٹ کر ہانپنے لگی۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ بیسی نے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپایا ہوا تھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم مجھے مل گئے۔'' بیسی نے سرشار لہجے میں کہا۔

''میں بھی بے حد خوش ہوں۔'' جونی نے بیسی کے لانبے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اچانک ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ تم واقعی یہاں منتقل ہو چکی ہو۔''

''میں تمہارے نزدیک رہنا چاہتی تھی اس لیے میں نے اس علاقے میں رہائش اختیار کرنے پر اصرار کیا... اور وہ بڑی مشکل سے رضامند ہوا ہے۔''

''تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

اس بات پر بیسی نے اس کے سینے پر سے سر ہٹا دیا اور اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔''

جونی نے اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بیسی، جونی سے الگ ہو کر اس طرف چل دی جہاں اس نے چند فٹ کے فاصلے پر اپنا نائٹ بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ میں سے ایک کمبل نکالا اور اسے زمین پر بچھا دیا۔ پھر پلٹ کر جونی کی طرف دیکھنے لگی۔ چاندنی میں اس کی براؤن آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

''ادھر میرے پاس آجاؤ تاکہ ہمارے درمیان کے تمام فاصلے...'' بیسی کا لہجہ خواب ناک تھا۔

...لیکن وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

ایک کان پھاڑ دینے والے دھماکے نے اچانک ہی رات کے سناٹے کو درہم برہم کر دیا۔

بیسی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور پھر جب اس کی نگاہ خون پر پڑی تو اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ نکل گئی۔

پھر ایک اور دھماکا ہوا... پھر ایک اور!

جونی نے فوراً ہی خود کو نیچے زمین پر گرا لیا اور رینگتے ہوئے ایک قریبی درخت کی آڑ میں چلا گیا۔ دھماکوں کی گونج سے اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ پھر اس نے درخت کی آڑ سے صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

ہر دھماکے کے ساتھ روشنی کا ایک جھماکا سا ہو رہا تھا۔ ہلکی چاندنی میں فائر کرنے والے کا چہرہ تھوڑا بہت نمایاں ہو رہا تھا۔

فائر کرنے والے کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی جونی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ درخت کی آڑ سے باہر نکل آیا۔

''سارہ!'' اس کے لہجے میں غصے اور حیرت کی آمیزش تھی۔ ''تم یہ کیا کر رہی ہو؟''

سارہ درختوں کے سائے سے نکل کر مکمل چاندنی میں آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ ''کیا تمہارے ڈیڈی نے تمہیں کبھی یہ نہیں سکھایا کہ اپنے گھر کے عقبی صحن میں گندگی نہیں کرنی چاہیے؟''

جونی خوف زدہ نگاہوں سے بیسی کی بے جان لاش کو گھور رہا تھا۔ خون اس کی قمیص کے سامنے کے حصے کو تر کر چکا تھا اور اب اس کی لاش کے گرد اکٹھا ہو رہا تھا۔

''تمہیں احساس ہے کہ تم نے یہ کیا کیا ہے؟'' جونی نے سارہ سے کہا۔

سارہ نے جونی کا ریوالور نیچے زمین پر پھینک دیا اور اپنے ہاتھوں پر سے لیٹیکس کے دستانے اتارتے ہوئے بولی۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''آلۂ قتل پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں۔'' سارہ نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیا پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو؟''

''پاگل پن کی بات تو یہ ہے کہ اب تم سے زندگی بھر کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا کتنا آسان ہوگا۔''

جونی نے ایک نگاہ سارہ کے قدموں پر ڈالی تو چونک گیا۔ سارہ اس کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ''کوئی بھی کبھی یقین نہیں کرے گا کہ...''

سارہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ''تم نے دو ہفتے قبل یہ ریوالور خریدا تھا... کیوں؟''

''حفاظت کے لیے!''

''لیکن جیوری یہ بات نہیں مانے گی۔ پھر اس بارے میں کیا کہو گے کہ مرنے سے قبل بیسی نے کس آخری فرد کو فون کیا تھا؟ کیا تمہارے خیال میں یہ ایک ٹھوس ثبوت نہیں ہے؟'' سارہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

جونی، بیسی کی لاش کے پاس جھک گیا اور بے تابی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اسے بیسی کے سیل فون کی تلاش تھی۔ جب اس نے سیل فون اور اپنا خالی ریوالور بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

''تم اس کا سیل فون جلا دو گے، تب بھی اس سے تمہاری جان بخشی نہیں ہوگی۔ وہ کال اس کے بل میں ایک مستقل ریکارڈ بن چکی ہے۔ فون کمپنی سے اس کال کی تصدیق ہو جائے گی اور تم اپنے ریوالور کی گولیوں کے خول پولیس کی آمد سے قبل تک کبھی تلاش نہیں کر پاؤ گے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے ہوں گے۔'' سارہ نے اسے مزید کچوکے لگاتے ہوئے کہا۔

جونی کو اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کر دھیرے دھیرے سارہ کی سمت گھوم گیا۔

''تم نے میرے لیے کوئی چوائس نہیں چھوڑی ہے۔'' اس نے سارہ کو حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں اور عدالت کے روبرو اس بات کی شہادت دوں کہ میں اس قتل کا عینی گواہ ہوں۔''

یہ سن کر سارہ نے ایک زوردار شیطانی قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے جونی کا جسم کانپ گیا۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے سارہ کو دیکھنے لگا۔

تب سارہ بولی۔ ''تم پولیس چیف کی بیوی کے ساتھ عشق لڑا رہے تھے۔ تمہارے خیال میں تم جو کچھ بھی کہو گے، وہ اس پر یقین کر لیں گے؟''

دسمبر 2010ء کے شمارے کی ایک جھلک

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

انجم انصار اور عالیہ بخاری کے سلسلے وار ناول

ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی دبیز تہیں بھی منعکس ہونے سے نہیں روک سکتیں...... زندگی کے نشیب و فراز میں اپنی منزل کو ڈھونڈتی لڑکی کی کہانی......

ذکیہ بلگرامی کا دلچسپ ناول

''تو ہی ازل سے میرے بخت میں'' وجیہہ احمد کی ایک دلچسپ داستان

قیصرہ حیات کے ناول ''پل صراط'' کی آخری قسط

طویل اور خوب صورت ناولٹ، بشریٰ گوندل اور نویدہ تبسم کے قلم سے

''بہنوں کی محفل'' میں دلچسپ، کھٹے میٹھے اور کڑوے خطوط جس میں آپ بھی شامل ہو سکتی ہیں

اس کے علاوہ

شمیم فضل خالق، عاطفہ فاروق، عروسہ عالم، نزہت جبیں ضیا، عقیلہ حق، شگفتہ کنول اور سیماں کمال صوفی کے دلچسپ اور تیکھے افسانے

کیا آپ پاکیزہ میں اپنی تحریر یا تصویر کے ساتھ انٹرویو دیکھنا چاہتی ہیں تو اس ماہ کا پاکیزہ پڑھیے اور ہم سے فوراً رابطہ کیجیے

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

http://digestpk.blogspot.com/

اٹھارھویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور باائر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون
کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا ساہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو. محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے ۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ...... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ...... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم ،افسر شاہی ،جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

http://digestpk.blogspot.com/

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ شہر یار اس کے ناجائز کاموں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہر یار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو گود دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیرآباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروا لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہر یار سے جاملتی ہے۔ شہر یار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی مستقل اس کے پیچھے رہتے ہیں پھر ماہ بانو مشکلات سے گزرتی ہوئی خواجہ سراؤں کے ہتھے لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہاگرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے پھر ایک چھاپے کے دوران ماہ بانو کو تھانے لے جایا جاتا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کرلیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو شہر یار کا ماموں زاد بھائی سجاد رانا اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہر یار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہر یار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جاچکا ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پاکر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہر یار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کردیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوشے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کراتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، وہ اسے ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نورپور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ ادھر چودھری شہر یار کو پھنسانے کے لیے چالیں چلتا ہے، مگر کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کا آفتاب کے دوست افضل اور اس کی بیوی کے ذریعے فرار ممکن ہوتا ہے۔ ادھر کشور کے غائب ہونے سے حویلی میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور کشور کے غیاب پر وہاں کی ملازمائیں زیرعتاب آجاتی ہیں۔ خاص طور پر کشور کی ملازمہ خاص رانی۔ ادھر ماہ بانو اس برف زار سے فرار ہونے کی کوشش کرتی ہے اور وہاں موجود عمران نامی لڑکے کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے مگر عمران ایک جگہ ایوالانچ کی زد میں آجاتا ہے اور اس میں دب کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ ماہ بانو تنہا اس برف زار میں بھٹکنے لگتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار نیویارک سے واپس آکر رانی پر بے انتہا تشدد کرتا ہے مگر رانی موقع پاکر چودھری کے ریوالور سے خود کو ختم کرلیتی ہے۔ شہر یار نورپور سے واپسی پر تھانے جاتا ہے جہاں ایک اتائی ڈاکٹر سے تفتیش کے دوران موت کے منہ میں چلے جانے والے بچے کا باپ جگو مل جاتا ہے اور وہ شہر یار کا احسان مند ہوتے ہوئے اسے اپنا موبائل نمبر دے کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کرتا ہے۔ ادھر مشابرم خان ماہ بانو کی تلاش میں اس برف زار تک پہنچ جاتا ہے اور دشمنوں کا پتا لگا لیتا ہے اور وہاں ایمونیشن بلاسٹ ہونے سے کافی تباہی ہوتی ہے۔ چودھری افتخار کو کشور کے غیاب کے حوالے سے ڈیوڈ کی زبانی آفتاب اور افضل سے متعلق اطلاعات ملتی ہیں کہ ان افراد کی شخصیت مشکوک ہے۔ چودھری ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلائمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ادھر کشور کو جب آفتاب کے اغوا کی خبر ملتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے اسپتال لے کر جاتا ہے۔ جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ادھر مشابرم خان لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے اور پاکستان آرمی والوں کے وہاں پہنچنے سے ان کی تحویل میں پہنچ جاتا ہے۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ دہشت گردوں کا ٹھکانا تباہ ہونے سے ڈیوڈ چراغ پا ہو جاتا ہے اور تحقیق کے لیے لنڈا کو پاکستان بھیجتا ہے۔ ادھر ماہ بانو کو بچانے والا مہربان شخص اپنے واقف کار کے توسط سے اسے ایک میجر سے ملوا دیتا ہے جو ماہ بانو کی فراہم کردہ معلومات کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہر یار کو بھی اس واقعے کی اطلاع میجر کے ذریعے مل جاتی ہے اور شہر یار فوراً اسکردو پہنچ جاتا ہے اور مشابرم خان اور ماہ بانو کو آرمی کی کسٹڈی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اسے یہ کہہ کر منع کردیا جاتا ہے کہ انویسٹی گیشن جاری ہے تاہم وہ ماہ بانو کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے کراچی منتقل کرنے کا منصوبہ بنا لیتا ہے۔ ادھر صحافی افضل پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے لیکن وہ زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچ جاتا ہے۔ اسپتال میں ایک میل نرس اسے میڈیسن دینے آتا ہے مگر وہ اسے دوائیں دینے نہیں بلکہ موت کے گھاٹ اتارنے آتا ہے۔ افضل اپنے بچاؤ کے لیے سائڈ ٹیبل پر رکھی شیشی اسے مارتا ہے جو اس کی آنکھ پر لگتی ہے مگر دشمن کے ہاتھ میں موجود پسٹل سے فائر ہو چکا ہوتا ہے۔ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں۔ افضل اس حملے میں مارا جاتا ہے اور حملہ آور بھی وہاں موجود گارڈز کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو کر مارا جاتا ہے تاہم مرنے سے پہلے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیتا ہے۔ قاتل مہتاب کا کزن تھا جو رقابت میں مہتاب، اس کے بچوں اور پھر افضل کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے... لنڈا پاکستان آکر خفیہ ٹھکانے پر تباہی کا پتا لگاتی ہے۔ ادھر چودھری افتخار کے آدمی اسکول کی عمارت اور ٹیچرز کی رہائش گاہ کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں رہائش پذیر تین اساتذہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شہر یار وہاں پہنچتا ہے تو سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ تاہم وہ اس واقعے کی رپورٹ چودھری کے خلاف درج کروا دیتا ہے۔ ادھر ملک کے تین بڑے شہروں میں پے در پے قیامت ٹوٹی۔ پہلے کراچی میں کافی اموات ہوئیں پھر لاہور میں ٹرینوں کا حادثہ اور پھر اسلام آباد میں ہوٹل میں بم دھماکا ہوا۔ اس سب کارروائیوں میں دشمن ملک کا ہاتھ تھا اور موساد بھی ملوث تھی۔ ماہ بانو کراچی آجاتی ہے اور میڈیکل کالج میں مہرین کے نام سے داخلہ لے لیتی ہے۔ وہاں اسے راحیلہ نامی ایک لڑکی ملتی ہے جو اس سے کافی گھل مل جاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کالج سے باہر چاٹ کھانے نکلتی ہے۔ ابھی وہ چاٹ والے کے پاس کھڑی ہوتی ہیں کہ ایک خواجہ سرا آکر ان سے بھیک مانگتا ہے۔ ماہ بانو اسے دیکھ کر سہم جاتی ہے اور اسے لگتا ہے اسے پھر گرداب نے گھیر لیا ہے اور وہ پھر کسی قید خانے میں پہنچائی جانے والی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

”ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے لڑکی! کیا پہلے کبھی کوئی خسرہ نہیں دیکھا؟“ اس کی اسی گم صم کیفیت پر وہ مانگنے والا یا والی بُرا مان کر پوچھنے لگا لیکن اس کی ایسی حالت ہو گئی کہ جواب دینے کے لائق بھی نہیں رہی۔

”کیا ہو گیا مہرین! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ چلو اندر چلتے ہیں۔“ راحیلہ جو اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی، اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر فکرمندی سے پوچھنے لگی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی وہ دونوں بڑے خوش گوار موڈ میں چھولوں کی چاٹ کھانے کے لیے کالج سے باہر نکلی تھیں۔

”آؤ اندر چلیں۔ تمہاری طبیعت تو مجھے بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ ماہ بانو کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر راحیلہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور چھولوں کو بھول کر کالج کے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ ماہ بانو نے گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ خواجہ سرا اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔ اس کے لیے ماہ بانو کا ردِعمل یقیناً انوکھا تھا لیکن یہ تو ماہ بانو ہی سمجھتی تھی کہ اسے دیکھ کر اس کی حالت غیر کیوں ہو گئی۔ اس کے وجود نے اسے اپنے ماضی کا ایک تلخ تجربہ یاد دلا دیا تھا۔ بے شک وہ غریب ان میں سے نہیں تھا جن سے اس کے ماضی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا صرف حلیہ ان جیسا تھا، چہرہ بالکل مختلف تھا۔ کردار بھی یقیناً مختلف ہوگا لیکن اس خواجہ سرا سے ہونے والے سامنے نے اس سے کچھ دیر قبل محسوس ہونے والا آزادی کا احساس چھین لیا تھا۔ اسے یہ یاد دلا دیا تھا کہ اس کی جان کے ساتھ کیسے جھمیلے اور مسائل چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ کیسے خود پر گزرنے والا وہ وقت بھول سکتی تھی جب وہ چودھری کے پنجوں سے نکل بھاگنے کے چکر میں ان لوگوں کے درمیان جا پھنسی تھی۔ وہ تو ان دنوں سیٹھ موتی والا کے ڈرائیور سرمد کے دوست عامر کے گھر پناہ گزین تھی جب خواجہ سراؤں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گئی۔ پھر وہ وہاں سے سیٹھ سندر رام نامی ایک تاجر کی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اپنی نظروں کے سامنے دلہن بنی ایک کم سن لڑکی کو دیوی کے قدموں میں قربان ہوتے دیکھا۔ کچھ عرصے بعد اسے نگار کی مدد سے خواجہ سراؤں کے چنگل سے نجات ملی اور وہ ڈی آئی جی سجاد رانا کے گھر تک پہنچی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس نے جس لڑکی کو سندر رام کی کوٹھی کے تہ خانے میں مرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی اور شہر یار کی بھتیجی شینا تھی۔ پولیس۔ قاتلوں کو پکڑنے میں ناکام رہی تھی البتہ بعد کی تحقیقات سے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ سندر رام پاکستان میں رہ کر حقیقت میں را کے مددگار کے طور پر کام کر رہا تھا اور یہ ہندو خواجہ سرا بھی اسی سیٹ اپ کا ایک حصہ تھے۔ جاسوسی کے اس نیٹ ورک کے دو اہم مہروں میں سے سندر رام تو مر گیا تھا جبکہ مہاگرو غائب تھا۔ اس کی تلاش کے لیے بعد میں کیا اقدامات اٹھائے گئے، ماہ بانو کو اس کا علم نہیں تھا۔

ماہ بانو کو شہر یار نے تحفظ کے خیال سے مشابرم خان کے گاؤں کاندے منتقل کر دیا تھا لیکن وہاں بھی وہ حالات کے گرداب سے بچ نہیں سکی اور اس گرداب میں ڈوبتی ابھرتی اب کراچی آ پہنچی تھی۔ کراچی کے اس کالج میں ایک عام طالبہ کی طرح دوبارہ اپنی پڑھائی کا آغاز کرنے کے بعد اسے لگا کہ اب وہ ایک نارمل زندگی کی طرف آگئی ہے لیکن کالج کے باہر ایک خواجہ سرا سے ہونے والے ٹکراؤ نے اسے احساس دلایا تھا کہ اس کے لیے زندگی کا نارمل ہو جانا اتنا آسان نہیں۔ اس نے زندگی کے جو پُرخطر رخ دیکھے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً اسے یاد آکر دہلاتے رہیں گے۔ آج بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو نا مہرین؟ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو میں پرنسپل سے بات کرتی ہوں۔ وہ تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس بھجوا دیں گی۔“ اسے ایک بینچ پر بٹھانے کے بعد اس کی پسینے سے تر ٹھنڈی ہتھیلیوں کو سہلاتے ہوئے

http://digestpk.blogspot.com/

راحیلہ نے اس سے دریافت کیا۔

"نن... نہیں رہنے دو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے راحیلہ کو جواب دیا۔

"تمہیں اچانک ہو کیا گیا تھا؟ میں نے تو بس یہ دیکھا کہ تم اس خواجہ سرا کو دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھی ہو۔ کیا تم اس سے ڈر گئی تھیں؟" راحیلہ نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں یار! بس پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں بچپن ہی سے ان خواجہ سراؤں سے بہت ڈرتی ہوں۔ شروع سے میرا یہ حال ہے کہ جہاں کسی خواجہ سرا کو قریب سے دیکھا، وہیں میری جان نکلنے لگی۔ ابھی بھی وہ اچانک سر پر آ کر کھڑا ہوا تو میں ڈر گئی۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے راحیلہ کی تسلی کے لیے بہانہ بنایا۔

"بہت بے وقوف لڑکی ہو تم۔ ساری دنیا جن سے لطف اندوز ہوتی ہے، تم نے دل میں ان کا خوف پال رکھا ہے۔ ارے، یہ بے چارے تو خود دنیا سے ڈرتے ہیں۔ کبھی لڑکوں کو دیکھا ہے کہ کیسے ان سے چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ اکثر تو بے چاروں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں اور تم ہو کہ اس قدر بے ضرر مخلوق سے ڈرتی ہو۔" راحیلہ اسے پیار سے ڈپٹنے اور سمجھانے لگی۔ وہ سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی کہ جواب میں اسے وہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی جو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور جو اس نے سہا تھا۔

☆☆☆

"یہ لیجیے جناب چائے۔" کشور نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی میز پر لا کر رکھی تو آفتاب لکھنے کا سلسلہ موقوف کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گزشتہ ایام کے مقابلے میں کافی نکھری ہوئی اور پُرسکون لگ رہی تھی۔ ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ انہیں کسی گھر کی چار دیواری کا تحفظ میسر آ گیا تھا۔ اسلام آباد میں مقیم بابر کی خالہ کا یہ گھر ان کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ بابر کی خالہ نے بھانجے کے بنا کسی حیل و حجت کے انہیں اپنے گھر میں جگہ دے دی تھی اور آج کل وہ ان کے گھر کی بالائی منزل پر واقع اس کمرے میں مقیم تھے۔

"بڑی زیادتی ہوئی آپ کے ساتھ... کہاں تو حویلی میں ہر وقت حکم بجا لانے والی ملازمائیں آپ کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھیں اور کہاں آپ کو یہ معمولی معمولی کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینے پڑ رہے ہیں۔" اس نے کشور کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

"ایسا مت سوچیں۔ ملازماؤں کے اس جھرمٹ اور آسائشوں کے ڈھیر میں مجھے اپنے دل کی کوئی خوشی میسر نہیں تھی۔ وہ تو کسی قید خانے میں مقید قیدی کی سی زندگی تھی جسے تین وقت کا کھانا اپنی کال کوٹھری میں فراہم کر دیا جاتا تھا۔ قیمتی ساز و سامان اور ملازماؤں کی فوج کے درمیان رہنے سے کسی کا خوش قسمت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ خوش قسمت وہ ہوتا ہے جو خوشی کو محسوس کر سکے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں کچن میں آپ کے لیے چائے بنا رہی تھی تو میرا دل ایسی خوشی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہ اللہ کی مجھ پر مہربانی ہی تو ہے کہ اس نے میری ویران زندگی میں خوشی کے رنگ برنگے پھول کھلا دیے۔ خوشی کے یہ دن تھوڑے بھی ہوئے تو میں کسی سے کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ اب اگر موت بھی آ جائے تو میں اس اطمینان کے ساتھ مر جاؤں گی کہ مرتے ہوئے میں آپ کے قریب تھی۔" وہ بہت جذب کے ساتھ اپنی اندرونی کیفیات کا اظہار کر رہی تھی۔

"مرنے کی باتیں نہ کریں میری جان! ابھی تو ہم نے ساتھ جینے کا آغاز کیا ہے۔ ہمیں بہت دور تک ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے اور اس زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا ہے جو اللہ کی مہربانی سے آپ کے وجود میں سانس لے رہی ہے۔ ابھی ہم پر ذرا مشکل وقت ہے لیکن اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی ضرور آئیں گے جب ہم اپنے گھر کے آنگن میں اپنے بچوں کو بھاگتا دوڑتا دیکھیں گے اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو گی۔" آفتاب نے اس کا ہاتھ ہونٹوں کے قریب لے جا کر نرمی سے اس کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے ایک خواب اس کی آنکھوں کو سونپا۔

"سچ کہیں آفتاب! کیا سچ مچ وہ دن ہماری زندگی میں آئیں گے؟ جب ہمارا اپنا ایک گھر ہو گا اور اس گھر کا آنگن ہمارے بچوں کی ہنسی سے مہکے گا؟ اگر ایسا ہوا تو زندگی کتنی خوب صورت ہو جائے گی نا... بالکل ایسا لگے گا جیسے آسمان سے ہمارے لیے رنگوں کی برسات ہو رہی ہے۔" وہ بے ساختہ ہی آفتاب کے سینے سے آ لگی اور آنکھیں موند کر گویا تصور میں اس منظر کو دیکھنے لگی۔

"بالکل ایسا ہی ہو گا۔ پھر ہم خود بچے بن کر اپنے بچوں کے ساتھ ان رنگوں سے کھیلیں گے۔ ویسے آپ کے خیال میں ہمارے کتنے بچے ہونے چاہئیں؟" وہ اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتا ہوا شرارت سے پوچھنے لگا۔ اس کے اس شرارت بھرے سوال پر کشور نے محجوب سی ہو کر اپنا چہرہ کچھ اور بھی اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اب آفتاب اس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس کے سامنے کشور کا سیاہ بالوں والا سر تھا۔ ان بالوں سے اٹھتی شیمپو کی مہک اس کی سانسوں سے ٹکرا کر کچھ اور بھی اسے دیوانہ کرنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کشور کا سر تھامتے ہوئے اس کا اپنے سینے میں چھپا چہرہ نظروں کے سامنے کیا اور پھر بے تحاشا اسے چومنے لگا۔ کشور کے گلابی ہونٹ، فراخ پیشانی، خم دار ٹھوڑی، چمکتے رخسار، بڑی بڑی آنکھیں سب بوسوں کی اس برسات میں بھیگتی چلی گئیں۔ محبت کے اس بے تحاشا اظہار پر وہ شدتِ جذبات سے اس بری طرح کانپنے لگی جیسے بہت دیر تک برسات کے ٹھنڈے پانی میں نہائی ہو۔

"اتنا مت چاہیں کہ پھر یہ دل زندہ رہنے کی ہوس میں مبتلا ہو جائے اور جب میرے باپ کے نمک خوار میری موت کا پیغام لے کر پہنچیں تو میرے لیے جان دینا مشکل ہو جائے۔" کپکپاتے لبوں سے یہ بات کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے کئی موتی پھسل پڑے۔

"پھر وہی مرنے کی باتیں... میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ مرنے کی بات مت کریں۔ ہمیں ایک لمبے عرصے تک جینا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ جینا ہے۔" آفتاب نے اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چنتے ہوئے خفگی سے ٹوکا تو وہ سنبھل گئی۔

"سوری آفتاب! بس حالات ہی ایسے ہیں کہ میں بار بار مایوسی کا شکار ہو جاتی ہوں لیکن اب میں ایسی باتیں نہیں کروں گی۔" اس کے مضبوط مردانہ ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے وعدہ کیا پھر چونک کر بولی۔ "باتوں باتوں میں آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ میں ابھی دوسری گرم چائے لے کر آتی ہوں۔"

"یہ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ ہم لکھنے والوں کے لیے گرم چائے کی پیالی ایندھن کا کام دیتی ہے۔ اس کے بغیر لگتا ہے کہ دماغ کی گاڑی ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں تو یوں بھی بہت دنوں بعد کاغذ قلم لے کر بیٹھا ہوں۔ خیالات کو یکجا کرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی ہے۔ پیچھے کے حالات کا بھی کچھ علم نہیں۔ میں نے بابر سے کہا تھا کہ مجھے مقامی اخبارات بھجوا دے تاکہ گاؤں کے حالات کا کچھ علم ہو سکے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اسکول کی ہے۔ تمہارے اباجی پہلے ہی اسکول کے دشمن ہیں، اب جو کچھ پیش آیا ہے اس کے بعد تو ان کا سارا نزلہ اسکول پر ہی گرے گا۔ وہ کوشش کریں گے کہ کسی طرح اسکول بند کروا دیں۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔ یوں بھی کبھی کبھی میں گلٹی فیل کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ذاتی خوشی کی خاطر اتنے بہت سے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے کرتے یک دم ہی رنجیدہ ہو گیا۔

پیر آباد کا وہ چھوٹا سا اسکول اس کے برسوں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اب کہیں جا کر تو وہ وقت آیا تھا کہ اسے اپنی محنت کا صلہ ملتا نظر آنے لگا تھا لیکن حالات نے یک دم ہی کروٹ لی تھی۔ کشور کی محبت میں مبتلا ہو جانا، اس سے خفیہ نکاح، ملاقاتیں اور پھر کشور کے امید سے ہونے کی خبر سننے کے بعد اسے حویلی کے عتاب سے بچانے کے لیے گاؤں سے فرار کروانا... یہ سب وہ واقعات تھے جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کی ترجیحات میں تو یہ سب کچھ شامل ہی نہیں تھا لیکن کشور کی تند و تیز محبت نے کچھ اس طرح اسے گھیرا کہ پھر وہ حالات کے دھارے پر بہتا ہی چلا گیا اور اب ہر چیز سے الگ تھلگ یہاں اسلام آباد میں بیٹھا حالات کے سازگار ہونے کا منتظر تھا۔

"سوری آفتاب! میری وجہ سے آپ اپنے مشن سے الگ ہو گئے۔ میری جذباتیت نے آپ کی ساری محنت و جدوجہد برباد کر کے رکھ دی۔ کاش! میں اپنے جذبات پر قابو رکھتی اور آپ کو اپنی محبت میں مبتلا ہونے پر مجبور کرنے کے بجائے حویلی کی دیواروں کے درمیان ہی گھٹ گھٹ کر مر جاتی تو یہ سب نہ ہوتا۔" اس کی رنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ بھی دکھی ہو گئی اور حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگی۔

"فضول باتیں مت سوچیں۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا جا چکا تھا، ہم اسے کسی صورت ٹال نہیں سکتے تھے۔ میں تو صرف اس لیے اداس ہو گیا تھا کہ میری اس پروجیکٹ کے ساتھ برسوں کی محنت جڑی تھی۔ میرا مقصد آپ پر الزام لگانا یا آپ کو شرمندگی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ آئندہ کبھی خود کو قصوروار جان کر اداس ہونے یا ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی جو حالت ہے اس میں ٹینشن لینا ویسے ہی مناسب نہیں۔ بچے پر اس کا بُرا اثر پڑ سکتا ہے اور یہ بچہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ آپ کو اس نشانی کی بہت حفاظت کرنی ہے۔ کچھ سمجھیں یا نہیں؟" وہ فوراً اپنا موڈ بدل کر کشور کو بہلانے لگا اور آخر میں اس کی ناک کی پھنگ کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان پکڑ کر ہلاتے ہوئے پیار سے استفسار کیا۔ جواب میں کشور نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

"اب جائیے اور گرم چائے لے آئیے۔ میں بھی اپنا کام مکمل کرتا ہوں۔" آفتاب ایک بار پھر اپنے سامنے رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کشور ٹھنڈی ہو جانے والی

http://digestpk.blogspot.com/

چائے کی پیالی لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ نیچے کچن میں بابر کی خالہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

”خالہ! آفتاب نے بابر بھائی سے کچھ اخبارات وغیرہ منگوائے تھے۔ وہ کوریئر سے بھجوائیں گے... آپ ذرا خیال رکھیے گا۔“ خالی چولھے پر چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے اس نے خالہ سے کہا۔

”بابر کا بھیجا ہوا پارسل تو صبح گیارہ بجے ہی مل گیا تھا۔ میں نے صفائی والی ماسی سے کہا تھا اوپر پہنچا دے۔ شاید وہ سمجھی ہوگی کہ بدر کے کمرے میں پہنچانا ہے اس لیے وہاں رکھ آئی ہوگی۔ تم وہاں دیکھ لینا۔“ خالہ نے جواباً کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی یہ چائے لے کر اوپر جاؤں گی تو دیکھ لوں گی۔“ اس نے ابلتے ہوئے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”دیکھو لڑکی! یہ اوپر نیچے کے چکر ذرا کم کیا کرو۔ اس حالت میں بار بار سیڑھیاں چڑھنا اترنا تمہارے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے بزرگوں والی اپنایت سے اسے ٹوکا تو وہ بُرا ماننے کے بجائے مسکرانے لگی۔ زندگی میں کوئی تو ایسا میسر آیا تھا جو بڑے ہونے کے ناتے اسے مشورے اور ہدایات دے سکے۔

”ہنسو مت۔ تم آج کل کی لڑکیاں بزرگوں کی باتوں کو مذاق سمجھتی ہو۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اپنے تجربے کی روشنی میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں۔“ اس کی مسکراہٹ کا غلط مطلب لیتے ہوئے انہوں نے ذرا سا بُرا مانتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

”ایسی کوئی بات نہیں خالہ! میں بھلا کیسے آپ کی بات کو مذاق میں اڑا سکتی ہوں۔ مجھے تو خود کسی بزرگ کے مشوروں کی ضرورت ہے۔“ کشور نے جلدی سے انہیں صفائی دی پھر مزید وضاحت پیش کرتے ہوئے بولی۔ ”اصل میں ابھی آفتاب کو آرام کی ضرورت ہے۔ ان کا پیر اس حد تک ٹھیک نہیں ہو سکا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ اتر سکیں اس لیے مجھے ہی انہیں اوپر سب کچھ لے جا کر دینا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ بات تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن تم بار بار چکر لگانے کے بجائے کوشش کیا کرو کہ ایک ساتھ ہی ضرورت کی ساری چیزیں اوپر لے جاؤ۔ دوپہر تک تو ماسی یہیں ہوتی ہے۔ اس وقت اس سے کام لے لیا کرو۔ یہ چائے وائے بھی گھڑی گھڑی بنا کر اوپر لے جانے کے بجائے ایک وقت میں تھرماس میں بھر کر لے جاؤ تاکہ تمہارے یہ اوپر نیچے کے چکر کم ہوں۔ پہلا پہلا معاملہ ہے، احتیاط بہت ضروری ہے۔“ وہ اسے ہدایتیں دیتی رہیں اور کشور ان کے خلوص کو محسوس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ اسے وہ خاتون یوں بھی شروع سے پسند آئی تھیں۔ انہیں بابر نے ان دونوں کے بارے میں جو بتایا تھا، انہوں نے اسی پر اکتفا کر لیا تھا اور بار بار کے سوالات یا غیر ضروری تجسس سے انہیں پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر کے اندر بھی ان دونوں کو پوری آزادی میسر تھی اور وہ پُرتکلف مہمانوں کے بجائے گھر کے افراد کی طرح وہاں رہ رہے تھے۔ البتہ آفتاب نے اخراجات کی مد میں ایک مناسب رقم ضرور بہ اصرار ان کے حوالے کی تھی کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کتنے عرصے انہیں یہاں قیام کرنا پڑے گا اور وہ طویل عرصے تک مہمان بن کر ان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ خالہ نے شروع میں انکار کیا لیکن پھر آفتاب کا مؤقف سمجھتے ہوئے رقم قبول کر لی۔ اس طرح وہ دونوں خود کو بہت زیادہ زیرِ بار نہ کرتے ہوئے آرام سے وہاں رہ رہے تھے۔

خالہ کی ہدایات پر فوری طور پر عمل کرتے ہوئے کشور نے تیار شدہ چائے تھرماس میں بھری اور بھرے ہوئے تھرماس کے ساتھ ایک دھلی ہوئی خالی پیالی لے کر اوپر پہنچ گئی۔ آفتاب پورے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے انہماک کو توڑنے کے بجائے اس نے چائے کا بھرا تھرماس اور پیالی اس کے قریب رکھی اور چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب اس کا رخ خالہ کے اکلوتے بیٹے بدر کے کمرے کی طرف تھا۔ بدر گھر سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے وہ بلا جھجک اس کے کمرے میں چلی گئی۔ سامنے ہی اسے ایک تپائی پر رکھا پارسل نظر آ گیا۔ پارسل آفتاب کے نام پر ہی تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ابھی آفتاب پارسل کھول کر اس میں موجود اخبارات کا جائزہ نہیں لے سکتا چنانچہ اس نے خود وہ پارسل کھول لیا۔ اسے بھی حالات کے متعلق تجسس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ اس کے غائب ہونے کے بعد آرام سے تو ہرگز نہیں بیٹھا ہوگا۔ اسے تلاش کرتے رہنے کے سوا اس نے اپنے غیظ و غضب میں کوئی نہ کوئی انتقامی کارروائی تو ضرور کی ہوگی۔

اسی فکر اور تجسس کے ساتھ وہ اخبارات کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اخبار میں چھپنے والی ماسٹر منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کی خبر ایسی نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ خبر میں اگرچہ واقعے کو نامعلوم افراد کے کھاتے میں ڈالا گیا تھا لیکن وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ نامعلوم افراد کون ہیں۔ وہ اس کے باپ کے چیلوں کے

سوا بھلا کون ہو سکتے تھے؟ وہ اس خبر کو پڑھ کر دیر تک گم صم سی بیٹھی رہی۔ اس خبر کے ساتھ ساتھ طوفانی بارشوں سے ہونے والی تباہ کاریوں کی خبریں بھی اخبار میں شائع ہوئی تھیں بلکہ یہ خبریں آگے کی تاریخوں کے اخبارات میں بھی چھپتی رہی تھیں جبکہ منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل سے متعلق دوبارہ کوئی خبر نہیں آئی تھی لیکن کشور کو سب سے زیادہ اسی ایک خبر نے متاثر کیا تھا۔ قدرتی آفت کا شکار ہونے والوں پر تو صبر کیا جا سکتا تھا لیکن منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی وجہ تو وہ اور آفتاب ہی بنے تھے۔ وہ بے چارے بے قصور لوگ صرف ان کی وجہ سے زیرِ عتاب آئے تھے، یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں تھی۔

وہ جو بدر کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی اخبارات کا مطالعہ کر رہی تھی، سر تھام کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سے زیادہ آفتاب کے لیے یہ خبر صدمے کا باعث بنے گی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل تو اس نے اپنے عزیز دوست افضل کی جدائی کا غم سہا تھا، اب وہ منیب جیسے ساتھی کے بچھڑ جانے کی اندوہ ناک خبر سنتا تو اس پر کیا گزرتی۔ پریشانی کی اس شدید کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

”آپ نے کیسے ہمارے اس کمرے کو رونق بخش دی؟“ اپنے بہت قریب سے اسے یہ جملہ سنائی دیا تو وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے بدر سرخ آنکھیں لیا کھڑا تھا اور اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”سوری! میں بغیر اجازت کے آپ کے کمرے میں آ گئی۔ اصل میں ملازمہ غلطی سے اخبارات کا یہ بنڈل یہاں رکھ گئی تھی۔ میں یہی لینے آئی تھی پھر یہیں بیٹھ کر پڑھنے لگی۔“ وہ جلدی جلدی وضاحت دیتے ہوئے اخبارات سمیٹنے لگی۔

”کوئی بات نہیں... کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ جب تک چاہیں یہاں بیٹھیں بلکہ چاہیں تو لیٹ جائیں۔“ بدر نے اس کے دونوں شانے تھامتے ہوئے اسے واپس بٹھانے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے اٹھتا بُو کا بھبکا کشور کے نتھنے سے ٹکرایا۔ اس بُو اور بدر کی حرکات و سکنات نے اسے احساس دلایا کہ وہ نشے میں ہے۔ نشے میں مست آدمی ہوش و حواس سے کس قدر بیگانہ ہوتا ہے اور اخلاق کی حد سے کتنا نیچے گر سکتا ہے، کشور کو اندازہ تھا۔ وہ بدر کو ایک زوردار دھکا دیتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔ پیچھے اس کا بے ہنگم قہقہہ سنائی دیا۔ کشور کمرے سے باہر نکل کر دیوار سے پیٹھ ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ بدر کے رویے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ جس گھر کو پناہ گاہ سمجھ رہی

شکاری کتا

ایک بار ملا نصر الدین کو گورنر نے حکم دیا کہ وہ اس کے لیے ایک شکاری کتا لائیں۔ چند دنوں بعد انہوں نے ایک نہایت بے ضرر نمائشی کتا اس کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا۔ تندخو اور سخت گیر گورنر نے جیسے ہی اس کتے کو دیکھا آگ بگولا ہو گیا اور بولا۔ ”میں نے تم سے شکاری کتا لانے کو کہا تھا یہ کیا میمنہ سا بزدل کتا لے آئے؟“

ملا نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ ”حضور، آپ مطمئن رہیں یہ میمنہ آپ کی صحبت میں شکاری کتا بن جائے گا۔“

کراچی سے مبشر علی کا تعاون

تھی، وہ اتنا بھی محفوظ نہیں ہے۔ گرداب میں گھری اس کی زندگی کی کشتی کو ابھی کچھ اور طوفانوں سے نمٹنا ہے۔

☆☆☆

”کیسے خشک اور کھردرے ہاتھ ہیں تیرے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بدن کو جوتے سے رگڑ رہا ہے۔“ صرف ایک جانگیا جسم پر چڑھائے بالا اوندھے منہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور شکل سے ہی مظلوم نظر آنے والی بیوی اس کی فرمائش پر اس کے جسم کی تیل سے مالش کر رہی تھی۔ عورت کی بڑی بڑی آنکھیں اور کھڑی ناک سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ماضی میں بھی خوش شکل رہی ہوگی لیکن اب آنکھوں میں بسی ویرانی، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں اور جِلد کی مٹیالی پڑتی رنگت نے اسے قطعی بے رونق و بے کشش بنا ڈالا تھا۔ بالے کے اعتراض پر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے اس کے سانڈ جیسے بدن کا مساج کرتی رہی۔

”وہ بھی کیا عورتیں ہوتی ہیں جن کے ہاتھ جسم کو چھوئیں تو لگتا ہے مکھن ملائی سے گندھی کوئی چیز جسم کو سہلا رہی ہے۔ ایسی پیاری شکلوں والی، میٹھی میٹھی گلاں کرتی عورتیں... کہ بندہ صرف ان کے پاس بیٹھے تو آدھی تھکن اتر جائے۔ اور یہاں ایسی منحوس شکل دیکھنے کو ملتی ہے کہ چنگا بھلا بندہ بھی بیکار میں غصے میں آ جاتا ہے۔ نہ صورت دیکھ کر چین پڑے، نہ گل سننے کا جی چاہے اور نہ چھو کر سواد آئے۔“ بازارِ حسن کی سستی طوائفوں کی تعریفوں میں رطب اللسان وہ مسلسل بیوی کو کچوکے لگا رہا تھا اور اس اللہ کی بندی میں اتنی

http://digestpk.blogspot.com/

جرأت نہیں تھی کہ اسے وہ وقت یاد دلا سکے جب وہ کسی مہکتے گلاب کی سی تروتازگی لیے بالے کے آنگن میں اتری تھی۔

شادی کے وقت اس کے حسن کا پورے گاؤں میں چرچا تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ شہزادی ہے جسے کوئی شہزادہ ہی بیاہ کر لے جائے گا لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ بالے کی اس پر نظر پڑ گئی اور پھر کس کی جرأت تھی کہ اس کی طرف سے بھیجے گئے پیام کے لیے انکار کر سکے... یوں وہ جو شہزادی کہلاتی تھی، ایک دیو کی قید میں آ پھنسی۔ بالے کی چند سالہ رفاقت نے اس کی ساری تازگی اور شادابی کو نچوڑ ڈالا۔ وہ بیوی کو پیر کی جوتی بنا کر رکھنے والا ایک حیوان صفت آدمی تھا جس کی وحشت بھری قربت نے بیوی کو تین عدد بچوں کا تحفہ تو ضرور دیا لیکن اس کے من کے اندر کوئی پھول نہ کھل سکا۔ بالے کا وجود اس کے لیے ایک ایسا ناپسندیدہ بوجھ تھا جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھانے پر مجبور تھی اور مجبوری کا یہ سودا اس سے اس کا سارا حُسن چھین کر لے گیا تھا۔

”ذرا یہ پیر تو داب۔ دن بھر بھاگ دوڑ کر کر کے ٹانگیں اکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ کسی کھوتے کی طرح چودھری کی خدمت کرو، تب کہیں جا کر وہ جیب ڈھیلی کرتا ہے لیکن تم لوگوں کو کیا لوڑ...؟ تم تو آرام نال حلق تک نوالے ٹھونس کر مستاتی ہو اور اس پر یہ حال ہے کہ ہاتھ پیروں میں دم ہی نہیں۔ سالی ایسے مرے مرے ہاتھوں سے پیر داب رہی ہے جیسے ہفتے بھر سے فاقے پر ہو۔“ اس نے اپنے حکم پر مساج چھوڑ کر پیر دبانے کا کام شروع کر دینے والی بیوی کو بے نقط سنائیں۔ یہ سب سناتے ہوئے اسے قطعی یاد نہیں تھا کہ وہ بیوی کو جن حلق بھر کر کھائے جانے والے لقموں کے طعنے دے رہا ہے، وہ لقمے مشکل سے ہی اس بے چاری کے حلق سے نیچے اتر پاتے تھے۔ وہ گھر جس میں اس کے لیے نہ تو عزت تھی، نہ پیار کے دو بول... وہاں رہ کر کچھ کھایا پیا اس کے بدن کو لگتا بھی تو کیسے؟ وہ تو اس آگ میں ہی جل جل کر پگھلتی رہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کا حق طوائفوں پر لٹا آتا ہے۔ رہی سہی کسر پے در پے پیدا ہونے والے تین بچوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ بچے بھی اپنے باپ کی طرح اس کی جان سے چمٹی جونک کی طرح تھے۔ اس پر بالے کی بوڑھی ماں بھی کم نہیں تھی۔ بہو کو ہر وقت طعنوں سے چھلنی کرنا اور کبھی کبھی موقع دیکھ کر دو چار ہاتھ جڑ دینا وہ ساس ہونے کے ناتے اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔

”جانے میری آنکھوں پر کیسی پٹی بندھ گئی تھی جو میں تجھ سے بیاہ کے لیے دیوانہ ہو گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو پچھتاتا ہوں۔ میرے لیے بھلا کیا کمی تھی۔ پنڈ کی جس کُڑی پر ہاتھ رکھ دیتا، وہ میری ہو جاتی۔“ اسے بیوی کی خاموشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے جو جی میں آ رہا تھا، وہ سناتا جا رہا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ یہ بے زبان لونڈی اس کی کسی بھی بات سے اختلاف کی جرأت نہیں کرے گی۔ واقعی وہ چپ رہی لیکن دوسرے پلنگ پر سویا اس کا سب سے چھوٹا بیٹا حلق پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ عورت میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ شوہر کی خدمت گزاری سے کچھ دیر کے لیے منہ موڑ کر بچے کو دیکھ لے۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اس کے پیر دباتی رہی۔

”پہلے اسے دیکھ... پتا نہیں مردود کو کہاں درد اٹھا ہے۔ ایک تو ماں میں کوئی گن نہیں، اوپر سے اولاد بھی ایسی پیدا کی ہے جو کچھ دیر چین نہیں لینے دیتی۔“ اس نے پیر دباتی بیوی کے پہلو میں ایک لات رسید کرتے ہوئے بیزاری سے اسے حکم دیا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور دوسرے پلنگ پر سوئے بچے کو جا کر چیک کیا۔ بچے نے پیشاب کر لیا تھا اور اسی وجہ سے بے چین ہو کر رو رہا تھا۔ اس نے اس کے کپڑے تبدیل کروائے اور پھر اسے دودھ پلانے لگی۔ ماں کے جسم سے غذا اور حرارت اپنے جسم میں منتقل ہو جانے پر بچہ ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ بچے کو پلنگ پر لٹا کر آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔

”کاکے کے پاس جا کر ہی مر گئی ہے کیا؟ خاوند کا تجھے کچھ خیال نہیں کہ تیری راہ دیکھ رہا ہے۔“ نیم تاریک کمرے میں بالے کی غراتی ہوئی آواز گونجی تو وہ جلدی سے بچے کو چھوڑ کر اس کے پلنگ کی طرف لپکی اور آہستگی سے پائنتی بیٹھ کر ایک بار پھر اس کے پیر دبانے لگی۔

”چل چھوڑ یہ پیر دابنا۔ اب لیٹ جا۔“ بالے کی آنچ دیتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو سارے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ کئی سال کی رفاقت اور تین بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اس کا یہ عالم تھا کہ شوہر کی قربت کے خیال سے کانپ جاتی تھی۔ وہ وحشی تھا جس کی وحشت کے مٹنے ... تک وہ نڈھال ہو کر رہ جاتی تھی... لیکن بہر حال انکار کی تاب بھی نہیں تھی چنانچہ چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ فوراً ہی ایک بالوں بھرا بازو اس کے جسم سے لپٹا اور پھر وہ اپنی سخت انگلیوں سے اس کے نازک جسمانی خطوط کو ٹٹولنے لگا۔ وہ ہونٹ بھینچے کسی مٹی کے مادھو کی طرح پڑی رہی۔ اس کی یہ سرد مہری کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ دوسرا فریق طلب کی آگ میں اس بُری طرح جھلس رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھی کے سرد جذبات سے کوئی غرض نہیں

تھی۔ اپنی طلب کو مٹانے کے لیے وہ مٹی کے اس مادھو کو بُری طرح بھنبھوڑے جا رہا تھا۔ اس کی کسی بن مانس کی سی گرم اور پُروحشت سانسوں کی... بُو کو بار بار سانس روک کر برداشت کرنے کی کوشش کرتی اس کی بیوی ان لمحوں کے مختصر ہو جانے کی دعا مانگ رہی تھی۔ یہ دعا وہ ہر ایسے موقع پر ہمیشہ مانگتی تھی لیکن آج حیرت انگیز طور پر اس کی دعا قبول بھی ہو گئی۔

”بالے بھائی!“ کسی نے بیرونی دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے کے ساتھ بلند آواز میں پکارا۔

”باہر کوئی تمہیں بلا رہا ہے۔“ بالا فوری طور پر ہوش میں نہیں آیا تھا لیکن اس کی بیوی نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ وہ اپنی نجات کا یہ موقع کیوں ضائع ہونے دیتی۔

”اس وقت کون آ گیا؟“ وہ بڑبڑایا اور طوعاً و کرہاً بدن پر دھوتی لپیٹتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ اس دوران دروازے پر دوبار مزید دستک دی جا چکی تھی۔

”کون ہے بھئی جس سے دو منٹ کا صبر نہیں ہو رہا؟“ بالے نے دہاڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ایک تو مسلسل دستک نے اسے جھنجلا دیا تھا، دوسرے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے گاؤں میں، اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے کر اسے باہر بلانے والا اس کا کوئی دشمن ہو سکتا ہے۔ وہ بنا کسی احتیاط کے غصے میں دندناتا ہوا باہر نکلا تھا لیکن باہر نکلتے ہی جس طرح اسے چاروں طرف سے چھاپ لیا گیا، اس سے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چھاپنے والوں نے اسے کچھ اس طرح سے چھاپا تھا کہ وہ ہاتھ پیر چلانا تو دور کی بات، منہ بھی نہیں کھول سکا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نکلنے سے قبل ہی اس کے منہ میں کپڑے کا گولا ٹھونس کر اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اسے اس طرح بے دست و پا کرنے کے بعد وہ لوگ اسے لے کر چل پڑے۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ جلدی سو جانے کے عادی گاؤں کے باسیوں میں سے اس کی یہ درگت دیکھنے کے لیے سنسان راہوں میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر کہیں کسی نے کچھ دیکھا بھی ہو گا تو انجان بن گیا ہو گا کیونکہ وہ پیدا ہونے کے بعد سے یہی سبق سیکھتے آئے تھے کہ ایسے ہر منظر پر آنکھیں بند کر لو اور بعد میں بھی زبان بند رکھو تو اسی میں بہتری ہے۔

بالے کو اٹھا کر لے جانے والے اسے چودھری کے اس گودام تک لے گئے جہاں ایکسپورٹ کیے جانے والے پھلوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ بہترین پیکنگ میں موجود یہ پھل اپنے اگانے والوں کو بھی میسر نہیں آئے تھے۔ جن کے خون پسینے کی محنت ان پھلوں میں ذائقہ اتارتی تھی، وہ اس کا ذائقہ چکھنے سے بھی محروم تھے کیونکہ ان کو اُگائے جانے کا مقصد صرف اور صرف چودھری کے خزانے میں اضافہ کرنا تھا۔ کل ان پھلوں کی پہلی کھیپ روانہ ہونی تھی۔ بالے کو ساتھ لے کر جانے والے گودام تک پہنچے تو اس نے دیکھا کہ گودام کے دروازے پر ڈیوٹی دینے والا چوکیدار موجود نہیں ہے۔ اسے لے جانے والے اسے گودام کے اندر لے گئے اور کسی بے جان شے کی طرح ..... اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اس طرح پھینکے جانے سے اس کی کمر اور بازوؤں پر شدید چوٹیں لگیں اور اس نے بے ساختہ ہی چیخنے کی کوشش کی لیکن منہ میں ٹھنسے کپڑے کے گولے کی وجہ سے اس کی چیخیں اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے موجود چاروں افراد کو دیکھنے لگا۔ ان چاروں نے سیاہ رنگ کے چست لباس پہن رکھے تھے اور چہروں کو ماسک کے پیچھے چھپایا ہوا تھا۔

بالے نے اپنی ساری زندگی چودھری کے لیے غنڈا گردی کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن اس کی زندگی میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ تن تنہا اور بالکل نہتا اس طرح کہیں پھنس گیا ہو۔ اب وقت آیا تو اس کی حالت خراب تھی۔ وہ اشاروں میں خود کو گھیر کر لانے والوں سے التجائیں کرنے لگا لیکن وہ لوگ ایسا لگتا تھا کہ آنکھوں سے اندھے ہیں جنہیں اس کا کوئی اشارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کسی بھی التجا کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے گودام میں ہی ایک طرف رکھے ڈنڈے اٹھائے اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ ان کا نشانہ اس کے دونوں پیر اور بازو تھے۔ وہ بے دردی سے ان دونوں اعضا پر تابڑ توڑ وار کرتے رہے۔ تکلیف کی شدت سے بے حال بالے کی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑتی رہیں۔ مارنے والوں نے اسے کسی رسّی وغیرہ سے باندھا نہیں تھا لیکن وہ اسے اتنی مہلت بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اٹھ کر بھاگ سکے اور اس گودام سے باہر نکل سکے۔ اپنے بازوؤں اور پیروں پر پے در پے وار سہتے بالے کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ وہ منہ میں پھنسایا گیا کپڑے کا گولا ہی کھینچ کر باہر نکال سکے اور کسی کو اپنی مدد کے لیے پکارے۔ اس نے کئی بار یہ کوشش کر کے بھی دیکھی لیکن اس کا ہاتھ ابھی اس کے منہ تک پہنچ نہیں پاتا تھا کہ کسی نہ کسی حملہ آور کے ڈنڈے کی ضرب اسے ہاتھ پیچھے کر لینے پر مجبور کر دیتی تھی۔

ایسی بے بسی اس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز لڑائی جھگڑوں اور مارکٹائی میں ہی گزرے تھے لیکن اس وقت وہ جن لوگوں کے

http://digestpk.blogspot.com/

ہتھے چڑھا تھا، وہ بڑے پروفیشنل انداز میں اسے مار رہے تھے۔ ان کی مہارت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اس کے پیروں اور بازوؤں کو نشانہ بنایا تھا۔ اب تک ایک بھی وار ان دونوں اعضا کے سوا جسم کے کسی دوسرے حصے پر نہیں پڑا تھا۔ اپنی زندگی کے اس پہلے بدترین تجربے سے گزرتے بالے نے بالآخر مزاحمت ترک کر دی۔ یوں بھی اب اس میں مزاحمت کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ روح تک کو لرزا دینے والی تکلیف سہتے ہوئے وہ یہ بات محسوس کر چکا تھا کہ اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ اور چٹخ چکی ہیں اور اب اگر ان لوگوں نے اسے زندہ چھوڑ بھی دیا تو وہ طویل عرصے تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گا۔ وہ گودام کے فرش پر کسی قربان کیے جانے والے بکرے کی طرح پڑا تڑپ رہا تھا اور اپنے سینے میں ہی قید ہو جانے والی چیخوں کو خود ہی سنتے ہوئے اس کے دماغ میں بے شمار مظلوموں کی وہ چیخیں گونج رہی تھیں جن سے کبھی وہ قہقہے لگاتے ہوئے لطف اندوز ہوا تھا۔

اپنی زندگی کے ان نازک ترین اور اذیت ناک لمحات میں اسے وہ سب کچھ یاد آ رہا تھا جسے کرتے ہوئے اس نے کبھی انسانیت کا بھرم رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کسی کتے یا گھوڑے کی طرح چودھری کا سدھایا ہوا ایک جانور بن کر اس کے اشاروں پر چلتا رہا تھا۔ اس نے اپنی حیوانی جبلت کو چودھری کے نمک کا حق ادا کرنے کے لیے خوب استعمال کیا تھا اور اب خود بھی کسی حیوان ہی کی طرح کے سلوک سے گزر رہا تھا۔ اس سلوک کو سہتے سہتے آخرکار اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور بالآخر اپنے خون میں لتھڑا وہ بے ہوشی کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اسے مارنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے تو انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور ہاتھوں میں موجود ڈنڈے ایک طرف پھینکتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ وہ چار تھے جن میں سے دو نے اسے کسی تعفن زدہ چوہے کی طرح زمین سے اٹھایا اور گودام سے باہر کی طرف لے گئے۔ ان کی منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ انہوں نے اسے گودام سے کچھ فاصلے پر موجود ایک درخت کے نیچے لے جا کر پھینک دیا۔ اسی درخت کے نیچے گودام کا چوکیدار بھی بے ہوش حالت میں پڑا تھا۔ چوکیدار کو بالے کی طرح تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ اسے صرف سر پر کسی بھاری شے کی ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ بالے کو چوکیدار کے قریب پھینکنے کے بعد وہ دونوں واپس گودام کی طرف پلٹے اور قریب ہی کھڑی جیپ میں سوار ہو کر منتظر نظروں سے گودام کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ ایک طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق عمل کر رہے تھے اس لیے انہیں اندر جا کر یہ دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی کہ ان کے ساتھی اندر کیا کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ وہی کچھ کر رہے ہوں گے جو طے کر کے آئے ہیں۔ آخرکار مختصر وقفے کے بعد... ان کا انتظار ختم ہو گیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو گودام سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں کے جیپ میں سوار ہوتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے جیپ اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اب وہ بڑی خاموشی لیکن برق رفتاری سے پیرآباد کی حدود سے نکل رہے تھے۔ وہاں سے نکلنے سے پہلے انہوں نے اپنے عقب میں موجود گودام میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا رقص دیکھا اور اپنے مشن کی سو فیصد کامیابی کا یقین لیے ہوئے پیرآباد سے باہر نکل آئے۔ ان کی اگلی منزل نورکوٹ میں تھی۔ نورکوٹ پہنچے تو کوئی ان کا منتظر تھا۔ انہوں نے جیپ اس منتظر آدمی کے حوالے کی اور پھر نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اپنے لیے تیار کیے جانے والے آرام دہ کمروں میں جا کر خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

رات کا باقی حصہ انہوں نے نہایت سکون سے گزارا اور پھر صبح ایک پُرتکلف ناشتے کے بعد صاف ستھرے لباسوں میں ملبوس ایک گھنٹے کے وقفے کے ساتھ دو دو کی ٹولی بنا کر بس اڈے پر پہنچ گئے۔ ان کے معزز حلیوں کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پچھلی رات پیرآباد میں داخل ہو کر چودھری کے سب سے سرچڑھے غنڈے کو عبرت کا نشان بنانے والے چار سیاہ پوشوں سے ان کا کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہی تو ان کا کمال تھا جسے مدِنظر رکھتے ہوئے انہیں اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

☆☆☆

دفتر پہنچنے کے کچھ دیر بعد شہریار کو جو پہلی فون کال موصول ہوئی وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔

''میں آفتاب احمد بات کر رہا ہوں سر!'' کال کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا تو پہلے تو وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا پھر اشتعال کی ایک زوردار لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس شخص آفتاب احمد کو وہ کتنا پسند کرتا تھا۔ اس کے عزائم اور مستقل مزاجی نے اسے اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ سوچتا تھا کہ آفتاب احمد کو دوسروں کے لیے ایک مثال بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسکول کے ساتھ آفتاب کی گہری وابستگی نے اسے ہمیشہ یہ احساس دلایا تھا کہ وہ اس کی ٹیم کا سب سے

بہترین ممبر ہے لیکن آفتاب نے اسے بُری طرح مایوس کیا تھا۔ صرف ایک لڑکی کی خاطر وہ اپنی برسوں کی محنت اور شہریار کا لگایا گیا سرمایہ داؤ پر لگا کر چلا گیا۔ اگر وہ چودھری کی بیٹی کے عشق میں مبتلا ہونے کی غلطی نہیں کرتا تو نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی۔ چودھری جو پہلے ہی اسکول کا سخت مخالف تھا، طیش کی وجہ سے ہر حد پار کر گیا تھا۔

''خیریت! تم نے کیسے مجھ سے رابطہ کرنے کی زحمت کی؟'' اپنے اشتعال کو سرد مہری میں لپیٹ کر اس نے آفتاب سے سوال کیا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں سر کہ فوری طور پر آپ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ حالات ہی کچھ ایسے رہے کہ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکا لیکن رات پچھلے دنوں کے اخبارات میں پیرآباد سے متعلق خبریں پڑھیں تو رہ نہیں سکا۔ پوری رات شدید کرب کے عالم میں گزری۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا، ایسا لگتا ہے کہ اخبارات میں جو کچھ چھپا ہے سب غلط ہے۔'' آفتاب کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ شدید جذباتی کیفیت سے گزر رہا ہے اور کسی بھی لمحے رو پڑے گا۔

''حالانکہ اتنے عرصے تک چودھری کو بھگتنے کے بعد تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں سے کوئی بھی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ چودھری جیسا منتقم مزاج اور کینہ پرور آدمی کبھی بھی اور کسی بھی حد سے گزر سکتا ہے اور وہ ایسا کر کے دکھا چکا ہے۔ اسکول کی عمارت کو جو نقصان پہنچا، اس کا مجھے اتنا غم نہیں ہے۔ مالی نقصان قابلِ تلافی ہوتے ہیں لیکن جو انسانی زندگیاں ضائع ہو گئیں، ان کا نعم البدل کہاں سے لایا جائے؟ کیا قصور تھا منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کا؟ بس یہی نا کہ وہ خلوصِ نیت کے ساتھ ہمارے مشن میں شامل تھے اور گاؤں کے بچوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا چاہتے تھے۔ وہ بالکل بے ضرر لوگ تھے جن کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن ان بے چاروں کو تمہارے حصے کی سزا بھگتنی پڑی۔ چودھری کو تم نہیں ملے تو اس نے ان مظلوموں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالا۔'' وہ اتنے غصے میں تھا کہ آفتاب کی افسردگی محسوس کرنے کے باوجود اس سے کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں ہوا اور بے نقط سناتا چلا گیا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں سر! میں خود بھی منیب اور دیگر اساتذہ کی موت کے لیے خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں لیکن یقین جانیے کہ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ چودھری اس حد تک گر جائے گا۔ اور ویسے بھی جو کچھ ہوا، ویسا کب کسی نے سوچا تھا۔ میں تو خود حالات کے دھارے پر بہتا چلا گیا۔ میں نے کبھی اپنی زندگی کے اس رخ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میری زندگی میں اسکول اور اپنے کاغذ قلم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کشور کیسے اچانک میری زندگی میں آئیں اور میں کیسے ان کی محبت میں ڈوبتا چلا گیا، مجھے بھی اندازہ نہیں۔ شاید لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ جذبہ اتنا زورآور ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کی ایک نہیں چلتی۔ میں بھی اس منہ زور جذبے پر کوئی بند نہیں باندھ سکا۔ حالانکہ یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے پیرآباد چھوڑنے اور اپنے اسکول سے دور ہونے کا کتنا دکھ ہے اور اب اس دکھ میں اپنے ساتھیوں کی ناحق موت کا دکھ بھی شامل ہو کر میرے لیے کیسی اذیت بن گیا ہے۔'' آفتاب کا کہا ایک ایک لفظ سچائی سے پُر تھا، یہ بات شہریار بھی سمجھتا تھا چنانچہ اس بار جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کا لہجہ ذرا نرم تھا۔

''تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا آفتاب! تم جانتے تھے کہ تم ایک ایسے شخص کی بیٹی سے محبت کر رہے ہو جو کسی صورت اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔ اب دیکھ لو کہ اس کا کیا ردِعمل سامنے آیا ہے۔ وہ ملازمہ رانی جو تمہاری رازداں تھی، دوسری دو ملازماؤں کے ساتھ پہلے ہی ہلاک ہو چکی ہے۔ تمہیں اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا، یہ بھی مجھے معلوم ہے۔ منیب اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے پیچھے تمہارے فرار سے چودھری کو ہونے والی کھسیاہٹ ہے، یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اور ابھی وہ مزید کہاں تک جائے گا اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کو بھی نہیں بخشا ہو گا۔ حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے اس پر کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہوں گے، اس کی خبر دینے والا بھلا کون ہے؟''

''آپ کشور کے لیے پریشان نہ ہوں سر! وہ بہ خیروعافیت ہیں اور میرے ساتھ ہی ہیں۔'' آفتاب کے اس انکشاف نے اسے بُری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا مطلب؟ یہ کیسے اور کب ہوا؟'' وہ اپنی حیرت کو لہجے میں در آنے سے نہیں روک سکا۔ جواب میں آفتاب نے وہ سارے حالات بیان کر دیے جن کے باعث اسے کشور کو فوری طور پر پیرآباد سے نکال لے جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ شہریار خاموشی سے ساری تفصیلات سنتا رہا۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا کہ چودھری کا اتنا شدید ردِعمل سامنے کیوں آیا تھا۔ وہ شخص جو بیٹی کے معاشقے کی خبر سننے کا بھی ظرف نہیں رکھتا تھا، اتنی بڑی بات پر تو اس کا آپے سے باہر ہو جانا ایک یقینی سی بات تھی۔

http://digestpk.blogspot.com/

”تم اپنے آپ کو بہت بڑی مشکل میں گرفتار کر چکے ہو۔ چودھری کسی صورت تم دونوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ کسی طرح تمہیں ڈھونڈ نکالے اور اس کے بعد وہ تمہارا کیا حشر کرے گا، اس کا اندازہ تو تم اس کی قید میں گزارے گئے وقت کو یاد کر کے بخوبی لگا سکتے ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ ابھی تو تمہارے وہ زخم ہی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے ہوں گے اور تم بغیر سہارے کے اپنے قدموں پر چلنے کے لائق بھی نہیں ہو سکے ہو گے۔“ شہریار نے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرے ان اجنبی محسنوں کے پیچھے آپ ہی تھے ناسر جنہوں نے مجھے چودھری کی قید سے آزادی دلوائی؟ ان لوگوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن میرا موہوم سا اندازہ تھا کہ شاید یہ آپ ہی ہوں جن کی وجہ سے مجھے اس قید سے نجات ملی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ سر!“ آفتاب جو مسلسل اس الجھن میں رہا تھا کہ اس کو چودھری کی قید سے کس نے آزادی دلوائی، اس کے بعض جملوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے ممنونیت کا اظہار کرنے لگا۔

”تم اچانک اس اسپتال سے کہاں غائب ہو گئے تھے جہاں تمہیں علاج کے لیے داخل کروایا گیا تھا؟“ شہریار نے بھی گویا بالواسطہ طور پر اپنی مدد کو تسلیم کر لیا اور اس سے دریافت کرنے لگا۔ جگو نے آفتاب کو جس اسپتال میں داخل کروایا تھا، وہ وہاں سے اچانک ہی غائب ہو گیا تھا اور تحقیقات سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی دوست کی مدد سے وہاں سے گیا تھا۔ آفتاب اپنی مرضی سے گیا ہے، یہ جان کر شہریار کی پریشانی تو دور ہو گئی تھی لیکن یہ الجھن بہر حال رہی تھی کہ وہ کہاں چلا گیا ہے چنانچہ اب یہ سوال اس سے پوچھ بیٹھا۔

”افضل کا خیال تھا کہ میرا اس اسپتال میں رہنا میری سلامتی کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے اس لیے اس نے مجھے ایک دوسرے اسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا۔ افضل کی موت کے بعد اس کے ایک صحافی دوست نے اس اسپتال سے بھی مجھے شفٹ کروا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چودھری میرے زخمی ہونے کی وجہ سے مختلف اسپتالوں میں تلاش کروا رہا ہوگا اس لیے مجھے اب کسی اسپتال میں نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ چند منٹوں کے فرق نے مجھے چودھری کے بندوں کے ہاتھ لگنے سے بچا لیا ورنہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہ لوگ اس اسپتال تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اب میں لاہور سے دور ایک دوسرے شہر میں ہوں۔ کشور میرے ساتھ ہیں اور ہم دونوں فی الحال خود کو کافی محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا ہے اور قلمی نام کی وجہ سے میرے پکڑے جانے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن میں پیر آباد کے حالات کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بارشوں کی وجہ سے جو پریشانی پیدا ہوئی ہے، اس سے تو خیر آپ آہستہ آہستہ نمٹ ہی لیں گے لیکن اسکول کے بارے میں سوچ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ منیب اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اس کے بعد تو کوئی بھی دوسرا استاد وہاں آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود وہاں پہنچ جاؤں لیکن اس سے بھی کیا فائدہ ہوگا؟ چودھری تو مجھے پیر آباد کی فضا میں دوسرا سانس لینے کا بھی موقع نہیں دے گا۔“ آفتاب کے لہجے میں حقیقی پریشانی تھی جسے محسوس کر کے شہریار کو اسے تسلی دینی ہی پڑی۔

”تم یہاں کی فکر نہ کرو۔ اسکول کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ماریا کی والدہ مسز جوزف نے اسکول میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے مجھے اپنے تعاون کی پیشکش کی ہے۔ جب تک حالات سنبھل نہیں جاتے، مسز جوزف اسکول کا انتظام دیکھ لیں گی۔ بس یہ سمجھو کہ تم نے جس طرح زیرو سے کام شروع کیا تھا، اسی طرح اب مسز جوزف کو کرنا ہوگا۔ خیر، کوئی بات نہیں... کام جاری رہنا چاہیے، باقی تو سب آہستہ آہستہ معمول پر آ ہی جاتا ہے۔ تمہارے لیے اب میرا یہی مشورہ ہے کہ جہاں ہو، وہاں خاموشی اور سکون سے رہو۔ حالات ذرا بہتر ہو جائیں تو پھر تم کچھ اور کرنے کا سوچ سکتے ہو۔ ویسے بھی دنیا کوئی پیر آباد کے اسکول پر ختم نہیں ہو جاتی پیر آباد کے علاوہ بھی وطن عزیز میں ایسے بہت سے گاؤں اور دیہات ہیں جہاں کے بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ تم ایسے کسی دوسرے گاؤں میں کام شروع کر سکتے ہو۔ مقصد تو علم کی روشنی پھیلانا ہے۔ چراغ کو اس سے کیا مطلب کہ وہ کہاں جل رہا ہے؟ ہاں، اگر کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ مجھ سے جو ممکن ہو سکا، وہ تمہارے لیے ضرور کروں گا۔“ اس نے آفتاب کو ایک صائب مشورہ دیتے ہوئے فون بند کر دیا اور کچھ دیر گم صم سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ وہ محبت کی طاقت پر غور کر رہا تھا۔ کیسا عجیب جذبہ تھا کہ ایک شخص کو اس کی زندگی کے محور و مرکز سے اتنی دور کھینچ کر لے گیا اور وہ کچھ نہیں کر سکا۔

کچھ دیر آفتاب کے بارے میں سوچنے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لیے

اطمینان کی بات یہ تھی کہ بارشوں کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا تھا اور جو لوگ اپنے گھر چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے تھے، وہ اب اپنے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ جن لوگوں کی املاک زیادہ متاثر ہوئی تھیں اور وہ روزمرہ زندگی کے معمولات میں شامل ہونے سے معذور ہو گئے تھے، ان کے لیے اس نے اپنی ٹیم کی مدد سے ایک مربوط پلان بنایا تھا اور اس پلان کے مطابق لوگوں کی امداد کا سلسلہ شروع کیا جا چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی باقی ماندہ چھوٹے موٹے مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور وہ رک جانے والے ترقیاتی منصوبوں پر ایک بار پھر کام شروع کروا سکے گا۔ اس وقت وہ کاغذوں کے پلندے میں الجھا ہوا انہی معاملات کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی اور اسے آئی جی مختار مراد کی کال کی اطلاع دی گئی۔ اس اطلاع کو سن کر اس کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ اس کی متوقع فون کال تھی جس کا وہ صبح سے انتظار کر رہا تھا۔

”السلام علیکم انکل! کہیے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ آپریٹر نے اس کی طرف سے اجازت ملنے پر لائن ملائی تو اس نے پہل کرتے ہوئے انہیں سلام کیا اور بڑے جوش سے حال احوال پوچھنے لگا۔

”وعلیکم السلام۔ اللہ کا شکر ہے، میں بالکل بہ خیر و عافیت ہوں لیکن تم بتاؤ کہ تمہاری طرف کیا چل رہا ہے؟ آئے دن مار دھاڑ اور قتل و غارت کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ کل رات بھی سنا ہے کہ چودھری افتخار کے دو بندے زخمی ہو گئے جن میں سے ایک کی حالت بہت خراب ہے۔ حملہ آوروں نے چودھری کے پھلوں کے گودام میں بھی آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے اس کا بہت بڑا مالی نقصان ہوا ہے۔“ حسبِ توقع مختار مراد نے اس سے اسی موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے فون کیا تھا جس کا وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔

”سنا تو میں نے بھی ہے یہ سب کچھ۔ صبح دفتر آنے سے پہلے ہی ایس پی نے فون کر کے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ایف آئی آر کاٹو اور تفتیش کرو کہ کس نے یہ حرکت کی ہے۔ اگر مجرم پکڑے گئے اور ان کا جرم ثابت ہو گیا تو پھر ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔“ اس نے نہایت اطمینان سے مختار مراد کو جواب دیا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ چودھری نے مشکوک افراد کی فہرست میں تمہارا نام بھی لکھوایا ہے... بلکہ سب سے زیادہ زور ہی تمہارے نام پر دیا ہے؟“ مختار مراد نے گہری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”اب میں کیا کر سکتا ہوں کہ چودھری کو اپنے ہر بگڑے معاملے کے پیچھے میرا ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو کل اس کا جو بندہ شدید زخمی ہوا ہے اس کی شہرت کوئی اچھی نہیں ہے۔ اسے علاقے کا سب سے بڑا غنڈا

دور اندیش

ہمیش اسٹیشن پر بیٹھا ٹرین کی آمد کا منتظر تھا کہ ایک اجنبی نوجوان اس کے پاس آیا اور اس سے وقت پوچھا۔ ہمیش نے اس کے سوال کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔

اجنبی نوجوان نے دوبارہ، سہ بارہ وقت پوچھا مگر ہر مرتبہ ہمیش نے حقارت سے اسے دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

اجنبی نوجوان نے حیرت سے کہا۔ ”دیکھیے جناب! میں آپ سے ایک ایسی درخواست کر رہا ہوں جس کے باعث آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں صرف وقت پوچھ رہا ہوں۔ آخر آپ اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟“

”میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ ہمیش نے کہا۔ ”اور اب غور سے میری بات سنو۔ میں یہاں ٹرین کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم جو میرے لیے بالکل غیر اور اجنبی ہو، آتے ہو اور وقت پوچھتے ہو۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں وقت بتا دوں مگر جانتے ہو پھر کیا ہوگا؟ تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔ ہم دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں گے۔ باتیں کرتے کرتے تم کہو گے، آؤ ایک پیالی چائے پی آئیں۔ بس ہم چائے پئیں گے پھر تم ٹرین میں میرے ساتھ بیٹھ جاؤ گے۔ اسٹیشن پر میری انیس سالہ خوب صورت بیٹی مجھے لینے آئے گی۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی عاشق ہو جاؤ گے۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہوں گی اور میری بیٹی مجھ سے کہے گی۔ پاپا میں شادی کروں گی تو اس سے کروں گی ورنہ ساری زندگی کنواری ہی بیٹھی رہوں گی۔ لیکن یہ سمجھ لو میں ایک ایسے شخص کو اپنا داماد ہرگز نہیں بنا سکتا جس کے پاس گھڑی تک نہیں ہے۔ اب سمجھے میں تمہیں وقت کیوں نہیں بتا رہا ہوں؟“

دانش اظہار کی پسندیدگی

http://digestpk.blogspot.com/

تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے تو بے شمار دشمن ہوتے ہیں۔ کسی کا بھی داؤ چل گیا ہوگا اور اس نے اپنی کوئی دشمنی نکال لی ہوگی۔ میرا بھلا اس قسم کے غنڈوں سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی تو سیدھے سیدھے پولیس کے ذریعے اسے اٹھواتا اور ڈرائنگ روم میں رکھ کر ایسی خاطر مدارات کرواتا کہ رات والے واقعے میں اس کی جتنی ہڈیاں بچ گئی ہیں، اتنی بھی نہیں بچ پاتیں۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے مجھ سے اس معاملے میں بازپرس کرنے کی زحمت کیوں کی؟ کیا آپ کو بھی شک ہے کہ میں ایسے کسی کام میں انوالو ہوسکتا ہوں؟'' اپنے حق میں دلائل دیتے دیتے اس نے اچانک ہی مختار مراد سے شکوہ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں چودھری نے خود مجھے فون کیا تھا اور تمہارے خلاف شکایت کی تو میں نے سوچا کہ تم سے اصل معاملہ پوچھ لوں۔'' مختار مراد اس کے اس سوال پر تھوڑا سا بوکھلا کر وضاحت دینے لگا۔ اپنی برسوں کی ملازمت میں اس نے اس طرح کی بڑی الٹ پھیر دیکھی تھی۔ شہریار کا پُراعتماد لہجہ مختار مراد کو اسے مشکوک سمجھنے سے روک نہیں سکتا تھا لیکن وہ اس کے لیے جو پدرانہ جذبات اپنے دل میں محسوس کرنے لگا تھا، ان کی وجہ سے شہریار کے لہجے میں موجود شکوے نے اسے جذباتی کردیا تھا۔ وہ اس کے اکلوتے مرحوم داماد سجاد رانا کا بالکل بھائیوں جیسا کزن تھا اور سجاد رانا کی موت کے بعد وہ اس کے اندر اسی کا عکس دیکھنے لگا تھا۔ شاید یہ اولادِ نرینہ سے محروم ایک تنہا شخص کی ایک ایسی اندرونی کمزوری تھی جس نے کچھ اس طرح اسے مغلوب کیا تھا کہ وہ خود بھی اس سے واقف نہیں ہوسکا تھا۔

''اصل میں بات یہ ہے انکل کہ میں نے منیب اور اس کے ساتھی اساتذہ کے قتل کے سلسلے میں چودھری پر شک ظاہر کیا ہے اور بے وجہ نہیں کیا۔ منیب کی مرنے سے پہلے جو آخری کال مجھے موصول ہوئی تھی، اس میں اس نے صاف لفظوں میں یہ بات کہی تھی کہ چودھری کے کارندوں نے اس کے مکان کو گھیر لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فون کال کی کوئی قانونی حیثیت نہیں اور نہ ہی میرے پاس وہ گفتگو ریکارڈ ہے کہ میں عدالت میں ثبوت کے طور پر پیش کرسکوں۔ لیکن خود مجھے بھی یقین ہے اور چودھری بھی جانتا ہے کہ اس واردات کے پیچھے کون تھا۔ اب چودھری کو موقع ملا ہے تو اس نے جوابی کارروائی کے طور پر مجھے ایک کیس میں مشکوک نامزد کردیا ہے۔ اس طرح کے الزامات میرے اور اس کے درمیان جاری لڑائی کا ایک حصہ ہیں۔ آپ ان باتوں کی ٹینشن مت لیں۔ چودھری کچھ بھی ثابت نہیں کرسکے گا بلکہ میں الٹا اس پر الزام لگادوں گا کہ اس نے خود اپنے کارندے کو پٹوایا اور اپنے گودام میں آگ لگوائی ورنہ اور کس میں ہمت ہے کہ باہر سے آکر اس کے خلاف اس کے علاقے میں کارروائی کرسکے۔'' وہ پوری تیاری کے ساتھ بیٹھا تھا اور مختار مراد کے ہر سوال کا پورے اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔

''اگر تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے پھر تم خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کرلینا۔ میں نے تو اس لیے ذکر چھیڑ دیا تھا کہ تم ہوشیار رہو اور بے خبری میں مارے نہ جاؤ۔ ویسے میرے فون کرنے کا اصل مقصد اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں تھا، میں تمہیں کچھ دوسری اہم باتوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔'' انہوں نے گویا سابقہ موضوع لپیٹ دیا۔

''وہ کیا؟'' شہریار نے فوراً ہی پوچھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ موضوع کیا ہے۔

''سجاد کے قتل کے معاملے کی تحقیقات کرتے ہوئے کچھ اہم انکشافات ہوئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ دیگر مشکوک معاملات کی تحقیقات کرتے ہوئے ہمیں سجاد کے قاتلوں کے بارے میں کچھ کلیوز ملے ہیں۔ پچھلے دنوں مری کے ایک ریسٹ ہاؤس سے ندا اور حنا نامی دو لڑکیاں گرفتار کی گئی تھیں۔ یہ لڑکیاں بظاہر وہاں سیر و تفریح کے لیے رکی ہوئی تھیں لیکن ایک تو اپنے طویل قیام کی وجہ سے نظر میں آگئیں، دوسرے یہ بھی نوٹ کیا گیا کہ دونوں بہنیں وی آئی پیز سے تعلقات قائم کرنے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔ مقامی یا غیر مقامی دونوں طرح کے سرکاری افسران، سیاست داں اور اعلیٰ فوجی عہدے داران کا خاص ٹارگٹ تھے۔ ان کی اس دلچسپی کو دیکھ کر انٹیلی جنس کے لوگ ان کے پیچھے لگ گئے اور بالآخر انہیں گرفتار کرکے ان سے یہ اگلوالیا گیا کہ وہ دونوں دراصل بھارتی ایجنٹس ہیں جن کے اصل نام ارمیلا اور گیتا ہیں۔ ان دونوں لڑکیوں نے انکشاف کیا کہ وہ لاہور میں قائم ایک میرج بیورو کی آڑ میں جسم فروشی کا بزنس کرنے والے نیٹ ورک سے جڑی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کچھ لڑکیاں خصوصی تربیت یافتہ تھیں جو درحقیقت بھارت کے لیے جاسوسی کا کام کررہی تھیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی کو سجاد سے بھی ملوایا گیا تھا اور بعد میں یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ سجاد اس لڑکی کے ذریعے ان کے نیٹ ورک تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے، اس لڑکی کو خودکشی پر مجبور کردیا گیا۔ ارمیلا اور گیتا نے قبول کیا ہے کہ اس

بات کا قوی امکان ہے کہ سجاد کو بھی را کے اشارے پر ہی ہلاک کیا گیا ہو۔ بہرحال، وہ سو فیصد پُریقین نہیں تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ میرج بیورو کی مالکن کا روپ دھار کر رہنے والی ان کی باس اصل حقیقت جانتی ہوگی لیکن اب وہ کہاں ہے، یہ انہیں نہیں معلوم۔ سجاد کے قتل کے فوراً بعد ہی میرج بیورو والا وہ سیٹ اپ ختم کردیا گیا اور اس کے بعد سے ان کا کبھی اپنی باس سے رابطہ نہیں ہوا۔ ہمارے لوگ اس میرج بیورو تک پہنچے تھے لیکن وہاں سے اس عورت کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر بات معلوم نہیں ہوئی۔ عمارت کے مالک نے عورت کا جو حلیہ بتایا ہے، وہ کسی بھی ادھیڑ عمر عیسائی عورت کا حلیہ ہوسکتا ہے جس کی بنیاد پر ہم کسی کو گرفتار نہیں کرسکتے۔ چنانچہ ہماری تحقیقات کی گاڑی اچھی خاصی چلنے کے بعد ایک بار پھر ٹھپ ہوچکی ہے۔''

''آپ کو ان دونوں لڑکیوں سے ہی اس عورت کا حلیہ اور اتا پتا معلوم کرنا چاہیے تھا۔'' مختار مراد کی فراہم کردہ معلومات سن کر اس نے جوش کے ساتھ مشورہ دیا۔

''اتا پتا تو جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا، وہ لڑکیاں جانتی ہی نہیں تھیں اور حلیہ معلوم کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔''

''کیا مطلب؟ کیوں نوبت نہیں آسکی؟'' وہ الجھا۔

''وہ کوئی معمولی لڑکیاں نہیں تھیں جو ذرا سی دھمکیوں اور تشدد پر ہمارے قابو میں آجاتیں۔ ہمیں بڑے سائنٹیفک طریقے سے ان پر کام کرنا پڑا تھا، تب کہیں جاکر یہ سب کچھ معلوم ہوا تھا۔ ہم اسٹیپ بائی اسٹیپ آگے بڑھتے ہوئے ان دونوں سے معلومات حاصل کررہے تھے لیکن بدقسمتی سے مکمل معلومات حاصل ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں مرگئیں۔ ارمیلا نے گیتا کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کردیا اور بعد میں دیوار سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو اس حد تک زخمی کرلیا کہ واپس ہوش کی دنیا میں نہیں آسکی اور تین دن کومے میں رہنے کے بعد مرگئی۔'' مختار مراد نے اس کی الجھن دور کی تو وہ گہرے تاسف میں ڈوب گیا۔ اسے یقین تھا کہ شینا اور سجاد رانا کے قاتل ایک ہی تھے لیکن ان کی بدقسمتی تھی کہ ہر بار قاتل ہاتھ میں آتے آتے بچ نکلتے تھے۔ ہر عام آدمی کی طرح اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اصل قاتلوں تک رسائی حاصل کی جاسکے تاکہ انہیں ان کے جرم کی سزا دی جاسکے۔ ان سفاک قاتلوں نے صرف شینا اور سجاد رانا ہی کو ہلاک نہیں کیا تھا، انہوں نے اس کے پورے خاندان سے زندہ رہنے کی امنگ چھین لی تھی۔ یہ امنگ اب کبھی لوٹ کر واپس نہیں آسکتی تھی لیکن زندہ لاش کی طرح جیتے لیاقت رانا، آفرین اور مریم کے دلوں کو یہ ٹھنڈک تو پہنچائی جاسکتی تھی کہ ان کے پیاروں کے خونِ ناحق کا بدلہ لیا جاچکا تھا... لیکن شاید ابھی وہ وقت آنے میں کچھ مدت باقی تھی اور انہیں صبر سے اس مدت کے گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

''تم آج میرے ساتھ میرے گھر چل رہی ہو۔'' پریکٹیکل ختم ہونے کے بعد وہ لوگ لیب سے باہر نکل رہے تھے، تب راحیلہ نے ماہ بانو کا ہاتھ تھامتے ہوئے یہ حکم صادر کیا۔

''اتنی اچانک؟ پھر کسی دن کا پروگرام رکھ لو۔ اس طرح اچانک جانے میں تو مشکل ہوجائے گی۔'' ماہ بانو نے انکار کیا۔

''کیسی مشکل؟ تمہیں کون سا گھر والوں کو جواب دہی کرنی ہے۔ ہاسٹل ہی تو جانا ہے۔ تین چار گھنٹے لیٹ بھی پہنچ جاؤ گی تو کیا بگڑے گا؟'' راحیلہ نے اس کے انکار کو قطعی اہمیت نہیں دی۔

''لیکن آج ہی جانا کیوں ضروری ہے؟ بعد میں کسی اور دن اطمینان سے بھی تو جایا جاسکتا ہے۔'' ماہ بانو کو اس

مجبوری

ریلوے اسٹیشن پر نوجوان جوڑا کھڑا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کی ناکام کوششیں کررہے تھے۔ ادھر سے گزرنے والے انہیں دیکھتے تو دل ہی دل میں افسوس کرتے کہ بے چاروں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑ رہا ہے۔ اسی اثنا میں انجن سے سیٹی کی آواز آئی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔

لڑکی روتی ہوئی اپنے ڈبے میں چلی گئی جبکہ لڑکا پلیٹ فارم پر کھڑا ہوکر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلانے لگا۔ ٹرین روانہ ہونے کے بعد ایک عمر رسیدہ خاتون جو جدائی کے اس منظر کو بغور دیکھتی رہی تھیں، لڑکی کے پاس گئیں اور اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''بس بس بیٹی! رونا بند کرو۔ میں جانتی ہوں کہ تم محض اس لیے رو رہی ہو کہ تمہیں اپنے شوہر کو چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔''

''نہیں۔'' لڑکی نے سسکی بھر کر کہا۔ ''میں اس لیے رو رہی ہوں کہ مجھے شوہر کے پاس جانا پڑ رہا ہے۔''

شاہین تبسم کا انتخاب کراچی سے

http://digestpk.blogspot.com/

طرح اچانک اس کے گھر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اپنے سابقہ تجربات کی بنیاد پر وہ ذرا محتاط رہنا چاہتی تھی اور احتیاط پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ محدود رکھے لیکن راحیلہ کے اصرار کو دیکھتے ہوئے اس سے صاف انکار بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔

"آج چلنا اس لیے ضروری ہے کہ آج بھائی کی چھٹی ہے اور میں ان سے کہہ کر آئی تھی کہ میں اپنے ساتھ اپنی دوست کو لے کر آؤں گی۔ آپ کہیں مت جائیے گا۔ اب وہ بے چارے ہمارے انتظار میں گھر پر بیٹھے ہوں گے اور تم نہیں جاؤ گی تو یقیناً انہیں بُرا لگے گا۔"

"تمہیں اپنے بھائی سے کچھ بھی کہنے سے پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی نا۔" ماہ بانو نے قدرے بے بسی محسوس کرتے ہوئے اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

"اب تو غلطی ہو گئی نا! تم کیسی دوست ہو کہ دوست کی ایک غلطی کو نبھا نہیں سکتیں۔ پلیز چلو نا... ہم بھائی سے ایکالوجی کا وہ ٹاپک بھی سمجھ لیں گے جو کل مسز شیرازی کے لیکچر میں سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔" راحیلہ نے اپنے اصرار میں ایک لالچ کو بھی شامل کیا۔

"ٹھیک ہے، تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو میں چلتی ہوں لیکن پلیز آئندہ ایسی غلطی نہیں کرنا۔" بالآخر ماہ بانو نے ہتھیار ڈال دیے۔

"تھینک یو۔ یہ ہوئی نا دوستوں والی بات۔" راحیلہ اس کے رضامند ہو جانے پر خوشی سے چہکی۔ پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی کالج سے باہر آ گئیں۔ باہر نکلنے سے قبل ماہ بانو نے اپنے چہرے کو اچھی طرح چادر کے پلو کا نقاب بنا کر ڈھانپ لیا تھا۔ راحیلہ کے ساتھ اس کے گھر کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اسے اطمینان تھا کہ اگر کسی آشنا کی اس پر نظر پڑ بھی گئی تو نقاب کی وجہ سے وہ شناخت نہیں کی جا سکے گی۔ راحیلہ نے رکشے والے کو کلفٹن چلنے کو کہا۔ کالج سے کلفٹن تک کا اچھا خاصا راستہ طے کرنے تک وہ ماہ بانو کو مسلسل مختلف جگہوں اور سڑکوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ ماہ بانو توجہ سے سنتے ہوئے ان ساری معلومات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کراچی اس کے لیے قطعی اجنبی شہر تھا اور یہاں آنے کے بعد سے اس نے کالج اور ہاسٹل کے سوا کوئی دوسری جگہ نہیں دیکھی تھی۔ یہاں ایسا کوئی شخص تھا ہی نہیں جو اسے یہ نیا شہر گھماتا یا اس کے بارے میں معلومات فراہم کرتا۔ آج راحیلہ کے طفیل وہ اس شہر کو دیکھ رہی تھی تو اسے اچھا لگ رہا تھا

وہ سوچ رہی تھی کہ اچھا ہی ہوا، میں نے راحیلہ کے اصرار کے آگے ہار مان لی۔ جب اس شہر میں رہنا ہی ہے تو پھر اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی ہونی چاہئیں۔ تقریباً پینتیس منٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لوگ کشادہ سے علاقے کے ایک بڑے سے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ رکشے سے اترنے کے بعد راحیلہ نے کرایہ ادا کیا اور گیٹ کے سائڈ میں لگی ڈور بیل بجا دی۔ ماہ بانو متاثر ہونے والے انداز میں اس بڑے سے گھر کا جائزہ لیتی رہی۔ راحیلہ نے اسے اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ اس کا تعلق متوسط طبقے سے ہے لیکن اب وہ جس گھر کے سامنے کھڑی تھیں، وہ اتنا شان دار تھا کہ متوسط طبقے کا کوئی شخص اس میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنی اس حیرت میں غلطاں اسے گیٹ کھولے جانے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ راحیلہ نے اس کا بازو ہلا کر اسے اندر چلنے کو کہا تو وہ ہوش میں آئی۔ گھر اندر سے بھی بہت خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔

"تم شاید اس گھر کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہو اور دل میں سوچ رہی ہو کہ راحیلہ نے تو اپنے بارے میں کچھ اور بتایا تھا... پھر یہ شان دار گھر اس کا کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی راحیلہ نے اس کی حیرانی کو بھانپ لیا اور خود ہی اس کی حیرت کو لفظوں کی زبان دے دی۔ جواباً وہ خاموش رہی۔

"اصل میں یہ گھر ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ ہمارا ذاتی گھر تو متوسط طبقے کے ایک علاقے شاہ فیصل میں ہے۔ یہاں ہم اپنے ایک ننھیالی انکل کی وجہ سے رہ رہے ہیں۔ میرے وہ انکل اپنی پوری فیملی کے ساتھ کینیڈا گئے ہوئے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ فیملی سمیت کینیڈا میں ہی سیٹل ہو جائیں گے لیکن اپنا یہ گھر انہوں نے احتیاطاً سیل نہیں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ایک سال تک جائزہ لیں گے کہ وہ اور ان کے بیوی بچے کینیڈا میں ایڈجسٹ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ایک سال بعد وہ یا تو واپس آ جائیں گے یا وہاں رہنے کی صورت میں مکان سیل کر دیں گے۔ واپسی کے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ یہ مکان سامان سمیت جوں کا توں چھوڑ کر گئے ہیں۔ کسی کو کرائے پر بھی اس لیے نہیں دیا کہ جانے کرایہ دار کس طرح چیزوں کو استعمال کریں۔ دوسرے ایک سال بعد واپس آنے یا مکان کو سیل کرنے دونوں صورتوں میں وہ کرائے داروں سے مکان خالی کرانے کی جھنجٹ سے بچنا چاہتے تھے لیکن بھرا ہوا مکان اس طرح خالی بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ ہمارے گھر آئے اور اماں سے استدعا کی کہ ان

کی عدم موجودگی میں ہم لوگ ان کے گھر میں رہائش اختیار کر لیں۔ اماں نے ان کی یہ بات مان لی، یوں ہم اس گھر میں رہتے ہیں۔ گھر میں ایک ملازم موجود ہے جو چوکیداری اور صفائی ستھرائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کی سال بھر کی تنخواہ انکل خود ادا کر کے گئے ہیں۔ باقی کچن کا کام کاج رہ جاتا ہے تو کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا ہے۔ اماں یہاں ہوں تو وہ کچھ پکا دیتی ہیں ورنہ بھائی ہوٹل سے کچھ لے آتے ہیں۔" راحیلہ نے ایک سانس میں پوری تفصیل کہہ سنائی۔ اس دوران میں وہ دونوں اندر لاؤنج تک پہنچ کر وہاں موجود نرم ملائم قیمتی صوفوں پر براجمان ہو چکی تھیں۔

"تمہاری اماں کیا مستقل تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہتیں؟" راحیلہ کی گفتگو سے نتیجہ اخذ کرنے کے علاوہ گھر میں چھائی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"کہاں...؟ ابا جی کی وجہ سے وہ بے چاری خوانخواہ گھن چکر بنی ہوئی ہیں۔ اصل میں ہمارے ابا ذرا اور دماغ کے آدمی ہیں۔ انہیں ہمارا اس گھر میں رہنے کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو پرائے گھر میں جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعد میں بیکار میں اپنا گھر بُرا لگنے لگے گا۔ چار دن کی چاندنی کے بعد اندھیری رات زیادہ کھلے گی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اعتراضات کے جواب میں بھائی نے کہا کہ ابا کی مرضی وہ اسی پرانے گھر میں رہیں، ہم تو چار دن کی چاندنی کے مزے لوٹنے ضرور جائیں گے۔ کیا معلوم کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ ہمیں واپس ان تپلی تپلی گلیوں اور چھوٹے مکان کی طرف پلٹنا ہی نہ پڑے۔ بس اسی وجہ سے بے چاری اماں گھن چکر بنی رہتی ہیں۔ کبھی یہاں رہتی ہیں اور کبھی ابا کے خیال سے پرانے گھر چلی جاتی ہیں۔ آج بھی وہ وہیں گئی ہوئی ہیں اس لیے تم تیار رہو، ہمیں کھانا باہر کا پکا ہوا کھانا پڑے گا۔ میرے خیال میں بھائی اسی انتظام کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔" اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے راحیلہ نے آخر میں خیال ظاہر کیا۔

"تو تم خود کھانا تیار کر لیا کرو۔ دو افراد کا کھانا پکانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟" ماہ بانو نے اسے مشورہ دیا۔

"نہ بابا! میں نہیں کر سکتی یہ کام۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں میڈیکل کے لیے اپنی میرٹ بناؤں یا ان فضول دھندوں میں پڑوں۔" راحیلہ نے ناک چڑھاتے ہوئے ایک ادا سے جواب دیا تو ماہ بانو نے اسے مزید کوئی نصیحت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی وقت پچیس چھبیس سالہ ایک شخص ہاتھ میں بہت سارے شاپرز لیے چلا آیا۔ درمیانی قامت اور

کندی رنگت والے اس [illegible] مشابہت تھی کہ ماہ بانو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ اس کے بھائی ڈاکٹر طارق ہیں۔

"یہ لو بھئی، میں لنچ کے لیے چیزیں لے آیا ہوں۔ تم چیک کر لو کہ تمہاری سہیلی کی خاطر مدارات کے لیے ان چیزوں میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔" ڈاکٹر طارق نے اپنے ہاتھوں میں موجود بھرے ہوئے شاپرز راحیلہ کو تھمائے۔

"میں چیک کر لیتی ہوں، آپ تب تک مہرین کو کمپنی دیں۔" راحیلہ اس کے ہاتھ سے شاپرز لے کر باہر نکل گئی۔ وہ ماہ بانو کے سامنے ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"راحیلہ آپ کا اکثر ذکر کرتی رہتی ہے۔ بقول اس کے پہلی بار کلاس میں کوئی ایسی لڑکی آئی ہے جو پڑھائی میں اس کی ٹکر کی ہے۔ میں نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ آپ سے دوستی کر لے۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے بتانے لگا۔ پھر گویا گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اس نے ماہ بانو سے اس کی فیملی، تعلیم اور دلچسپیوں سے متعلق ڈھیروں سوال پوچھے۔ وہ اپنے غیر معمولی حالات کو چھپاتے ہوئے اس کے تمام سوالات کے سچائی سے مگر محتاط انداز میں جواب دیتی رہی۔ راحیلہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ لوگ لاؤنج سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ ڈائننگ روم کی سجاوٹ بھی قابلِ دید تھی اور میز پر جن برتنوں میں کھانا پیش کیا گیا تھا وہ بھی نہایت نازک، نفیس اور خوب صورت تھے۔ ان تینوں نے خوش گوار موڈ میں کھانا ختم کیا اور کھانے کے بعد ایک بار پھر واپس لاؤنج میں آ گئے۔ لاؤنج میں آنے کے بعد راحیلہ کی فرمائش پر طارق نے ان دونوں کو ایکالوجی کا وہ ٹاپک سمجھایا جو انہیں کالج میں دیے جانے والے لیکچر کے دوران میں سمجھ نہیں آیا تھا۔

"اب تم لوگ آپس میں گپ شپ کرو۔ میں ایک گھنٹے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ واپس آ کر مہرین کو اس کے ہاسٹل ڈراپ کر دوں گا۔" پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوا تو طارق یہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پھر گویا اچانک کچھ یاد آ جانے پر جاتے جاتے واپس پلٹا۔

"میرے خیال میں، میں تم لوگوں کی کچھ تصویریں بنا دیتا ہوں۔ اچھا ہے یادگار رہیں گی۔" اس نے جیب سے اپنا موبائل فون نکال لیا۔ یہ کیمرے والا موبائل فون تھا۔

"تصویروں کی کیا ضرورت ہے؟" ماہ بانو تھوڑا ہچکچائی اور طارق کو روکنے کی کوشش کی۔

"کھینچنے دو نا مہرین! کون کس سے کب جدا ہو جائے

http://digestpk.blogspot.com/

کیا معلوم ہوتا ہے۔ تصویروں کی شکل میں انسان کے پاس کم از کم یادگار ہی رہ جاتی ہے۔'' راحیلہ نے پیار بھرے لہجے میں اصرار کیا تو وہ مزید انکار نہیں کر سکی۔ طارق نے جلدی جلدی اس کی اور راحیلہ کی چار پانچ تصویریں لیں اور پھر انہیں خدا حافظ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ، ماہ بانو کو اوپر کے پورشن میں لے کر آ گئی۔

''یہ میرا بیڈ روم ہے۔ میرا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا ہے۔'' ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر لے جاتے ہوئے راحیلہ نے بتایا۔ باقی گھر کی طرح اس کمرے کی سجاوٹ بھی نہایت عمدہ تھی۔ پنک اور وائٹ کمبی نیشن نے کمرے کے ماحول کو بڑا خوابیدہ سا بنا دیا تھا۔ ماہ بانو کو بے ساختہ ہی راحیلہ کے والد کا استدلال یاد آیا۔ واقعی وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے کہ بڑے سے شان دار گھر میں رہنے کے بعد اپنے چھوٹے اور معمولی گھر میں واپس جا کر رہنا بہت مشکل لگے گا۔ راحیلہ جو اتنے استحقاق سے پرائے گھر کے ایک کمرے کو اپنا بیڈ روم قرار دے رہی تھی، واپس اپنے اصل گھر جاتی تو جانے کیسا محسوس کرتی۔

''تم بیٹھو۔ میں چائے بناتی ہوں۔'' ماہ بانو کی سوچوں سے بے خبر راحیلہ نے اس سے کہا اور وہاں موجود الیکٹرک کیتل میں چائے کے لیے پانی ڈالنے لگی۔

''پڑھنے کے دوران میں اگر چائے کی طلب ہو تو میں یہیں اپنے لیے چائے بنا لیتی ہوں۔ بھائی نے بھی یہی بندوبست کیا ہوا ہے۔ مجھے ڈسٹرب نہیں کرتے۔'' اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے وہ ماہ بانو کو بتانے لگی۔ وہ اس کی بات پر یونہی سر ہلا کر ٹیرس کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور اس دروازے سے گزر کر ٹیرس پر جا پہنچی۔ کشادہ ٹیرس پر سے اس خوب صورت گھر کے لان کے علاوہ پڑوس کے بنگلے کا منظر بھی نظر آ رہا تھا۔ فی الحال دونوں ہی جگہیں ویران لگ رہی تھیں اور کسی انسان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پھر اس منظر میں ایک مرد اور عورت داخل ہو گئے۔ مرد پختہ عمر کا اور کلین شیو تھا۔ اس نے چست جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اپنے لمبے بالوں کو پونی ٹیل میں قید کر رکھا تھا۔ مرد کے مقابلے میں عورت بہت کم عمر اور خوب صورت تھی۔ اس کے جسم پر جدید تراش خراش کا لباس تھا اور یہ تراش خراش اس حد تک کی گئی تھی کہ عورت کے جسم کے بیشتر اعضا عریاں ہی نظر آ رہے تھے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وہاں موجود سیاہ رنگ کی کرولا تک پہنچے۔ باوردی ڈرائیور نے پھرتی سے پچھلی جانب کا دروازہ کھولا اور پھر خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا گیا۔ مرد گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے عورت کی طرف گھوما۔ اس کے اس طرح گھومنے سے اس کا چہرہ پوری طرح ماہ بانو کے سامنے آ گیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں شناسائی کا احساس جاگا لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا کہ اس شخص کو اس نے کہاں دیکھا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دینے لگی لیکن پھر بے ساختہ ہی چہرہ موڑنے پر مجبور ہو گئی۔ مرد یک دم ہی عورت سے بغل گیر ہو گیا تھا اور اپنے لب اس کے بھرے بھرے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ ماہ بانو نے چہرہ موڑا تو اسے اپنے برابر میں راحیلہ کھڑی مسکراتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کچھ اور بھی جھینپ گئی۔

''بڑے ماڈرن ہیں تمہارے پڑوسی۔ ڈرائیور کی موجودگی کا بھی خیال نہیں۔ اگر ان صاحب کا بیوی سے رومانس کا موڈ ہو رہا تھا تو اندر سے فارغ ہو کر ہی باہر نکلتے۔'' اس نے شرمندہ سے لہجے میں تبصرہ کیا جس پر راحیلہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔ ''ہائی سوسائٹی میں سب کچھ چلتا ہے ڈیئر! ویسے تمہیں کس نے کہا کہ وہ دونوں آپس میں میاں بیوی ہیں؟''

''کسی نے نہیں۔ میں نے ان کے اسٹائل سے اندازہ لگایا ہے۔ ظاہر ہے عورت اپنے شوہر سے ہی اس حد تک فری ہو سکتی ہے۔''

''لیکن پڑوس میں موجود خاتون ذرا مختلف ہیں۔ وہ اپنے ہاں آنے والے ہر بندے سے اسی طرح ملتی ہیں۔ ہر بار ان کا اسٹائل یہی ہوتا ہے لیکن ''شوہر'' بدل جاتا ہے۔'' اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے راحیلہ نے اس پر جو انکشاف کیا، اسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس انکشاف کی روشنی میں تو راحیلہ کی وہ پڑوسن خاصے مشکوک کردار کی عورت تھی۔

''تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ آج کل طوائفیں اسی طرح رہنے لگی ہیں۔ کوٹھوں کا رواج اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب کوٹھیوں اور بنگلوں میں بزنس ہوتا ہے۔'' راحیلہ نے کسی پختہ کار عورت کی طرح اسے سمجھایا۔

''ہمیں کیا... چلو اندر چل کر چائے پیتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اس موضوع پر گفتگو کو مزید جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ راحیلہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اندر جا کر چائے پینے کے بعد وہ دونوں کمبائنڈ اسٹڈی کرتی رہیں۔ طارق کے واپس آنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ واپس آیا تو اس نے ماہ بانو کو واپس اس کے ہاسٹل چھوڑ دیا۔ ماہ بانو کے لیے یہ ایک

اچھا دن تھا۔ بہت عرصے بعد اسے کسی گھر کی چار دیواری میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ دن کا باقی بچا کھچا حصہ اپنے معمول کے مطابق گزارنے کے بعد اس نے رات کو کافی دیر سے بستر کا رخ کیا تو بھی راحیلہ کے ساتھ گزارے خوش گوار دن کی یادیں اس کے ساتھ تھیں۔

وہ حالات کی وجہ سے ایک طویل عرصہ پڑھائی سے دور رہی تھی اس لیے اسے عام طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ وقت اور محنت سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ اکثر وہ آدھی رات کے بعد ہی سونے کے لیے لیٹتی تھی۔ آج بھی اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ خاصی تھکن محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے تھکے ماندے ذہن میں کوئی چیز اس طرح اٹکی ہوئی تھی کہ وہ فوری طور پر سونے میں بھی ناکام تھی۔ اس کا ذہن مسلسل دن بھر کے واقعات کو دہرا رہا تھا۔ واقعات کے اس تسلسل میں راحیلہ کے گھر کے ٹیرس پر کھڑے ہو کر دیکھا جانے والا پڑوس کا منظر بھی شامل تھا۔ اس منظر کی جزئیات کو دہراتے ہوئے جیسے ہی مرد کا چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین پر ابھرا، اسے اپنی نیند کے غائب ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اس کا لاشعور مسلسل اس اضطراب میں مبتلا رہا تھا کہ شناسا محسوس ہونے والا وہ چہرہ آخر کس کا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس چہرے کے ایک ایک نقش کو ذہن میں دہراتے ہوئے اس کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کوشش میں جانے کیسے اس کے دماغ نے دیکھے گئے اس چہرے میں کچھ تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ اس نئے بننے والے نقش میں پہلے کچھ رنگ شامل ہوئے اور انہوں نے چہرے کو میک اپ زدہ کر کے نسوانی ٹچ دینا شروع کیا۔ پھر لباس کی تبدیلی واقع ہوئی اور جینز اور ٹی شرٹ کی جگہ ایک بھڑکیلے نسوانی لباس نے لے لی۔ لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی ماہ بانو کے اندر کوئی جھما کا سا ہوا اور وہ بے قراری ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اس کے ذہن نے راحیلہ کے پڑوس میں نظر آنے والے مرد کی تصویر کا جو تبدیل شدہ رخ دیکھا تھا، وہ سو فیصد خواجہ سراؤں کے مہاگرو سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ذہن میں شک بھی ابھرا کہ شاید کوئی غلطی ہو رہی ہے لیکن اندر جیسے کوئی سگنل دے رہا تھا کہ وہ درست ہے۔

اس نے اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کے لیے پہلے ایک گلاس پانی پیا اور ایک بار پھر تجزیہ کرنے لگی۔ نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ ہاتھ میں چھرا تھامے کم سن شینا کو قربان کرتا وہ مکروہ وجود اس کی یادداشت سے کبھی مٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے اتنی دیر بھی اس لیے لگی تھی کہ ایک خواجہ سرا اور مرد کے درمیان کی تفریق نے نظروں کو فوری طور پر بھٹکا دیا تھا لیکن اب فیصلہ ہو گیا تو اس کے لیے صبح کا انتظار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے فوراً اپنے تکیے کے نیچے رکھا موبائل نکالا اور شہریار کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کراچی آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شہریار سے رابطہ کر رہی تھی ورنہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ خود سے اسے فون کر لے۔ کبھی دل بہت ہی خواہش کرتا، تب بھی وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کروا لیتی لیکن اب تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ وہ جس شخص کے بارے میں اطلاع دینے جا رہی تھی اس سے زیادہ وہ شہریار کو مطلوب تھا۔ اس شخص نے اس کی پیاری بھتیجی کو قتل کیا تھا اور یقیناً وہ اس سفاک قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا۔ شہریار اس کا محسن تھا اور اپنے محسن کے کسی کام آنے کا اسے پہلی بار موقع مل رہا تھا تو وہ کسی صورت تاخیر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نمبر ملایا تو تیسری بیل پر دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔

''خیریت تو ہے مہرین! تم نے اتنی رات کو کیسے فون کیا ہے؟'' وہ اس کا فون آنے پر یقیناً پریشان ہوا تھا اور احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اس کے اصل نام سے مخاطب کرنے کے بجائے تبدیل شدہ نام سے پکارا تھا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں لیکن آپ کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتی تھی اس لیے بے وقت زحمت دی۔''

''کیسی اطلاع؟'' شہریار اگرچہ چند لمحوں میں ہی بہت سے واہموں اور خدشات سے گزر گیا تھا کہ جانے کیا ہو گیا ہے، بہر حال اس نے ماہ بانو کو ٹوکا نہیں اور پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''آج میں نے شینا کے قاتل کو دیکھا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سو فیصد وہی ہے۔'' وہ گویا اسے تفصیل بتانے سے قبل ہی باور کروا دینا چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔

''تم نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے؟ مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔'' اطلاع ایسی تھی کہ شہریار بھی ہل کر رہ گیا اور اس نے بہ مشکل خود پر قابو رکھتے ہوئے اس سے کہا۔ جواباً ماہ بانو نے اسے راحیلہ سے ہونے والی تازہ دوستی، اس کے گھر جانے اور وہاں سے پڑوس میں نظر آنے والے مرد کے بارے میں ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''تمہاری دوست کے گھر کا ایڈریس کیا ہے؟'' ساری بات سننے کے بعد شہریار نے اس سے پوچھا۔

''وہ کلفٹن کے علاقے میں رہتی ہے لیکن میں اس کا

http://digestpk.blogspot.com/

بنگلا نمبر وغیرہ نوٹ نہیں کر سکی۔'' ماہ بانو نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

''کل تم اس لڑکی سے ملنا تو کسی بہانے اس سے اس کا ایڈریس لے کر مجھے ایس ایم ایس کر دینا۔ باقی معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔ تمہیں مزید پریشان ہونے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آرام سے سو جاؤ۔'' آخری جملہ اس نے ماہ بانو کی تسلی کے لیے کہا تھا جسے سن کر وہ واقعی پُرسکون ہو گئی۔ فون بند کرتے ہی نیند کی دیوی فوراً ہی اس پر مہربان ہو گئی اور وہ اس دیوی کی بانہوں میں آرام سے سو گئی لیکن دوسری طرف شہریار کا سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ اسے اپنے خاندان کو کبھی نہ بھرنے والا زخم دینے والے شخص کے متعلق اطلاع ملی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر اب وہ سکون سے سو سکتا، یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ رات کا باقی ماندہ حصہ اس نے بہت بے چینی کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے گزارا۔ اب اس کے لیے یہاں رک کے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اسے ہر صورت شینا کے قاتل تک پہنچنا تھا۔

☆☆☆

''آخر کار تم آ ہی گئیں۔ لیکن سچ کہوں تو بڑا تڑپانے اور انتظار کروانے کے بعد آئی ہو۔'' چودھری نے اپنے سامنے کھڑی لِنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی سریلی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ وہ ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے بولی۔

''خاص چیزوں اور لوگوں کے لیے تو ہمیشہ انتظار ہی کرنا پڑتا ہے۔''

''یہ بھی تم نے صحیح کہا لیکن کچھ تو سامنے والے کی چاہت کا بھی خیال کرنا چاہیے۔'' چودھری نے اس سے شکوہ کیا۔

''آپ کی چاہت کا ہی تو خیال تھا چودھری صاحب جو میں ان حالات میں بھی آپ سے ملنے چلی آئی ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ رسک ہرگز نہیں لیتا۔''

''کیا مطلب... کیسا رسک؟'' چودھری اس کی بات سن کر چونکا۔

''آپ کے خیال میں یہاں کے حالات مجھ سے چھپے ہوئے ہیں... میں کچھ جانتی نہیں ہوں؟'' لِنڈا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تمہارا اشارہ کن حالات کی طرف ہے؟'' چودھری کچھ الجھ سا گیا۔ ویسے سابقہ تجربے سے وہ یہ تو جان گیا تھا کہ لِنڈا اور ڈیوڈ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ وہ کسی ایسے نیٹ ورک سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے کسی بھی طرح کی معلومات حاصل کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس کی ڈیوڈ سے پہلی ملاقات ہی ان حالات میں ہوئی تھی کہ وہ اس کی ماہ بانو میں دلچسپی اور اس کے فرار سے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ دوسری بار ان لوگوں نے اسے یہ بتا کر چونکایا تھا کہ وہ کشور کے حویلی سے فرار سے واقف ہیں۔ انہی لوگوں نے اسے افضل کا اتا پتا بھی دیا تھا لیکن بدقسمتی سے افضل اپنی پرانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا اور چودھری کے بندے اس سے آفتاب کا پتا معلوم نہیں کر سکے۔

اپنے ان تجربات کی روشنی میں چودھری کو یقین تھا کہ لِنڈا اگر یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ وہ پیر آباد کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے تو اس دعوے میں کوئی ابہام نہیں ہے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا اشارہ خاص طور پر کن حالات کی طرف ہے۔ وہ تو آج کل ہر طرف سے ہی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف اس کے گودام میں آگ لگا کر بالے کو اس حد تک مارا پیٹا گیا تھا کہ دوبارہ اس کے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا امکان کم ہی تھا... تو دوسری طرف اسے کشور کی تلاش میں ناکامی کا سامنا تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ اور جدوجہد کے بعد بھی اس کے کارندے صرف اس اسپتال تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے جہاں کشور اور آفتاب زیرِ علاج رہے تھے۔ وہ اسپتال سے کب اور کہاں گئے، یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور ان حالات نے چودھری کو صحیح معنوں میں زچ کر رکھا تھا۔ آج کل وہ بُری طرح بلبلایا ہوا تھا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور و خوض میں مشغول تھا۔

ان حالات میں اسے لِنڈا کی کال موصول ہوئی کہ وہ پیر آباد آنے کے لیے لاہور سے روانہ ہو چکی ہے تو اس نے فوراً سے پیشتر اس کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ منشی اور ایک ڈرائیور حویلی کی سب سے شان دار گاڑی میں اسے ریسیو کرنے کے لیے گئے اور اسے پیر آباد پہنچنے سے قبل ہی اس شان دار گاڑی میں منتقل کروا لیا۔ لِنڈا کو فی الحال حویلی ہی لایا گیا تھا اور اس کی رہائش کا بھی یہیں بندوبست کیا گیا تھا کیونکہ چودھری اسے اپنی معزز مہمان باور کروانا چاہتا تھا۔ براہِ راست ڈیرے پر وہ عورتیں لائی جاتی تھیں جو پیشہ ور ہوتی تھیں لیکن لِنڈا کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ وہ اپنی خدمات کا معاوضہ کس شکل میں وصول کرے گی، مستفید ہونے والا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ بظاہر تو وہ دوست بن کر ہی سامنے والے کو اپنی قربت سے نوازتی تھی لیکن وہ قیمت وصول ضرور کرے گی، یہ بات چودھری بھی اب سمجھنے لگا تھا۔ وہ لِنڈا کی سحر انگیز قربت کے لیے ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کو تیار بھی تھا لیکن اس بار وہ اپنے بھی کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا تھا

اس لیے بھی اس نے اسے حویلی میں ٹھہرایا تھا۔ حویلی میں بیویوں کی موجودگی میں اسے خود پر کنٹرول رکھنے میں کچھ آسانی رہتی۔ بعد میں معاملہ سیٹ ہونے پر ڈیرے پر جا کر گل چھرّے اڑائے جا سکتے تھے لیکن لِنڈا نے تو آتے کے ساتھ ہی اسے الجھا دیا تھا۔ وہ صاف طور پر اس پر احسان جتا رہی تھی کہ وہ حالات کی خرابی کے باوجود اس سے ملنے کے لیے آ گئی ہے۔

''وہی حالات جن میں آپ کے لیے اپنی مال و عزت کی حفاظت کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ جان کا خطرہ بھی یقیناً ہو گا لیکن فی الحال تو بے چارے ملازموں کی ہی شامت آئی ہوئی ہے۔ ملازموں کے بعد آپ کے دشمن کب مہمانوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیں، کچھ کہا تو نہیں جا سکتا... لیکن دیکھ لیں، ہم پھر بھی ہمت کر کے آپ کی محبت میں یہاں تک کھنچے چلے آئے ہیں۔'' ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے چودھری پر طنز کے تیر چلائے اور خود ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر کچھ اس انداز سے بیٹھ گئی کہ پہلے ہی اسکرٹ سے نیچے اپنی رعنائی دکھاتی اس کی لمبی سڈول ٹانگوں کی خوب صورتی کچھ اور بھی عیاں ہو گئی۔ چودھری کو اس کے طنزیہ جملوں نے بلبلا کر نہ رکھ دیا ہوتا تو وہ سیدھا جا کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگتا۔

''تم نے چند چھوٹے موٹے واقعات سے ہماری طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں اگر چپ ہوں تو صرف مصلحتاً۔ تم نے اور ڈیوڈ نے خود مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اے سی شہریار کے خلاف کچھ نہیں کیا جائے۔ تم لوگوں کے کہنے پر ہی مجھے اچھا بھلا اپنے قبضے میں موجود اے سی کو رہا کرنا پڑا تھا ورنہ تو میں اس کل کے چھوکرے کا دماغ درست کر دیتا۔ اب بھی میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کی شہ پر ہو رہا ہے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن صرف اس لیے چپ ہوں کہ میرا جوابی ردِعمل تمہارے پروجیکٹ کو نقصان نہ پہنچا دے۔'' تیوریاں چڑھا کر اس نے لِنڈا کی بات کا ذرا سختی سے جواب دیا۔

''آپ تو بُرا ہی مان گئے چودھری صاحب! میرا مقصد آپ کی بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ لیں یہ پیجیے۔ آپ کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔'' لِنڈا کے ہونٹوں پر وہی بجلی کوندنے جیسی مسکراہٹ چمکی اور وہ اپنی خاطر کے لیے سامنے رکھی جانے والی شراب کی بوتلوں میں سے ایک بوتل سے جام بھر کر بہ نفسِ نفیس خود چودھری کے ہونٹوں سے لگانے کے لیے اس کے پہلو میں پہنچ گئی۔ یہ ون ٹو ون ملاقات تھی جس میں ملازموں اور مکینوں سمیت کسی کو بھی بلا اجازت اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

''غیرت کے معاملے میں ہم لوگ بہت نازک مزاج ہوتے ہیں اس لیے آئندہ ایسی کوئی بات کرنے سے پہلے سوچ لینا۔ ہماری غیرت پر حملہ کرنے والے کو جلد یا بہ دیر اس کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ میرے جو دشمن ابھی میری پہنچ سے دور ہیں، وہ ہمیشہ دور نہیں رہیں گے۔ میں جلد ان کی شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔ رہا تمہارے تحفظ کا معاملہ تو بے فکر رہو۔ یہاں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' چودھری کو اس کی قربت نے کافی حد تک پگھلا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے دو گھونٹ بھرنے کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ کافی حد تک سنبھلا ہوا تھا لیکن لفظوں کی سختی برقرار تھی۔

''سوری ڈارلنگ! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔'' لِنڈا کو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ چودھری کی دھمکیوں میں آتی لیکن مصلحتاً اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ ویسے بھی اس کا مقصد تو صرف چودھری پر اس کی پوزیشن واضح کرنا تھا، سو وہ کام ہو چکا تھا۔ اوپر سے چودھری کتنا ہی غصہ دکھا لیتا، حقیقت تو بہرحال نہیں بدل سکتی تھی۔

''او کے، اب تم ایسا کرو کہ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر ہم لنچ پر دوبارہ ملتے ہیں۔'' اس کے بالکل اپنے پہلو میں بیٹھے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چودھری نے اس کا ایک بوسہ لیا اور بولا۔

''آرام تو میں لنچ کے بعد بھی کر لوں گی۔ پہلے یہ بتائیں کہ کام کی کیا پوزیشن ہے؟ ہم بہت زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں جلد از جلد نتائج درکار ہیں۔'' وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی عورت تھی، پل میں چودھری کو اس کے رومینٹک موڈ سے نکال کر کام کی بات پر لے آئی۔

''کام شروع ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے بندے مہیا کر دیے ہیں۔ فاریسٹ آفیسر عابد انصاری بھی تم لوگوں کے دعوے کے مطابق تعاون کر رہا ہے بلکہ سارا کام اصل میں اس کے مشوروں کے مطابق ہی ہو رہا ہے۔ یقیناً اسے بھی تم لوگوں نے بڑی قیمت ادا کی ہو گی۔'' رپورٹ دیتے دیتے آخر میں چودھری نے خیال آرائی کی۔

''اسے تعاون کرنا ہی تھا۔ اسی تعاون کے لیے تو اس کا یہاں ٹرانسفر کروایا گیا ہے۔'' لِنڈا نے بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، وہ شروع ہی سے تمہارا آدمی ہے؟'' چودھری چونکا۔

''یقیناً۔ وہ ہمارا ہی آدمی ہے... آپ کے لیے مشورہ ہے کہ اسے اپنے پچھلے دھندوں کے لیے اکسانے کی کوشش

http://digestpk.blogspot.com/

مت کیجیے گا۔ وہ پچھلے فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کی طرح آپ کا ساتھ ہرگز نہیں دے گا کیونکہ اسے ہماری طرف سے اجازت نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جنگل کا سارا انتظام ظاہری طور پر اتنے شفاف طریقے سے چلتا رہے کہ انتظامیہ مکمل طور پر بے فکر ہو جائے۔ اگر کھالوں اور درختوں کی چوری چکاری کا سلسلہ جاری رہا تو ہمارے پروجیکٹ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور ایسا ہم ہرگز نہیں چاہتے۔ اے سی شہریار کو عابد انصاری کافی حد تک مطمئن کر چکا ہے۔ اگر آپ ہماری طرف سے ملنے والے معاوضے پر... جو بہر حال بہت زیادہ ہے، اکتفا کریں تو آگے بھی حالات ہمارے لیے سازگار رہیں گے۔'' لِنڈا کا یہ تنبیہہ کرتا ہوا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ بہر حال باس وہی ہے اور چودھری حسبِ روایت اس معاملے میں اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ چودھری نے کوشش تو کی تھی کہ عابد انصاری کے ساتھ بھی اقبال باجوہ کی طرح معاملات طے کر سکے لیکن عابد انصاری اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کی وجہ یقینی طور پر یہی تھی کہ وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کا مکمل وفادار تھا۔

''مجھے تمہارا مطالبہ قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ بدلے میں رقم کی فراہمی کے سوا بھی تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرو۔ ماہ بانو کے لیے تم لوگوں نے وعدہ کیا تھا چنانچہ وہ مجھے ملنی ہی چاہیے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی باغی بیٹی اور اس کو ورغلانے والے ماسٹر کا پتا بھی چاہیے۔ میرا یہ کام ہو گیا تو میں سکون سے تم لوگوں کا ساتھ دے سکوں گا ورنہ میری یہ الجھنیں تمہارے لیے بھی مشکل کا باعث بنیں گی۔'' چودھری اپنے ان مطالبات کے بارے میں پہلے ہی سوچ کر بیٹھا ہوا تھا چنانچہ موقع ملتے ہی فوراً ہی اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔

''ماہ بانو کے معاملے میں ہم آپ سے صرف معذرت ہی کر سکتے ہیں۔ وہ لڑکی اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے اس لیے اس کا آپ تک پہنچنا بھی ممکن نہیں۔ اپنے وعدے کو پورا نہ کرنے کی تلافی کے طور پر ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ کے معاوضے میں مزید کچھ اضافہ کر دیں۔ رہا آپ کی بیٹی کی تلاش کا سوال تو میں دیکھوں گی کہ اس سلسلے میں آپ سے کتنا تعاون کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال، یہ ہمارے کیلیبر کا کام نہیں ہے کہ ہم گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو تلاش کر کے ان کے ماں باپ تک پہنچائیں۔ آپ سے خصوصی تعلقات کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ بہر حال کر ہی دیا جائے گا۔'' وہ جو تھوڑی دیر پہلے اس کے غصے میں آجانے پر اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے پہلو میں آبیٹھی تھی، ایک بار پھر اسی لب و لہجے پر اتر آئی لیکن اس بار چودھری کی ہمت نہیں ہو سکی کہ اپنے غصے کا اظہار کر سکے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس قبیل کی فرد نہیں جو اس کے غصے کو خاطر میں لائے۔ وہ تو اس کے ملک کے حکمرانوں پر بھی حکمرانی کرنے والوں میں سے تعلق رکھتی تھی چنانچہ وہ کتنا بھی زور آور سہی، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بہتری اسی میں تھی کہ غلام بن کر جو کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ حاصل کر لے اور غلامی کا سب سے سنہری اصول زباں بندی تھا... چنانچہ اس نے بھی اس بار زبان نہیں کھولی۔

''کسی ملازم سے کہیں کہ مجھے میرا کمرا دکھا دیں۔ میں لنچ سے پہلے فریش ہونا چاہتی ہوں۔'' اس کے پہلو سے اٹھتے ہوئے لِنڈا نے فرمائش کی۔

''کیوں نہیں، میں ابھی کسی کو بلاتا ہوں۔'' چودھری نے فوراً گھنٹی کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''کل صبح تیاری رکھیے گا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے میں جلد از جلد اب تک کے کام کا جائزہ لینا چاہتی ہوں۔'' چودھری کی انگلی کے دباؤ سے باہر بجنے والی گھنٹی کے ردِعمل میں کوئی ملازم اندر داخل ہوتا، اس سے قبل لِنڈا نے ایک اور حکم جاری کیا۔

''او کے! میں انتظامات کر لوں گا۔'' چودھری نے اتنی فرماں برداری کا مظاہرہ کبھی اپنے باپ کے سامنے بھی نہیں کیا ہوگا جتنا لِنڈا کے سامنے کر رہا تھا۔

''میڈم کو ان کے کمرے تک لے جاؤ۔'' ملازم اندر آیا تو چودھری نے اسے حکم دیا۔ ملازم تابع داری کی تصویر بنا فوراً لِنڈا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس کی راہنمائی میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگی۔

''بچ...'' اس کے عقب میں چودھری نے زیرِلب گالی دی۔ اب تک وہ لِنڈا سے بہ زبان انگریزی ہی گفتگو کرتا رہا تھا، شاید اسی لیے گالی دینے کے لیے بھی اسی زبان کا انتخاب کیا تھا۔

☆☆☆

''ویلکم مائی ڈیئر فرینڈ! تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، میں بتا نہیں سکتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنے گھر والوں کو بھی تمہاری آمد کے بارے میں بتاتا اور وہ لوگ بھی تمہارے استقبال کے لیے اس وقت یہاں موجود ہوتے۔'' وہ جیسے ہی ارائیول لاؤنج میں پہنچا، وہاں منتظر کھڑے اس کے دیرینہ دوست زبیر نے اسے گرم جوشی سے گلے لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ہلکا سا شکوہ بھی کیا۔ چند سال قبل زبیر لاہور میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اس نے اور شہریار نے ساتھ ہی گریجویشن کیا تھا۔ گریجویشن کے بعد زبیر نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا اور شہریار سول سروسز کی طرف چلا گیا لیکن ان دونوں کی دوستی بہر حال برقرار رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے لیکن پھر زبیر کو ایم بی اے کے دوران ہی کراچی شفٹ ہونا پڑا۔ شفٹنگ کی وجہ اس کے تایا کو ہونے والا شدید ہارٹ اٹیک تھا۔ تایا کی اکلوتی بیٹی سے زبیر کا رشتہ طے تھا اور تایا چاہتے تھے کہ زبیر فوری طور پر ان کی بیٹی سے شادی کرے، ان کا کاروبار سنبھال لے۔ اس موقع پر زبیر کے والد نے بھی اپنے بڑے بھائی کا ساتھ دیا چنانچہ زبیر جو لاہور چھوڑتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچا رہا تھا، بزرگوں کے اس فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کا یہ فیصلہ اس حساب سے معقول ثابت ہوا کہ اس کے تایا شادی کے محض ایک ہفتے بعد ہی دنیا سے چل بسے اور وہ مرتے ہوئے تایا کی آخری خواہش پوری نہ کرنے کی خلش سے بچ گیا۔ بعد میں اس کے والد نے بھی آہستہ آہستہ اپنا کاروبار کراچی منتقل کر لیا اور وہ سب مل کر ایک جگہ رہنے لگے۔ اس طرح زبیر کو گھر داماد بننے کا جو تھوڑا بہت قلق تھا، وہ بھی دور ہو گیا اور وہ ایک مطمئن زندگی گزارنے لگا۔

شہریار سے اس کا ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا۔ کبھی کبھار لاہور جانے پر شہریار سمیت دیگر دوستوں کے ساتھ ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور وہ محفل جما کر پچھلی یادوں کو تازہ کر لیا کرتے تھے لیکن طالبِ علمی کے دور سے نکل کر عملی میدان میں آنے کے بعد سے یہ سلسلہ ذرا موقوف ہو گیا تھا چنانچہ جب شہریار نے زبیر کو یہ اطلاع دی کہ وہ کراچی آرہا ہے تو زبیر کھل اٹھا... لیکن اس کی طرف سے لگائی گئی اس قدغن کی وجہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس کی کراچی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ اس وقت بھی اس نے اسی حوالے سے شہریار سے شکوہ کیا تھا۔

''ناراض مت ہو یار! تم جانتے ہو کہ مجھے خود بھی تمہارے گھر والوں سے مل کر ہمیشہ بہت خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن اس وقت میں کچھ ایسی نوعیت کے کام سے یہاں آیا ہوں کہ اپنی آمد سے متعلق کم سے کم لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے پی اے تک کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اسے بھی یہی علم ہے کہ میں لاہور اپنے گھر والوں سے ملنے گیا ہوا ہوں اور ان کے ساتھ چند دن گزار کر واپس آجاؤں گا۔'' اس نے زبیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ اس کا چھوٹا سا سفری بیگ جس میں ضرورت کی بس چند بہت ہی اہم اشیا موجود تھیں... زبیر نے اس سے لے کر پہلے ہی اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم کسی بہت ہی خفیہ کام سے یہاں آئے ہو... لیکن یار! تم کوئی انٹیلی جنس کے بندے تو نہیں ہو کہ تمہیں اس نوعیت کے کام کرنے پڑیں۔'' اس کی معذرت کو قبول کرتے ہوئے زبیر نے نکتۂ اعتراض اٹھایا۔

''میں محکمہ جاتی کام سے آیا بھی نہیں ہوں۔ یہ ذرا نجی نوعیت کا کام ہے لیکن ہے بہر حال ملکی مفاد میں۔ مجھے یہاں رہ کر کچھ ملک دشمن عناصر کے خلاف کارروائی کرنی ہے لیکن اس طرح... کہ کسی کو علم نہ ہو سکے۔ تم پر مجھے بہت اعتماد ہے اس لیے میں نے تمہیں اتنی تفصیل بتا دی ہے۔ اس سے زیادہ مزید تمہیں کچھ نہیں بتا سکوں گا اور تم پوچھنا بھی مت۔'' زبیر کی تسلی کے لیے اسے تھوڑا سا بریف کرنے کے ساتھ ہی اس نے آخر میں اسے تاکید کی۔

''جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے میں تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ جو بھی کرو، بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ تمہاری ایڈونچرز فطرت سے میں اچھی طرح واقف ہوں لیکن اب طالبِ علمی کا دور نہیں رہا ہے کہ تم بلا سوچے سمجھے جذبات میں کسی بھی معاملے میں انوالو ہو جاؤ۔ تم ایک حساس نوعیت کی پوسٹ پر کام کر رہے ہو اور تمہاری کوئی بھی غلطی تمہارے کیریئر اور خاندان کی عزت کے لیے مسئلہ بن سکتی ہے۔'' اب وہ لوگ پارکنگ میں کھڑی زبیر کی گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح شہریار کو مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

''تم مجھے جانتے ہو کہ میں غلط کام نہیں کرتا۔ ہاں، غلط کام کرنے والوں کو روکنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں اس لیے بالفرض اگر کوئی ایشو کھڑا بھی ہوا تو اس سے صرف میرے کیریئر کو نقصان پہنچے گا۔ خاندان کی عزت کو بہر حال کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'' شہریار نے اپنے مخصوص نپے تلے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''چل بھائی، اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تُو سب کچھ ٹھان کر آیا ہے۔ اب مجھے بتا دو کہ میرے لیے کیا حکم ہے۔ گھر والوں سے تم اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتے ہو اس لیے میرے ساتھ یقیناً گھر تو چلنا پسند نہیں کرو گے۔ تمہارے کام کی نوعیت کے اعتبار سے کون سی جگہ تمہارے لیے مناسب رہے گی، یہ تم خود بتا دو تاکہ میں اسی حساب سے بندوبست کر دوں؟'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے زبیر نے اس سے

http://digestpk.blogspot.com/

دریافت کیا۔

’’کوئی بھی ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں میرا زیادہ لوگوں سے واسطہ نہ پڑے اور میری سرگرمیاں کسی کے علم میں نہ آسکیں۔‘‘ شہریار نے اسے اپنی ڈیمانڈ سے آگاہ کیا۔

’’میرے پاس اس طرح کی دو جگہیں ہیں۔ ایک تو کلفٹن کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ ہے۔ جس پروجیکٹ میں میں نے اپنا یہ اپارٹمنٹ لیا ہے وہ ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا اس لیے چند ایک کے سوا ابھی زیادہ تر اپارٹمنٹس خالی پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی فی الحال کسی کرائے دار کو نہیں رکھا ہے کہ خوامخواہ کا جھنجٹ ہوگا۔ دوسرا میرا ایک بنگلا ہے جسے ہفتے بھر پہلے ہی کرائے دار خالی کر کے گئے ہیں اور فی الحال وہاں صرف ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ اب تم دونوں میں سے جس جگہ رہنا پسند کرو، میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔‘‘ زبیر نے اسے تفصیلات بتاتے ہوئے اس کی پسند پوچھی۔

’’تمہارا اپارٹمنٹ جس بلڈنگ میں ہے، چوکیدار تو وہاں بھی ہوگا؟‘‘ شہریار نے کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے ضروری معلومات حاصل کرنا مناسب سمجھا۔

’’وہاں تو بہ یک وقت چار چار چوکیدار ہوتے ہیں۔ دو بلڈنگ کے اگلے گیٹ پر ڈیوٹی دیتے ہیں اور دو پچھلے گیٹ پر تاکہ اگر ایک کو کسی ضرورت کے تحت گیٹ چھوڑنا بھی پڑے تو دوسرا وہاں موجود رہے۔ سیکیورٹی کا بہت اچھا انتظام ہے وہاں۔‘‘ زبیر نے اسے بتایا۔

’’اس صورت میں وہاں کسی کی آمدورفت کا چھپا رہنا ممکن نہیں۔ میرے لیے تمہارا بنگلا مناسب رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ وہاں موجود چوکیدار کو ایک ہفتے کی چھٹی دے دو۔‘‘ شہریار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

’’لیکن کسی ملازم کے نہ ہونے کی صورت میں تمہیں پریشانی ہوگی۔ خالی بنگلے میں کون تمہارے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھے گا۔‘‘ زبیر ذرا پریشان ہوا۔

’’لیوایٹ یار! میں یہاں کسی تفریحی دورے پر نہیں آیا ہوں کہ ہر طرح کی سہولیات کے ساتھ رہنا ضروری سمجھوں۔ اس وقت میری سب سے اہم ضرورت پرائیویسی ہے اور اس حساب سے تمہارا بنگلا بہت مناسب ہے۔‘‘

’’اوکے! پھر میں چوکیدار کو ابھی فون کر کے کہہ دیتا ہوں کہ وہ آدھے گھنٹے میں چھٹی پر جانے کی تیاری کرلے۔ اس دوران ہم دونوں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لنچ کر لیتے ہیں۔‘‘ اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے زبیر اس سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس بار شہریار نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی رضامندی کو محسوس کرتے ہوئے زبیر نے پہلے چوکیدار کو فون کر کے احکامات جاری کیے پھر گاڑی کا رخ ایک ریسٹورنٹ کی طرف کرلیا۔ ریسٹورنٹ کی پُرسکون فضا میں مزے دار سے لنچ کا لطف اٹھاتے دونوں دوست ماضی کی خوش گوار یادوں کو دہراتے رہے۔ ان باتوں کے دوران ایک گھنٹا کیسے گزر گیا، معلوم بھی نہیں ہوا۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل کر زبیر کے خالی بنگلے تک پہنچے تو پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔

’’میں اپنی یہ گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ تمہیں آنے جانے میں سہولت رہے گی۔ میں ٹیکسی کر کے واپس چلا جاؤں گا پھر شام میں کسی وقت چکر لگاؤں گا تاکہ تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ لاسکوں۔‘‘ اس کو بنگلے پر پہنچا کر رخصت ہونے سے قبل زبیر نے گاڑی کی چابی اسے تھماتے ہوئے کہا۔ وہ کافی سنجیدہ تھا اور اب اس کے انداز میں وہ جوش و خروش نظر نہیں آرہا تھا جس کا اس نے ائرپورٹ پر شہریار کو دیکھنے کے بعد مظاہرہ کیا تھا۔

’’میرے خیال میں تم یہ زحمت نہ کرو۔ میں شاید ہی شام کو تم سے مل پاؤں گا بلکہ کسی بھی وقت کے لیے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جب میں فارغ ہوں تو خود تمہیں فون کر کے انفارم کردوں۔ میرے کھانے پینے کے سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی کچھ نہ کچھ ارینج کرلوں گا۔ میری سب سے بڑی ضرورت ایک محفوظ رہائش گاہ تھی اور وہ تم مجھے فراہم کر چکے ہو۔‘‘

’’اوکے... ایز یو وش۔‘‘ اس بار زبیر نے ذرا بھی بحث نہیں کی اور اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

’’بُرا مت ماننا یار! میں تمہیں نظرانداز نہیں کر رہا ہوں، بس کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں خود مجبور ہوں۔‘‘ شہریار نے اس کے ہاتھ کو ذرا زور سے دباتے ہوئے اس کی دل جوئی کے لیے وضاحت کی۔

’’پاگل ہوگئے ہو جو اس طرح کی بات کر رہے ہو۔ میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں جو ذرا سی بات کا بُرا مان جاؤں گا۔ میں تمہاری فطرت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اس لیے تمہارے متعلق کچھ غلط سلط سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے اس رویّے کے پیچھے کوئی بہت ہی خاص وجہ ہوگی اس لیے کسی قسم کی بدگمانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں، تھوڑی سی مایوسی ضرور ہوئی ہے کہ تم یہاں کراچی میں رہو گے اور پھر بھی ہماری محفلیں نہیں جم سکیں

گی... لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی! تو ہم پھر دوبارہ کسی اچھے ماحول میں فراغت سے ملیں گے۔ تم بے فکری سے یہاں رہ کر اپنا کام کرو اور اگر کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت پیش آئے تو مجھے بتا دینا۔ مجھے تمہارے کام آکر خوشی ہوگی۔‘‘ زبیر نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

’’تھینک یو دوست! تم نے میرے دل سے بوجھ اتار دیا ورنہ میں تمہاری دل آزاری کا سوچ کر بہت گھبرا رہا تھا۔‘‘ شہریار بے ساختہ ہی اس سے بغل گیر ہوگیا۔ اس کا یہ بے تکلف اظہارِ محبت بس چند لوگوں تک ہی محدود تھا ورنہ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کے مطابق وہ زیادہ تر اپنے خول میں ہی بند رہتا تھا۔ شاید اسی تربیت کا اثر تھا کہ وہ محبت کے مسلسل اپنے دل پر دستک دینے کے باوجود ابھی تک انجان بنا بیٹھا تھا اور مستقل اس دستک کو نظرانداز کر رہا تھا۔

’’ٹھیک ہے تو پھر اب میں چلتا ہوں۔‘‘ دوستوں کے درمیان وہ جذباتی سا لمحہ گزر گیا تو زبیر نے اس سے اجازت لی اور ہاتھ ہلاتا ہوا بنگلے کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار نے بھی اس کمرے کا رخ کیا جس کے بارے میں زبیر نے نشاندہی کی تھی کہ وہ اسے اپنے بیڈروم کے طور پر استعمال کرسکتا ہے۔ بنگلا چونکہ مکمل فرنشڈ حالت میں کرائے پر دیا جاتا تھا اس لیے وہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔ شہریار نے اپنے سفری بیگ سے لباس نکالتے ہوئے فریش ہونے کے خیال سے واش روم کا رخ کیا۔ ساتھ ہی اس کا ذہن اپنا آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کر رہا تھا۔ اس لائحہ عمل کو سوچتے ہوئے اس کا ذہن بار بار کلفٹن کے اس گھر کا ایڈریس بھی دہرا رہا تھا جو ماہ بانو نے اس کے کہنے پر ایس ایم ایس کی شکل میں اسے بھیجا تھا۔

☆☆☆

’’لو، اب یہ دہی پھینٹ کر سالن میں شامل کر دو اور پھر پتیلی پر ڈھکن ڈھانپ کر چولھے کی آنچ ہلکی کر دو۔ سات آٹھ منٹ بعد تمہارا سالن بالکل تیار ہوگا۔ کھانا نکالتے وقت اوپر سے ڈش میں ہرا دھنیا چھڑک دینا۔ سالن کی خوشبو اور رونق دونوں بڑھ جائیں گی۔‘‘ اس کے ہاتھ میں دہی کا پیالہ پکڑاتے ہوئے خالہ نے ہدایات جاری کیں۔ کشور نے خود ہی ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے کھانا پکانا سکھا دیں۔ ڈھیروں ملازماؤں کے جھرمٹ میں رہتے اسے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کہ باورچی خانے کا رخ کرتی۔ ہر ٹائم کا کھانا پکا پکایا سامنے آجاتا اور کھا لیا جاتا لیکن اب اسے آفتاب کے ساتھ زندگی گزارنی تھی اور ظاہر ہے یہ زندگی حویلی جیسے شاہانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ تو گزر نہیں سکتی تھی۔ پھر خود اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ اپنے محبوب شوہر کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلائے لیکن اس کی ککنگ محض چائے بنا لینے تک محدود تھی چنانچہ آج کل خالہ کی زیرِنگرانی اس کی ٹریننگ جاری تھی۔ آفتاب بھی اب اپنا زیادہ وقت لکھنے لکھانے کو دے رہا تھا، اس لیے وہ اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے زیادہ تر وقت خالہ کے ساتھ ہی بتانے لگی تھی۔ برسوں سے تنہائی کا شکار خالہ اس کا ساتھ پاکر خوش تھیں۔ کشور کی صورت میں گویا انہیں بیٹی مل گئی تھی جس کے ساتھ ان کا وقت بھی اچھا گزر جاتا تھا اور وہ بیٹی کی تربیت کا شوق بھی پورا کر لیتی تھیں۔ کشور کو خود بھی یہ مہربان خاتون بہت پسند آئی تھیں چنانچہ دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ خوب گزر رہی تھی۔

’’یہاں سے جانے کے بعد میں آپ کو بہت یاد کروں گی خالہ! آپ بہت پیاری خاتون ہیں۔ آپ سے مل کر دل چاہتا ہے کہ کاش آپ میری ماں ہوتیں۔‘‘ کشور نے ان کی ہدایات پر عمل کیا اور باورچی خانے میں رکھے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگی۔ شوق شوق میں وہ گھریلو کام کاج میں شامل تو ہو جاتی تھی لیکن ایک طرف عادت نہیں تھی اور دوسری طرف اس کی حالت بھی کچھ ایسی تھی کہ ذرا دیر میں ہی تھکن محسوس کرنے لگتی۔ اس وقت بھی اسے اپنا بی پی اچھا خاصا لو ہوتا محسوس ہو رہا تھا اس لیے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

’’تم چاہو تو مجھے اپنی ماں سمجھ سکتی ہو لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہ یہاں سے جانے کا خیال تمہارے دل میں کیوں آیا؟ بابر نے تو کہا تھا کہ تم دونوں اب یہیں میرے پاس رہو گے۔‘‘ وہ اس سے بازپرس کرتے ہوئے فریج سے سیب نکالنے لگیں۔

’’ہم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتے نا! آپ کی زندگی ہمارے رہنے سے ڈسٹرب ہوتی ہوگی۔ اگر آفتاب کی ٹانگ کا مسئلہ نہیں ہوتا تو ہم اب تک اپنی شفٹنگ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر چکے ہوتے۔‘‘

’’تو یہ کہو کہ مجبوری میں یہاں رہ رہی ہو اور ابھی جو تھوڑی دیر پہلے اپنائیت کا اظہار ہو رہا تھا وہ بس یونہی تھا۔‘‘ وہ اس سے ناراض ہو چکی تھیں اور اس ناراض ناراض سی کیفیت میں ہی دھلے ہوئے سیبوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوسر مشین میں ڈالتی جارہی تھیں۔

’’ایسی کوئی بات نہیں ہے خالہ لیکن انسان کو بہت کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص پر تو خیر کوئی شک

http://digestpk.blogspot.com/

نہیں لیکن بدر تو اس طرح اچانک ہمارے اپنے گھر میں آکر بیٹھ جانے کو محسوس کرتا ہوگا۔ نوجوان نسل کہاں پسند کرتی ہے کہ کوئی ان کی پرائیویسی میں دخل انداز ہو... اور ہم نے تو ایک طرح سے آپ کے گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔'' کشور فوراً ہی انہیں وضاحت دینے لگی۔

''اس نالائق کا ذکر نہ کرو۔ اسے ماں کا خیال ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ دیکھا نہیں ہے تم نے کہ کیسے رات گئے تک گھر سے غائب رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو واپس ہی نہیں آتا۔ میں اکیلی بوڑھی عورت ہر وقت اس کی راہ تکتی رہتی ہوں۔ نہ اسے میرا خیال ہے، نہ اپنے مستقبل کی فکر۔ اب بھلا بتاؤ کہ جس شخص کو گھر میں رہنا ہی نہیں ہوتا، اسے کیا غرض کہ گھر میں کون رہتا ہے اور کون نہیں۔'' خالہ کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نظر آنے لگی تھیں لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت نہیں روکی تھی چنانچہ بات کے اختتام پر سیب کے جوس سے بھرا ہوا گلاس انہوں نے کشور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جب سے یہاں رہ رہی تھی، خالہ اسی طرح اس کا خیال رکھتی تھیں۔

''بدر ایسا کیوں ہے خالہ؟'' اس نے ان سے سوال کیا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس کے ذہن میں وہ بدصورت منظر آگیا تھا جب بدر نے اس سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔

''یہ شروع سے ایسا نہیں ہے۔ پہلے تو اچھا خاصا پڑھنے لکھنے والا تھا لیکن قسمت کی خرابی کہ اس کے میٹرک کرتے ہی اس کے ابّا کا انتقال ہوگیا۔ ان کے جانے سے ہمیں مالی پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی لیکن بدر کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کے ابّا اچھے عہدے پر تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی دکانیں اور دو مکانات تھے جو انہوں نے کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ کرائے کی مد میں ہمیں ٹھیک ٹھاک رقم مل جاتی تھی۔ میری عدت کی مدت میں بدر ہی ان کرائے داروں سے لین دین کرنے لگا۔ کرائے داروں میں سے ایک شخص نے جس کے پاس ہماری چار دکانیں تھیں، بدر کو بھٹکانا شروع کردیا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ کب بدر پڑھائی سے دھیان ہٹا کر الٹے سیدھے دھندوں میں دلچسپی لینے لگا۔ جب معلوم ہوا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ یہاں اسلام آباد میں میرا کوئی قریبی عزیز بھی نہیں تھا جس سے میں مدد کے لیے درخواست کرتی۔ ویسے بھی مجھے شرم آتی تھی کہ اپنی اولاد کی خامیاں کسی کے سامنے بیان کروں۔ میں اپنے طور پر ہی اسے سدھارنے کی کوشش کرتی رہی لیکن بھلا اکیلی عورت دنیا کی چالبازیوں کا مقابلہ کیا کرپاتی۔ یوں میرا بچہ مکمل طور پر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دکانیں اس نے اونے پونے داموں بیچ ڈالیں بلکہ بیچ بھی کیا، اسی منحوس کرائے دار نے چالاکی سے اپنے نام لکھوالیں۔ اب مکانوں کے کرائے اور تمہارے خالو کی پنشن سے گھر کا خرچہ چلتا ہے۔ مالی پریشانی تو خیر اب بھی نہیں ہے لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کی برباد زندگی دیکھ کر کڑھتی رہتی ہوں۔ مفاد پرستوں نے اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اچھے بھلے لڑکے کو تباہ کردیا۔ جانے کیا الٹے سیدھے دھندے کرتا پھرتا ہے، مجھے معلوم نہیں لیکن اس کی جیب میں نوٹ ہمیشہ دیکھے ہیں اور یہی بات مجھے ہولاتی ہے کہ تعلیم اور ہنر سے محروم شخص بھلا حلال روزی کہاں سے کما سکتا ہے۔'' خالہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے اور چہرے پر بے بسی کی انتہا پر پہنچے ہوئے دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ کشور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب گئی اور ان کے دونوں شانے تھام کر تسلی دینے لگی۔

''صبر کریں خالہ! آپ کا یہ صبر ایک دن رنگ لائے گا اور انشاءاللہ بدر سدھر جائے گا۔'' خالہ نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور خود ہی اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ایک بار پھر کام میں مصروف ہوگئیں۔ ان کے تاثرات سے کشور نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بدر کی طرف سے مکمل مایوسی کا شکار ہیں اور اب انہوں نے اس قسم کی تسلیوں سے بہلنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ دکھی دل کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔ اسی وقت اس کی نظر کچن کے دروازے پر پڑی۔ وہاں بدر کھڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے یہاں ہونے والی گفتگو سن لی ہے۔ کشور جھینپ سی گئی۔

''ناشتا...'' وہ بہت خراب موڈ کے ساتھ یہ ایک لفظی حکم سنا کر واپس پلٹ گیا۔ خالہ نے بھی بیٹے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے لیے ناشتا تیار کرنے لگیں اور تیار کرنے کے بعد کام والی کے ہاتھوں ٹرے میں رکھ کر اوپر اس کے کمرے میں بھجوا دیا۔

''تم کیوں یہاں گرمی میں بیٹھی ہوئی ہو؟ اندر کمرے میں جا کر بیٹھو۔ میں بھی کھانے کے لیے یہ دو چار روٹیاں ڈال لوں تو پھر وہیں آتی ہوں۔'' سالن تو تیار ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے چاول دم پر رکھنے کے بعد چولھے پر توا رکھا اور کشور کو ٹوکتے ہوئے بولیں تو وہ جو واقعی گرمی محسوس کررہی تھی، خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ البتہ دل ہی دل میں خالہ کے اسٹیمنا کو داد ضرور دے رہی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بڑی پھرتی سے کام کرتی تھیں اور ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی خوب تھا۔

اندر کمرے میں پہنچ کر اس نے ٹی وی کھول لیا اور

مختلف چینلز لگا لگا کر دیکھنے لگی لیکن کہیں پر بھی اس کا دل نہیں لگا۔ خالہ کا دکھ مسلسل اس کے ذہن کو ڈسٹرب کررہا تھا۔ بالآخر اس نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ ایک طرف رکھا اور کچھ وقت آفتاب کے ساتھ گزارنے کے خیال سے اوپر کا رخ کیا۔ ابھی اس نے آخری سیڑھی طے ہی کی تھی کہ بدر اپنے کمرے سے باہر نکلتا نظر آیا۔ کشور نے کوشش کی کہ اس سے کنی کترا کر گزر جائے لیکن وہ لپک کر اس کے قریب آگیا اور اس کا راستہ روک لیا۔

''میرا راستہ چھوڑو۔'' کشور نے دھیمی آواز میں غصے کا اظہار کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آواز آفتاب تک پہنچے اور یہاں کوئی بدمزگی پیدا ہو۔

''کیوں؟ ویسے تو مجھ میں بڑی دلچسپی ہے کہ میری ماں سے میرا پورا تفصیلی تعارف حاصل کیا جارہا تھا اور خود مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں۔ کبھی مجھ سے اکیلے میں ملو تو تمہیں اپنے بارے میں صحیح سے بتاؤں۔ بے چاری اماں کو معلوم ہی کیا ہے جو تمہیں بتا سکیں۔'' وہ بے باکی سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ کشور کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔'' کشور نے پہلے سے زیادہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا لیکن اس کی آواز اب بھی دھیمی ہی تھی۔

''شور مچانے سے کیا ہوگا؟ تمہارا وہ لنگڑا تو آکر میرا کچھ بگاڑنے سے رہا۔ ویسے تم ہو عجیب بدذوق لڑکی... گھر سے بھاگنے کے لیے تمہیں یہی منحنو ملا تھا؟ اور انہیں دیکھو، ہمارے کزن بابر رضا کو۔ ہمارے گھر کو کوئی دارالامان سمجھ کر تم لوگوں کو یہاں بھجوا دیا۔ شاید ہمارے صحافی کزن فی الحال کہیں اور مصروف ہیں، بعد میں تم لوگوں پر کوئی چٹ پٹی سی رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔'' وہ صاف لفظوں میں مذاق اڑا رہا تھا۔ احساسِ توہین سے کشور کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''ویسے داد دیتا ہوں میں لنگڑے کی قسمت کو۔ کیا چیز پائی ہے اس نے۔ میں نے تو جب سے تمہیں دیکھا ہے، تڑپ رہا ہوں۔ ایسا کرو، آج رات یہ تڑپ دور کردو پھر میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ تم دونوں جب تک چاہنا یہاں رہنا، کوئی پابندی نہیں ہوگی... لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں خود تمہارے وارثوں کا اتا پتا ڈھونڈ کر انہیں تمہارے یہاں ہونے کی اطلاع دے دوں گا۔'' وہ اپنی بدنیتی کا اظہار کرتے ہوئے اسے لالچ اور دھمکی دونوں دے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے بہرحال اتنا ضرور واضح تھا کہ وہ کشور اور آفتاب کی اصلیت سے واقف نہیں ہے اور محض قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے۔ اس کی اتنی گری ہوئی باتیں سن کر کشور کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے سے ہٹا کر آگے بڑھ جانے کی کوشش کی لیکن بدر نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ تھام کر یہ کوشش ناکام بنادی۔

''میرا ہاتھ چھوڑ دو ذلیل آدمی! پتا نہیں کیسے تم جیسا آوارہ و بدکردار شخص اس شریف گھرانے میں پیدا ہوگیا۔'' کشور نے بلبلا کر اسے لعنت ملامت کی۔ جواباً وہ ہنسنے لگا لیکن پھر یک دم ہی اس کی ہنسی رک گئی اور اس نے کشور کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ کشور ایک پل کے لیے تو حیران ہوئی لیکن دوسرے ہی پل اسے وجہ سمجھ آگئی۔ غصے میں بھری ہوئی خالہ اس کے عقب سے نکل کر سامنے آئیں اور انہوں نے بدر کے منہ پر لگاتار تین چار تھپڑ جڑ دیے۔

''نکل جا تو اس گھر سے۔ آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ تجھ جیسے آوارہ کی ماں کہلانے سے بہتر ہے کہ میں خود کو بے اولاد ہی تصور کرلوں۔'' وہ غصے کی شدت سے بری طرح کانپ رہی تھیں۔ بدر نے کشور کو دھمکی آمیز نظروں سے گھورا اور دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر گیا۔

''مجھے معاف کردو بیٹی! میرے بیٹے کی وجہ سے تمہیں جو تکلیف اٹھانی پڑی اس کے لیے میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم آرام سے یہاں رہو۔ اب میں اس ناخلف کو دوبارہ گھر میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔'' اپنے بیٹے کے جانے کے بعد خالہ اس سے معذرت کرنے لگیں۔

''آپ اس طرح معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں خالہ! بدر کی بدتمیزی میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں۔'' کشور کی اپنی طبیعت کافی مکدر ہوگئی تھی لیکن اس نے ایک بوڑھی بے بس ماں کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بھی دیکھتی جارہی تھی۔ کمرے کا دروازہ ہنوز بند تھا جس سے اسے اطمینان محسوس ہورہا تھا کہ آفتاب کو یہاں ہونے والے ہنگامے کی بھنک نہیں پڑی۔

''میرا ہی قصور ہے۔ میں نے اس کے ابّا کے مرنے کے بعد بے پروائی نہ برتی ہوتی تو یہ اس حد تک نہ بگڑتا۔'' اب وہ بہت ہی زیادہ آزردہ تھیں۔

''آپ اتنی ٹینشن نہ لیں ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ چلیں، میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ دوں۔ آپ تھوڑی دیر آرام کرلیں۔'' کشور زبردستی انہیں

http://digestpk.blogspot.com/

اپنے ساتھ نیچے لے گئی۔ نیچے جاتے ہوئے اس نے آخری سیڑھی پر رکھا اچار کا مرتبان دیکھ لیا تھا۔ یقیناً خالہ اس مرتبان کو دھوپ میں رکھنے کے لیے ہی اوپر آرہی تھیں جو انہوں نے بدر کو اس سے بدتمیزی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

''دیکھو بیٹی! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ بدر کو آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی اس لیے تم یہاں سے جانے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ اور ہاں، اپنے میاں کو بھی کچھ نہیں بتانا۔ اس نے بابر سے تذکرہ کر دیا تو وہ کیا سوچے گا کہ خالہ کا بیٹا اتنا بگڑا ہوا ہے۔ میں نے برسوں سے خاندان میں اپنی جو عزت بنا کر رکھی ہوئی ہے، اس آخری عمر میں اس کا بھرم رہ جائے تو اچھا ہے۔'' خالہ کو ان کے بستر پر لٹانے کے بعد اس نے انہیں بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والی گولی کھلائی اور پھر انہیں آرام کی تاکید کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے لگی تو انہوں نے بڑی لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

ان کی درخواست پر یونہی سر ہلاتی ہوئی وہ باہر نکل گئی اور سست روی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا دماغ بُری طرح الجھ گیا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ خالہ کتنے ہی دعوے کرتیں، بہرحال یہ بدر کا اپنا گھر تھا اور اسے یہاں آنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر روک بھی دیا جاتا تو وہ تو پہلے ہی دھمکی دے چکا تھا کہ کشور کے وارثوں تک اس کی خبر پہنچا دے گا۔ اب انتقام لینے کے لیے تو وہ ضرور ہی اس دھمکی پر عمل کرتا۔ دوسری طرف اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگر آفتاب کو سارے حالات بتائے جائیں تو وہ کچھ کر سکے گا یا نہیں۔ فوری طور پر اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونا کوئی آسان بات تو نہیں تھی، وہ بھی اس صورت میں کہ وہ لوگ کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

اسی الجھن کے ساتھ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور آخری سیڑھی پر رکھا اچار کا مرتبان اٹھا کر دھوپ میں رکھنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آفتاب رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا قلم پوری روانی سے چل رہا تھا۔ چند روز کے عرصے میں ہی کشور اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ بہت مگن ہو کر لکھتا ہے اور لکھتے ہوئے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے اسے کمرے سے باہر ہونے والے ہنگامے کا معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی لاعلمی سے اطمینان محسوس کرتی ہوئی وہ بستر پر لیٹ گئی۔ جو کچھ ہوا تھا، اس نے اسے ذہنی وجسمانی طور پر نڈھال کر دیا تھا اور وہ خود کو پُرسکون کر کے کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی، چنانچہ تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ان بند آنکھوں سے وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ آفتاب کا حرکت کرتا ہوا قلم رک گیا ہے اور اب وہ اس کی طرف رخ کیے بہت تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

اس کے موبائل میں راحیلہ کا پتا محفوظ تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ماہ بانو نے اس بات کی پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی کہ اس مشکوک عورت کا بنگلا جہاں اس نے مہاگرو کو دیکھا تھا، راحیلہ کے گھر کے بائیں جانب ہے۔ شہریار نے بے حد ہلکی رفتار میں گاڑی اس بنگلے کے سامنے سے گزارتے ہوئے بنگلے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کی بیرونی دیواروں پر کافی کلر کا پینٹ کیا گیا تھا۔ بنگلے کی دیواریں خاصی اونچی تھیں اور ان دیواروں پر خاردار تار بھی بچھائے گئے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ایسا کوئی درخت بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کی مدد سے دیوار پر چڑھا جا سکتا۔ ایک طرح سے بنگلے کو محفوظ رکھنے کا ٹھیک ٹھاک انتظام کیا گیا تھا اور کسی شخص کے لیے وہاں نقب لگانا آسان نہیں تھا۔ شہریار کا چوری چھپے وہاں داخل ہونے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف باہر ہی سے اس بنگلے کو دیکھنا چاہتا تھا ورنہ اس کے ذہن میں کوئی اور ہی منصوبہ تھا۔ اس منصوبے کے تحت ہی اس نے اپنی گاڑی روکے بغیر آگے بڑھا دی۔

جب وہ بنگلوں کی اس قطار کو پار کر کے داہنی جانب اپنی گاڑی موڑ رہا تھا تو اس نے راحیلہ والے بنگلے کے باہر ایک ٹیکسی کو رکتے ہوئے دیکھا۔ اس ٹیکسی میں سے ایک لڑکا اور لڑکی باہر نکل کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ وہ راحیلہ اور اس کے بھائی ڈاکٹر طارق ہوں گے جو کہیں سے واپس لوٹے تھے۔ اسے ان بہن بھائی سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ دیے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کسی خاص سمت میں گاڑی نہیں چلا رہا تھا بلکہ اس سارے علاقے میں یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس طرح وہ اس علاقے کے راستوں سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا کراچی بہت کم آنا جانا رہا تھا اس لیے وہ اس شہر سے بہت کم واقف تھا اور کسی مخصوص علاقے کے اندرونی راستوں سے واقف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت وہ اپنی اسی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ذہن میں موجود منصوبے کے مطابق راستوں کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ آخرکار اس کی یہ جدوجہد رنگ لائی اور وہ ایک ایسا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا

جس کی اسے اپنے منصوبے کے مطابق تلاش تھی۔ اس راستے سے گزر کر وہ بائیں جانب موجود ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر مڑتا تو اس راستے پر آجاتا جس سے اس کے اندازے کے مطابق راحیلہ کی لین میں رہنے والے ہر شخص کو اپنے علاقے سے نکل کر مین روڈ تک پہنچنے کے لیے لازماً گزرنا پڑتا۔

شہریار نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے مطابق وہ راحیلہ کے پڑوس والے بنگلے کی نگرانی کرتا رہتا اور جب وہاں مقیم عورت اپنی گاڑی میں کہیں جاتی تو خود بھی اس کے تعاقب میں نکل پڑتا لیکن مسلسل اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی لگا کر رکھنے کے بجائے دوسرے راستے پر چل پڑتا۔ اس وقت اسے یہ دھیان رکھنا تھا کہ اس کی گاڑی کی رفتار اس عورت کی گاڑی کی رفتار سے زیادہ ہوتا کہ وہ بائیں جانب والی تنگ سڑک کو پار کر کے پہلے اس بڑی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے عورت کی گاڑی کو گزرنا تھا۔ وقت کی اس برتری کا فائدہ اٹھا کر وہ یک دم ہی اپنی گاڑی عورت کی گاڑی کے سامنے لا کر اسے رکنے پر مجبور کر دیتا اور پھر اسلحے کے زور پر اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیتا۔ مزاحمت کی صورت میں اس کے پاس عورت کو بے ہوش کرنے کا بھی انتظام تھا۔ یہاں سے وہ اس عورت کو زبیر کے اس بنگلے میں لے جاتا جہاں وہ خود رہائش پذیر تھا۔ بنگلے میں اس نے اسی مقصد کے تحت کسی ملازم کو نہیں رہنے دیا تھا کہ تنہائی میں آرام سے اس عورت سے پوچھ گچھ کر سکے۔ اپنے اس منصوبے پر اسے پہلے ہی دن عمل کرنے کا موقع مل جائے گا، اس سلسلے میں وہ پُریقین نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ عورت آج ہی کہیں جانے کے لیے باہر نکلتی اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ دو تین دن تک کہیں بھی نہیں جاتی۔

شہریار دونوں طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے حلیے میں بھی کافی تبدیلی کر لی تھی۔ چہرے پر موجود مصنوعی فرنچ کٹ داڑھی، مونچھیں اور بڑا سا مسّا اس کی شناخت چھپانے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اس نے آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس حلیے میں اس کے قریبی جاننے والے بھی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکیں گے۔ کراچی میں یوں بھی اس کے آشنا کم ہی تھے اور اس نے حلیے کی یہ تبدیلی کسی ناخوش گوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے احتیاطاً کی تھی۔ اگر اسے ایک دن سے زیادہ بار عورت کے بنگلے کی نگرانی کرنی پڑتی تو وہ اسی حلیے میں کچھ چھوٹے موٹے ردوبدل کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس کا فل ٹائم نگرانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ عورت جس قسم کی تھی، اس کا اس نے ماہ بانو کی اشاروں کنایوں میں کی گئی گفتگو سے اندازہ کر لیا تھا اور اسے بہ خوبی معلوم تھا کہ اس قسم کی عورت کا دن کی روشنی میں کہیں باہر نکلنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ وہ شام ڈھلے ہی بنگلے سے نکل کر کہیں جاتی ہوگی چنانچہ اس نے اسی حساب سے نگرانی کے وقت کا دورانیہ طے کیا تھا۔

اب بھی اس نے جب اپنا ابتدائی کام نمٹا لیا تو گاڑی کو واپس موڑا اور اس بنگلے کے قریب ایسی پوزیشن میں گاڑی لے جا کر روک لی جہاں کسی کی اس کی طرف توجہ نہ جائے لیکن وہ خود بنگلے کو نظر میں رکھ سکے۔

اس علاقے میں کیونکہ زیادہ تر امرا رہائش پذیر تھے اس لیے اردگرد بڑا روایتی سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ متوسط طبقے کی گلیوں کی طرح ٹھیلے اور خوانچوں والوں کے تو یہاں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے سوا بھی کوئی ذی نفس نظر نہیں آرہا تھا۔ شہریار کے سامنے بس ایک بنگلے کا گیٹ کھلا تھا اور اس میں سے ایک گاڑی نکل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس بنگلے کے چوکیدار نے اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر گیٹ دوبارہ بند کر لیا تھا۔ شہریار نے اپنی گاڑی کھڑی کرنے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی، وہ ایک خالی پلاٹ کے سامنے کا ایریا تھا۔ اگر وہ کسی بنگلے کے سامنے گاڑی کھڑی کرتا تو یقیناً وہاں کا چوکیدار اس سے بازپرس کرنے کی کوشش کرتا لیکن فی الحال اسے اب تک کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کا بونٹ اٹھائے وقتاً فوقتاً انجن سے اس طرح چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا جیسے گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو اور وہ اسے صحیح کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اپنی اس اداکاری کے دوران وہ گاہے بگاہے اپنے مطلوبہ بنگلے پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس عمل کے دوران میں اس کی راحیلہ کے بنگلے پر بھی اچٹتی سی نظر پڑ جاتی تھی۔ ایک بار جو اس کی نظر وہاں پڑی تو اس نے بنگلے کے ٹیرس پر اسی لڑکے اور لڑکی کو کھڑا پایا جنہیں یہاں سے پہلی بار گزرتے ہوئے ٹیکسی سے اترتا دیکھ چکا تھا اور قیاس کیا تھا کہ وہ راحیلہ اور اس کا بھائی ڈاکٹر طارق ہیں لیکن اس بار جو اس کی ان دونوں پر نظر پڑی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا اندازہ شاید کچھ غلط تھا۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو جن مخمور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، وہ بہن بھائی کے رشتے کے منافی تھیں۔ اس موقع پر شہریار نے ایک بات اور نوٹ کی کہ ان دونوں کے درمیان ذرا بھی مشابہت نہیں

http://digestpk.blogspot.com/

ہے۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ بہن بھائی ایک دوسرے سے مشابہ ہوں لیکن عموماً خونی رشتوں سے جڑے افراد میں ایک دوسرے کی جھلک نظر آ ہی جاتی ہے۔ پھر اسے تو ماہ بانو نے بتایا تھا کہ راحیلہ اور اس کا بھائی شکل وصورت اور خیالات میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں اور اس ہم آہنگی نے انہیں ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ماں باپ کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ٹیرس پر لڑکی کے ساتھ کھڑا لڑکا اسمارٹ تھا لیکن لڑکی اس کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ حسین تھی۔ اس کی گلابی رنگت اور سنہری بال اسے لڑکے سے بہت مختلف ظاہر کر رہے تھے۔ پھر ایک اور بات جو اس نے نوٹ کی وہ لڑکی کی عمر تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے باوجود اتنی کم عمر نہیں نظر آ رہی تھی کہ اسے ماہ بانو کا ہم عمر تصور کیا جا سکتا اور راحیلہ کو اس کی ہم جماعت ہونے کی وجہ سے لگ بھگ اسی کی ہم عمر ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ذہن الجھ سا گیا لیکن فی الحال وہ راحیلہ یا اس کے بھائی پر تحقیق کرنے یہاں نہیں آیا تھا اس لیے اپنی توجہ اس جوڑے کی طرف سے ہٹالی اور ایک بار پھر انجن پر جھک گیا۔

''کیا بات ہے سر جی! آپ بہت دیر سے یہاں کھڑے ہیں۔ گاڑی میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟'' ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس نے اپنے عقب میں یہ آواز سنی اور سر گھما کر پوچھنے والے کو دیکھا۔ یہ اس بنگلے کا چوکیدار تھا جس سے کچھ دیر قبل اس نے ایک گاڑی کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ چوکیدار اس کی مسلسل یہاں موجودگی سے شاید کچھ مشکوک ہو کر پوچھ گچھ کرنے چلا آیا تھا لیکن اس کا انداز بہر حال مہذبانہ تھا۔ یقیناً شہریار کی قیمتی گاڑی اور نفیس لباس نے اسے اس احتیاط پسندی پر مجبور کیا ہوگا۔

''گڑبڑ تو اچھی خاصی ہے لیکن میں ٹھیک کر لوں گا۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں چوکیدار کو جواب دیا۔ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے وہ اسے اپنے ساتھ بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''آپ کو جانا کہاں ہے؟'' چوکیدار نے اس کے لہجے کا اثر لیے بغیر اگلا سوال کیا۔

''خیابانِ شمشیر میں بیرسٹر اظہار الحسن کے بنگلے تک... لیکن تم اتنی انکوائری کیوں کر رہے ہو؟'' اس نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ بیرسٹر اظہار کا نام وہ اس طرف آتے ہوئے ایک بنگلے کی نیم پلیٹ پر دیکھ کر آیا تھا اور اس کے ذہن میں رہ گیا تھا اور چوکیدار پر اپنی حیثیت جتانے کے لیے اس وقت اس کا استعمال کر ڈالا۔

''آپ کو خیابانِ شمشیر جانا تھا تو اس طرف کہاں نکل آئے؟ وہ تو یہاں سے کافی آگے ہے۔'' چوکیدار نے اعتراض کیا۔

''میں اس شہر کا رہنے والا نہیں ہوں اس لیے راستوں کا صحیح سے اندازہ نہیں ہے۔ مجھے بیرسٹر صاحب نے فون پر راستہ سمجھایا تھا لیکن شاید مجھ سے سمجھنے میں کچھ غلطی ہو گئی اور میں بھٹک کر اس طرف آ نکلا۔ اوپر سے یہ گاڑی بھی خراب ہو گئی اور تم بجائے یہ کہ مجھے سکون سے گاڑی ٹھیک کرنے دو، سوالات پر سوالات کیے جا رہے ہو۔'' وہ چوکیدار کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے ہر سوال کا جواب ضرور دے رہا تھا لیکن لہجے میں جھنجلاہٹ بھی عیاں تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ہم جاتا ہے، آپ آرام سے اپنا گاڑی ٹھیک کرو۔'' اس کا موڈ دیکھتے ہوئے چوکیدار واپس جانے لگا لیکن پھر جاتے جاتے پلٹ کر اس سے بولا۔ ''آپ بیرسٹر صاحب کو فون کیوں نہیں کر لیتے؟ وہ اپنا ڈرائیور یہاں بھیج کر آپ کو بلوا لیں گے اور گاڑی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''میں کوشش کر چکا ہوں۔ ان کا موبائل آف ہے۔'' بال کی کھال نکالنے والے اس شخص پر دل ہی دل میں لعنت بھیجتے ہوئے اس نے قدرے تحمل سے جواب دیا، ورنہ اب حقیقتاً اسے اس شخص پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کا جواب سن کر چوکیدار سر ہلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ شہریار بھی کچھ جھنجلاتا ہوا بونٹ گرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس چوکیدار کے رویے نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ روز روز یہاں کھڑے ہو کر نگرانی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر آج ہی اس کی مطلوبہ عورت اپنے بنگلے سے نہیں نکلی تو اس کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ممکن تھا کہ اسے اپنے منصوبے میں ہی تبدیلی کرنی پڑتی۔

انہی سوچوں میں ڈوبا وہ بے خیالی کے عالم میں اپنے مطلوبہ بنگلے کے گیٹ کو گھور رہا تھا کہ اچانک گیٹ کھلتا چلا گیا اور اس میں سے ایک چمکتی ہوئی سرخ رنگ کی گاڑی برآمد ہوئی۔ گاڑی کو نکلتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن پھر سرخ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس شخص کو دیکھ کر اس کے ذہن نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ تعاقب کرنا بھی بھول گیا اور سرخ کار اپنی پچھلی نشست پر بیٹھی طرح دار حسینہ کو لیے آگے نکلتی چلی گئی۔

حادثات وسانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

انسان جذبات و احساسات کا مجموعہ ہے... اس کی زندگی سے اگر جذبات کو نکال دیا جائے تو پھر اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا... محبت... رقابت... دکھ درد... فراق وصال کے تغیرات ہی اس کی زندگی اور جسم کو متحرک رکھتے ہیں... سائنس کے انسانی دل کے ساتھ منسلک ہو جانے والے تعلق کا سنسنی خیز احوال...

اس سائنس داں کی مشکل جس کی ایجاد اس کے لیے وبالِ جان بن گئی تھی

آصف ملک

دل کا معاملہ

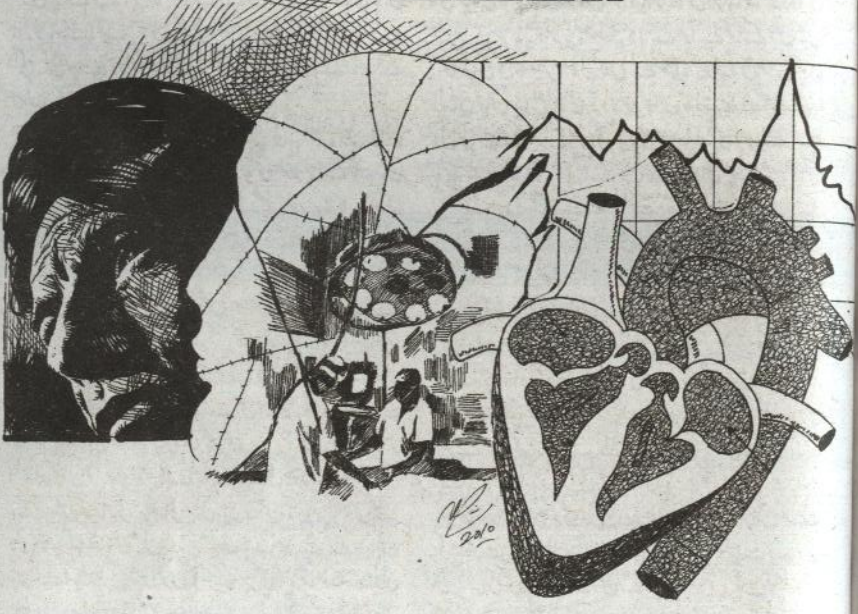

کلیوجون ایک سائنس داں تھا اور آج رات اس نے ایک پُرہجوم پریس کانفرنس میں جو ساری دنیا میں دکھائی جا رہی تھی، اپنی حیرت انگیز ایجاد کا اعلان کیا تھا۔ اس نے ایسا مصنوعی دل بنا لیا تھا جو کارکردگی میں انسان کے اصلی دل سے بھی کہیں بہتر تھا۔ بہتر یوں کہ یہ کم سے کم بیس سال بنا کسی خرابی کے چل سکتا تھا اور یہ ان امراض سے پاک تھا جو اصلی دل کو لاحق ہو جاتے ہیں۔ کلیو نے اپنی پریس کانفرنس میں ان نکات کو شامل نہیں کیا تھا جو اس ایجاد کی اصل وجہ تھے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس طرح ایک لمبی بحث چھڑ جائے گی اور اس کی ایجاد کی طرف کم اور اس بحث کی طرف لوگوں کی توجہ

http://digestpk.blogspot.com/

زیادہ ہو جائے گی۔ اس نے اپنی تعارفی تقریر کے دوران دل کی کارکردگی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”یہ مکمل طور پر سلیکون فائبر کا بنا ہوا دل ہے۔ اس کی لچک، مضبوطی اور نرمی بالکل اصلی دل جیسی ہے۔ چونکہ یہ ایک چھوٹی سی بیٹری سے کام کرتا ہے جسے دو سال بعد ایک آرٹری انجکشن کی مدد سے نیا فیول مہیا کیا جاتا ہے، اس لیے اسے خون کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دل انسانی جسم کی ضرورت کا پندرہ فی صد آکسیجن اور گلوکوز خود استعمال کرتا ہے کیونکہ اسے کام اتنا کرنا پڑتا ہے... جبکہ میرے مصنوعی دل کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کا مطلب ہے نو بلڈ پریشر، نو بائی پاس اور نو ہارٹ اٹیک۔ اس پر کوئی وائرس یا بیماری اثر نہیں کرے گی۔ بچ جانے والی اضافی آکسیجن اور گلوکوز جسم کے دوسرے اعضا کے کام آئیں گے۔“

کلیو جون نے بتایا کہ اس دل کی مسلسل دس سال آزمائش کی جا چکی ہے اور اسے آزمائشی طور پر اب تک تین ایسے مریضوں کو لگایا گیا ہے جن کا دل مکمل طور پر ناکارہ ہو گیا تھا اور اگر ان کا دل تبدیل نہ کیا جاتا تو وہ کسی وقت بھی مر سکتے تھے۔ مصنوعی دل نے ان کو بچا لیا کیونکہ ان کے ٹشوز سے میچ کرتا اصل دل کہیں دستیاب نہیں ہوا تھا۔ کلیو جون کے ایجاد کردہ دل کو ٹشو میچنگ کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ اسے ہر انسان کو چاہے وہ کسی بھی خطے کا ہو، بلاخوف وخطر لگایا جا سکتا تھا۔ جسمانی حفاظتی نظام کی جانب سے بھی اسے مسترد کیے جانے کا کوئی امکان موجود نہیں تھا پھر اس دل کو لگانے کے بعد انسان کو ان تمام دواؤں سے نجات مل جاتی جو ایک تبدیلی دل کے مریض کو ساری عمر کھانی پڑتی ہیں۔ جن تین مریضوں کو یہ دل لگایا گیا تھا، وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے تھے اور ان میں سے ایک تو گزشتہ دنوں ہائکنگ پر بھی گیا تھا اور اسے دل کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور اس نے بالکل کسی نارمل دل والے شخص کی طرح ہائکنگ سے لطف اٹھایا تھا۔

کلیو جون نے دعویٰ کیا کہ صرف مریض ہی نہیں بلکہ جن کے دل نارمل ہیں، وہ بھی اس کا ایجاد کیا ہوا دل لگوا کر مستقبل میں پیش آنے والے بہت سے عوارض سے بچ سکتے ہیں جن سے اصلی دل نہیں بچ سکتا۔ کلیو جون کی یہ پریس کانفرنس ساری دنیا نے دیکھی تھی اور فوراً ہی اس پر تبصرے شروع ہو گئے۔ بہت سارے دل کے سرجنوں نے فوری طور پر کلیو جون کے بنائے ہوئے دل کو استعمال کرنے کا اعلان کر دیا اور بہت ساروں نے اس کی مخالفت کی۔ مذہبی راہنماؤں کا کہنا تھا کہ کلیو نے بکواس کی ہے کیونکہ خدا کی تخلیق سے انسان کی تخلیق کس طرح بہتر ہو سکتی ہے۔

کلیو جون بعد میں کئی دن ٹی وی پر جاری مباحثوں اور تبصروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اسے ان کی فکر نہیں تھی کیونکہ برطانیہ میں اس کے ایجاد کردہ دل کو استعمال کرنے کی پہلے ہی اجازت دی جا چکی تھی۔ صرف برطانیہ میں دل کی تبدیلی کے منتظر افراد کی تعداد پچاس ہزار تھی اور ان کے لیے سالانہ صرف دو ہزار انسانی دل دستیاب تھے۔ ایسے میں کلیو جون کا ایجاد کیا ہوا دل ان کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ کلیو جون نے صرف دل ہی ایجاد نہیں کیا تھا بلکہ اپنی نگرانی میں اس کی تیاری کا کام بھی شروع کرا دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ایجاد کسی سرمایہ دار یا صنعت کار کے حوالے کر کے اس میں کوالٹی کی کمی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اس طرح کوئی انسانی جان ضائع ہوتی تو وہ خود کو اس کا ذمے دار سمجھتا۔ لہٰذا دل کی ایجاد کی طرح اس کی تیاری کا معاملہ بھی اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اس نے دل بنانے والی لیب میں کوالٹی کنٹرول اور ٹیسٹنگ کے بہت سخت معیار رکھے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی خراب مصنوعی دل کے یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

آغاز میں مصنوعی دل کی یومیہ پیداوار سو کے قریب تھی۔ کلیو جون نے اسے بعد میں بڑھا کر یومیہ ایک ہزار کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں مصنوعی دل بنانے کے باوجود کئی ممالک میں موجود مریضوں کی مانگ پوری کرنے میں کچھ سال لگ سکتے تھے۔ کلیو کی پریس کانفرنس کے ایک ہفتے کے اندر دنیا کی کئی حکومتوں نے کلیو جون سے رابطہ کیا تھا اور اسے مصنوعی دل کی پیداوار اپنے ہاں شروع کرنے کی صورت میں گراں قدر معاوضے اور تمام سہولیات دینے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن کلیو جون نے ان تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ محبِ وطن تھا اور اس نے مصنوعی دل انسانیت کی بھلائی کے لیے ایجاد کیا تھا۔ وہ اس سے نفع نہیں کمانا چاہتا تھا اس لیے اس نے مصنوعی دل کی قیمت بہت کم رکھی تھی۔ یعنی صرف دو ہزار پاؤنڈز فی دل۔ ساتھ ہی اس نے مصنوعی دل کی بلیک مارکیٹنگ روکنے کے لیے دل صرف ان منظور شدہ اسپتالوں کو فراہم کرنے کا اعلان کیا جہاں دل کی تبدیلی کے بہترین انتظامات تھے۔ یعنی اس کے تیار کردہ مصنوعی دل صرف اسپتال خرید سکتے تھے اور ان کو دل بھی عین آپریشن والے دن مہیا کیا جاتا۔ اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کلیو جون کا بنایا ہوا کوئی مصنوعی دل کسی مستحق کو ملنے کے بجائے کسی دولت مند کو مل جائے جو اپنی باری کا انتظار کرنے

کے بجائے اسے بلیک مارکیٹ سے خریدنے کی استعداد رکھتا ہو۔ مریضوں کو قرعہ اندازی کے ذریعے مصنوعی دل لگائے جاتے تاکہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

ایک سال کے عرصے میں کوئی دس ہزار افراد کو آپریشن کر کے مصنوعی دل لگائے گئے۔ آپریشن کے بعد شرح اموات صرف تین فی صد تھی۔ یہ تناسب ہارٹ بائی پاس کے بعد مرنے والے مریضوں سے کہیں کم تھا۔

دنیا بھر میں کلیو جون کے بنائے ہوئے مصنوعی دل کی افادیت کو تسلیم کیا جا رہا تھا۔ اسے طب کے نوبل انعام سمیت بے شمار اعزازات سے نوازا گیا اور اس پر انعامات کی صورت میں دولت کی بارش ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کروڑ پتی بن گیا۔ اگرچہ اپنے بنائے ہوئے مصنوعی دل کی فروخت سے بھی اس نے لاکھوں پاؤنڈز کمائے تھے لیکن انعامات کی رقم کہیں زیادہ تھی اسی طرح جن ..... دولت مند مریضوں کو باری آنے پر دل لگایا جاتا اور وہ صحت یاب ہو جاتے تو وہ بھی کلیو جون کی فاؤنڈیشن میں بھاری عطیات دیتے تھے۔ یہ فاؤنڈیشن کلیو نے اس مقصد کے لیے بنائی تھی کہ وہ غریب مریض جو دو ہزار پاؤنڈز دے کر دل نہیں لے سکتے تھے، انہیں دل مفت میں فراہم کیا جائے۔ خاص طور سے تیسری دنیا کے مریض جن کے لیے دو ہزار پاؤنڈز بھی بہت بڑی رقم تھی۔

کلیو جون نے اپنی لیب میں توسیع کی اور اس میں مزید جدید مشینیں اور نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ عملہ ملازم رکھا۔ پھر اس نے دل کی روزانہ پیداوار بڑھانا شروع کر دی کیونکہ برطانیہ میں تقریباً تمام ہی منتظر مریضوں کو دل لگ گیا تھا اور صرف نئے کیسز میں لوگوں کو دل درکار ہوتا تھا، اس لیے بچ جانے والے دل اب دنیا کے دوسرے ملکوں کو برآمد کیے جا رہے تھے۔ یہاں بھی کلیو جون نے یہی طریقہ کار رکھا تھا۔

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/350
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/325
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت ورسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش -/150
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ -/380
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/350
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے -/350
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/200
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت -/325
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین -/325
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/325
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/350
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/300
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز -/350
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/300
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/180
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہموں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/280
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/160
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/325
سیّد خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/150
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/225
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/325
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 022-2780128
051-35539609 021-2765086
042-37220879 041-2627568

http://digestpk.blogspot.com/

دل صرف اسپتالوں کو فراہم کیے جاتے اور مریضوں کے ناموں کی قرعہ اندازی کلیو جون کی لیب میں کی جاتی اور جن مریضوں کے نام نکل آتے صرف ان کے لیے دل روانہ کیے جاتے تھے۔ شروع میں اسے شکایات ملی تھیں کہ تیسری دنیا کے بعض اسپتالوں میں دھوکا دہی سے دل حاصل کیے جا رہے تھے جنہیں بھاری معاوضے کے عوض دولت مند افراد کو لگایا جا رہا تھا۔ لیکن یہ شکایات اتنی زیادہ نہیں تھیں کیونکہ جب پیداوار بڑھ کر ایک ہزار دل یومیہ ہوئی تو عالمی طلب کا بڑا حصہ پورا ہونے لگا۔ شروع میں طلب پورا ہونے کا تناسب پچاس فی صد تھا لیکن ایک سال میں یہ تناسب ستر فی صد تک جا پہنچا اور اس طرح مصنوعی دل کی بلیک مارکیٹنگ کا امکان کم ہوتا چلا گیا۔ کلیو جون کا اندازہ تھا کہ مزید دو سال بعد جب تمام منتظر مریضوں کو مصنوعی دل لگ جائے گا تو ایک ہزار دل روزانہ کی پیداوار ساری دنیا کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی ہوتی۔

کلیو جون ایک طرف تو نیک نامی اور دولت دونوں کما رہا تھا، دوسری طرف اس پر بعض حلقوں کی جانب سے تنقید کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کلیو جون دل کی تیاری کا راز صرف خود تک رکھے ہوئے ہے۔ اس نے نہ تو کسی اور کو دل تیار کرنے کی اجازت دی ہے اور نہ ہی کسی کو اس کا فارمولا بتایا ہے۔ فائبر کے بنے اس دل میں ریشوں کا کیا تناسب بنتا تھا جس سے اس دل میں بیک وقت نرمی، مضبوطی اور لچک آتی تھی اور وہ طویل عرصے تک انسانی جسم میں بنا خراب ہوئے کام کر سکتا تھا... کیونکہ انسانی جسم کسی بھی مصنوعی چیز کو برداشت نہیں کرتا اور اسے فوری طور پر حل کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے... مگر یہ مصنوعی دل اس طرح بنا تھا کہ اس کے ریشے جسم کے تحلیل کرنے والے مادوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ تنقید کرنے والوں کا کہنا تھا کہ اگر کلیو جون مر جاتا ہے تو اس دل کی تیاری کا راز بھی اس کے ساتھ چلا جائے گا۔ اسے چاہیے کہ اس کا فارمولا عام کرے تاکہ نہ صرف دوسرے اس دل کو تیار کر سکیں بلکہ اسے مزید بہتر بھی بنایا جا سکے۔

کلیو جون کی لیب میں صبح سے شام تک کام ہوتا تھا اور اس کے بعد عملے کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ صرف اس حصے میں کام ہوتا تھا جہاں مصنوعی دل پیک کر کے مختلف ملکوں کو روانہ کیے جاتے۔ کلیو جون عملے کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر لیب میں رکتا تھا۔ اس دوران وہ اگلے دن کے معاملات اور مسائل پر غور کرتا تھا اور اپنے منیجرز کے لیے اگلے دن کے لیے نوٹس لکھتا تھا جو صبح سویرے ان کی میزوں پر پہنچ جاتے۔ اس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا منیجرز کے لیے نوٹس لکھ رہا تھا۔ اس کے دفتر کی شیشے کی دیوار کے باہر لیب کا بیشتر حصہ تاریکی میں تھا۔ اس لیے جب تک وہ سایہ بالکل اس کے دفتر کے سامنے نہیں پہنچ گیا، اسے اس کی آمد کا پتا نہیں چلا۔ شیشے پر سایہ لہرایا تو کلیو جون چونکا۔ سایہ واضح نہیں تھا۔ وہ اس کے دفتر کا آدمی بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ سب جا چکے تھے۔ باہر موجود دو گارڈز کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر انہیں کلیو جون سے کوئی بات کرنی ہوتی تو وہ اس سے فون پر رابطہ کرتے، اس طرح اندر نہیں آتے۔

''کون ہے؟'' کلیو جون نے بلند آواز سے کہا۔

اس پر سایہ حرکت میں آیا اور اندر آ گیا۔ اس نے ایک بڑا سا سوٹ کیس تھام رکھا تھا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو کلیو جون کو اس کی صورت جانی پہچانی لگی۔ پھر وہ اسے پہچان کر حیرت زدہ رہ گیا۔

☆☆☆

بیس سال پہلے کلیو جون حال ہی میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا، اس نے انسانی اعضا کی مصنوعی تیاری کے موضوع پر آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا تھا۔ اس زمانے میں اس کے ساتھ ہی ایک اور نوجوان ولیم فاک نے ڈاکٹریٹ کیا تھا لیکن اس کا موضوع بالکل مختلف تھا اور اس نے انسانی اعضا کی دوبارہ سے تیاری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اتفاق سے دونوں نے سائنسی تحقیق کے ایک ہی ادارے میں ملازمت کی تھی۔ اسی ادارے میں ملازمت کے دوران کلیو جون نے مصنوعی دل کی تیاری کا خیال پیش کیا تھا اور ولیم فاک نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ ولیم کا کہنا تھا کہ مصنوعی دل کسی طرح بھی انسان کے اصلی دل کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس سے پہلے بھی مصنوعی دل بنانے کی بے شمار کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انسان کے اپنے دل کو دوبارہ سے تیار کر کے اس کی پیوند کاری کے منصوبے پر کام کیا جائے۔

سائنسی تحقیق کے ادارے نے ان دونوں کے پروجیکٹس کا جائزہ لیا اور دونوں کو اس کام کا اہل پا کر ان کی منظوری دے دی۔ ولیم کو جتنی خوشی اپنا پروجیکٹ منظور ہونے کی تھی، اس سے زیادہ دکھ اسے کلیو جون کے پروجیکٹ کے منظور ہونے کا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دل، جسم کا اہم ترین عضو ہوتا ہے اور ایک انسان کے لیے اس سے زیادہ توہین آمیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے سینے میں ایک مصنوعی دل

دھڑک رہا ہو۔ دل، انسان کے جذبات کا گھر ہوتا ہے... اگر وہی اصل نہ رہے تو انسان کے جذبات اور احساسات کی کیا حقیقت باقی رہ جائے گی؟ اس کا کہنا تھا کہ ایک انسان کے سینے میں نہ صرف انسانی دل ہونا چاہیے بلکہ یہ اس کا اپنا دل ہونا چاہیے۔ اسی لیے اس نے انسانی اعضا کو دوبارہ سے بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ ایک انسان کے عضو سے ٹشوز لے کر ان کو پرورش کرنے کے بعد ویسا ہی عضو حاصل کر لیا جائے جو بالکل اصل جیسا ہوگا اور انسان کے جسم سے سو فی صد میچ کرے گا۔ اس لیے جسمانی دفاعی نظام کی طرف سے اسے رد کیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت تک ٹشوز کلچر سائنس میں بے پناہ ترقی ہو چکی تھی اور سائنس اصلی اعضا پھر سے بنانے کے تقریباً قابل ہو چکی تھی۔ اس لیے ولیم کو امید تھی کہ وہ کامیاب رہے گا اور اس سے زیادہ اسے یقین تھا کہ کلیو جون ناکام رہے گا... کیونکہ اب تک جتنے مصنوعی انسانی دل بنائے گئے تھے، ان کی کارکردگی ناقص رہی تھی۔ ان کا سائز اور کام کرنے کا فنکشن اصل انسانی دل کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر مصنوعی دل ناکام رہے اور ایک دو بار کے بعد ان کا تجربہ نہیں کیا گیا۔ پھر ان میں دوسرے مسائل تھے۔ اکثر خارجی توانائی سے کام کرتے تھے جس کی وجہ سے انسان کو ہمہ وقت اپنے ساتھ واشنگ مشین کے سائز کی مشین لے کر گھومنا پڑتا تھا۔ پھر مصنوعی ہونے کی بنا پر خون کے جماؤ کا ہمہ وقت خطرہ رہتا تھا اور بالآخر یہ کچھ عرصے کام کرنے کے بعد نقص کا شکار ہو جاتے تھے کیونکہ ان میں مضبوطی نہیں ہوتی تھی اور ان کے والوز بھی ناقص ہوتے تھے۔

ان سب وجوہات کی بنا پر ولیم کو یقین تھا کہ کلیو کبھی مصنوعی دل بنانے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس نے کئی بار یہ بات کلیو سے کہی بھی تھی۔ ''مصنوعی دل ایک احمقانہ خواب ہے۔ اس کی تعبیر پانا ناممکن ہے۔''

کلیو اسے ہمیشہ یہی کہتا۔ ''بہت ساری سائنسی ایجادات اپنی تکمیل سے پہلے دیوانے کا خواب تھیں اور آج وہ ہماری زندگی میں پوری طرح شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسی طرح ایک دن لوگوں کے سینوں میں میرا بنایا ہوا مصنوعی دل دھڑک رہا ہوگا۔''

''مصنوعی دل...!'' ولیم نے حقارت سے کہا۔ ''احساسات اور جذبات سے عاری ایک مشین۔ جون! کیا انسان ایک مشین بن جائے گا؟ مجھے یقین ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایک انسان کے سینے میں انسانی دل ہی ہونا چاہیے۔''

''ممکن ہے تمہارا پروجیکٹ کامیاب ہو جائے اور ایسا ہی ہوگا۔'' کلیو جون نے خلوص سے کہا۔ ''لیکن انسان کو ہمیشہ متبادل پر غور کرتے رہنا چاہیے۔ اس کا کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ فائدہ ہے۔''

''مصنوعی اعضا میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' ولیم نے جواب دیا۔

''ہمارا کام ہے چیز بنانا۔ اس کا کیا فائدہ اور نقصان ہے، اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔''

ولیم ایک شائستہ اور مہذب نوجوان تھا۔ ایسا نوجوان جس میں دوسروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچے، یہ اس کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ وہ تو کسی کو معمولی سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیب میں کام کرنے والی ایک لڑکی کا ہاتھ ایک مشین میں آ کر زخمی ہو گیا تھا تو اس کا زخم دیکھ کر ولیم رو دیا تھا۔ وہ خود اسے اسپتال لے گیا تھا اور اس وقت تک بے چین رہا تھا جب تک ڈاکٹر نے اسے یہ نہیں بتایا کہ لڑکی کا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ اچھے انداز میں پیش آتا تھا۔ وہ کسی سے ایسا مذاق تک نہیں کرتا تھا جس سے اس کی دل آزاری ہو۔

صرف کلیو جون سے اس کی لگتی تھی۔ وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتا تھا اور اکثر اسے ایسے الفاظ کہہ جاتا جو مناسب نہیں ہوتے تھے۔ کلیو نے اسے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی تلخ و ترش باتیں بھی برداشت کر جاتا تھا۔ دوسرے حیران ہوتے تھے کہ ولیم جو ایک دردمند، دوسروں کا خیال رکھنے والا اور خوش اخلاق شخص ہے، وہ کلیو کے ساتھ اس انداز میں کیوں پیش آتا ہے۔ اس کا رویّہ اکثر تہذیب سے گر جاتا تھا۔ اس وقت لوگوں نے سمجھا کہ ان میں مسابقت ہے۔ حالانکہ مسابقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، دونوں بالکل مختلف نوعیت کے کام کر رہے تھے۔

ان دونوں کو اپنے پروجیکٹس میں ابتدائی کامیابی کے لیے تین سال کا وقت دیا گیا تھا۔ اس کے بعد لیب کے اعلیٰ حکام فیصلہ کرتے کہ ان کے پروجیکٹس کو مزید جاری رکھا جائے یا نہیں۔ اس ابتدائی کامیابی کے لیے دونوں جان مار رہے تھے۔ اکثر وہ چودہ پندرہ گھنٹے کام کرتے تھے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ ڈرائیو کر کے گھر جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اس لیے لیب میں ہی سو جاتے تھے۔ ان کا اکثر اتوار کا دن بھی لیب میں گزرتا تھا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا اور تین سال یوں گزر گئے کہ ان کو پتا ہی نہیں چلا۔

http://digestpk.blogspot.com/

مدت پوری ہونے پر لیب حکام نے پروجیکٹس کی تفصیل اور کام طلب کرلیا۔ ولیم فاک نے آغاز سے کام کیا تھا۔ اس نے پہلے چھوٹے ڈیملز پر تجربہ کیا اور ان کا دل خلیات کی مدد سے ٹشو ڈش میں تیار کرکے اس کی اصل دل کی جگہ پیوندکاری کی۔ اس کا تجربہ چوہوں اور خرگوشوں پر کسی حد تک کامیاب رہا تھا لیکن اس کا بنایا ہوا دل بہت جلد بوسیدہ ہوکر ناکارہ ہوجاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس میں اپنی مرمت کی صلاحیت نہ ہو۔ اس نے جتنے دل بھی ٹشو ڈش میں تیار کیے، ان سب کے ساتھ یہی مسئلہ آرہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ بالآخر وہ اس مسئلے کا حل بھی نکال لے گا۔

ولیم فاک کے برعکس کلیوجون نے جانوروں پر تجربات کرنے کے بجائے اپنی ساری توجہ ایک ایسے مصنوعی انسانی دل کی تیاری پر لگادی تھی جو اصل انسانی دل کی طرح مضبوط، لچک دار اور اپنی اندرونی طاقت سے خون پمپ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لیب حکام ان دونوں کے کام کا جائزہ لے رہے تھے۔ جب کلیو کو اپنا کام پیش کرنے کو کہا گیا تو اس نے لیب حکام کو اپنے شعبے میں چلنے کی دعوت دی۔

”میرا کام دیکھنے کے لیے آپ کو وہاں تک چلنے کی زحمت کرنا ہوگا۔ میں عملی طور پر دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے۔“

لیب میں کلیوجون کے لیے الگ مخصوص حصہ تھا جہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ لیب حکام کو وہاں لایا جہاں ٹیبل پر ایک انسان پڑا ہوا تھا اور اس کے اوپر چادر ڈھکی ہوئی تھی لیکن چادر تلے صاف لگ رہا تھا کہ یہ ایک انسان لیٹا ہوا ہے اور زندہ ہے کیونکہ اس کا سینہ مستقل اوپر نیچے ہورہا تھا۔ لیکن جب کلیوجون نے چادر ہٹائی تو وہ حیران رہ گئے کیونکہ وہاں ایک مصنوعی انسانی جسم پڑا تھا۔ یہ ایک مکمل انسانی جسم کی ڈمی تھی جس کی شفاف کھال تلے اس کے تمام اعضا اور خون کی نالیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان نالیوں میں خون بھی رواں تھا۔ ڈمی کا سینہ اوپر نیچے ہورہا تھا۔

”یہ تو ڈمی ہے.....“ لیب ڈائریکٹر نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔

”جی سر... لیکن میں آپ کو کچھ اور دکھانا چاہتا ہوں۔“ کلیوجون نے کہا اور اس نے ڈمی کا سینہ سامنے سے کھولا۔ یہ سینے کے ٹکڑے تھے جو بس رکھے ہوئے تھے۔ کلیو نے انہیں کسی ڈھکن کی طرح الگ کردیا۔ اندر سے بھی ڈمی مکمل تھی اور ایک انسان کے سینے اور پیٹ میں جتنے اعضا ہوتے ہیں، وہ سب درست اور اصل جیسے سائز میں موجود تھے۔ حد یہ کہ اس کے پھیپھڑے بھی کسی میکنزم کے تحت مستقل اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ دل اپنی جگہ تھا۔ شفاف سلیکون فائبر کا بنا ہوا دل دھڑک رہا تھا اور خون بھی پمپ کررہا تھا۔ وہ سب دنگ رہ گئے۔ کلیوجون نے کہا۔

”یہ میرا بنایا ہوا مصنوعی دل ہے۔ مجھے اس کی تیاری اور اس کی جانچ میں دو سال لگے ہیں۔ اس کے بعد میں نے عملی جانچ کے لیے انسانی جسم کی مکمل ڈمی تیار کی۔ اس میں تمام اعضا اور ہڈیاں لگائیں۔ اس کا وزن بھی انسانی جسم جتنا ہے اور باریک رگوں کو چھوڑ کر اس میں تمام انسانی شریانیں بھی بنائی گئی ہیں۔ ان کی لمبائی اور موٹائی انسانی شریانوں جتنی ہے۔ اس دل کو ان میں خون پمپ کرنے کے لیے ایک انسانی دل جتنا زور لگانا پڑتا ہے اور یہ مائع اصل میں خون ہی ہے۔ ڈمی کا درجۂ حرارت انسانی جسم جتنا ہے اور اسی ٹیبل پر اسے مختلف پوزیشنز پر رکھا جاسکتا ہے جس میں ایک انسان کا جسم ہوسکتا ہے۔“

ڈمی میز پر فکس تھی اس لیے جب کلیوجون نے مکینزم کی مدد سے میز کو کھڑا کرکے دائیں بائیں اور الٹا کرکے دکھایا تو ڈمی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دل بدستور ویسے ہی کام کرتا رہا۔ لیب حکام اس تجربے سے متاثر ہوئے تھے لیکن ان میں سے ایک نے کہا۔ ”یہ تو ڈمی ہے... کیا ایک انسان کے جسم میں یہ دل اسی طرح کام کرے گا؟“

”ڈمی میں آزمانے کا مقصد دل کی انسانی جسم میں کام کرنے کی استعداد ہے۔ یہ دل اس ڈمی میں گزشتہ چھ مہینے سے کام کررہا ہے اور اس میں ابھی تک کسی خرابی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی اسے انسانی جسم میں آزمانے کی منزل دور ہے۔“

”تمہیں کتنا عرصہ مزید لگ سکتا ہے؟“

”تین سال تک تو اس کی اسی طرح ڈمی میں آزمائش ہوگی اور اس کے بعد ہی اسے انسان کے جسم میں لگانے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“

سوال کرنے والا لیب ڈائریکٹر بے چین ہوگیا۔ ”یہ کچھ زیادہ طویل عرصہ نہیں ہے؟“

”کسی مرض کے لیے بنائی جانے والی دوا کے تجربات میں اس سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے... یہ تو انسانی جسم کے اہم ترین عضو کا متبادل ہے۔“ کلیوجون نے کہا۔

لیب حکام نے ولیم فاک کے پروجیکٹ کو مزید جاری رکھنے سے انکار کردیا کیونکہ وہ ابھی تک چھوٹے ڈیملز پر ہی

تجربات کررہا تھا اور وہ بھی ناکامی سے دوچار تھے۔ اس میں کامیابی کے لیے طویل عرصہ درکار تھا۔ لیب کے پاس فنڈز کا مسئلہ بھی تھا۔ کلیوجون سے کہا گیا کہ وہ تین سال میں اپنا پروجیکٹ مکمل کرسکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کا پروجیکٹ بھی بند کیا جارہا ہے۔ کلیو نے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس پروجیکٹ کو کامیابی کے لیے کم سے کم دس سال کا عرصہ درکار ہے۔ انکار کے بعد لیب نے اس کا پروجیکٹ بھی بند کردیا اور کلیوجون نے لیب چھوڑ دی۔

اس دوران میں اس کے بنائے ہوئے مصنوعی دل پر ایک ٹی وی چینل نے پروگرام کیا۔ یہ پروگرام بے حد کامیاب رہا اور پورے ملک میں لاکھوں افراد نے اسے دیکھا۔ ایک برطانوی لارڈ نے مرتے وقت اپنی ساری دولت اور جائداد اس شرط پر کلیوجون کے نام کردی کہ وہ اس کی دولت سے مصنوعی دل تیار کرے گا۔ کلیو نے اس دولت سے اپنی ذاتی تجربہ گاہ قائم کی اور مصنوعی دل کی آزمائش میں لگ گیا۔ دل وہ بنا چکا تھا اور اب اس کی آزمائشیں باقی تھیں۔ اس کے لیے اتنا طویل عرصہ درکار تھا۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ کلیوجون نے مصنوعی دل پروجیکٹ پر پھر سے کام شروع کردیا ہے تو اسے مزید عطیات ملنے لگے اور چند سال میں اس کے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی جو اس کے طویل تجربات کے لیے کافی تھی۔

اس کے بعد کلیوجون تن دہی سے اس کام میں لگ گیا۔ اس نے تجربات کی روشنی میں اس دل کو مزید بہتر کیا۔ اس کو طاقت دینے والی مشین کو بہتر بنایا۔ اس دل کو انسانی جسم تک لانے میں اسے مزید پانچ سال کا عرصہ لگ گیا تھا۔ ایک نوجوان دل کے مریض جس کا دل ایک وائرس اٹیک کے بعد رفتہ رفتہ مردہ ہوتا جارہا تھا اور اس کے ٹشوز میچنگ کا مسئلہ بھی ہورہا تھا، اسے مصنوعی دل کے لیے اولین موزوں امیدوار قرار دیا گیا۔ وہ ہانگر تھا اور اب بے بسی سے اسپتال میں موت کا انتظار کررہا تھا۔ جب اسے مصنوعی دل کے بارے میں بتایا گیا تو وہ اسے لگوانے پر راضی ہوگیا۔

یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نوجوان آپریشن کے تیسرے دن بنا کسی سہارے کے چلنے پھرنے لگا اور پانچویں دن اسے اسپتال سے رخصت کردیا گیا۔ ایک مہینے بعد وہ زندگی کے معمولات میں پوری طرح حصہ لینے لگا اور آپریشن کے چھ مہینے بعد اس نے ڈاکٹرز کی نگرانی میں ایک پہاڑی سر کی۔ اس دوران میں اسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ مصنوعی دل بہترین طریقے سے کام کررہا تھا۔ وہ صرف خون نہیں پمپ کرتا تھا بلکہ جسمانی حالت کے لحاظ سے اپنی پمپ کرنے کی رفتار بھی تیز اور آہستہ کرلیتا تھا۔ کلیوجون نے اس تجربے کو فی الحال میڈیا سے چھپایا ہوا تھا کیونکہ میڈیا پیچھے لگ جاتا تو اس کے لیے کام جاری رکھنا دشوار ہوجاتا۔ اس کی خواہش تھی کہ سب تجربات مکمل ہونے کے بعد ان کا اعلان کیا جائے۔ اس نے مزید دو مریضوں کے لیے مصنوعی دل تیار کرکے دیے جو انہیں لگادیے گئے۔ یہ آپریشن بھی کامیاب رہے۔ پورے دو سال تک ان کی آزمائش کی جاتی رہی اور اس عرصے میں ان تینوں مصنوعی دلوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کلیوجون نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی ایجاد کو دنیا کے سامنے لے آئے۔ اس نے بہت بڑے پیمانے پر یہ کام کیا۔ ساری دنیا کے میڈیا کو مدعو کیا اور ان کے سامنے ان تین افراد کو پیش کیا جو دو سے ڈھائی سال کے عرصے سے کلیوجون کے ایجاد کردہ دل کے سہارے جی رہے تھے۔

کلیوجون کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ملی۔ اگرچہ اس پر اعتراضات بھی ہوئے لیکن لوگوں نے ان اعتراضات کی طرف توجہ نہیں دی اور جب اس نے اعلان کیا کہ وہ بغیر نفع نقصان پر اپنا تیار کیا ہوا دل ضرورت مند مریضوں کو فراہم کرے گا تو اس کی مقبولیت آسمان پر جاپہنچی۔ پھر دو سال کے عرصے میں وہ شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچ گیا جہاں کرۂ ارض کا ہر باشندہ اس کا نام جانتا تھا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ لوگوں کے نزدیک اس کی ایجاد سے زیادہ یہ بات قابلِ ستائش تھی کہ اس نے اپنی ایجاد سے کوئی مالی نفع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ نادار مریضوں کو بلامعاوضہ مصنوعی دل فراہم کررہا تھا۔ اسے جتنے عطیات ملتے تھے، وہ اس کام میں صرف کردیتا تھا۔ اسے جو انعامات ملے تھے بس وہی اس کی کمائی تھی۔ اس سے پہلے اسے لیب کے سربراہ کی حیثیت سے سالانہ دو لاکھ ڈالرز تنخواہ ملتی تھی اور اسی میں اس کا گزارہ ہوتا تھا۔ وہ چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا اور عام سی کار استعمال کرتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے بیوی بچے بھی عام سی زندگی گزار رہے تھے۔

البتہ جب اس کے پاس انعامات کی دولت آئی تو اس نے ایک عالی شان مکان بنوایا... اور اپنے بیوی بچوں کو دنیا کی ہر سہولت دی.... لیکن ذاتی طور پر.... وہ اب بھی سادہ تھا وہ اسی پرانی کار میں سفر کرتا تھا اور کم قیمت لباس پہنتا تھا۔ لنچ وہ لیب میس میں تمام ملازمین کے ساتھ کرتا تھا۔ لیب میں بھی اس نے مساوات رکھی تھی۔ البتہ ملازمین کو وہ بہترین تنخواہ دیتا تھا تاکہ وہ پوری دل جمعی سے کام

http://digestpk.blogspot.com/

کریں۔ اس نے تنخواہ کے علاوہ بھی ان کو بہترین سہولیات دے رکھی تھیں اور اس کے بدلے اس کا مطالبہ تھا کہ وہ کام کام سمجھ کر نہیں بلکہ عبادت سمجھ کر کریں۔ اب تک اس کے ملازمین اس کی توقع پر پورے اترے تھے۔ اس کی لیب میں تیار ہونے والے مصنوعی دل کا معیار ساری دنیا آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے لگی تھی۔

کامیابی کے بعد اسے سر کھجانے کی فرصت بھی کم ملتی تھی، اسے پرانی یادیں کہاں سے آتیں، یہی وجہ تھی کہ اسے ولیم فاک کو شناخت کرنے میں کچھ دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

''ولیم... تم؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''تم مجھے یقیناً بھول چکے ہو گے؟'' وہ تلخ انداز میں مسکرایا۔ ''ناکام لوگوں کو سب بھول جاتے ہیں اور صرف کامیاب لوگوں کو یاد رکھا جاتا ہے۔''

''ناکام...!'' کلیو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''نہیں، تم ناکام نہیں تھے۔ تم نے بھی اپنے کام میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی لیکن بدقسمتی سے لیب حکام نے میرے اور تمہارے دونوں کے پروجیکٹس منسوخ کر دیے تھے۔''

''ہاں لیکن تمہیں پھر سہارا مل گیا اور تم نے کامیابی حاصل کر لی۔''

''اگر تمہیں بھی کوئی...'' کلیو کہتے کہتے رک گیا پھر اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو... تم کھڑے کیوں ہو؟''

ولیم اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''ہاں، مجھے تمہاری طرح کوئی سرمایہ دار نہیں ملا جو اپنی ساری دولت اور جائداد میرے نام کر جاتا۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' کلیو نے کہا۔ ''لیکن اس میں قسمت کا بھی دخل ہے۔ ممکن ہے تمہیں کوئی فنڈز لگانے والا مل جاتا تو آج میرے بنائے ہوئے مصنوعی دل کے بجائے تمہارے بنائے ہوئے اصلی دل کا دور ہوتا اور ہر انسان کے جسم میں اس کے اپنے ٹشوز سے تیار کیا ہوا اصلی دل لگا ہوتا۔''

''تمہیں میرا پروجیکٹ یاد ہے؟'' ولیم کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ تم بھول چکے ہو گے۔''

''نہیں، میں بھولا نہیں تھا۔'' کلیو نے کسی قدر بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''سچ کہوں تو مجھے تمہارا آئیڈیا زیادہ پسند آیا تھا لیکن افسوس یہ میرا میدان نہیں تھا ورنہ ممکن ہے ہم دونوں مل کر کام کرتے۔''

''بہرحال، اب تو تم کامیاب ہو چکے ہو۔ تمہارے بنائے ہوئے مصنوعی دل نے دنیا میں دھوم مچا دی ہے۔ ایک لاکھ افراد سینے میں تمہارا تیار کردہ دل لگائے گھوم رہے ہیں۔''

کلیو جون اب کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر پہلو بدلا۔ ''ولیم! تم اندر کیسے آئے؟... میرا مطلب ہے، گارڈز نے تمہیں روکا نہیں؟''

''روکا تھا لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ تم میرے کولیگ رہ چکے ہو تو انہوں نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔''

کلیو سمجھ گیا کہ ولیم جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ گارڈز رات کے اس وقت کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور اگر کوئی اس سے ملنے آتا بھی تو وہ لازمی پہلے اس سے رابطہ کرتے۔ اس طرح تو وہ کلیو کے نائب اور لیب ڈائریکٹر موڈی کو آنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ پھر ولیم اندر کیسے آیا... ''کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ ولیم کی آواز پر چونکا۔

''کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج اتنے عرصے بعد تمہیں میری یاد کیسے آ گئی؟''

''میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کامیابی حاصل کر کے تم کتنا بدل گئے ہو۔'' ولیم کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا کیونکہ کلیو کے بارے میں لحہ بہ لحہ کی خبر میڈیا پر آتی رہتی تھی اور ٹی وی باقاعدگی سے دیکھنے والا شخص جانتا تھا کہ کلیو جون کس قسم کی زندگی گزارتا ہے۔

کلیو ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ اس نے اس بار ذرا سرد لہجے میں کہا۔ ''تو تم نے دیکھ لیا کہ میں کس قسم کی زندگی گزار رہا ہوں؟''

''ہاں، میں پچھلے ایک سال سے اسی کھوج میں ہوں اور میں نے بہت کچھ جان لیا ہے جو دوسرے نہیں جانتے۔''

کلیو چونکا۔ ''کیا مطلب؟ تم نے کیا جان لیا ہے جو دوسرے نہیں جانتے؟''

''بہت کچھ۔'' ولیم مسکرایا۔ ''سب سے پہلی بات یہ کہ لارڈ میکس بری نے اپنی ساری دولت اور جائداد تمہارے نام کر دی تھی۔ یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔''

کلیو کا رنگ ایک لمحے کو بدلا لیکن اس نے جلد خود پر قابو پا لیا۔ ''یہ جھوٹ نہیں ہے، بالکل سچ ہے۔ میرے پاس لارڈ میکس بری کا وصیت نامہ بھی ہے۔''

''یقیناً ہو گا اور شاید اصلی بھی ہو لیکن لارڈ میکس بری

ایک قلاش شخص تھا جو اپنی ساری دولت جوئے میں اڑا چکا تھا۔ اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔''

''یہ غلط ہے۔ میں نے اس کی جائداد اور نوادرات نیلام کر کے دو کروڑ پاؤنڈز کی خطیر رقم حاصل کی تھی۔''

''یہ بھی جھوٹ ہے کیونکہ وہ جائداد اور نوادرات لارڈ میکس بری کے نہیں تھے بلکہ نیلام ہی ایک کہانی ہے۔ ایسا کوئی نیلام کبھی ہوا ہی نہیں۔''

کلیو نے ولیم کی آنکھوں میں دیکھا اور یک دم ہی مسکرا دیا۔ ''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن دوست... تم اسے ثابت نہیں کر سکتے۔''

''مجھے ثابت کرنا بھی نہیں ہے لیکن میں بتا رہا ہوں کہ میں سب جان چکا ہوں۔ یہ بھی کہ تمہیں فنڈز اصل میں کہاں سے ملے اور یہ بھی کہ مصنوعی دل کی تیاری کے پس پشت کیا کہانی ہے۔''

''اچھا۔'' کلیو کا لہجہ مذاق اڑانے والا ہو گیا۔ ''بھلا مجھے فنڈز کس نے دیے اور مصنوعی دل کی تیاری کا اصل مقصد کیا ہے؟''

ولیم فاک نے اپنے کوٹ سے ایک چھوٹا سا رسالہ نکالا۔ ''یہ فیوچر سائنس کا بارہ سال پرانا شمارہ ہے۔ اس میں تم نے ایک مضمون لکھا تھا۔ مصنوعی دل کی تیاری کے بارے میں... یاد ہے؟''

کلیو پریشان ہو گیا۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ اسے تو میں نے...''

''ہاں، تم نے اسے تلاش کروا کے ضائع کروایا تھا لیکن کچھ شمارے بچ گئے اور ان میں سے ایک میرے ہاتھ لگ گیا۔'' ولیم نے رسالہ لہرایا۔ ''اس میں تم نے مصنوعی دل کی تیاری کے اصل مقاصد بیان کیے ہیں۔ پورا مضمون پڑھنا تو بےکار ہے لیکن میں اس میں سے تمہیں کچھ اقتباس سناتا ہوں۔''

''مصنوعی دل ان تمام جذبات اور احساسات سے عاری ہو گا جن کا انسانی دل گھر ہوتا ہے۔

''اسے جذبات کے بجائے مشینی احکامات کے تابع بھی کیا جا سکتا ہے۔

''ضرورت پڑنے پر یہ دل انسان کو موٹی ویٹ کرے گا اور اس سے وہ کام بھی کرا سکے گا جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ مصنوعی دل انسان میں سے وہ تمام جذبات نکال دے گا جو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ جیسے خوف، بزدلی، رحم اور ہمدردی وغیرہ۔ جن افراد کے سینے میں یہ دل لگے گا، وہ ان تمام احساسات سے عاری ہو جائیں گے اور انہیں کبھی ان جذبات کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

ولیم نے رسالہ بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ ''یہ تھے تمہارے مصنوعی دل کے اصل مقاصد!''

''اگر یہ مقاصد بھی تھے تو ان میں کیا برائی ہے؟''

''ممکن ہے کسی وقت میں اسے برائی ہی سمجھتا لیکن اب میں اسے بالکل بھی برائی نہیں سمجھ رہا۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟'' کلیو کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟ تم جانتے ہو کہ میں کن لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں اور ایسی کسی کوشش کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟''

ولیم کے تمسخرانہ تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''میں جانتا ہوں۔ تمہیں فوج کے ایک خفیہ شعبے نے فنڈز فراہم کیے تھے جو مستقبل میں لڑنے والے سپاہیوں کی تیاری پر کام کر رہا ہے۔ ظاہر ہے، ایسا دل سپاہیوں کے لیے ضروری ہے جس میں خوف، بزدلی اور رحم دلی کے جذبات نہ ہوں۔ یہ دو کروڑ پاؤنڈز اصل میں تمہیں حکومت نے فراہم کیے تھے۔ ان کی مدد سے تم نے اپنے تجربات مکمل کیے اور بالآخر مصنوعی دل بنانے میں کامیاب ہو گئے۔''

''چلو میں نے مان لیا کہ میں نے حکومت سے فنڈز لے کر یہ کام کیا ہے، تب بھی اس میں کیا برائی ہے؟ کیا میں نے لاکھ سے اوپر افراد کو یہ دل مہیا کر کے انسانیت کی بھلائی کے لیے کام نہیں کیا ہے؟ اگر میرا تیار کیا ہوا مصنوعی دل نہ ہوتا تو ان میں سے اکثر لوگ موت کی نیند سو چکے ہوتے۔''

''یہ ایک بھلائی کا کام ہے اور جو فوجی تمہارے تیار کیے ہوئے دل کے ساتھ بنا کسی احساس کے لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، ان کا حساب کون کرے گا؟'' ولیم کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''میرا مقصد فوج میں لڑنے والوں سپاہیوں کے دل سے خوف اور بزدلی کے احساسات کو ختم کرنا تھا۔''

''لیکن ساتھ ہی ان میں رحم اور انسانیت کے جذبات بھی ختم ہو گئے۔ تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تمہارا بنایا ہوا دل اگر کسی سپاہی کے لگا ہے تو وہ کسی عام بے گناہ شخص کو قتل کرتے ہوئے احساسِ جرم کا شکار نہیں ہو گا؟''

کلیو جون چپ رہا۔ یہ چپ ہی ولیم کے سوال کا جواب تھی۔ اس کے بجائے اس نے پوچھا۔ ''ولیم! تم کیا چاہتے ہو؟''

ولیم اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے مسکرایا۔

http://digestpk.blogspot.com/

”ایک سال پہلے مجھے احساس ہوا کہ میں اب تک ایک بیکار زندگی گزارتا آیا ہوں۔ میں انسانوں کی بھلائی کے لیے مرا جا رہا تھا اور انسانوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے انسانوں کے لیے اپنی فکر کو خیر باد کہہ دیا۔“

”ہاں، تم میں جذبۂ ہمدردی کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔“

”پایا جاتا تھا۔“ ولیم نے تصحیح کی۔ ”اب میں اس سے چھٹکارا پا چکا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے تمہارے راستے پر چلوں گا۔ میں لوگوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کام کروں گا۔“

”یہ غلط ہے، میں نے لوگوں کے لیے بھی کام کیا ہے۔“ کلیو نے اعتراض کیا۔

”لوگوں کے لیے کام کیا ہے!“ ولیم ہنسا۔ ”نہیں، تم نے لوگوں سے ان کے احساسات اور جذبات چھین لیے ہیں۔ کیا تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ جن لوگوں نے تمہارا تیار کیا ہوا دل لگایا ہے، ان کے احساسات اور جذبات کیسے ہیں؟“

”میں نے اس قسم کی کوئی احمقانہ کوشش نہیں کی۔“ کلیو نے ناگواری سے کہا۔

”لیکن میں نے کی ہے۔ تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ جو لوگ تمہارا تیار کیا ہوا دل لگانے سے پہلے احساس، مروت اور ہمدردی رکھتے تھے، مصنوعی دل لگانے کے بعد وہ درشت، بدمزاج اور بدلحاظ ہو گئے۔ ان میں دوسروں کے لیے ہمدردی اور مروت کے جذبات باقی نہیں رہے۔ صرف عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ اپنے اہلِ خانہ کے لیے بھی وہ جذبات و احساسات سے عاری ہو چکے ہیں۔ ان میں اکثر افراد کا رویّہ ایسا ہو چکا ہے جیسے وہ انسان سے روبوٹ میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ دوسروں کی تکلیف اور پریشانی اب ان کو بالکل بھی متاثر نہیں کرتی۔“

”یہ بکواس ہے۔“

”شریف اور دوسروں کا خیال رکھنے والے لوگ جھگڑالو اور دوسروں کو اذیت دینے والے بن گئے ہیں۔ شاید تمہیں علم بھی نہ ہو، جنہوں نے پہلے کبھی چوہے کا بچہ بھی نہیں مارا، وہ قتل تک کرنے لگے ہیں۔ ہاں، دوست... تمہارے بنائے ہوئے مصنوعی دل سے لیس افراد میں سے سو سے زیادہ قاتل بن چکے ہیں اور انہوں نے یہ قتل بنا کسی اشتعال کے کیے ہیں اور بعد میں بھی اپنے اس قبیح فعل پر شرمندہ نہیں ہیں۔“

”ایک لاکھ افراد میں سے سو قاتل بن گئے ہیں، یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ کلیو نے سنجیدگی سے کہا۔ ”عام طور سے اتنے افراد میں سو قاتل نکل ہی آتے ہیں۔“

”لیکن یہ سارے وہ لوگ ہیں جو پہلے بہت شریف اور امن پسند تھے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔“

”جیسے تم کسی کو نقصان پہنچانے کا نہیں سوچ سکتے؟“ کلیو ہنسا۔ ”لیکن اس بات کو کون تسلیم کرے گا کہ مصنوعی دل لگانے سے لوگوں میں تبدیلی آئی ہے؟ جبکہ اتنی بڑی دنیا کی دس ارب کی آبادی میں صرف ایک لاکھ لوگوں کو یہ دل لگا ہے۔ پھر سالانہ صرف تیس ہزار افراد کو تبدیلیِ دل کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”لوگ جلد جان جائیں گے، جب ایسے اعداد و شمار سامنے آئیں گے... لیکن میرا مسئلہ یہ نہیں ہے اور نہ میں اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”پھر کس لیے آئے ہو؟ اگر تمہارا ارادہ مجھے بلیک میل کرنے کا ہے تو اسے بھول جاؤ۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے، یہ باتیں سب کو بتا دو۔ پوری دنیا میں شور مچاتے پھرو لیکن کوئی تمہاری بات پر یقین نہیں کرے گا۔“

”میں نے کہا نا میں اس مقصد کے لیے نہیں آیا ہوں۔“ ولیم نے کہا۔ وہ عمر میں کلیو سے کچھ ہی بڑا تھا لیکن اپنی عمر سے دس سال چھوٹا لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے کلیو کی طرح شدید محنت نہیں کی تھی اور اس کا زیادہ وقت تفریحات میں گزرا تھا۔

”پھر کس مقصد کے لیے آئے ہو؟“

”اس لیے۔“ ولیم نے اچانک ہی ایک پستول نکال کر کلیو پر تان لیا۔ ”دونوں ہاتھ اوپر کر لو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔“

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ کلیو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم پستول جیسی چیز اٹھاؤ گے۔“

”میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔“ ولیم نے گھڑی دیکھی۔ ”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے مصنوعی دل کا فارمولا کہاں رکھا ہے؟“

”کہیں نہیں، وہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔“

”اوہ... چلو کوئی بات نہیں، اب مجھے دکھاؤ کہ یہ دل کہاں تیار ہوتا ہے۔“ ولیم نے پستول کو جنبش دی۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

”میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا لیکن تم واقعی مجھے شوٹ کر دو گے؟“

اس سوال کے جواب میں ولیم نے اچانک فائر کر دیا۔ گولی کلیو کے بازو سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی اور اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اس نے بازو تھام لیا جس سے خون نکل رہا تھا۔ گولی چلنے سے دھماکا سا ہوا لیکن اس کا دفتر ساؤنڈ پروف تھا۔ آواز یہاں سے باہر نہیں گئی ہوگی۔ کلیو نے چلّا کر کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”اب تم کو یقین آ گیا ہوگا کہ میں تمہیں شوٹ کر سکتا ہوں۔“ ولیم نے کہا۔ ”اب چلو۔“

کلیو لرزتے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ولیم اس کے پیچھے تھا۔ اس نے بڑے سائز کا سوٹ کیس بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کلیو نے کہا۔ ”یہ جو تم کر رہے ہو اس کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

”فائدہ ہوگا۔ میں نے بھی ایک مصنوعی دل بنایا ہے لیکن یہ اس حد تک مصنوعی نہیں ہے بلکہ اس سے جذبات بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔“

کلیو اسے ایک ہال میں لایا جو مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ تھا اور یہاں ہوا اتنی صاف تھی کہ گرد کا ایک ذرّہ بھی نہیں تھا۔ یہاں سو سے زیادہ ماہر ٹیکنیشین مخصوص لباس اور ماحول میں دل اسمبل کرتے تھے اور پھر انہیں جانچ پڑتال سے گزار کر مخصوص ہوا بند ڈبوں میں پیک کر کے ان اسپتالوں کو روانہ کر دیا جاتا تھا جہاں ان کی طلب ہوتی تھی۔ کلیو نے کہا۔

”دل یہاں اسمبل کیے جاتے ہیں۔“ اس نے اب بھی بازو پکڑ رکھا تھا، اگرچہ خون بہنا بند ہو چکا تھا۔

”خوب... اور اس کے پارٹس کہاں بنتے ہیں؟“ ولیم نے پوچھا۔

کلیو اسے ایک اور ہال میں لایا جہاں درجن بھر جدید ترین کمپیوٹرائزڈ...... مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ کلیو کا ایجاد کردہ دل ان مشینوں پر تیار ہوتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”دل یہاں بنتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اب تم آخری بار اس جگہ کو دیکھ لو کیونکہ یہاں مزید کوئی دل نہیں بنے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ میرے دوست... کہ تم اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے اور یہ جگہ تباہ ہو جائے گی۔“

کلیو کا چہرہ دہشت سے بگڑ گیا۔ ”مگر کیوں؟“ اس نے چلّا کر کہا۔

”اب یہ دل میں بناؤں گا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں نے بھی ایک مصنوعی دل ایجاد کیا ہے اور وہ جذبات سے عاری بھی نہیں ہے بلکہ اس سے جذبات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔“

”کک... کیسے جذبات؟“

”نفرت، حسد اور غصے کے جذبات۔“ ولیم مسکرایا۔ ”تم سوچ سکتے ہو کہ جب تمہارے جذبات سے عاری دل کی اتنی مانگ ہے کہ اب تک تم حکومت کو دو لاکھ دل بیس ہزار پاؤنڈ زفی دل کے حساب سے فراہم کر چکے ہو... اور اس فروخت کی رقم ایک خفیہ سوئس بینک اکاؤنٹ میں جاتی ہے تو میرے تیار کیے ہوئے دل کی کتنی مانگ ہوگی۔“

کلیو اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے ولیم نہیں بلکہ اس کا بھوت آ گیا ہو۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ”تت... تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایسے آدمی تو نہیں تھے۔“

”میں اب بدل گیا ہوں۔ میں نے سیکھ لیا ہے کہ دنیا میں شرافت اور اچھائی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اس سے آدمی نہ تو دولت کما سکتا ہے اور نہ عزت۔ اس لیے میں نے خود کو تبدیل کر لیا ہے۔“

کلیو نے پہلی بار سوٹ کیس کو غور سے دیکھا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

”اس میں ایسے آتش گیر مادے ہیں جو اس پوری لیب کو مشکل سے نصف گھنٹے میں خاکستر کر سکتے ہیں اور جب تک فائر بریگیڈ کا عملہ یہاں آئے گا، سوائے راکھ کے کچھ نہیں بچے گا۔“

کلیو کو احساس ہونے لگا کہ ولیم انتہائی خوف ناک شخصیت بن گیا ہے اور وہ اسے قتل کرنے اور لیب کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ کلیو اسے نہیں روک سکتا تھا لیکن اس کے سامنے گڑگڑا ضرور سکتا تھا۔ ”ولیم! خدا کے لیے... میں مانتا ہوں کہ میں نے دولت کے لالچ میں غلط کام کیا اور اپنے مصنوعی دل کو حکومت اور دیگر ممالک کی حکومتوں کو بھی بیچا لیکن اس سے عام آدمی کا فائدہ بھی تو ہوا ہے۔ اگر یہ لیب تباہ ہو گئی تو...“

”جلد دوسری بن جائے گی۔“ ولیم نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ میری لیب ہوگی اور اس میں جو دل تیار ہوں گے ان میں جذبات بھی ہوں گے۔ جو اپنے لیے جیسے جذبات چاہے گا، میں اسے ویسے جذبات کے ساتھ دل دے سکوں گا۔ لیکن میں تمہاری طرح اسے سستا نہیں بیچوں گا۔“

http://digestpk.blogspot.com/

''میری بات سنو... تمہیں دولت کی ضرورت ہے نا؟''
کلیو نے ہاتھ اٹھایا۔ ''میرے پاس بہت دولت ہے۔ سوئس بینک میں میرے بیس ارب پاؤنڈز موجود ہیں۔''

''مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان سے زیادہ کما لوں گا۔'' ولیم نے کہا اور پستول والا ہاتھ سیدھا کیا۔ ''خدا حافظ میرے دوست!''

کلیو نے دونوں ہاتھ آگے کیے جیسے آنے والی گولی سے بچنا چاہ رہا ہو لیکن ولیم نے گولی نہیں چلائی۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ''کلیو! کیا تم جانتے ہو کہ مجھ میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟''

کلیو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا اور شاید اس نے ولیم کا سوال سنا بھی نہیں تھا۔ ولیم نے خود ہی جواب دیا۔

''کچھ سال پہلے مجھے دل کی ایک بیماری ہو گئی تھی جس میں دل رفتہ رفتہ بوسیدہ ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا اور مزید بدقسمتی کہ اس بیماری کا دنیا میں کوئی علاج بھی نہیں ہے۔ اس لیے میرے پاس بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں دل تبدیل کرا لوں۔ اس سلسلے میں میرے پاس دو آپشن تھے۔ ایک کسی سے ٹشو میچنگ کر کے دل عطیے میں حاصل کر لوں اور پھر ساری عمر اسے راضی رکھنے کے لیے دوائیاں کھاتا رہوں اور عملاً ایک بیمار زندگی گزاروں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں تمہارا بنایا ہوا مصنوعی دل لگوا لوں اور صحت مند زندگی گزاروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ دل لگوانے کی صورت میں میرے اندر سے وہ تمام احساسات اور جذبات ختم ہو جائیں گے جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ میں کسی کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھ سے بچوں کا رونا برداشت نہیں ہوتا تھا اور آج میں پورے سکون سے کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں۔ بغیر جذبات میں آئے... کیونکہ مجھ میں جذبات ہیں ہی نہیں۔ تمہارے بنائے ہوئے دل میں جذبات نہیں آ سکتے۔''

''مجھے اس بارے میں معلوم تھا۔'' کلیو نے زیر لب کہا۔

''اب میں تم سے بہتر دل بناؤں گا۔'' ولیم بولا اور اس نے ہاتھ سیدھا کر کے دو گولیاں یکے بعد دیگرے کلیو کے عین دل کے مقام پر اتار دیں۔ وہ زمین پر گرتے ہی مر گیا۔ بس اس کا جسم ایک لمحے کو اینٹھا تھا۔ ولیم نے خود سے کہا۔ ''اصل دل کا یہ نقصان بھی ہے، آدمی کو مرتے وقت اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

اس نے پستول جیب میں رکھا اور حرکت میں آ گیا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا اور اس میں موجود بم نکال کر لیب میں مختلف مقامات پر لگانے لگا۔ اس نے اندر آنے سے پہلے دونوں گارڈز کو بھی قتل کر دیا تھا اس لیے اس کی کارروائی دیکھنے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب لیب جل کر خاکستر ہو جاتی تو کوئی نہ جان پاتا کہ یہ کس کا کام تھا۔ تمام بم ٹائمر کے ساتھ تھے۔ اس نے ان پر آدھے گھنٹے کا وقت سیٹ کیا۔ اسے کام مکمل کرنے میں مشکل سے بیس منٹ لگے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے ہاتھوں پر باریک ربر کے دستانے پہن لیے تھے اس لیے اس کی انگلیوں کے نشانات کہیں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا... اور اگر کوئی نشان رہ بھی جاتا تو آگ اسے چاٹ جاتی۔ اپنا کام مکمل کر کے اس نے خالی بریف کیس بھی ایک بم کے پاس رکھ دیا۔ ویسے اس سے بھی اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

کام مکمل کر کے وہ باہر آیا تو بم پھٹنے میں دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔ اس کی نظر گھڑی کی سوئی پر تھی۔ اسے خیال آیا کہ کلیو کے ایجاد کردہ دل نے اس کی زندگی چھین لی تھی کیونکہ یہ دل ہی تھا جس نے ولیم جیسے نرم مزاج شخص کو سرد مزاج قاتل بنا دیا تھا۔ وہ تین افراد کو قتل کر کے آیا تھا اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔ جیسے ہی وقت پورا ہوا، لیب کی عمارت سے شعلے اٹھنے لگے۔ بموں کے پھٹنے کی آواز اتنی شدید نہیں تھی لیکن انہوں نے لمحوں میں پوری عمارت کو آگ کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ولیم نے ایک نظر عمارت سے اٹھتے شعلوں کو دیکھا۔ اس آگ کو سرد کرنا ناممکن تھا۔

''اب میں تم سے بہتر دل بناؤں گا مسٹر کلیو جون۔'' اس نے زیر لب کہا اور اگنیشن کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اسے اپنے سینے سے کٹ کی آواز آئی اور اسے لگا جیسے کوئی مشین چلتے چلتے رک گئی ہو۔ پھر اس کا ہاتھ بے جان ہوا اور اس کے بعد وہ اسٹیئرنگ پر اوندھے منہ گر گیا۔ اسے ذرا دیر سے احساس ہوا کہ اس کا مصنوعی دل کسی وجہ سے رک گیا ہے اور وہ مرنے والا ہے۔ مصنوعی دل آخر مصنوعی ہوتا ہے، بنا کسی وجہ کے بھی کام کرنا چھوڑ سکتا ہے۔ اسے اپنے جسم کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ احساسات اور جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ جب ایک پولیس کار سائرن بجاتی ہوئی وہاں پہنچی تو ولیم کار میں مردہ پڑا تھا۔

چھوٹی سی بات

محمد عمر نعمان

بظاہر صاف اور عیاں نظر آنے والے منظر کے پس منظر میں بہت کچھ پنہاں ہوتا ہے... ایک سراغ رساں کی باریک بینی... جس نے سب کی نظروں سے اوجھل چیزوں کو کھوج لیا تھا۔

خودکشی کی واردات سے شروع ہونے والے ایک منطقی انجام کی دلچسپ روداد

ایڈریان مونک کے خیال میں تبدیلی کا عمل جاری رہنا چاہیے ورنہ زندگی یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ ہر کام میں ترتیب، توجہ اور موزونیت چاہتا ہے۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں ان سب باتوں کا زیادہ قائل ہو گیا لیکن بدقسمتی سے لوگ اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مونک میں حسِ مزاح کی کمی ہے اور وہ کسی بھی صورت بے ترتیبی قبول نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ اس کی زندگی میں پیش آنے والا وہ حادثہ ہے جس نے اس کی

http://digestpk.blogspot.com/

اچھی بھلی زندگی کو بکھیر کر رکھ دیا۔

دس سال پہلے اس کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا جس کا اس کے ذہن پر بہت برا اثر ہوا۔ اسے نفسیاتی طور پر ناکارہ قرار دے کر سان فرانسسکو پولیس سے نکال دیا گیا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور سراغ رساں کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اس پیشے میں اس کی غیر معمولی صلاحیتیں بہت کام آئیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر معاملے کی تفصیل سے جانچ پڑتال کیا کرتا تھا اور کوئی معمولی سے معمولی بات بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ پولیس بھی اس کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہوگئی لیکن بدقسمتی اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ حالیہ برسوں میں دوبار اسے فارغ کیا گیا... کیونکہ مالی حالات خراب ہونے کی وجہ سے شہری حکام ملازمتوں میں تخفیف کرنے پر مجبور ہوگئے تھے اور ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ مونک کو اپنے پیرول پر رکھ سکیں۔ ان حالات نے ہم دونوں کو ہی پریشان کردیا کیونکہ مونک کی مالی پوزیشن سے میں بھی متاثر ہوتی ہوں۔ جی ہاں... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی کل وقتی ذاتی معاون ہوں۔ یہ تو ہم دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ مونک ایک انتہائی پیچیدہ مشہور کیس حل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اسی بنا پر ہومی سائڈ والوں نے اس کے ساتھ تین سال کا معاہدہ کرلیا اور اس طرح ہم دونوں کو کسی حد تک مالی تحفظ حاصل ہوگیا۔

اس معاہدے کے بعد مونک کی زندگی میں تھوڑی سی یکسانیت آگئی۔ وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے لیکن ایک خواہش اب بھی اس کے دل میں ابھرتی رہتی تھی... یعنی یہ کہ وہ کسی طرح اپنی بیوی ٹروڈی کے قتل کا معما حل کر سکے۔ اسے وہ اپنی نالائقی سمجھتا تھا کہ کئی انتہائی اہم اور پیچیدہ کیس حل کرنے کے باوجود وہ ٹروڈی کے قتل کا سراغ نہ لگا سکا۔ اس کی وجہ سے اس کے ذہن پر ایک بوجھ تھا۔ زندگی میں تبدیلیاں دیکھنے کا خواہش مند مونک اپنی اس کیفیت کو بدلنے سے قاصر تھا۔

اس کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ اس کیس کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ گو کہ اس واقعے کو عرصہ گزر چکا تھا لیکن اسے یہ جان کر قدرے سکون ہوا کہ جس حادثے میں اس کی بیوی کی جان گئی، اس میں کار چلانے والے سے زیادہ اس کی بیوی کا اپنا قصور تھا۔ وہ سڑک پار کررہی تھی کہ اچانک ہی ٹریفک سگنل کی سبز بتی جل اٹھی۔ اس کی بیوی نے بوکھلاہٹ میں سڑک پار کرنے کی کوشش کی لیکن ایک تیز رفتار کار کی زد میں آگئی۔ کار کا ڈرائیور تیزی میں آگے نکل گیا۔ ویسے بھی ہائی وے پر بہت دور جانے کے بعد یوٹرن ملتا ہے۔ صبح کے وقت سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا اس لیے کسی کی نظر اس کار پر نہیں گئی۔ چند منٹوں بعد پولیس کی گشتی کار وہاں سے گزری تو اس وقت تک ٹروڈی دم توڑ چکی تھی۔ اس حوالے سے بہت سی تفصیلات مونک کے علم میں پہلے سے تھیں لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق چھوٹی سے چھوٹی بات جاننے کا خواہش مند تھا۔ پولیس نے تو روایتی تفتیش کے بعد اس کیس کو داخلِ دفتر کردیا لیکن مونک اپنے طور پر جزئیات کی کھوج میں لگا رہا اور اب اسے یہ جان کر اطمینان ہوگیا تھا کہ اس کی بیوی کو کسی نے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا بلکہ وہ اپنی غلطی سے ایک حادثے کا شکار ہوئی تھی۔

اس جانب سے مطمئن ہوجانے کے بعد مونک کی زندگی میں ٹھہراؤ آگیا اور اب میں نے اس میں ایک نمایاں فرق یہ محسوس کیا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا پُرسکون اور قناعت پسند ہوگیا تھا اور اس کا اظہار خود اس نے ایک دن کردیا۔

"تم نے محسوس کیا کہ ان دنوں زندگی خاصی ہموار اور پُرسکون ہوگئی ہے؟"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ موجودہ حالات سے مطمئن ہو۔" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری زندگی میں ترتیب اور سلیقہ آگیا ہے۔ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر ہیں اور کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آتی۔"

"شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تم نے ان پر توجہ دینا چھوڑ دیا ہے۔ تم تن آسان ہوگئے ہو۔"

مونک نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ لوگ پہلے کے مقابلے میں سنجیدہ ہوگئے ہیں اور وہ ہر فعل کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔"

"اور تم اس پر خوش ہو؟"

اس نے اپنے کندھے اچکائے اور بولا۔ "نہیں بلکہ اس کی وجہ سے میرے اضطراب میں تھوڑی سی کمی ہوگئی ہے۔"

☆☆☆

ہماری صبح کا آغاز پولیس اسٹیشن سے ملنے والی خبروں سے ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک صبح مونک کو جائے حادثہ پر پہنچنے کے لیے کہا گیا۔ بظاہر یہ خودکشی کا کیس معلوم ہوتا تھا۔ کم از کم ہمیں اس بارے میں پہلی اطلاع یہی ملی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس میں کہیں کوئی شبہ تھا لیکن پولیس اپنے طور پر موت کی تحقیقات ضرور کرتی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کسی کیس میں گن استعمال کی گئی ہو۔ مونک کو عام طور

پر خودکشی کے کیسوں میں نہیں بلایا جاتا تھا لیکن غیر معمولی حالات میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب متوفی کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہو یا صورتِ حال اتنی سادہ ہو کہ اصل حقیقت تک پہنچنا مشکل نظر آنے لگے۔

اس کیس میں ایسا کوئی پس منظر نہیں تھا اور بظاہر یہ ایک عام سا خودکشی کا کیس لگ رہا تھا۔ ہمیں اطلاع دینے والا ایک پولیس آفیسر تھا جس کے پاس مرنے والے کے نام اور پتے کے سوا کوئی تفصیل نہیں تھی۔ مرنے والے کا نام نیلسن ڈیرک تھا اور وہ شہر کے مشرق میں سنگل فیملی والے کاٹیج میں رہتا تھا جو ایک گیراج کی چھت پر بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک جانب گودام اور دوسری جانب اس جیسا ایک اور کاٹیج تھا اور اس پر برائے فروخت کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچے تو دروازے پر ہی وہ پولیس آفیسر کھڑا تھا۔ میں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ "وہ میری بیٹی سے شاید ہی تھوڑا سا بڑا ہوگا۔" پولیس آفیسر نے کہا۔

"سترہ!" مونک نے کہا۔

"میں چالیس سال کا ہوں۔" پولیس آفیسر جھینپتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری عمر نہیں بلکہ سیڑھیوں کی تعداد کے بارے میں بتا رہا تھا۔" مونک تصحیح کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ!" اس کے گالوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "کیا اس کی بھی کوئی اہمیت ہے؟"

"بہت زیادہ۔" مونک نے کہا اور دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ اسے توڑ کر کھولا گیا ہے۔

"کسی شخص کی خودکشی کا سیڑھیوں کی تعداد سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

"اس کا جواب تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔" مونک نے بے رخی سے کہا اور اس کے بعد جائے وقوع کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل، چٹخنی، ٹوٹی ہوئی چوکھٹ، چٹخنی کی ٹوٹی ہوئی زنجیر اور اسکرو سمیت تمام نصب شدہ اشیا کو بہ غور دیکھا۔ آفیسر کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ہم تو صرف سیڑھیوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔"

"اس سوال کا جواب تم اپنے آپ سے پوچھو۔" مونک برہم ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے اس پہلو پر غور کیا کہ اس مکان میں کس قسم کا آدمی رہ سکتا ہے؟ صرف وہی جو زندگی کے ہاتھوں ستایا ہوا ہو... جو اپنی غربت اور فاقہ کشی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو... جسے ہر روز ان سیڑھیوں سے چڑھتے اترتے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا ہو۔ اس کے سر پر پستول رکھنا گویا اسے دنیا کے دکھوں سے نجات دلانے کے مترادف ہے۔"

مونک نے اپنا سر نیچے کیا اور اندر جا کر لکڑی کے بنے ہوئے فرش کا معائنہ کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک شخص پر گئی جو خود بھی فرش کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے مونک کو دیکھا تو بولا۔ "معاف کرنا۔ میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔"

اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے نیوی بلیو سوٹ، سفید قمیص اور سرخ و سفید دھاریوں والی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اگر اس کے سیدھے ہاتھ کی تین انگلیوں پر پٹی نہ بندھی ہوتی تو اس کی ظاہری حالت کسی امریکی صدر سے کم نہیں تھی۔

اسی وقت کیپٹن اسٹالٹ میئر بائیں جانب والے

تحسین

جارج برنارڈ شا کو اپنے ان نقادوں سے اچھی طرح نمٹنا آتا تھا جو کبھی کبھی اس کے فن پر بے جا تنقید کردیا کرتے تھے۔

ایک بار تھیٹر میں اس کا نیا ڈراما پیش کیا جارہا تھا عوام کو وہ ڈراما اتنا پسند آیا کہ انہوں نے شور مچا مچا کر تھیٹر کے منتظمین کو مجبور کردیا کہ ڈراما نگار کو اسٹیج پر لے کر آئیں تاکہ اس عظیم فن کار کا دیدار کیا جاسکے۔

برنارڈ شا اسٹیج پر پہنچا اور بار بار جھک کر ناظرین کی تعریفوں کا شکریہ ادا کرتا رہا اسی اثنا میں ایک جانب سے آواز آئی۔ "شا! تمہارا ڈراما بالکل بکواس ہے۔"

تھیٹر میں موجود سارے کے سارے تماشائیوں پر سکتہ سا طاری ہوگیا مگر بہت ہی معمولی سی ہچکچاہٹ کے بعد برنارڈ شا ایک قدم آگے بڑھا اور جس طرف سے آواز آئی تھی ادھر اپنا منہ کر کے بولا۔ "میرے دوست! میں تم سے سو فیصدی متفق ہوں لیکن اتنی اکثریت کے سامنے ہم دونوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟"

اور ہال ایک بار پھر تعریفی تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

کراچی سے دُر شمیم کی پسند

http://digestpk.blogspot.com/

کمرے سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ نصف درجن کے قریب فارنسک کا عملہ تھا۔ شادی کے بعد سے کیپٹن اسٹالٹ نے اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ اس کی گھنی مونچھیں سلیقے سے ترشی ہوئی تھیں اور بال بھی سنورے ہوئے تھے۔ لباس بے داغ اور شکنوں سے آزاد تھا۔

''تمہارے آنے کا شکریہ!'' کیپٹن، مونک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم ڈیوڈ ہیل سے پہلے ہی مل چکے ہو؟''

''دراصل ہماری باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی۔'' مونک بولا۔ ''بلکہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' ہیل بولا۔ ''لگتا ہے کہ میں ابھی تک صدمے کی کیفیت میں ہوں۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ نیلسن خودکشی بھی کر سکتا ہے۔''

''کیا تم نے سیڑھیاں نہیں دیکھیں؟'' مونک نے پوچھا۔

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں سیڑھیاں چڑھے بغیر ہی اوپر آگیا؟''

''میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا مسٹر ہیل!'' مونک نے کہا۔

کیپٹن مونک کی طرف مڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ''نیلسن ایک مصنف تھا اور مسٹر ہیل اس کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔''

''نیلسن گزشتہ دس سال سے میرا کلائنٹ تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ مشکلات میں ہی گھرا ہوا دیکھا۔ وہ ڈپریشن میں مبتلا رہتا تھا اور کبھی کبھی خودکشی کے بارے میں بھی سوچنے لگا تھا لیکن اب اس کی کیفیت پہلے سے بہتر تھی اور میں یہی سمجھا کہ وہ ماضی کو بھلا چکا ہے۔ ہم دونوں کو آج صبح ملنا تھا تاکہ ایک ایڈیٹر کے ساتھ اس کی نئی کتاب کے معاہدے کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ میں نے اسے کئی بار فون کیا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ چنانچہ مجھے اوپر آنا پڑا۔ پہلے میں نے دروازے پر دستک دی۔ جواب نہ ملنے پر کھڑکی سے جھانکا جس پر پورا پردہ پڑا ہوا تھا لیکن ان کے درمیان تھوڑا سا خلا موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی لکھنے والی کرسی پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی اطلاع میں نے فوراً ہی پولیس کو دے دی۔''

ہیل نے کچن کی جانب دیکھا جہاں پولیس والے میز پر بیٹھے کافی کے گھونٹ لے رہے تھے۔

''انہوں نے دروازہ توڑ دیا۔'' ہیل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن بہت دیر ہو چکی تھی اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔''

کیپٹن نے ہیل کی جانب دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہرنا پسند کرو گے؟ ممکن ہے کہ ہمیں کچھ سوالات کرنا پڑیں۔''

''ہاں ہاں... کیوں نہیں۔'' ہیل جلدی سے بولا اور ایک بار پھر اپنی نظریں فرش پر جما دیں۔

''اگر تم چاہو تو باہر جا سکتے ہو لیکن کہیں دور مت جانا۔''

مونک نے اسٹڈی کا رخ کیا اور اپنی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایک نظر لاش کو بھی دیکھ لیا جائے۔''

اسٹالٹ میئر نے فارنسک ٹیم کو مخاطب کر کے کہا۔ ''سب لوگ باہر چلے جائیں۔ سراغ رساں لاش کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''

سب لوگ باہر آگئے۔ اب کمرے میں ایک لیڈی سراغ رساں اور لاش کے سوا کوئی نہ تھا۔ نیلسن ڈیرک اپنی کرسی پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی پیٹھ ہماری جانب تھی۔ اس کا جسم کرسی کے ایک ہتھے پر لٹکا ہوا تھا۔ نزدیک ہی فرش پر گن پڑی ہوئی تھی جو اس کے جھولتے ہوئے بازو کی پہنچ سے باہر تھی۔ میز پر ایک پرانا ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا جس پر ایک کاغذ چڑھا ہوا تھا اور اس پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی کوک کے دو کین اور چپس کی کھلی ہوئی تھیلی رکھی ہوئی تھی۔

مونک نے اس کے سر کا دونوں طرف سے جائزہ لیا۔ اس کے دونوں بازو اٹھا کر اس کے سامنے کیے اور ایک فلم ڈائریکٹر کی طرح سین بنانے لگا۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد وہ کتابوں کی الماری کی طرف گیا اور فریم میں لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں نوجوان ڈیرک ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھا تھا اور اس کی درمیانی انگلیاں ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر تھیں۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا اور قریب ہی اسکاچ کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

خاتون سراغ رساں بھی مونک کو بہ غور دیکھ رہی تھی۔ اس نے پرانی سی جینز اور وی گلے کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ چمڑے کی جیکٹ پر اس کے نام کا بیج لگا ہوا تھا جبکہ بیلٹ میں لگے ہولسٹر میں اس کا ریوالور بھی نظر آرہا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ وہ لمبے قد اور دبلے جسم کی مالک تھی۔ اس نے جب مجھے اپنی جانب متوجہ پایا تو ایک سرد نگاہ ڈال کر منہ پھیر لیا۔ اتنی دیر میں مونک اپنا کام ختم کر چکا تھا۔

''یہ لیفٹیننٹ ایمی ڈیولن ہیں۔'' اسٹالٹ میئر نے

مونک سے اس خاتون کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''حال ہی میں ان کا ٹرانسفر ہومی سائڈ میں ہوا ہے۔'' پھر وہ ایمی سے بولا۔ ''یہ مسٹر مونک ہیں۔ ہمارے خصوصی کنسلٹنٹ اور ان کے ساتھ معاون عیتالی ٹیگر ہیں۔''

ہم نے آپس میں مصافحہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

اس نے رسماً سر ہلایا اور مونک کی طرف متوجہ ہو گئی جو لکھنے کی میز کے نیچے جھکا ہوا تھا۔ ''میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔''

وہ اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایک جوڑی دستانوں کی ضرورت ہے۔''

کیپٹن نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دستانے نکال کر اسے پکڑا دیے۔ ہم سب مونک کے گرد اکٹھے ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ اسے کیا خاص ثبوت ملا ہے۔ اس نے ڈیرک کے جوتوں کے تسمے باندھنا شروع کر دیے۔

''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' ڈیولن نے پوچھا۔

''کیونکہ یہ بندھے ہوئے نہیں تھے۔''

''لیکن اب اس کی کیا ضرورت ہے؟ وہ مر چکا ہے اور اب کہیں جانے کے قابل نہیں رہا۔''

مونک نے دونوں جوتوں کے تسمے باندھے اور اسٹالٹ میئر سے بولا۔ ''ان خاتون کو پولیس کے کام کے بارے میں بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔''

ڈیولن بھی خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے کیپٹن سے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ مونک کو صرف مشکل کیس کے لیے بلایا جاتا ہوگا۔''

''فی الحال ہمارے پاس کوئی دوسرا سراغ رساں نہیں ہے لہٰذا میں نے سوچا کہ تم دونوں کے ملنے کے لیے یہ ایک اچھا موقع ہے تاکہ ایک دوسرے کے طریقۂ کار کے بارے میں جان سکو۔''

''لگتا ہے کہ ہم لوگ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' ڈیولن بولی۔ ''بظاہر یہ ایک سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہے۔''

مونک میز کے نیچے سے نکل کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے؟''

ڈیولن نے ٹائپ رائٹر میں لگے ہوئے کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس خط میں خودکشی کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے ہاتھ میں گن تھی اور گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھے... لہٰذا باہر سے کسی شخص کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

انصاف

موجودہ دور میں دنیا کے مختلف ممالک کی عدالتوں میں مقدمات کی غیر معمولی بھرمار ہے لیکن اس معاملے میں اٹلی نے تو حد ہی کر دی۔ تازہ اطلاع کے مطابق بیس لاکھ اطالوی اپنے مقدمات کی سماعت کے انتظار میں ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ پانچ سال سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ 27 ہزار اطالوی ایسے ہیں جو ایک سال سے جیل میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں لیکن ان کے مقدمات کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔

مرسلہ: افضال احمد زبیری، نئی کراچی

''تم سیڑھیوں کو بھول گئیں۔'' مونک نے کہا۔

''سیڑھیوں کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''ان کی تعداد سترہ ہے۔ ہم انہیں کس طرح نظرانداز کر سکتے ہیں؟ چاہو تو بعد میں متعلقہ آفیسر سے پوچھ لینا۔ وہ اس کی وضاحت کر دے گا۔ البتہ تمہیں اپنے مشاہدے کو تیز کرنے کی ضرورت ہے... ورنہ ہومی سائڈ میں نہیں چل سکو گی۔''

یہ کہہ کر وہ جھکا اور ٹائپ رائٹر میں لگے کاغذ کی تحریر پڑھنے لگا۔ ''میں نے دس سال پہلے ایک اچھا ناول لکھا تھا اور بار بار اسے کاٹ چھانٹ کر لکھ رہا ہوں۔ اب میں لوگوں کو مزید بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ کم از کم اپنے آپ کو تو بالکل نہیں۔ مجھے یہ کام بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ اس طرح لوگوں کو بہت سی تکلیف سے بچایا جا سکتا تھا۔''

''موت کا وقت کیا تھا؟'' مونک نے پوچھا۔

''میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت صبح تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔''

''کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی؟'' میں نے پوچھا۔

خاتون سراغ رساں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں نے شادی کی محفل میں چلانا شروع کر دیا ہو۔

''پارکنگ لاٹ سڑک کے دوسری جانب ہے اور رات میں وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ پڑوس میں واقع گودام بھی

http://digestpk.blogspot.com/

اس وقت خالی تھا جبکہ دوسرا امکان بھی خالی ہے اور اس پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا ہے... لہٰذا یہ امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی ہو۔"

"تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ ڈیرک نے ہی یہ خط لکھا تھا؟" مونک نے خاتون سراغ رساں سے پوچھا۔

ڈیولن نے گہرا سانس لیا اور بولی۔ "ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ اور اس کاغذ پر انگلیوں کے نشانات ایک جیسے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریر ڈیرک کی ہی ہے۔"

"تم کون سی انگلیوں کی بات کر رہی ہو؟" مونک نے پوچھا۔

"ہم نے سب انگلیوں کے نشانات لیے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹائپ رائٹر یا کمرے میں کسی دوسری جگہ پر کوئی اور نشانات نہیں ملے کیونکہ ڈیرک اکیلا رہتا تھا۔"

مونک نے ایک بار پھر تحریر پر نظر ڈالی اور ہیل کی جانب مڑا جو بیرونی کمرے میں ٹہل رہا تھا لیکن اب بھی اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ مونک نے اپنے سر کو دائیں بائیں گھمایا۔ میں جانتی تھی کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہے لیکن جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو وہاں مجھے بے گانگی کی جھلک نظر آئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود ہی اپنے طور پر لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ڈیولن سے کیوں الجھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم مطمئن ہو گئے ہو گے؟" ڈیولن نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" مونک نے مختصر سا جواب دیا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ایک آسان سا کیس ہے۔"

"یقیناً۔" مونک بولا۔ "ایک سادہ سا قتل کا کیس!"

قتل کا لفظ سنتے ہی ڈیوڈ ہیل نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ لفظ ہی ایسا ہے جسے سن کر چونک جانا ایک فطری سی بات ہے۔

ڈیولن نے مونک کو گھورا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے اخذ کردہ نتائج کے خلاف کچھ نہیں سننا چاہتے۔ وہ ذرا تیز لہجے میں بولی۔ "کیا تم نے میری بات غور سے نہیں سنی؟"

مونک سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ کاغذ پر لکھی تحریر ڈیرک کی ہے اور کی بورڈ پر اسی کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔"

"پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ قتل کا کیس ہے؟"

"کیونکہ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ کاغذ پر ٹائپ شدہ تحریر ڈیرک کی ہے اور کی بورڈ پر اسی کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔"

ڈیولن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی اپنا پستول نکال کر اسے شوٹ کر دے گی۔ میں نے محسوس کیا کہ کیپٹن اسٹالٹ میئر بھی اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب میں اس پوری مشق کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈیولن بھی مونک کے غیر روایتی طریقۂ کار کو سمجھ لے تاکہ مستقبل میں اسے غیر معمولی قتل کے کیس حل کرنے میں آسانی ہو۔

مونک اس سے اسی انداز میں پیش آ رہا تھا جس طرح وہ دوسروں سے برتاؤ کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے طریقۂ کار کے مطابق کام کر رہا تھا اور اسے اس بات کی بالکل بھی پروا نہیں تھی کہ دوسرے لوگوں پر اس کے عمل کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ ڈیولن پر منحصر تھا کہ وہ کس طرح اس کے نقشِ قدم پر چلنا سیکھتی ہے۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا اور یہ بات مجھے طویل، تکلیف دہ اور ذاتی تجربے کے بعد معلوم ہوئی تھی۔

"مونک کا کہنا ہے کہ یہ سارے شواہد خودکشی کے بجائے قتل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔" کیپٹن وضاحت کرتے ہوئے بولا لیکن اس بار وہ اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس سے ڈیولن اور جھنجلا گئی۔

"ہاں، میں جانتی ہوں۔" وہ تناؤ کے عالم میں بولی۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں خود بھی نہیں سمجھ سکا لیکن جب مونک اس کی وضاحت کرے گا تو ہم دونوں اپنے آپ کو احمق سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

مجھے لگا کہ ڈیولن کو کیپٹن کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ وہ کسی صورت بھی اپنے آپ کو احمق سمجھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کے چہرے کی سختی اور بڑھ گئی۔

"ہمیں اس معاملے کو شروع سے دیکھنا ہوگا۔" مونک سنجیدگی سے بولا۔ "تم نے مجھے بتایا کہ ڈیرک کی انگلیوں کے نشان پورے کی بورڈ پر موجود ہیں حالانکہ وہ صرف دو انگلیوں سے ٹائپ کیا کرتا تھا۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"یہ تم دیوار پر لگے ہوئے فوٹو میں دیکھ سکتی ہو۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ٹائپ کرنے کی وجہ سے اس کی درمیانی انگلیوں کے سرے سخت ہو گئے ہوں گے اور ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ پر صرف انہی انگلیوں کے نشانات ہونے

چاہئیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کسی دوسرے شخص نے یہ تحریر ٹائپ کی۔ اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اس پر ڈیرک کی انگلیوں کے نشان ڈال دیے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کئی سالوں کی مشق کے بعد ڈیرک سیکھ گیا ہو کہ ٹائپ کرنے کے لیے دو سے زیادہ انگلیاں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔" ڈیولن نے امکان ظاہر کیا۔

"شاید... لیکن ہم اس تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"اس میں کیا خرابی ہے؟" ڈیولن نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"اس پیراگراف میں ٹائپنگ کی غلطیاں بھی ہیں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ نیلسن کے بجائے کسی اناڑی شخص نے جلدی میں یہ خط ٹائپ کیا ہے۔"

"اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔ "میں اب بھی یہی سمجھتی ہوں کہ ڈیرک نے ہی یہ تحریر لکھی ہے اور پورے اعتماد کے ساتھ اسے خودکشی قرار دیتی ہوں۔"

"تم ان دروازوں اور کھڑکیوں کو بھول رہی ہو جو اندر سے بند تھے۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ اچھا ہوا کہ تم نے یہ نکتہ بھی پکڑ لیا۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ قتل کا کیس نہیں ہے۔"

"اگر غور کرو تو یہی اس قتل کا واضح ثبوت ہے۔" مونک نے کہا۔ "جیسا کہ تمہیں یقین ہے کہ ڈیرک نے صبح تین بجے کے قریب اپنے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی اور قرب و جوار میں کوئی بھی شخص اس فائر کی آواز سننے کے لیے موجود نہیں تھا۔ تب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈیرک کو تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اسے یہ ڈر تھا کہ باہر سے کوئی شخص اسے بچانے کے لیے آ سکتا ہے؟"

"وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔" ڈیولن نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" مونک نے کہا اور داخلی کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈیوڈ ہیل موجود تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا، ہم سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"دروازے کا ہینڈل اور چٹخنی کی زنجیر اندر سے بند تھی کیونکہ جب دروازہ توڑا گیا تو ان کی وجہ سے چوکھٹ کو نقصان پہنچا اور یہ دونوں چیزیں بھی مکمل طور پر ناکارہ ہو گئیں۔"

"یہ کوئی نئی اطلاع نہیں ہے۔" ڈیولن بولی۔

"لیکن چٹخنی اندر سے بند نہیں تھی کیونکہ اس کا جو حصہ چوکھٹ میں نصب ہے، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

سینگ

قمر لمبے شہر کے نواح میں قائم ہونے والی تمام مویشی منڈیوں کے پھیرے لگا کر مایوس ہو چکے تھے۔ قربانی کے لیے ان کا بجٹ کل 35 ہزار تھا جس میں سے سات سو اسّی روپے ان پھیروں میں خرچ ہو چکے تھے۔ دام آسمان سے باتیں کر رہے تھے انہیں امید نہیں تھی کہ 34,220 روپے میں کوئی مناسب گائے مل سکے گی۔

وہ ان ہی پریشانیوں میں غلطاں، برنس روڈ سے گزر رہے تھے کہ انہیں بجلی کے ایک کھمبے سے بندھا ہوا ایسا جانور نظر آیا جو قامت و جسامت کے اعتبار سے ان کے بجٹ میں آ سکتا تھا۔

وہ لپک کر اس کے قریب گئے اور عینک کے دھندلائے ہوئے شیشوں کو صاف کر کے جانور کا معائنہ کرنے لگے۔ ان کی گہری دلچسپی دیکھ کر دھوتی اور بنیان میں ملبوس، ایک توانا شخص ان کی طرف آیا اور اشتباہ آمیز نظروں سے ان کا جائزہ لینے لگا۔

قمر لمبے نے داموں کی بات چھیڑنے سے قبل جانور کی عیب جوئی ضروری جانی تاکہ اس کے مالک کو ذہنی جھٹکا دے سکیں۔ انہوں نے جانور کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دھوتی پوش سے پوچھا۔ "اس گائے کے سینگ کیوں نہیں ہیں؟"

"جانوروں کے سینگ لڑائی جھگڑے میں ٹوٹ جاتے ہیں۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکا کے جواب دیا۔ "کچھ کے پیدائشی سینگ نہیں ہوتے، بعض کے کٹوا دیے جاتے ہیں مگر میں دھوبی ہوں اور یہ گائے نہیں، میرا گدھا ہے۔"

قمر لمبے سر جھکا کر تیزی کے ساتھ وہاں سے یوں رخصت ہوئے جیسے چوری کرتے ہوئے کسی نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

کوئٹہ سے راشدہ بتول کا انتخاب

ہم سب نے چوکھٹ کو غور سے دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا لیکن ڈیولن اب بھی ماننے کو تیار نہ تھی۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"یہ چٹخنی اس لیے بند نہ ہو سکی کیونکہ قاتل کے لیے دروازے سے باہر جانے کے بعد ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔"

"پھر اس نے چٹخنی کی زنجیر کیسے چڑھائی؟" ڈیولن نے پوچھا۔

"اس کے لیے اس نے مچھلی پکڑنے کی ڈور اور ایک ہک استعمال کیا لیکن جب وہ دروازہ بند کرنے کے لیے ہک

http://digestpk.blogspot.com/

کو کھینچ رہا تھا تو ڈور ٹوٹ گئی۔"

"اگر یہ سچ ہے تو وہ ہک کہاں گیا؟"

مونک مڑا اور ہیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہی وہ سوال ہے جو یہ اپنے آپ سے کر رہا ہے۔"

ہیل اپنی جگہ کھڑے کھڑے یوں کپکپانے لگا جیسے کسی نے یخ بستہ پانی سے بھری ہوئی بالٹی اس کے اوپر انڈیل دی ہو۔ وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں بولا۔ "یہ سچ نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔"

"نیلسن ڈیرک کی لاش جس حالت میں دیکھی گئی، وہ ایک بہت ہی دردناک منظر ہے۔ خاص طور پر اس کے دوستوں اور چاہنے والوں کے لیے۔ ایسی صورت میں لوگ لاش کے قریب رہنا پسند نہیں کرتے لیکن تم نے پولیس کے آنے تک یہ جگہ نہیں چھوڑی۔"

"مجھ سے یہاں رکنے کے لیے کہا گیا تھا۔"

"کسی نے تم سے یہاں رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ تم باہر کھڑے ہو کر بھی پولیس کا انتظار کر سکتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا اور اسی جگہ موجود رہے کیونکہ تمہیں کسی چیز کی تلاش تھی۔"

"تم نے خود ہی کہا ہے کہ اپنے دوستوں یا جاننے والوں کو اس حالت میں دیکھنا بہت مشکل ہے... پھر میں ڈیرک کی لاش کیسے دیکھ سکتا تھا۔"

"تمہیں ڈیرک کی لاش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ تم شدت سے وہ ہک ڈھونڈ رہے تھے۔"

"اگر ایسا ہے تو ہم اس ہک کو تلاش کر لیں گے۔" میں جلدی سے بولی۔

"یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔" مونک بولا اور اس کی نظر کچن میں بیٹھے سپاہیوں پر گئی جو کھانے پینے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں کچھ کہتا، کیپٹن بولا۔ "وہ ہک کہاں ہے؟"

مونک نے کچن میں بیٹھے سپاہی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "وہ ہک ڈیفی کے بائیں پاؤں کے جوتے میں اٹکا ہوا ہے۔"

"تمہیں یہاں سے بھی وہ ہک نظر آ رہا ہے؟" ڈیولن حیرت سے بولی۔

"یہ ہک میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا جب یہ شخص کافی پینے کے دوران بے چینی سے اپنی بائیں ٹانگ کو ادھر ادھر ہلا رہا تھا لیکن اسے اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اپنا جوتا اتار کر دیکھ لیتا۔"

ڈیولن کچن کی طرف بڑھی اور اس سپاہی کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے جوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سپاہی نے ایک ایک کر کے اپنے پاؤں اوپر اٹھائے تو مونک کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ وہ ہک سپاہی کے بائیں پیر کے جوتے میں اٹکا ہوا تھا۔ ڈیولن واپس اپنی جگہ پر آتے ہوئے بولی۔ "اوہ میرے خدا! میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

اسٹالٹ میسّر اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب مسٹر ہیل کو اپنے دفاع کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔"

"اس ایک ہک کے مل جانے سے یہ کیسے ثابت ہو گا کہ نیلسن کو قتل کیا گیا ہے؟" اس بار ہیل کا انداز مدافعانہ تھا۔

"اس سے بھی بڑا ثبوت تمہاری انگلیوں پر لگا ہوا زخم ہے۔" مونک نے اس کی تین انگلیوں کی جانب اشارہ کیا جن پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ "جب تم مچھلی پکڑنے کی ڈور سے ہک کو کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے تو اس ڈور سے تمہاری انگلیاں کٹ گئیں۔ کیا اس کے بعد بھی شبہے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟"

ڈیولن نے اپنی کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھیلے سے ہتھکڑی نکالی اور ہیل کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اب تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، وہ عدالت میں کہنا۔"

واقعی ہیل کے پاس مزید کچھ کہنے کے لیے نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔

اسٹالٹ میسّر نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم نے غور کیا ہو گا کہ اس طرح کے کیسوں میں آدھے ایسے ہوتے ہیں جن میں پولیس کو اطلاع دینے والا ہی قاتل ہوتا ہے۔"

"پھر تو تمہیں جائے واردات پر پہنچتے ہی اس شخص کو گرفتار کر لینا چاہیے تھا تاکہ وقت ضائع نہ ہوتا۔"

اس دوران میں مونک بالکل خاموش کھڑا رہا۔ ڈیولن نے ہیل کی ہتھکڑی تھامی اور اسے باہر لے گئی۔ میں نے مونک سے پوچھا۔ "تم نے یہ تو معلوم کر لیا کہ یہ خودکشی نہیں بلکہ قتل کا کیس ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیلسن کو کیوں قتل کیا گیا؟"

"تھوڑا بہت کام پولیس کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہیے ورنہ ان کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔" مونک نے اسٹالٹ میسّر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ قتل کی وجہ بھی جان گیا ہو گا لیکن وہ اپنے لیے مقرر کردہ حدود سے باہر نکلنا کبھی پسند نہیں کرتا۔ ایک بار پھر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ ہمارے کام میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی کتنی اہمیت ہے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک صرف اپنی شناخت اور ذات کا ادراک کافی نہیں ہوتا ...... یہی احساس وہ دوسروں کے لیے بھی شدت سے محسوس کرتے ہیں ...... ایک ایسی ہی لڑکی کی دوستی اور ذہانت کا ماجرا جو اپنی دوست کے قاتل کو ہر ممکن طور پر قانون کی گرفت میں چاہتی تھی۔

ایک سادہ لوح عورت کا قصہ جس کے گرد سازشی افراد کا گھیرا بڑھ رہا تھا

سلیم انور

کایاپلٹ

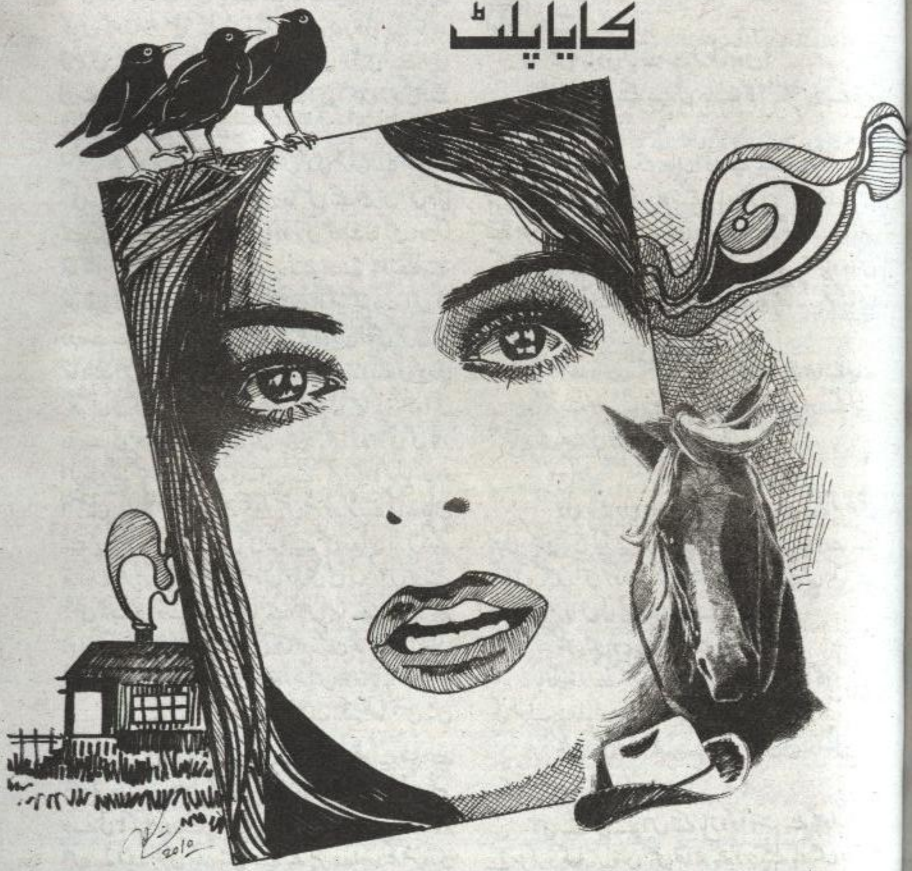

ایلس کو اخبار میں شائع ہونے والی قتل کی سنسنی خیز خبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ عموماً انہیں نظرانداز کر دیا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سبھی خبریں ایک جیسی ہوتی ہیں اور ان میں پڑھنے کے لیے دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا لیکن اس خبر کی سرخی پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی۔ اس نے اپنے شوہر کے جانے کے بعد اطمینان سے اس خبر کو پڑھنا شروع کیا۔ ایک عورت ہالی ڈے ہوم میں مردہ پائی گئی تھی اور پولیس ابھی تک اس قتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ اس خوب صورت عورت کے قتل کی وجہ سے پورے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ مقتولہ کا نام پڑھ کر وہ چونک گئی۔

http://digestpk.blogspot.com/

یہ نام اس کے لیے غیر معمولی ضرور تھا لیکن اجنبی نہیں۔

ایسٹیل نے یتیم خانے میں پرورش پائی لیکن وہ شروع سے ہی پُرعزم، باہمت اور بلند حوصلہ واقع ہوئی تھی۔ اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جنون تھا اور وہ زندگی کی ہر خوشی کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتی تھی اور اسی لیے اس نے اپنے لیے یہ مردانہ نام پسند کیا تھا۔ ایلس اور وہ دونوں چھٹی جماعت سے کالج جانے تک ساتھ رہیں۔ وہ اکثر اپنی کلاس چھوڑ کر قریبی کیفے میں چلی جاتیں اور کافی کے ساتھ پیسٹری کے مزے اڑاتیں۔ ایلس بڑی دلچسپی سے اپنی دوست کے پلان سنا کرتی جو اس نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رکھے تھے۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد ایلس بُری طرح بے چین ہو گئی۔ ایسٹیل اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کیے بغیر ہی اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ ایسٹیل نام کسی دوسری عورت کا بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے بائیں کندھے پر بنے ہوئے چھوٹے سے گلاب کے ٹیٹو کا پڑھ کر ایلس کو یقین ہو گیا کہ یہ خبر اس کی دوست کے بارے میں ہی ہے۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس نے ایسٹیل کو یہ ٹیٹو بنوانے سے روکنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ایلس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ وہ اپنی دوست کی موت کے بارے میں جان کر غم زدہ ہو گئی تھی پھر اس کی جگہ تجسس نے لے لی۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ایسٹیل کے قاتل تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرے گی۔ جان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ ان دنوں کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا اور ایلس محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس پر پہلے جیسی توجہ نہیں دے رہا۔ اچھا ہے، اس بہانے جان کو کچھ دنوں کے لیے تنہا رہنے کا موقع ملتا اور ممکن تھا کہ اس تنہائی کے نتیجے میں اسے ایلس کی اہمیت کا احساس ہو جاتا۔

اس نے اپنے شوہر کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں اپنے جانے کی وجہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر اسے وہاں کا فون نمبر دے گی تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اس سے رابطہ کر سکے۔ پھر اس نے ایک سفری بیگ میں اپنے کچھ کپڑے اور دیگر ضروری سامان رکھا اور اپنی چھوٹی سی فورڈ سیلون میں بیٹھ کر ایم تھری موٹروے پر روانہ ہو گئی۔ چار گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد وہ ڈیون کے وسط میں واقع ایک وادی میں پہنچی جس کے سرے پر ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی کار ایک بار کے سامنے روکی اور داخلی دروازہ کھول کر بڑے محتاط انداز میں اندر داخل ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے شوہر کے بغیر کسی بار میں جاتے ہوئے جھجک محسوس کرتی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا شخص اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ایلس کی جانب دیکھا اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

ایلس اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھنکھاری۔ اس نے ناگواری سے اس کی جانب دیکھا اور منہ بناتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”کچھ پینے کے لیے مل جائے گا؟“ ایلس نے نرم لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں... ہم یہاں اسی لیے بیٹھے ہیں۔“

اسی دوران ایک اور شخص بار میں داخل ہوا۔ اس نے مزدوروں والا لباس پہن رکھا تھا۔ بارٹینڈر نے کچھ کہے بغیر ہی اس کی جانب بیئر کا گلاس بڑھا دیا۔ غالباً وہ اس کا پرانا گاہک تھا۔ پھر اس نے ایلس سے پوچھا۔ ”تم کیا پینا چاہو گی؟“

”وائٹ وائن۔“ ایلس نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔

”رہنے دو۔“ بارٹینڈر نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”شاید میں تمہاری کوئی خدمت نہ کر سکوں۔“

”وہ کیوں؟“ ایلس نے حیرانی سے پوچھا۔

”کوئی عام دن ہوتا تو مجھے تم سے پیسے لے کر خوشی ہوتی لیکن آج لیڈیز ڈے ہے اور یہاں کی روایت کے مطابق تمہیں اسی صورت میں کچھ پینے کے لیے مل سکتا ہے جب کوئی مرد اس کی قیمت ادا کرے۔“

”لیکن میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتی۔“

بارٹینڈر نے مسکراتے ہوئے وائٹ وائن کا گلاس اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”تمہارا کام تو ہو گیا۔“

”لیکن ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ اس کی ادائیگی کوئی مرد کرے گا۔“

اسی لمحے کسی نے اس کے بازو کو آہستہ سے چھوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ دیر پہلے بار میں داخل ہوا تھا۔

”یہ میں نے تمہارے لیے خریدی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اس گاؤں میں خوش آمدید! کیا تم میرے ساتھ اس میز پر بیٹھنا پسند کرو گی؟“

وہ اسے لے کر ایک کیبن کی جانب بڑھا۔ وہ بار

چھوٹا ضرور تھا لیکن اس کے ایک حصے میں لکڑی کے پارٹیشن لگا کر چھوٹے چھوٹے کیبن بنا دیے گئے تھے۔ ایلس کو ایک اجنبی شخص کے ساتھ بیٹھنا کچھ عجیب لگ رہا تھا لیکن وہ مروتاً انکار نہ کر سکی۔ تاہم اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”واقعی، اس وقت مجھے کچھ پینے کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے میری مدد کی لیکن یہ ضرور بتانا چاہوں گی کہ میں شادی شدہ ہوں تاکہ تم مجھ سے کوئی غلط توقع نہ رکھو۔“

اجنبی شخص نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ”میرا نام جیک ہے۔“

ایلس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا اور بولی۔ ”مجھے ایلس کہتے ہیں۔“

”یہاں کس سلسلے میں آنا ہوا؟“ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے اس لیے چھٹیاں گزارنے چلی آئی۔“

”واقعی، یہ جگہ بہت خوب صورت ہے... خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو گھڑ سواری کا شوق رکھتے ہیں۔ اس وادی کے دونوں طرف پگڈنڈیوں کا جال بچھا ہوا ہے اور یہ سب راستے پہاڑ کی چوٹی کی طرف جاتے ہیں۔“

”لگتا ہے کہ تمہیں ان راستوں سے اچھی خاصی واقفیت ہے؟“

”میں گھڑ سواری سکھاتا ہوں۔ اگر تمہیں گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں کی سیر کرنے کا شوق ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔“

”ضرور!“ ایلس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فی الحال مجھے ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ چاہیے۔ کیا تمہاری نظر میں کوئی ہالی ڈے ہوم ہے؟“

”ہاں، ایک مکان ہے تو سہی لیکن اس کے خالی رہنے کی وجہ یہ ہے کہ چند روز پہلے وہاں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔“

”میں نے بھی اس بارے میں خبر پڑھی تھی۔“ ایلس نے اعتراف کیا۔ ”واقعی بڑا خوفناک حادثہ تھا۔“

”ابھی تک پورا گاؤں صدمے کی حالت میں ہے۔“ جیک سنجیدگی سے بولا۔ ”ابھی تک قاتل کا کچھ پتا نہیں چلا۔“

”وہ یہیں کی رہنے والی تھی یا کسی دوسری جگہ سے آئی تھی؟“

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مُقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مُطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”اسے یہ مکان ورثے میں ملا تھا اور وہ کچھ عرصہ قبل ہی یہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس کے یہاں رہنے پر سبھی کو تعجب ہوا کیونکہ یہ مکان ہمیشہ سے ہی ہالی ڈے ہوم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ وہ بہت جلد یہاں کے لوگوں میں گھل مل گئی تھی۔“

”اب اس مکان کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے؟“ ایلس نے پوچھا۔

”اسٹیٹ ایجنٹ... اس کا دفتر مین اسٹریٹ پر ہی ہے۔ کیا تم کچھ اور پینا پسند کرو گی؟“

”نہیں۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔“ ایلس اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے اس اسٹیٹ ایجنٹ سے مل لینا چاہیے۔“

ایلس پیدل ہی جیک کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔ ایجنٹ کا دفتر تلاش کرنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ ایلس کا خیال تھا کہ اس کا واسطہ کسی بوڑھے خرانٹ مرد سے پڑے گا لیکن وہ ایک نوجوان دبلی پتلی لڑکی تھی۔ جب ایلس نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ بہ خوشی دو ہفتے کے لیے مکان کرائے پر دینے کے لیے تیار ہو گئی لیکن اس نے حال ہی میں پیش آنے والے واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ شاید وہ ایسا کر کے اپنے کمیشن سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔

ایلس کے ذہن میں ایک مثالی ہالی ڈے ہوم کا تصور تھا۔ صاف ستھرا، گلاب کے پھولوں اور خوب صورت لان سے آراستہ... لیکن وہ مکان اس سے خاصا مختلف تھا۔ گو کہ اس کی لوکیشن بہت اچھی تھی لیکن مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خستہ حالت میں تھا۔ لان کی گھاس بے ترتیب اور بڑھی ہوئی تھی۔ لکڑی کا پرانا داخلی دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلتا تھا جس کی چھت بہت اونچی تھی۔ ایلس نے ڈائننگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک بڑی پرانی میز کے گرد چھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچن کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے کسی نے کافی عرصے سے استعمال نہیں کیا۔

http://digestpk.blogspot.com/

ایلس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ وہاں چار بیڈ روم تھے۔ اس نے اپنے لیے آخری کمرا منتخب کیا اور سامان کھول کر چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ شاپنگ کے لیے چل دی لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس سڑک پر واقع واحد دکان بھی بند ہو چکی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف پانچ بجے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بوڑھی عورت ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آرہی تھی۔ اس نے ایلس کو مشورہ دیا کہ وہ عقبی دروازہ کھٹکھٹائے، دکان کی مالکن اس وقت کچن میں ہوگی۔ ایلس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جھجکتے ہوئے مکان کے پچھلے حصے کی جانب بڑھ گئی۔ چھوٹا سا لان عبور کر کے وہ کچن تک پہنچی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایلس نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہیلو! یہاں کوئی ہے؟''

ایک لمبے قد کی عورت بغلی دروازے سے برآمد ہوئی اور بولی۔ ''کیا چاہیے؟''

ایلس نے اسے مطلوبہ اشیا کے بارے میں بتایا تو اس عورت نے وہ سب چیزیں اس کے حوالے کر دیں۔ البتہ وہ یہ جان کر ضرور حیران ہوئی کہ ایلس نے وہ مکان کرائے پر لیا ہے جہاں چند روز پہلے ہی ایک خوفناک حادثہ پیش آیا تھا۔

''مجھے تو اس بارے میں سوچ کر ہی خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''میں تو کبھی وہاں ٹھہرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''اس مکان کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ وہاں کوئی رہتا ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ مقتولہ کا سامان کہاں چلا گیا؟ مثلاً کپڑے وغیرہ۔''

''وہ سب چیزیں اسٹور میں رکھ دی گئی ہیں کیونکہ اس نے اس بارے میں کوئی ہدایات نہیں دی تھیں۔ اس کا شوہر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ یہاں چلی آئی لیکن زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ یہ حادثہ پیش آگیا۔''

''تمہارے خیال میں وہ کیسی عورت تھی؟'' ایلس نے ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔

''میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتی۔ وہ کبھی کبھی میری دکان پر سودا خریدنے آتی تھی لیکن اس کا زیادہ وقت پب میں گزرتا تھا اور وہ عورتوں کے بجائے مردوں کی کمپنی میں خوش رہتی تھی۔''

گھر واپس آنے کے بعد ایلس نے سامان کچن میں رکھا اور اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسٹیل کے قاتل تک پہنچنے کے لیے کہاں سے شروع کرے؟ گاؤں کے لوگوں سے زیادہ پوچھ گچھ مناسب نہ تھی۔ اس طرح وہ مزید محتاط ہو سکتے تھے۔ ویسے تو وہ اپنے ساتھ کھانے کا کافی سامان لے کر آئی تھی لیکن اس نے مقامی پب میں جا کر ڈنر کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اسے وہاں سے کچھ معلومات مل جاتیں۔

گو کہ وہ کوئی خاص تیاری کر کے نہیں آئی تھی اور اس نے عام سا لباس پہنا ہوا تھا لیکن جونہی وہ پب میں داخل ہوئی تو کئی نظریں اس جانب اٹھ گئیں۔ ایلس ان نگاہوں کی تپش واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی اس لیے وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بار کی جانب بڑھ گئی۔ کاؤنٹر پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ ایلس نے اس سے وائٹ وائن کی فرمائش کی تو اس نے مسکراتے ہوئے ایک گلاس سامنے رکھ دیا۔ ایلس کو صبح والا واقعہ یاد آگیا اور وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا لیڈیز ڈے ختم ہو گیا؟''

''یہ بات تم سے میرے شوہر نے کہی ہوگی۔'' وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہ نئے آنے والوں سے ایسا ہی مذاق کرتا ہے۔ اگر آئندہ وہ تمہیں تنگ کرے تو اس کے سامنے میرا نام لینا، وہ ڈر جائے گا۔''

اس عورت کا نام روبی تھا۔ وہ بہت باتونی واقع ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں ایسٹیل کا ذکر آگیا۔ روبی نے بتایا کہ وہ محفلوں کی جان تھی اور خاص طور پر مردوں میں بے حد مقبول تھی۔ ایلس نے اپنے آپ کو خاصا دکھی محسوس کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کی دوست کے بارے میں ایسی باتیں کرے۔ اچانک ہی ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''کیا میں مخل ہو سکتا ہوں؟''

ایلس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک تھی لیکن وہ شریف نظر آنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ ایک پبلک بار ہے اور تم کسی بھی خالی کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔'' ایلس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میرا نام ڈینی ہے اور میں مچھلیاں پکڑتا ہوں۔ میری اپنی کشتی بھی ہے۔''

''مجھے مچھلیاں پکڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ گھنٹوں بیٹھے انتظار کرتے رہو اور جب شکار ہاتھ آئے تو اسے واپس پانی میں پھینک دو۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کرتا۔ یہ تو میری روزی کا ذریعہ ہے۔''

''ممکن ہے کہ تم اپنی تسلی کے لیے ایسا سوچتے ہو۔'' ایلس نے بے پروائی سے کہا اور پھر اپنے گلاس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

ڈینی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے مچھلیاں پکڑنے کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ ایسٹیل کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ وہ ہرگز ایسی نہیں تھی جیسا کہ لوگوں نے اس کے بارے میں مشہور کر رکھا ہے۔ وہ بہت خوب صورت اور فرشتوں جیسی معصوم تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مچھلیاں پکڑنا بھی ایک آرٹ ہے۔ وہ کئی بار میری کشتی پر مچھلیاں پکڑنے گئی۔ وہ خاموش بیٹھی رہتی اور سورج ڈوبنے کا منظر دیکھا کرتی۔ اسے فطرت سے عشق تھا۔''

ایلس نے غور سے اس لڑکے کو دیکھا اور بولی۔ ''تم کہاں رہتے ہو؟''

''وادی کے دامن میں دریا کے کنارے ایک بوٹ ہاؤس ہے، وہیں رہتا ہوں۔ یہی میری زندگی اور شوق ہے۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتا، وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی۔''

ایلس کو اس کی باتوں سے الجھن محسوس ہونے لگی لیکن وہ جان گئی تھی کہ اس جذباتی نوجوان سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے اس لیے نرمی سے بولی۔ ''لیکن وہ تو شادی شدہ تھی؟''

''صرف نام کی حد تک۔ اس کا شوہر ایک کاروباری شخص تھا اور اسے پیسے کمانے سے غرض تھی۔ وہ کبھی نہ جان سکا کہ اس کی بیوی کتنی پیاری، پُرجوش اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ اس نے کبھی ایسٹیل کے جذبات کی پروا نہیں کی لیکن اس تمام سرد مہری کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی تھی۔''

''تم اس کے بارے میں اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے وہ تمہاری گہری دوست تھی... جبکہ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے عمر میں کچھ زیادہ ہی ہوگی؟''

''وہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف تھی لیکن اس کی مثال اس مچھلی کی طرح ہے جو کبھی اپنا راستہ نہیں بدلتی۔''

ایلس کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، وہ جیک تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں کھانے کے لیے آیا تھا لیکن یہ امید نہیں تھی کہ تم مل جاؤ گی۔''

ایلس نے محسوس کیا کہ اس نے ڈینی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''میں بھی یہاں اسی مقصد سے آئی تھی۔ اب ہم ساتھ ہی ڈنر کریں گے۔'' پھر وہ ڈینی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ایکسکیوز می ڈینی!''

ڈینی کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ جیک نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جو بار کاؤنٹر سے دور اور قدرے الگ تھلگ تھی۔ جیک نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''تمہیں ڈینی جیسے لوگوں سے محتاط رہنا ہوگا۔''

''مجھے تو وہ بے ضرر سا انسان نظر آتا ہے۔''

''اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عورتوں کو تنگ کرتا ہے۔ دن کی روشنی میں بے ضرر نظر آنے والا یہ شخص عموماً رات کی تاریکی میں گھات لگا کر شکار کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا ہے۔''

ایلس کو یہ تنقید اچھی نہیں لگی تاہم اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''بے فکر رہو۔ میں رات کو سوتے وقت بیڈ روم کا دروازہ اندر سے لاک کر لوں گی۔'' پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''صبح تم بتا رہے تھے کہ لوگوں کو گھڑ سواری سکھاتے ہو؟''

''ہاں۔ اس علاقے میں سب سے اچھا اور اکلوتا گھڑ سوار میں ہی ہوں۔'' جیک کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ''تم ضرور آنا۔ اس علاقے کو گھوم پھر کر دیکھنے کا یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ میں ہر روز صبح دس بجے گھڑ سواری سکھاتا ہوں۔ پہلی بار مفت!''

''تمہاری بیوی کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا کہ تم ایک اجنبی عورت کو مفت میں گھوڑے پر سیر کی پیشکش کر رہے ہو؟''

''میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔'' وہ ایک بار پھر آگے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ''میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور میری سرگرمیوں پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں۔ میں کسی پرندے کی طرح آزاد ہوں۔ زندگی بہت مختصر ہے اور میں اس سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ افسردہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''زندگی کا کیا بھروسا... کب دغا دے جائے۔ مجھ سے پہلے جو عورت اس کاٹیج میں رہ رہی تھی، اسی کی مثال لے لو۔''

''مختصر ہی سہی لیکن اس نے بہت اچھی زندگی گزاری۔''

''کیا تم اسے جانتے تھے؟'' ایلس نے حیرت سے پوچھا۔

جیک نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''یہ بہت چھوٹی سی

http://digestpk.blogspot.com/

جگہ ہے اور یہاں سب ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"ڈینی کا کہنا ہے کہ وہ بھی آزاد فطرت رکھتی تھی۔ اس لحاظ سے تم دونوں ایک جیسے ہوئے۔"

یہ جملہ سن کر جیک کچھ مضطرب سا ہو گیا اور پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "وہ شادی شدہ تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے اس کے لیے کوئی پیچیدگی پیدا ہو۔ اسی لیے میں نے اس سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔"

"میں بھی تو شادی شدہ ہوں۔ اس کے باوجود تم مجھ سے راہ و رسم بڑھا رہے ہو؟" ایلس نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم سوال بہت کرتی ہو۔ لگتا ہے کہ تمہارے اندر کسی سراغ رساں کی روح ہے۔"

"میں ایک عام سی عورت ہوں جو کسی اجنبی کے ساتھ گھڑ سواری کے لیے جانا پسند نہیں کرتی۔" ایلس نے شرارت آمیز انداز اختیار کیا۔ "اب میں چلوں گی۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"میں تمہیں گھر تک چھوڑ سکتا ہوں؟ اس طرح تم محفوظ رہو گی۔" جیک نے پیشکش کی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اگر کچھ پینا چاہو تو میں تمہارے لیے آرڈر دے دیتی ہوں۔"

جیک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایلس بار کاؤنٹر تک آئی اور روبی کو جیک کے لیے ایک پیگ بنانے کی ہدایت کی۔

روبی نے پلکیں جھپکائیں اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "جیک سے ہوشیار رہنا۔ یہ بہت تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ اس نے تو ایسٹیل سے بھی دوستی گانٹھ لی تھی اور دونوں لازم و ملزوم بن کر رہ گئے تھے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" ایلس کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

وہ بار سے باہر آئی تو اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ اسے تاریکی میں خوف سا محسوس ہونے لگا۔ شاید اس نے جیک کی پیشکش ٹھکرا کر غلطی کی تھی۔ اچانک ہی ایک بھاری بھرکم شخص اس کے سامنے آ گیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی تو اس نے اپنی طاقتور ٹارچ روشن کر کے اس کے چہرے کی جانب کر دی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔ وہ کوئی پولیس والا تھا۔

"ہاں، میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔" اس نے اپنے حواس قابو کرتے ہوئے کہا۔ "میرا قیام اسی سڑک پر واقع ہالی ڈے کاٹیج میں ہے۔"

"میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو وہاں تک کمپنی دے سکتا ہوں۔ ویسے بھی ان دنوں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔" ایلس بولی۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ چند روز پہلے اس گھر میں ایک حادثہ پیش آ چکا ہے۔ کیا اس سلسلے میں کوئی گرفتاری ہوئی؟"

"یہ جگہ سب سے الگ تھلگ ہے اور اس وقت گرد و نواح میں کوئی فرد موجود نہیں تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس واردات کا محرک کیا ہو سکتا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ ابھی تفتیش جاری ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ گھر کے گیٹ پر پہنچ کر پولیس والے نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ گھر کی ایک لائٹ ہر وقت جلتی رہنے دیا کرو۔ اس وقت بھی جب تم گھر سے باہر جاؤ تا کہ یہاں سے گزرنے والے یہی سمجھیں کہ تم گھر میں موجود ہو۔"

"میں یہ بات ذہن میں رکھوں گی آفیسر!"

"تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے ہوگو کہہ سکتی ہو۔"

ایلس نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور گیٹ کھول کر اندر چلی گئی۔ بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور لائٹ بند کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی اس لیے فوراً ہی نیند آ گئی۔ دوسرے دن اس کی آنکھ کافی دیر سے کھلی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس نے شاور لیا اور تیار ہو کر سیر کے لیے چل دی۔ اس کا رخ جیک کے اصطبل کی جانب تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جیک ایک گھوڑے کی زین کسنے میں مصروف تھا۔ ایلس کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گی... لیکن شاید آج موقع نہ مل سکے کیونکہ تمام گھوڑے بک ہو چکے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں... پھر کبھی سہی۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"میری واپسی دو گھنٹے بعد ہو گی اگر تم اتنی دیر انتظار کر سکو..."

"میں تم سے بعد میں ملوں گی۔"

جیک نے مایوسی سے سر ہلایا اور گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی

منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ بھی واپس جانے کے لیے مڑی پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اب اس کے قدم اصطبل سے ملحقہ گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس نے داخلی دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ شاید جیک بے دھیانی میں دروازے کو لاک کرنا بھول گیا تھا۔ وہ محتاط انداز میں اندر داخل ہوئی۔ گھر کافی صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں جیک کی سلیقہ مندی کی داد دی اور ہر چیز کا بہ غور جائزہ لیتی ہوئی جیک کے بیڈ روم تک پہنچ گئی۔ اس کمرے میں بھی اسے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ پھر اس نے دیوار گیر الماری کھولی تو حیرت زدہ رہ گئی۔ سامنے کی دیوار پر ایک لائن میں لڑکیوں کی تصویریں آویزاں تھیں جو یقیناً جیک کی دوست رہی ہوں گی۔ ایک تصویر کو دیکھتے ہی وہ چونک گئی۔ وہ ایسٹیل تھی جو پیراکی کا لباس پہنے ہوئے کسی مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ جیک اور ایسٹیل کے تعلقات کی نوعیت سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔

اس کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی اور اب اس کے لیے وہاں ایک منٹ رکنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اس نے مزید گھومنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور واپس چل پڑی۔ راستے میں اسے روبی ملی۔ وہ خاصی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے ایلس کو پیشکش کی کہ وہ مناسب معاوضے پر اس کے گھر کی صفائی کر سکتی ہے۔ ایلس راضی ہو گئی اور کہا کہ وہ اسے اپنے گھر کی اضافی چابی دے دے گی تا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اپنا کام کر سکے۔ وہ گھر پہنچی تو گیٹ پر ہوگو کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

"تم گیٹ بند کرنا بھول گئی تھیں۔ اگر میں نہ آتا تو بچے تمہارے لان کا حشر بُرا کر دیتے۔"

ایلس مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس لان کی حالت ویسے ہی بہت خراب ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس پر کافی عرصے سے توجہ نہیں دی گئی۔"

ہوگو اس کے ساتھ چلتا ہوا لان کے آخری سرے تک آیا جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں مقتولہ کی لاش پائی گئی تھی۔"

"اوہ!" ایلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے کہا۔ "اس خوب صورت جگہ سے کتنی تلخ یاد وابستہ ہو گئی ہے۔"

"تم چھٹیاں گزارنے آئی ہو۔ اس بارے میں سوچ کر اپنے آپ کو پریشان مت کرو۔"

ایلس نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ ہوگو بھی بن بلائے مہمان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے آیا اور کچن کے سامنے پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ ایلس نے چولہے پر کیتلی رکھی اور بولی۔

"کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔ میں نے یہاں کی پولیس میں ملازمت کرنے کے لیے ایک مقامی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ تم میری بیوی میلینی سے مل چکی ہو۔ یہ وہی اسٹیٹ ایجنٹ ہے جس نے تمہیں یہ مکان کرائے پر دیا ہے۔"

ایلس کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ ہوگو جیسا بے ڈھب، کند ذہن اور سست آدمی میلینی کا شوہر ہو سکتا ہے جو خاصی ذہین اور ہوشیار واقع ہوئی تھی۔ وہ اس بے جوڑ شادی پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ہوگو کو پولیس میں ملازمت کس طرح مل گئی؟ وہ کسی طرح بھی اس جاب کا اہل نہیں تھا۔ ہوگو چائے پی کر چلا گیا تو اس نے بھی باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اسے امید تھی کہ ڈینی سے ملنے کے بعد اسے مزید معلومات مل سکیں گی۔ یہ وہی لڑکا تھا جس سے وہ بار میں مل چکی تھی۔

بوٹ ہاؤس دریا کے کنارے واقع تھا۔ ڈینی اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم یہاں بھی آ سکتی ہو۔"

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔" ایلس نے شوخ لہجے میں کہا۔

ڈینی نے پُرتپاک انداز میں دروازہ کھولا اور ایلس بے جھجک اس چھوٹے سے گھر میں چلی گئی جو ایک بڑے کمرے پر مشتمل تھا۔ اس کے ایک کونے میں چولہا، واش بیسن اور کھانا پکانے کے برتن نظر آ رہے تھے۔ یہ جگہ کچن کے طور پر استعمال ہوتی تھی جبکہ دوسرے کونے میں ایک بستر لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ تھا جو باتھ روم میں کھلتا ہو گا۔ کمرے میں جگہ جگہ کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور دیوار پر کچھ پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔

ایلس نے تعریفی انداز میں کمرے کا جائزہ لیا اور کھڑکی میں سے دریا کا نظارہ کرتے ہوئے بولی۔ "بہت پیارا منظر ہے۔ تم واقعی خوش قسمت ہو۔ کئی لوگ اس جگہ کو خریدنے کے لیے معقول رقم دینے کو تیار ہو سکتے ہیں۔"

"میرے لیے پیسے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے یہ

http://digestpk.blogspot.com/

جگہ پسند ہے اور میں نے اسے بیچنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔“

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”ہم دونوں کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگ تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہوں گے۔“

ایلس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ غصے سے بولی۔ ”میں تم سے بہت بڑی ہوں اور اگر تم سے ملنے چلی آئی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہوں۔“

”تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔“ ڈینی جھینپتے ہوئے بولا۔ ”کم از کم میں اس شخص سے مختلف ہوں جو لوگوں کو گھڑ سواری سکھاتا ہے۔“

ایلس موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”یہ بتاؤ کہ تم کشتی کی سیر کرانے کا کیا معاوضہ لو گے؟“

”جو تمہارے جی میں آئے دے دینا اور اگر چاہو تو مفت میں بھی سیر کر سکتی ہو۔“ ڈینی نے فراخ دلی سے کہا۔

وہ اسے لے کر کمرے سے باہر آ گیا اور لکڑی کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کشتی کی جانب بڑھا جو ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ جب ایلس کشتی میں بیٹھ گئی تو ڈینی نے رسّی کھولی اور زور لگا کر کشتی کو دریا میں دھکیل دیا۔ پھر اس نے پوری طاقت سے چپّو چلانا شروع کر دیے اور کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ جب وہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچے تو اس نے کشتی روک کر لنگر نکالا اور پانی میں ڈال دیا۔ ایلس نے دور تک نظر دوڑائی۔ پانی کی چمک اس کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اس نے یہ سارا منظر بڑی دلچسپی سے دیکھا اور مسحور ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ واقعی چھٹیاں منا رہی ہوں۔ سورج کی روشنی اور بہتے پانی کی آواز مجھے نیند کی وادی میں دھکیل رہی ہے۔“

اچانک ہی اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ کشتی بری طرح ہچکولے لے رہی تھی۔ اس کے کانوں میں کسی طاقتور کشتی کے انجن کی آواز گونجی اور دوسرے ہی لمحے وہ پانی میں تھی۔ وہ زور زور سے چلّانے لگی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ بس یونہی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ طاقت ور کشتی اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی اور تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی جبکہ اس کی اپنی کشتی صرف بیس فٹ دور تھی پھر اس نے ڈینی کو دیکھا جس نے ایک ہاتھ سے کشتی کو پکڑ رکھا تھا

اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش مت کرنا۔ میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔“

پھر وہ چپّو کی مدد سے کشتی دھکیلتا ہوا اس تک پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ انہیں بوٹ ہاؤس تک پہنچنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ ایلس فوراً ہی کشتی سے اتری اور لکڑی کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی برآمدے میں بیٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگی۔ ڈینی اپنے کمرے میں گیا اور اپنا ایک جوڑا دیتے ہوئے بولا۔ ”تم لباس تبدیل کر لو۔ میں بھی کپڑے بدل کر چائے بناتا ہوں۔“

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ایلس نے تولیا سے اپنے بال خشک کیے اور چائے کا مگ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ ”بعض اوقات مچھلیاں پکڑنا دلچسپ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔“

”یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ یہ کوئی حادثہ تھا... لیکن وہ ایسا کیوں کریں گے؟ انہیں ہم سے کیا پُرخاش ہو سکتی ہے؟“ ڈینی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”کیا تم اس کشتی کو پہچان لو گے؟“

”نہیں... کیونکہ میں اس کا نام نہیں دیکھ سکا۔ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔“

”تمہیں اس واقعے کی رپورٹ پولیس میں کرنی چاہیے کہ کسی نے تمہیں مارنے کی کوشش کی۔“

”اس سے کیا ہوگا؟ سوائے اس کے کہ ہوگو کو تمہارے گھر کے چکر لگانے کا موقع مل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایلس منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھو، اگر ایسا جان بوجھ کر کیا گیا ہے تو وہ دوبارہ بھی اس طرح کی کوشش کر سکتے ہیں۔“ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے خیال میں یہ کون ہو سکتا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ ڈینی نے نظریں چراتے ہوئے کہا لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ گھر جانے کے ارادے سے اٹھی۔ ڈینی بھی اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم دوسرے راستے سے جاؤ۔ اس طرح جلدی گھر پہنچ جاؤ گی اور تمہیں کئی حسین مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔“

”اگر تم ساتھ چلنا چاہو تو اور بات ہے ورنہ مجھے جنگل میں بھٹکنے کا کوئی شوق نہیں۔“

ڈینی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور وہ دونوں اس

http://digestpk.blogspot.com/

راستے پر چل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ ایک بڑے سے شاہ بلوط کے درخت کے پاس رک گئے جس کا تنا کم از کم دو میٹر قطر کا تھا اور اس کی بڑی بڑی شاخیں زمین تک جھکی ہوئی تھیں۔ ایک مضبوط شاخ پر رسّی لٹکی ہوئی تھی۔ شاید بچے وہاں جھولا جھولتے ہوں گے۔ ڈینی کو شرارت سوجھی اور اس نے رسّی کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ ایلس دوڑتی ہوئی اس کے پاس گئی اور بولی۔ ’’یہ کیا کر رہے ہو؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔‘‘

ڈینی شاید کسی ایسے ہی موقعے کے انتظار میں تھا۔ اس نے ایلس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کر خود سے قریب کر لیا۔

ایلس ہکّا بکّا رہ گئی۔ اسے ڈینی کی جانب سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ ایک منٹ بعد وہ اس کی گرفت سے آزاد ہوئی اور اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ’’اب ہمیں چلنا چاہیے۔‘‘

ڈینی نے اپنے گلے سے رسّی کا پھندا نکالا اور اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ’’اتنی جلدی بھی کیا ہے؟‘‘

جواب میں ایلس نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ ایلس غضب ناک لہجے میں بولی۔ ’’کوئی مرد میری مرضی کے خلاف مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اگر مجھ سے دوستی رکھنا چاہتے ہو تو آئندہ محتاط رہنا ورنہ اس سے بھی بُرا سلوک کروں گی۔‘‘

ڈینی شرمندہ ہو گیا اور مُردہ آواز میں بولا۔ ’’یہاں سے آگے کا راستہ صاف ہے۔ تم آرام سے جا سکتی ہو۔‘‘

وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔ ڈینی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ راستہ اس کے گھر کے عقبی حصے کی طرف نکلتا تھا۔ کچن میں روشنی ہو رہی تھی۔ شاید روبی صفائی کرنے آئی ہو گی۔ اسے ایک سایہ سا لہراتا ہوا نظر آیا۔ وہ جس جگہ کھڑی تھی، وہاں سے اسے اس کی پشت ہی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے ہوگو کو کچن میں آتے دیکھا جو اس وقت وردی میں نہیں تھا۔ اس نے جانے کیا کہا کہ روبی غصے میں وہاں سے چل دی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بیڈ روم تک گیا اور اسے دھکیل کر بستر پر گرا دیا۔ ایلس دبے پاؤں آگے بڑھی اور بیڈ روم کی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگی۔ روبی بہ ظاہر مزاحمت کر رہی تھی لیکن لگتا تھا کہ اسے بھی اس کھیل میں مزہ آ رہا ہے۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی ایلس میں تاب نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد پہلے ہوگو مکان سے نکلا پھر روبی بھی باہر آتی دکھائی دی۔ ایلس جلدی سے دیوار کی آڑ میں ہو گئی۔

ان کے جانے کے بعد آدھے گھنٹے تک ایلس یونہی خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا تھا اور وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا وہ واپس اپنے گھر چلی جائے یا یہیں رک کر حالات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے؟ اس نے یہ مکان اپنے رہنے کے لیے عارضی طور پر لیا تھا اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اس جگہ کو ملاقاتوں کے لیے استعمال کرے۔ پھر اس نے کندھے اچکائے اور کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر کا جائزہ لینے لگی۔ اسے اپنے پڑوس میں کچھ فاصلے پر ایک مکان نظر آیا جسے دیکھ کر وہ چونک گئی۔ اس نے غور سے اس جگہ کا جائزہ نہیں لیا تھا اور سمجھ رہی تھی کہ گاؤں اور دریا کے بیچ یہی ایک مکان ہے جس میں وہ رہ رہی تھی۔ پھر اس کی نظر کرکٹ گراؤنڈ سے متصل ایک ذیلی سڑک پر گئی جہاں ٹیلی فون باکس لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایلس کو خیال آیا کہ اس نے اب تک اپنے شوہر کو فون نہیں کیا جبکہ یہ کام اسے یہاں پہنچتے ہی کر لینا چاہیے تھا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنے شوہر کو فون کیا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ اس نے مشین پر پیغام چھوڑ دیا اور ٹیلی فون کے تار کے ساتھ ساتھ اس مکان تک پہنچ گئی جس کی حالت کافی خستہ نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دروازے سے بندھا کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز سن کر ایک عورت باہر آئی اور ایلس کو خوف زدہ ہوتے دیکھ کر بولی۔ ’’ڈرو نہیں۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟‘‘

ایلس نے اپنا تعارف کروایا اور معذرت کی کہ وہ اب تک اس سے نہیں مل سکی تھی۔ وہ عورت تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ’’میں سمجھی کہ تم بچوں کی شکایت کرنے آئی ہو۔ وہ تمہارے لان میں جا کر کھیلتے ہیں، حالانکہ میں انہیں کئی بار منع کر چکی ہوں۔ میرا نام جیسیکا ہے۔ یہ ٹم ہے اور بیٹی کا نام سانتھا ہے۔ اندر آؤ نا۔‘‘

وہ ایلس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ وہ مکان ایک بڑے سے ہال اور کچن پر مشتمل تھا جس کے گوشے گوشے سے غربت اور تنگ دستی عیاں تھی۔ اس نے چائے بنانے کے لیے کیتلی چولہے پر رکھی اور معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ’’معاف کرنا، میں تمہاری اچھی طرح خاطر نہیں کر سکوں گی۔ البتہ کچھ اور پینا چاہو تو میرے پاس عمدہ قسم کی وائن ہے جو میں نے خاص موقعوں کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔‘‘

’’نہیں... بس چائے ہی کافی ہے۔‘‘

ایلس کو اس گھر کی خستہ حالی دیکھ کر شدید کوفت ہو رہی تھی۔ جیسیکا نے اسے بتایا کہ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے اور وہ بچوں کو لے کر اپنے آبائی گاؤں میں واپس آ گئی ہے۔ یہاں اس کی کچھ زمین ہے جو کرائے پر دے رکھی ہے لیکن اس کا کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں۔ اس گاؤں میں واحد رشتے دار فریڈ ہے جس کے بار میں وہ کچھ عرصے کام کرتی رہی لیکن اس کی بیوی روبی کو یہ پسند نہیں تھا لہٰذا اسے وہ جاب چھوڑنا پڑ گئی۔ فریڈ چوری چھپے اس کی مدد کرتا تھا لیکن اس چھوٹی رقم سے گزارہ ہونا مشکل تھا۔

ایلس نے اپنے پرس سے بیس پاؤنڈ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ’’تم وہ شراب مجھے دے دو اور اس کے عوض بچوں کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آؤ۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی پھر ہم ساتھ بیٹھ کر ہی ڈنر کریں گے۔‘‘

جیسیکا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ کچھ کہے بغیر سودا سلف خریدنے چلی گئی۔ تین گھنٹے بعد جب ایلس کی واپسی ہوئی تو وہ یہ تہیہ کر چکی تھی کہ جیسیکا کو اس کا حق دلا کر رہے گی۔ جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پشت سے جکڑ لیا۔ وہ بُری طرح گھبرا گئی پھر ایک مانوس آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ’’پہچانو... میں کون ہوں؟‘‘

’’اوہ جان! تم نے تو میری جان ہی نکال دی۔‘‘ ایلس نے پلٹ کر دیکھا اور اپنے شوہر سے بغل گیر ہو گئی۔ ’’تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟‘‘

’’تمہارا پیغام ملتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ ایسی کیا مصیبت آن پڑی تھی کہ تم نے میرے گھر آنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور ایک رقعہ چھوڑ کر یہاں جاسوسی کرنے آ گئیں... کچھ پتا چلا؟‘‘

’’ابھی نہیں... لیکن میں ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تمہاری واپسی کب ہے؟‘‘

’’صبح چلا جاؤں گا لیکن تم محتاط رہنا اور ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرو تو مجھے فوراً فون کر دینا۔‘‘

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو جان واپس جا چکا تھا۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے اس کے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن جان سے طویل گفتگو کرنے کے بعد وہ ایک پلان ترتیب دے چکی تھی اور اس پر عمل کرنے کے لیے سب سے پہلے اسٹیٹ ایجنٹ سے ملنا ضروری تھا۔ اس نے شاور لیا اور ہلکا پھلکا سا ناشتا کرنے کے بعد اس سے ملنے چل دی۔ میلینی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ جب وہ فارغ ہوئی تو اس نے ایلس سے پوچھا۔

’’چھٹیاں کیسی گزر رہی ہیں؟‘‘

’’بہت اچھی۔ بس کھڑکیوں پر پردے نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی سی الجھن ہو رہی ہے لیکن اس وقت میں یہ شکایت لے کر نہیں آئی۔‘‘

’’پھر میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟‘‘

’’اگر میں یہ مکان خریدنا چاہوں تو اس کی کیا قیمت ہو گی؟‘‘

میلینی کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اور وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ’’یہ ایک غیر معمولی سوال ہے۔ یہ تو مالک کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کی کیا قیمت طلب کرتا ہے۔‘‘

’’اگر میں کوئی آفر دوں تو تمہارے خیال میں وہ کتنی ہونی چاہیے؟‘‘

’’میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی، البتہ یہ ضرور معلوم کر سکتی ہوں کہ وہ اس مکان کو بیچنا چاہتے ہیں یا نہیں۔‘‘

’’مجھے کب تک جواب مل سکے گا؟‘‘ ایلس بے چین ہوتے ہوئے بولی۔ ’’کیا مالک یہیں رہتا ہے؟‘‘

’’میں تمہیں اس کا نام نہیں بتا سکتی، البتہ جواب آنے میں دو ہفتے لگ سکتے ہیں۔ اس وقت تک شاید تمہاری چھٹیاں ختم ہو جائیں گی۔‘‘

’’اگر اتنی دیر لگے گی تو میں ابھی سے اپنی آفر دے دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پچھتّر ہزار پاؤنڈز مناسب رہیں گے کیونکہ مجھے اس میں کافی کام کروانا ہو گا۔‘‘

’’میں نہیں سمجھتی کہ وہ اس قیمت پر یہ مکان بیچنے کو تیار ہو جائیں گے۔‘‘ میلینی منہ بناتے ہوئے بولی۔

’’یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ آفر ان تک پہنچا دو۔ میں جواب کا انتظار کروں گی۔‘‘

’’اگر تم کوئی دوسرا مکان دیکھنا چاہو تو میں اس کا بندوبست کر سکتی ہوں۔‘‘

’’نہیں، میں صرف اسی مکان کو خریدنا چاہتی ہوں۔‘‘ ایلس نے بے رخی سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

اب اس کا رخ بوٹ ہاؤس کی جانب تھا جہاں وہ اپنے کپڑے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ اس کے کپڑے برآمدے میں لٹکے ہوئے تھے۔ وہ احتیاط سے قدم بڑھاتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے کپڑے سمیٹنے لگی۔ پھر اس نے اندر کی طرف

http://digestpk.blogspot.com/

جھانکا اور دروازے کو ہلکا سا دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”ہیلو ڈینی! تم کہاں ہو؟“

کوئی جواب نہ ملنے پر وہ کمرے میں داخل ہو گئی جو ہمیشہ کی طرح بے ترتیب نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک طرف رکھی میز کی طرف گئی اور ڈی ایچ لارنس کی کتاب اٹھالی۔ وہ جانتی تھی کہ ڈینی کو مطالعے کا شوق ہے۔ اس نے کتاب کھولی تو وہاں ایک کاغذ نظر آیا جس پر لکھا تھا۔

”پیارے ڈینی کے نام جس نے نیک کام کا فیصلہ کرنے میں میری مدد کی... ایسٹیل!“

اسی لمحے ڈینی بھی اندر آ گیا۔ اس نے ایلس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو لپک کر آگے بڑھا اور اس سے کتاب چھینتے ہوئے بولا۔

”اگر تم عورت نہ ہوتیں تو میں تمہیں ایک زوردار گھونسا رسید کر دیتا۔“

”میں تو اپنے کپڑے لینے آئی تھی۔ دروازہ کھلا دیکھا تو اندر آ گئی۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی تلاش ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ ایلس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے بھی ڈی ایچ لارنس پسند ہے اور میں نے تمہارے انتظار میں وقت گزاری کے لیے یہ کتاب اٹھالی تھی۔“

ڈینی کو اس کی وضاحت پر یقین نہیں آیا۔ وہ رکھائی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم نے کپڑے لے لیے... اب تم جا سکتی ہو۔“

”میں اس پرچے کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔ تم مجھے اس تحریر کا مطلب سمجھاؤ اور میں تمہیں اپنے یہاں آنے کا مقصد بتاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔“ ڈینی رازداری سے بولا۔ ”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جیک اور فریڈ کے ساتھ ایسٹیل کے کچھ کاروباری تعلقات تھے۔ جس مکان میں تم رہ رہی ہو وہ اسے اپنے شوہر کے ترکے میں ملا تھا لیکن وہ اس سے بہت مختلف اور بہت اچھی عورت تھی جو ہمیشہ اچھے کام کرنا چاہتی تھی۔ گو کہ اس نے کھل کر تو نہیں بتایا لیکن یہ اشارہ ضرور دیا کہ وہ اخلاقی طور پر کسی الجھن میں گرفتار ہے۔ میں نے اسے فیصلہ کرنے میں مدد دی اور کہا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں، اسے وہی کرنا چاہیے جسے وہ درست سمجھتی ہے۔ میرے مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔“

یہ کہہ کر ڈینی زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ایلس اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”تم اپنے آپ کو الزام نہ دو۔ میں ایسٹیل کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ہمیشہ درست فیصلے کرتی تھی، چاہے اس کے لیے اسے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑ جاتی۔“

”تم اسے جانتی ہو؟“ ڈینی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ہر لحاظ سے ایک اچھی انسان اور میری بہترین دوست تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی اچھا کام کرنے سے روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں اس کا یہ مشن پورا کرنا ہوگا اور اب میں جان گئی ہوں کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ کیا تم مجھے اپنا ٹیلی فون استعمال کرنے کی اجازت دو گے؟“

ایلس نے پہلا فون اپنے شوہر کو کیا اور خاموشی سے اس کی تفتیش کا نتیجہ سنتی رہی۔ اس کی بات ختم ہونے پر بولی۔ ”گویا میں صحیح خطوط پر چل رہی ہوں۔“

”تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ دوسری طرف سے جان نے کہا۔

”بے فکر رہو... میں اپنا پورا خیال رکھوں گی۔“

دوسرا ٹیلی فون اس نے میلینی کو کیا۔ ”کیا تم میرے لیے کسی مقامی وکیل کا بندوبست کر سکتی ہو جو یہاں کی جائداد کا تخمینہ لگا سکے؟ اسی طرح مجھے ایک سرویئر کی ضرورت بھی ہو گی جو اس مکان میں استعمال ہونے والے سامان اور ڈھانچے کا سروے کر سکے۔“

دوسری طرف سے میلینی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”میرے خیال میں یہ قبل از وقت ہوگا۔ مجھے نہیں لگتا کہ مالک اس مکان کو فروخت کرنے پر راضی ہو جائے گا۔“

”میرا خیال اس کے برعکس ہے۔“ ایلس جارحانہ انداز میں بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ میری پیشکش کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میرا یہ کام کرو گی یا نہیں؟ ورنہ میں خود کسی دوسرے پیشہ ور ایجنٹ کی مدد لے سکتی ہوں۔“

اس نے ”پیشہ ور“ پر خاص طور پر زور دیا جو یقیناً میلینی کو ناگوار گزرا ہوگا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”تمہیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم مقامی معاملات کو یہیں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں آج تین بجے اپنے گھر پر میٹنگ رکھ رہی ہوں۔ کیا تم ان لوگوں کو لے کر وہاں آ سکتی ہو؟“ میلینی نے رضامندی ظاہر کر دی تو ایلس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ آخری ٹیلی فون اس نے جیک کو کیا۔

”مجھے اپنے کاٹیج میں کچھ خطوط ملے ہیں جو کسی ایسٹیل نامی عورت نے تمہارے نام لکھے ہیں۔ کیا تم وہ خطوط لینا پسند کرو گے؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کن خطوط کی بات کر رہی ہو؟“ جیک نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

”آج میں گھر پر ہی رہوں گی۔ تین بجے مکان کی خریداری کے سلسلے میں ایک میٹنگ ہے۔ میں نے ان خطوط پر سرسری نظر ڈالی ہے، لگتا ہے کہ وہ عورت کسی الجھن میں مبتلا تھی۔“

”وہ میرے ذاتی خطوط ہیں اور تمہیں انہیں پڑھنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“

”میں بھی بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گی۔“ ایلس نے مسکراتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ڈینی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس سے پہلے ایلس بول پڑی۔

”شاید آج سہ پہر میں مجھے تمہاری ضرورت پیش آ جائے۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم اسی درخت کے پاس رک کر میرے گھر کی نگرانی کر سکو جس سے تمہاری ایک خوش گوار یاد وابستہ ہے۔“

ڈینی اس واقعے کو بھول چکا تھا لیکن ایلس کے یاد دلانے پر بری طرح جھینپ گیا اور بولا۔ ”مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہو گی۔“

دن کا بقیہ حصہ ایلس نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزارا۔ وہ کسی ممکنہ خطرے کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہی تھی۔ گو کہ اس نے اپنے تحفظ کے لیے خاطر خواہ انتظامات کر لیے تھے لیکن ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ بار بار گھڑی پر نظر ڈال رہی تھی۔ تین بجنے میں چند منٹ تھے جب اس نے ڈور بیل کی آواز سنی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے میلینی کھڑی تھی۔ ایلس نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا تو وہ بولی۔

”دوسرے لوگ بھی بس آنے والے ہی ہوں گے۔“

ایلس کچن تک گئی اور کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھنے لگی پھر اس نے کچھ لوگوں کے قدموں کی چاپ سنی جو پچھلے دروازے سے اندر آ رہے تھے۔ انہوں نے دستک دینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ ہوگو، فریڈ، جیک اور روبی تھے اور دندناتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ ایلس انہیں دیکھ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ان میں سے کوئی بھی وکیل یا سرویئر نہیں تھا۔

فریڈ اس کی طرف بڑھا اور تند لہجے میں بولا۔ ”تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟“

”جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میرا نام ایلس ہے۔ وہ عورت جس کا قتل ہوا، میری دوست تھی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اسے کیوں قتل کیا گیا اور یقین کرنا چاہتی ہوں کہ اس کے قاتل سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔“

”تم مصروف عورت ہو۔ ان چکروں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع مت کرو۔“ جیک نے اس سے کہا۔ ”لاؤ، وہ خط مجھے دے دو۔“

”میں بھی ایسٹیل کی طرح سچائی پر یقین رکھتی ہوں اور اب میں جیسیکا کو بتا دوں گی کہ اس کے مرحوم باپ نے جو زمین اور جائداد تم لوگوں کے نام لیز کی تھی، وہ ختم ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ انکشاف تمہارے لیے صدمے کا باعث بنے گا کیونکہ تم سات سال گزر جانے کے باوجود اس جائداد کے مالک بنے بیٹھے ہو اور جیسیکا اس حقیقت سے ناواقف ہے... لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ اسے یہ بات معلوم ہو جائے۔ ایسٹیل بھی یہی چاہتی تھی اور اسی لیے اسے قتل کر دیا گیا۔“

وہ سب دم بہ خود اس کی بات سن رہے تھے۔ چند لمحے سناٹا چھایا رہا۔ پھر سب سے پہلے ہوگو نے زبان کھولی۔ ”میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”لیکن تم اس بارے میں سب کچھ جانتے ہو اور خاموش رہنے کی قیمت بھی وصول کرتے رہے ہو۔“ یہ کہہ کر ایلس نے روبی کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا جس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور وہ کن انکھیوں سے فریڈ کی جانب دیکھنے لگی۔

”اگر تم سچ بول رہی ہو تو تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے۔“ فریڈ غراتے ہوئے بولا۔

”تم ایک کوشش پہلے بھی کر چکے ہو۔ میں نے وہ کشتی تمہارے پب کے پیچھے دیکھی ہے اور اس پر رگڑ کے نشانات بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فارنسک ٹیم بہ آسانی ان کا موازنہ ڈینی کی کشتی کے رنگ سے کر لے گی۔ ویسے بھی تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ کوئی شخص پہاڑی پر بیٹھا میری نگرانی کر رہا ہے۔“

”تم شہری لوگ ہمیں بالکل ہی احمق سمجھتے ہو۔“ میلینی نے بھی زبان کھولنا ضروری سمجھا۔ ”ہم جانتے تھے کہ

http://digestpk.blogspot.com/

تم نے یہ جال اسی لیے بچھایا ہے کہ ہم سے اعترافِ جرم کروا سکو اور اسی لیے ہم نے یہاں آنے سے پہلے تمام امکانات کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس وقت تمہارا دوست رسیوں سے بندھا پڑا ہے۔"

ایلس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ دروازے کی جانب لپکی لیکن فریڈ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے بُری طرح موڑنے لگا۔ درد کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ چلّاتے ہوئے بولی۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ہم نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تمہاری موت کو ایک حادثہ ہی سمجھا جائے۔ دو محبت کرنے والے دنیا کی نظروں سے چھپ کر مے نوشی میں مشغول تھے۔ بد قسمتی سے پڑوسن نے تمہیں ملاوٹ شدہ شراب فروخت کر دی جو تمہارے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ اس طرح سارا الزام جیسیکا کے سر آئے گا اور ہم صاف بچ جائیں گے۔" جیک نے بڑے اطمینان سے اپنا منصوبہ اسے سنا دیا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی روبی آگے بڑھی اور اس نے ایک شیشی کھول کر زرد رنگ کا محلول وائن کی بوتل میں انڈیل دیا پھر اس نے وہ شراب ایک گلاس میں بھری اور ایلس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یقیناً تم نے صبح سے کچھ نہیں پیا ہوگا۔ یہ لو، تمہارا انتظار ختم ہوا۔"

ایلس جان بوجھ کر خودکشی نہیں کر سکتی تھی لہٰذا اس نے گلاس پکڑنے کے بجائے اپنے آپ کو فریڈ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ جیک سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ہوگو سے کہا۔ "یہ شراب زبردستی اس کے حلق میں انڈیل دو۔ پھر ہمیں اس جھنجھٹ سے بھی نمٹنا ہے۔ واقعی لوگ یہ منظر دیکھ کر بڑے متاثر ہوں گے کہ دو محبت کرنے والوں نے کس طرح ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد نبھایا۔"

ہوگو حریصانہ نگاہوں سے ایلس کو دیکھتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور ایک ہاتھ سے اس کے بال جکڑ لیے۔ ایلس مچھلی کی طرح تڑپی اور زور زور سے چلّانے لگی۔ عین اسی لمحے دروازہ کھلا اور جان چھ باوردی پولیس والوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ جان نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی پھر ہوگو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی یہ حرکت نہ کرتا۔"

ہوگو نے پولیس والوں کو دیکھ کر جلدی سے ایلس کے بال چھوڑ دیے مگر اب دیر ہو چکی تھی اور ہوگو کی یہ حرکت سب کی نظروں میں آ گئی تھی۔ ایلس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو فریڈ کی گرفت سے آزاد کروایا اور لپک کر جان سے بغل گیر ہو گئی۔ وہ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

پولیس والے ان چاروں کو اپنے ساتھ لے گئے تو جان نے ایلس سے کہا۔ "اب تم اپنی سہیلی کے ادھورے کام کو پورا کر سکتی ہو۔ قدرت نے یہ نیکی تمہاری قسمت میں لکھی تھی۔ تم اس مسرور لمحے کو کبھی فراموش نہیں کر سکو گی جب جیسیکا کو یہ معلوم ہوگا کہ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہونے کے باوجود وہ اچانک ہی کتنی دولت مند ہو گئی ہے۔ جس مکان میں وہ پلی بڑھی، صرف وہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ملحقہ بہت سی زمین بھی اس کی ملکیت ہے جس پر ان لوگوں نے قبضہ کر رکھا تھا... لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم ان لوگوں تک پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہوئیں؟"

"یہ سب میلینی کی حماقت کی وجہ سے ہوا۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کے چکر میں ماری گئی اور اپنے ساتھ گروپ کے دوسرے لوگوں کو بھی لے ڈوبی۔ جب میں پہلی بار اس کے پاس گئی تو اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اس مکان کی کسٹوڈین ہے اور مالک کی عدم موجودگی میں اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسٹیل میری سہیلی ہے اور وہی شوہر کے مرنے کے بعد اس کی مالک تھی۔ جب میں نے اس مکان کو خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے فرضی مالک کی آڑ لے کر مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔ پھر مجھے جیسیکا کی کہانی معلوم ہوئی اور ذرا سی کوشش کے بعد مجھے پتا چل گیا کہ اس جائداد کی لیز سات سال پہلے ختم ہو چکی ہے۔ یہ بات ایسٹیل کو بھی معلوم تھی اور اسی لیے ان لوگوں نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ اگر میں یہاں آ کر واقعات کا کھوج نہ لگاتی تو جیسیکا کے ساتھ ساتھ یہ لوگ ایسٹیل کے مکان پر بھی قبضہ کر چکے ہوتے۔"

"واقعی تم کسی سراغ رساں سے کم نہیں ہو۔" جان نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں ڈیٹیکٹو ایجنسی کھول لینی چاہیے۔"

"شاید میں اتنی اچھی جاسوس نہیں ہوں ورنہ اب تک تمہاری حرکتوں کا ضرور سراغ لگا لیتی۔" ایلس نے جھینپتے ہوئے کہا اور جیسیکا کے گھر کی طرف چل دی۔ وہ آنے والے خوش گوار لمحات سے جلد از جلد لطف اندوز ہونا چاہ رہی تھی۔

خالی ہاتھ دنیا کو فتح کرلینے کے عزم کا ساتھ جب عمل دے تو پھر منزل دور نہیں رہتی۔ اس دوشیزہ کا پُرفسوں ماجرا جس کے پاس زندگی کے خار زار میں عزائم اور اپنے وجود کے سوا کچھ اور زادِ راہ نہیں تھا۔

ایک تشنۂ کام کی چہرہ نمائی...... جس کے تمام خواب کاغذ کی کشتیوں کے مانند بھیگ گئے تھے

بازی گر

تنویر ریاض

پہلا رنگ

لیلیٰ شوٹنگ سے واپس آئی تو بری طرح تھک چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پہنچتے ہی وہ شاور لے گی اور لمبی تان کر سو جائے گی کیونکہ دوسرے روز پھر ریکارڈنگ تھی اور یہ سلسلہ پورے پندرہ دن تک چلنا تھا۔ پورچ میں کھڑی گاڑی دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی بن بلایا مہمان نازل ہو گیا تھا۔ وہ جونہی لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں دو عورتوں اور ایک مرد کو بیٹھا پایا۔ یہ چہرے اس کے لیے اجنبی تھے۔ وہ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے رک کر ان

http://digestpk.blogspot.com/

مہمانوں سے رسماً ہیلو ہائے کرنا چاہیے یا انہیں قطعاً نظرانداز کر کے سیدھی اپنے کمرے میں چلی جائے۔ اسے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ جیسے ہی ماں کی نظر اس پر پڑی، وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولی ۔ ”لیلیٰ! ادھر آؤ... دیکھو تو کون آیا ہے؟“

لیلیٰ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر بے دلی سے چلتی ہوئی اس جانب بڑھ گئی جہاں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے خوش اخلاقی سے ...... ان خواتین کو سلام کیا اور لاتعلقی کے انداز میں ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ دونوں خواتین بڑی دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں جبکہ ان کے ساتھ آنے والا مرد بھی ایک مرتبہ نظر بھر کر اسے دیکھ چکا تھا۔ ان لوگوں کے انداز سے لیلیٰ کو یہی گمان ہوا کہ شاید وہ اس کے رشتے کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ان دنوں ماں کو اس کی شادی کی فکر سوار تھی اور وہ اپنے کئی جاننے والوں سے اس کے رشتے کے بارے میں کہہ چکی تھی جبکہ لیلیٰ فی الحال شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ اس وقت اپنے کیریئر کے عروج پر تھی۔ اس کا شمار صفِ اول کی ٹی وی اداکاراؤں میں ہوتا تھا۔ ہر پروڈیوسر کی خواہش ہوتی کہ لیلیٰ اس کی سیریل یا سوپ میں کام کرے لیکن وہ بہت احتیاط اور دیکھ بھال کے بعد اپنے لیے رول کا انتخاب کرتی۔ اس کا معاوضہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ کوئی اوسط درجے کا پروڈیوسر بھی اسے افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود لیلیٰ کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ صبح شوٹنگ کے لیے گھر سے نکلتی تو رات گئے ہی اس کی واپسی ہوتی۔ کبھی کبھی تو اسے دن میں دو یا تین ریکارڈنگز بھی کروانی پڑتیں۔ البتہ اتوار والے روز وہ مکمل آرام کرتی اور کوئی لاکھ روپے کی بھی آفر کرتا تو وہ شوٹنگ کے لیے تیار نہ ہوتی۔

”ان سے ملو بیٹی!“ ماں کی آواز پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ”یہ تمہاری خالہ زبیدہ ہیں... ان کی بیٹی نائلہ اور بیٹا اشعر۔ یہ لوگ ایک طویل مدت کے بعد جاپان سے آئے ہیں اور اب پاکستان میں ہی رہیں گے۔“

لیلیٰ نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی، ویسا نہیں تھا۔ خالہ زبیدہ کے بارے میں اس نے ماں کی زبانی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ انہوں نے ایک غیر خاندان میں شادی کر لی تھی۔ خالو کے گھر والوں نے اس رشتے کو قبول نہیں کیا اور وہ مسلسل ان پر زور دیتے رہے کہ خالہ زبیدہ کو طلاق دے کر اپنی بچپن کی منگیتر سے شادی کر لیں۔ تنگ آ کر خالو نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی کو بتائے بغیر چپکے سے یونان چلے گئے۔ ان دنوں وہاں بحری جہازوں پر بہ آسانی کام مل جاتا تھا۔ خالو نے بھی تین چار سال ایک جہاز پر کام کیا۔ اسی دوران میں ان کی جہاز کے ریڈیو انجینئر سے اچھی دوستی ہو گئی۔ وہ جاپانی تھا۔ اس نے جب خالو کے حالات سنے تو مشورہ دیا کہ وہ جاپان میں سیٹل ہو جائیں اور بیوی کو بھی وہیں بلا لیں۔ اس سلسلے میں وہ ان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ اس نے اپنا وعدہ نبھایا اور وطن واپس جاتے ہی خالو کو جاپان بلانے کی کوشش شروع کر دی۔ چند ماہ بعد وہ خالو کے لیے ٹوکیو کے نواح میں واقع ایک فیکٹری میں جاب تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک سال بعد خالہ زبیدہ بھی جاپان چلی گئیں۔ وہیں ان کے دونوں بچے پیدا ہوئے۔ خالو نے ساری عمر پاکستان واپس نہ آنے کا تہیہ کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب بھی وطن جائیں گے تو انہیں خاندان والوں کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بعد خالہ زبیدہ کے لیے اس اجنبی دیس میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

خالہ زبیدہ نے پیار بھری نظروں سے لیلیٰ کو دیکھا اور بولیں۔ ”ماشاءاللہ... بڑی پیاری بچی ہے۔ سنا ہے تم ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی ہو؟“

”امی! ان کے نام کی تو بڑی دھوم ہے۔ کوئی سا بھی چینل آن کریں... انہی کا ڈراما چل رہا ہوگا۔“ نائلہ نے لیلیٰ کا تعارف مکمل کرواتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! اتنا زیادہ کام مت کیا کرو۔ صحت خراب ہو جائے گی۔ تھوڑا سا اپنے آرام کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔“

”اب تو عادت ہو گئی ہے اور اس فیلڈ میں تو کام سے ہی نام بنتا ہے۔ ایک مہینے کے لیے غائب ہو جاؤ تو لوگ بھول جائیں گے کہ لیلیٰ نام کی کوئی ایکٹریس ہوا کرتی تھی۔“

”اب تو اس نے پروڈکشن کا بکھیڑا بھی پال لیا ہے۔ رہا سہا وقت اس کی نذر ہو جاتا ہے۔“ اس کی ماں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

اب تک اشعر بالکل خاموش بیٹھا تھا لیکن پروڈکشن ہاؤس کا نام سنتے ہی وہ بھی اس گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے براہ راست لیلیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہ کام تنہا کر رہی ہیں یا کسی کے ساتھ پارٹنر شپ ہے؟“

”جی نہیں، میں پارٹنر شپ کی قائل نہیں۔ آپ نے سنا نہیں کہ ساجھے کی ہنڈیا بیچ چوراہے پر پھوٹتی ہے۔“

”کہتی تو آپ ٹھیک ہی ہیں لیکن سبھی پارٹنر ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ اشعر نے کہا۔

”شاید آپ کا خیال درست ہو لیکن میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ایسا کہہ رہی ہوں۔“ لیلیٰ نے جواب دیا۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیلیٰ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ یہ لوگ رخصت ہوں تو وہ بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے۔ لیلیٰ کی ماں انہیں کھانے پر روکنا چاہ رہی تھی لیکن اشعر کو کسی کام سے جانا تھا اس لیے انہوں نے معذرت کر لی۔ ان کے جانے کے بعد لیلیٰ کی ماں نے اپنی بہن کی شان میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔

”تم نے دیکھا زبیدہ کو... اتنی دولت مند ہے لیکن غرور نام کو نہیں۔ اور وہ اشعر ارب پتی نہیں تو کروڑ پتی ضرور ہوگا۔ باپ نے ساری عمر کمایا، جائداد بنائی، بینک بیلنس بڑھایا... سونا، ہیرے جواہرات جمع کیے۔ سب کچھ سمیٹ کر پاکستان آ گیا۔ سنا ہے ڈیفنس میں تین کروڑ کی کوٹھی خریدی ہے۔ زبیدہ تو بہت کہہ رہی تھی کہ کسی دن کھانے پر آ جاؤ لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ تمہارے پاس فرصت ہو تو کچھ کہتی۔“

”امی! ایک تو آپ ہر ایک سے بہت جلدی مرعوب ہو جاتی ہیں۔ آپ خود کسی سے کم ہیں کیا؟ ہم جس مکان میں رہ رہے ہیں یہ بھی ڈیڑھ کروڑ کا ہے۔ میں آج چاہوں تو تین کیا پانچ کروڑ کا گھر خرید سکتی ہوں لیکن میں اسرافِ بے جا کی قائل نہیں۔ نہ جانے کل کو اس گھر میں رہنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اس لیے ہمیں آج کے بجائے آنے والے کل کی فکر کرنی چاہیے۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ ایکٹریس کی عمر کتنی ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ سال۔ اس کے بعد کوئی نہیں پوچھتا۔ میں اسی لیے زیادہ سے زیادہ کام کر رہی ہوں تاکہ میرا کل آرام سے گزرے۔ پروڈکشن ہاؤس بھی اسی لیے شروع کیا ہے کہ ایکٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد بھی میرے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ باقی رہے۔“

”اوہو... تم تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔“ ماں تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ...“

”آپ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھیں، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ فی الحال میں سونے جا رہی ہوں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔“

لیلیٰ اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس کی ماں فریدہ بیگم سوچوں میں گم ہو گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے اشعر کا سراپا لہرا رہا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اسے بھا گیا تھا اور اس سے ملنے کے بعد دل میں یہ خواہش انگڑائی لینے لگی کہ کسی طرح اشعر اور لیلیٰ کی شادی ہو جائے۔ اسے یقین تھا کہ زبیدہ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ لیلیٰ کے ساتھ وہ جس شفقت اور محبت سے پیش آئی تھی، اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ شاید زبیدہ کے دل میں بھی ایسی ہی کوئی خواہش موجود ہے۔ فریدہ بیگم نے اشعر کی نگاہوں میں بھی لیلیٰ کے لیے پسندیدگی کے جذبات دیکھے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ لیلیٰ کا تھا۔ وہ کسی طور بھی شادی کے لیے رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ اسے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے فرصت ملتی تو وہ شادی کے بارے میں سوچتی۔ اس نے ماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ بڑی محنت

کیڈٹ کی افسری

سگنل سینٹر میں پہنچے تو وہ جو احترام انسانیت کی افواہیں تھیں، سچ مچ درست نظر آنے لگیں۔ تمام استاد ادب سے پیش آئے لیکن چھ ماہ کی متواتر بے ادبی کے بعد ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابل ادب قسم کے آدمی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ساری تعظیم ہمیں جعلی سی لگتی تھی۔ ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسی نظام سقہ کی اپنی مختصر سی جلالت مآبی کے دور میں ہوئی ہو گی۔ شاید ہماری حالتِ زار نظام سے بھی کچھ پتلی تھی، کیونکہ اسے اپنا انجام معلوم تھا اور ہمیں اعتبار نہ تھا کہ یہ فالتو احترام واقعی کوئی دیرپا چیز ہے یا کسی وقت یہی مؤدب انسٹرکٹر ایک ہلاکوانہ قہقہہ لگا کر ہمیں ثریا سے کھینچ کر زمین پر دے ماریں گے اور پھر ہم ہوں گے اور ایکسٹرا ڈرل! لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اس احترام میں ملاوٹ نہ تھی اور یہ کہ ہمیں مرتبے کا احساس قصداً دلایا جا رہا تھا۔ وہی احساس جو او ٹی ایس میں ہمارے دماغ سے نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس وقت کہ ہم تازہ تازہ شہری زندگی سے فوج میں آئے تھے وہی صحیح تھا، اور اب کہ افسری کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ہمیں افسرانہ انداز سکھائے جا رہے تھے۔

کرنل محمد خان کی بجنگ آمد سے ایک اقتباس
(فہمیدہ احمد...... میر پور خاص)

http://digestpk.blogspot.com/

اور مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد اس مقام تک پہنچی ہے اور عین عروج کے دنوں میں یہ پروفیشن نہیں چھوڑ سکتی۔ وقت اور حالات نے اسے سکھا دیا تھا کہ اس دنیا میں پیسے سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں، اگر جیب میں پیسے نہ ہوں تو سگے رشتے بھی نظریں چرانے لگتے ہیں۔ بیٹا بے روزگار ہو تو ماں باپ اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے نکھٹو ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ بیٹی کا رشتہ آنے میں دیر ہو جائے اور وہ کوئی کام نہ کرتی ہو تو گھر والوں کے لیے بوجھ بن جاتی ہے۔ قدرت نے اُسے دولت کمانے کا ایک موقع فراہم کیا تھا تو وہ کفرانِ نعمت کیسے کرتی۔

لیلیٰ نے مفلسی اور محرومی کی طویل رات کاٹ کر خوش حالی کا سورج دیکھا تھا۔ اس کا باپ ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھا اور بیٹی سے بے انتہا محبت کرنے کے باوجود اس کے لاڈ اٹھانے سے قاصر تھا۔ اس کی معمولی سی تنخواہ میں دو وقت کی روٹی ہی مشکل سے پوری ہوتی تھی پھر وہ بیٹی کے لیے اچھے کھلونے اور کپڑے کہاں سے لاتا؟ لیلیٰ بچپن سے ہی ذہین اور سمجھ دار تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس میں صبر اور قناعت کا مادہ بھی موجود تھا۔ عام بچوں کی طرح اس نے کبھی کسی چیز کے لیے فرمائش یا ضد نہیں کی۔ جو مل گیا، پہن لیا کھا لیا۔ شاید اسے بچپن ہی میں یہ ادراک ہو گیا تھا کہ گھر پر چھائی ہوئی غربت کی وجہ سے اسے محرومی کی آگ میں جلنا ہو گا۔ اس محرومی کو دور کرنے کے لیے غربت کے اندھیروں سے باہر آنا ضروری تھا اور یہ تبھی ممکن تھا کہ ان کے پاس بہت سارے پیسے ہوں۔ اس کی کلاس میں امیر گھرانوں کی کئی لڑکیاں تھیں جو کسی نہ کسی بہانے اپنی امارت کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ لیلیٰ کو دوستیاں کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ ان لڑکیوں سے دور ہی رہی۔ البتہ نجمہ سے اس کی اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بھی لیلیٰ کی طرح غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی کی طرح گھر کا دھلا ہوا یونیفارم پہنتی اور ہاف ٹائم میں کینٹین جانے کے بجائے کلاس میں کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی۔

کالج میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ یہاں کا ماحول اسکول سے قدرے مختلف تھا۔ کالج میں آنے کے بعد لیلیٰ کو شدت سے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ اس کے دماغ کی سوئی ایک ہی جگہ پر آ کر رک گئی تھی کہ اگر اس نے خود کو غربت کے چُنگل سے نہ نکالا تو زمانے کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گی... لیکن اس کے لیے پیسے کی ضرورت تھی اور پیسا کہاں سے آتا؟ یہی وہ سوال تھا جس کا جواب اسے نہیں مل رہا تھا۔

وہ اور نجمہ گھنٹوں پیسے کمانے کی ترکیبیں سوچتیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جس پر عمل کر کے وہ راتوں رات امیر بن جاتیں۔ میٹرک پاس کو تو کوئی چھوٹی موٹی ملازمت بھی نہ ملتی۔ کاروبار شروع کرنے کے لیے سرمائے اور تجربے کی ضرورت تھی۔ پھر کیا کیا جائے؟ یہی سوچ سوچ کر دونوں سہیلیاں ہلکان ہوتی رہتیں لیکن کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کالج کی طرف سے پکنک ہو رہی تھی اور تمام طالب علموں کو اس کے لیے سو روپے فی کس جمع کروانے تھے۔ لیلیٰ نے نوٹس بورڈ پڑھا اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں باپ سے سو روپے مانگ کر وہ اسے اور خود کو شرمندہ نہیں کر سکتی تھی لہٰذا پکنک پر جانے کے بارے میں سوچنا ہی فضول تھا۔ وہ نوٹس بورڈ کے پاس کھڑی تھی کہ نجمہ اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں چلی آئی اور بولی۔

”پکنک پر جاؤ گی نا؟“

”نہیں۔“ لیلیٰ نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیوں؟“ نجمہ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس قسم کی عیاشی افورڈ نہیں کر سکتی۔“

”کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میری خود ہمت نہیں پڑ رہی کہ امی سے سو روپے مانگوں۔“ نجمہ نے اداسی سے کہا۔

”انہیں پریشان کرنے سے بہتر ہے کہ میری طرح تم بھی اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کر سو جاؤ... کیونکہ ہمارے مقدر میں یہی لکھ دیا گیا ہے۔“

”سنا ہے کہ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے۔“ نجمہ پُرخیال انداز میں بولی۔

”تو پھر سوچو کوئی تدبیر جس سے ہمارا سویا ہوا نصیب جاگ جائے اور ہم محرومیوں کی دلدل سے نکل آئیں۔“

”ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے لیکن ڈرتی ہوں کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔“

لیلیٰ نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ تمہاری زبان سے نکلی ہوئی ناپسندیدہ بات بھی برداشت کر لوں گی۔“

”تم نے آئینے میں خود کو کبھی غور سے دیکھا ہے؟ خدا کی قسم تم جیسی خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی پورے کالج میں نہیں ہے۔ یہ حسین چہرہ، سانچے میں ڈھلا جسم، شہد ٹپکاتی آواز، جھیل جیسی گہری آنکھیں... کس کس بات کی تعریف کروں۔“

لیلیٰ جھینپتے ہوئے بولی۔ ”تم تقدیر بدلنے کی تدبیر بتاتے بتاتے میرے حُسن کا قصیدہ کیوں پڑھنے لگیں؟“

”اسی طرف آ رہی ہوں۔“ نجمہ اطمینان سے بولی۔ ”سنو! تم ماڈلنگ میں کیوں ٹرائی نہیں کرتیں؟ سنا ہے وہاں بہت اچھے پیسے ملتے ہیں۔ ایک ہی سال میں مالا مال ہو جاؤ گی۔“

”فضول بکواس مت کرو۔“ لیلیٰ تیز لہجے میں بولی۔ ”غریبوں کے پاس عزت ہی واحد سرمایہ ہے، اگر وہ بھی نہ رہے تو اس کی زندگی میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ اول تو مجھے گھر سے ہی اجازت نہیں ملے گی اور اگر میں نے رو دھو کر اپنی بات منوا بھی لی تو یہ معاشرہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ میں ماڈلنگ کو بُرا نہیں سمجھتی لیکن لوگوں کی زبان کون روک سکتا ہے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ یونہی جلتے کُڑھتے زندگی گزارو اور صبح شام اپنی حسرتوں کا ماتم کرتی رہو۔“ نجمہ جل کر بولی۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ لیلیٰ اور نجمہ اپنے بکھرے خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے سیکنڈ ایئر میں آ گئیں۔ زندگی روز بروز مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے محدود آمدنی والوں کا جینا محال کر دیا تھا۔ لیلیٰ گھر کے حالات دیکھ دیکھ کر کُڑھتی رہتی لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ اس کے باپ نے آمدنی بڑھانے کے لیے ایک میڈیکل اسٹور پر پارٹ ٹائم کام شروع کر دیا تھا۔ وہ صبح دفتر جاتا تو اس کی واپسی شام پانچ بجے ہوتی۔ کھانا کھا کر وہ چھ بجے دکان پر چلا جاتا جہاں سے رات بارہ بجے واپس آتا۔ اس مشقت کے عوض اسے صرف دو ہزار روپے ملتے تھے جو بجلی کے بل کے لیے بھی ناکافی تھے۔ لیلیٰ کے بس میں ہوتا تو وہ خود باپ کی جگہ میڈیکل اسٹور چلی جاتی لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ تاہم اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دے گی اور کسی اسکول میں ملازمت کر کے باپ کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرے گی۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ لیلیٰ نے جو سوچا تھا، اس پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کے امتحان میں تین مہینے باقی تھے کہ وہ حادثہ پیش آ گیا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ شدید محنت، ناکافی خوراک اور ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے اس کے باپ کی صحت بُری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ اسے شوگر اور بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہو چکا تھا لیکن اس کے پاس نہ وقت تھا اور نہ پیسا کہ وہ باقاعدگی سے اپنا علاج کروا سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک رات جب وہ کام

”آپ کو اپنے وزن میں فوری کمی کی ضرورت ہے۔
ایسا کریں، یہ بیلٹ اتار دیں“۔

سے واپس آنے کے بعد بستر پر لیٹا تو دوسری صبح اس کی آنکھ ہی نہ کھل سکی۔

لیلیٰ اور اس کی ماں کے سر سے گویا سائبان ہٹ گیا۔ باپ کے مرتے ہی یوں لگا جیسے وہ کسی لق و دق صحرا میں کھڑی ہیں۔ لیلیٰ کا کوئی سگا چچا یا ماموں بھی نہ تھا جس سے کسی مدد کی توقع کی جا سکتی۔ دور پرے کے رشتے دار زبانی ہمدردی جتا کر چلے گئے تو لیلیٰ اور اس کی ماں کے سامنے یہ سوال پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا کہ اب گزر بسر کیسے ہو گی؟ اگر باپ کی سرکاری نوکری ہوتی تو پنشن اور فنڈ کا سہارا ہوتا لیکن پرائیویٹ جاب میں ایسی کوئی سہولت نہیں ملتی۔ مالک نے البتہ اتنا احسان ضرور کیا کہ گھر آ کر اس مہینے کی پوری تنخواہ مع بونس دے گیا جس سے چند دن گزارہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا، یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ماں بیٹی میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔

باپ کے سوئم کے بعد وہ گھر سے نکلی اور کالج جانے کے بجائے اس نے اپنے ہی علاقے میں واقع دو تین اسکولوں میں جا کر ملازمت کی بات کی لیکن ہر جگہ اس کی تعلیم آڑے آئی۔ اس نے تو ابھی انٹر بھی نہیں کیا تھا جبکہ اسکول ٹیچر کے لیے گریجویٹ ہونا ضروری تھا۔ وہ مایوس ہو کر گھر لوٹ آئی لیکن اس نے ماں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے دن وہ کالج گئی اور نجمہ کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ اسے پہلے سے ہی اس صورتِ حال کا اندازہ تھا۔ لیلیٰ نے جب اسے بتایا کہ اسکول ٹیچر کے لیے گریجویٹ ہونا

http://digestpk.blogspot.com/

ضروری ہے تو وہ جھلاتے ہوئے بولی۔

''ارے لعنت بھیجو ایسی نوکری پر۔ دن بھر بچوں سے دماغ کھپاؤ اور ملے گا کیا...؟ زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار روپے۔ اس میں تمہارا گزارہ کیسے ہوگا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے دس پندرہ ہزار کی جاب مل سکتی ہے؟'' لیلیٰ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اگر صحیح سمت میں کوشش کی جائے تو سب کچھ ممکن ہے۔''

''کھل کر بات کرو... کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' لیلیٰ الجھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو بُرا مت منانا لیکن مطلب کے لیے گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ تم عامر کو تو جانتی ہی ہو۔ ہماری کلاس میں ہی پڑھتا ہے۔ وہ آج کل میرے بہت آگے پیچھے پھر رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس سے کچھ کہوں تو وہ انکار نہیں کرے گا۔''

''وہ... وہ کیا کر سکتا ہے اس سلسلے میں؟'' لیلیٰ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ارے بے وقوف... وہ کسی معمولی آدمی کا بیٹا نہیں۔ اس کے باپ کی اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ تمہارے لیے کوئی نہ کوئی گنجائش نکال ہی لے گا۔''

''لیکن میں وہاں کیا کروں گی؟ ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں تو سب پروفیشنل لوگ ہوتے ہیں۔''

''شروع شروع میں سب کچے پکے ہوتے ہیں۔'' نجمہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کام سیکھ کر ہی بندہ پروفیشنل بنتا ہے۔ ویسے بھی یہ سب تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ اگر انہیں جاب دینا ہوگی تو وہ تمہارے لیے جگہ بھی نکال لیں گے۔ تم صرف اتنا بتا دو کہ میں اس سے بات کروں یا نہیں؟''

لیلیٰ کے پاس سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ اسے وقت ضائع کیے بغیر کوئی کام شروع کرنا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم بات کر کے دیکھو۔''

دوسرے دن نجمہ نے اسے خوش خبری سنائی کہ عامر نے اپنے ڈیڈی سے بات کر لی ہے اور انہوں نے لیلیٰ کو انٹرویو کے لیے بلایا ہے۔ یہ کہہ کر نجمہ نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکالا اور لیلیٰ کو دیتے ہوئے بولی۔ ''اس پر عامر کے ڈیڈی کا نام اور دفتر کا ایڈریس وغیرہ سب کچھ درج ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم کل ہی انٹرویو کے لیے چلی جاؤ۔ اگر اکیلے جاتے ہوئے گھبرا رہی ہو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

''یہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان ہوگا۔'' لیلیٰ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''غیروں جیسی باتیں مت کرو۔ اگر تمہارا کام ہو گیا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

لیلیٰ نے گھر آ کر ماں کو ساری بات بتائی تو وہ زاروقطار رونے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی! میری بڑی خواہش تھی کہ تم اپنی تعلیم مکمل کر لیتیں۔''

''زندگی نے مہلت دی تو آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گی لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں۔ آپ مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دے دیں تاکہ زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی رہے۔''

ماں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ دوسرے دن لیلیٰ، نجمہ کو ساتھ لے کر..... ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے دفتر پہنچی تو اسے فوراً ہی انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ عامر نے اپنے باپ کو لیلیٰ کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا۔ لہٰذا یہ انٹرویو ایک رسمی سی کارروائی تھی۔ ارشد خاں سلجھے ہوئے ذہن کے زمانہ شناس آدمی تھے۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ لڑکی ذہین ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہاں کے کام سے واقف ہو جائے گی۔ انہوں نے پہلے تو لیلیٰ سے اس کے باپ کے انتقال پر تعزیت کی اور بولے۔ ''دیکھو بیٹی! تم ابھی زیرِ تعلیم ہو۔ اگر تم اس سال امتحان نہ دے سکیں تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ اسی لیے میں نے تمہارے لیے ایک ایسا کام سوچا ہے جس میں تمہیں اتنا وقت مل جائے گا کہ گھر پر امتحان کی تیاری کر سکو۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں سر۔'' لیلیٰ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوئی اور تمہارے پاس کسی کام کا تجربہ بھی نہیں ہے۔ دفتر میں بٹھاؤں تو تمہیں کیا تنخواہ ملے گی۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس ہزار روپے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم ماڈلنگ کی طرف آ جاؤ۔ اس فیلڈ میں پیسا بھی بہت ہے اور تمہیں پڑھائی کے لیے وقت بھی مل جائے گا۔''

''شاید مجھے اس کی اجازت نہ ملے۔'' لیلیٰ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ فی الحال تم ریسپشن پر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری تنخواہ چھ ہزار روپے ہوگی۔ بعد میں، میں تمہارا رجحان دیکھ کر کسی مناسب جگہ پر پوسٹ کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصے بعد تمہاری سمجھ میں میری بات آ جائے۔''

لیلیٰ نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ عامر کے ڈیڈی نے ماڈلنگ پر اصرار نہیں کیا۔ اس کے لیے یہ چھ ہزار بھی بہت تھے، کم از کم ایک وقتی سہارا تو مل گیا تھا۔ اس نے گھر آ کر ماں کو یہ خبر سنائی تو وہ ایک بار پھر رونے بیٹھ گئی۔ بڑی مشکل سے اس نے ماں کو چپ کروایا اور اپنا بکس کھول کر بیٹھ گئی۔ اب اسے یہ فکر سوار ہو گئی تھی کہ پہلے روز کون سے کپڑے پہن کر آفس جائے؟ کالج میں تو یونیفارم سے کام چل جاتا تھا۔ گھر میں پہننے کے لیے اس کے پاس دو چار کاٹن کے معمولی سے سوٹ تھے جنہیں پہن کر آفس جانے کا مطلب اپنی ہی نظروں میں گرنے کے برابر تھا۔ مجبور ہو کر اسے اپنا وہ واحد بہترین سوٹ نکالنا پڑا جو وہ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں پہن کر جاتی تھی۔

دوسرے دن دفتر پہنچی تو استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے اسے بتایا کہ وہ آفس منیجر ہمدانی صاحب کو رپورٹ کرے۔ وہی اسے کام کے بارے میں بریفنگ دیں گے۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی۔ سیدھے ہاتھ پر بنے ہوئے ایک کیبن پر اسے ہمدانی کے نام کی تختی نظر آ گئی۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی ریوالونگ چیئر پر ہمدانی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس سال کے درمیان ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے کم لگتا تھا۔ لیلیٰ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ خیر مقدمی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''آئیے مس لیلیٰ... تشریف رکھیے۔''

لیلیٰ اسے سلام کر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تو ہمدانی بولا۔ ''آپ کا اپائنٹ منٹ لیٹر تیار ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو مل جائے گا۔ کیونکہ یہ آپ کی پہلی جاب ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ میں آپ کو دو چار ضروری باتیں بتا دوں۔ اگر گفتگو کے دوران تھوڑا سا بے تکلف ہو جاؤں یا کھل کر بولوں تو مائنڈ مت کیجیے گا۔ اس کے بغیر میں اپنی بات کی وضاحت نہیں کر سکوں گا۔''

لیلیٰ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کانپنے لگی۔ ایسی کیا بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی جا رہی تھی۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''فرمائیے... میں سن رہی ہوں۔''

''دیکھیے مس لیلیٰ! ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا ماحول بڑا کھلا ڈلا ہوتا ہے۔ یہاں شرمانے، جھجکنے اور سمٹنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ جو جتنا بولڈ اور فرینک ہے، وہ اتنا ہی زیادہ کامیاب ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جیسا دیس ویسا بھیس... تو سمجھ لیجیے کہ سب سے پہلے آپ کو اپنے لباس، اسٹائل اور لُک پر توجہ دینا ہوگی۔ آپ استقبالیہ پر بیٹھیں گی۔ اپنی ساتھی لڑکی کو فالو کیجیے۔ امید ہے کہ دو چار دن میں سب کچھ آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔''

لیلیٰ کی سمجھ میں تو سب کچھ اسی وقت آ گیا تھا جب اس نے دفتر میں قدم رکھتے ہی استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کو دیکھا تھا۔ رہی سہی کسر ہمدانی نے پوری کر دی تھی۔ دونوں ہی فیشن کا چلتا پھرتا اشتہار لگ رہے تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کر ہمدانی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو... ''بس یا کچھ اور کہنا باقی ہے۔''

ہمدانی اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گیا اور اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، اب آپ جا سکتی ہیں۔ باقی باتیں آپ کو نوشین بتا دے گی۔''

نوشین اس لڑکی کا نام تھا جو استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی شکل تو واجبی سی تھی لیکن چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور اٹھلا اٹھلا کر انگریزی بولنے کی وجہ سے وہ پُرکشش کہلائے جانے کے قابل تھی۔ اس نے جدید تراش خراش کا لباس پہن رکھا تھا اور شانوں پر بکھرے بال اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔ لیلیٰ واپس آئی تو اس نے اپنے برابر والی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ، بیٹھو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم جیسی خوب صورت لڑکی کا ساتھ نصیب ہو رہا ہے۔''

لیلیٰ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''شکریہ... تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کم آن... ایسے جملے وہ لڑکے بولتے ہیں جنہیں مجھ سے فلرٹ کرنا ہوتا ہے۔ ویسے مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اور سنو... تم بھی اب نیک پروین کے خول سے باہر آ جاؤ۔ ایک ہفتے تک تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ صرف یہاں کے ماحول اور اپنے کام کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہر ایک سے انگریزی میں بات کرو۔ اگر نہیں آتی تو یس اور نو پر ہی اکتفا کرو۔ اگر غلط بھی بولو گی تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہاں کسی کو صحیح اور غلط کا فرق معلوم نہیں ہے۔''

دونوں نے لنچ ایک ساتھ ہی کیا۔ اس دوران نوشین نے لیلیٰ کا تعارف دفتر کے دوسرے لوگوں سے بھی کروایا۔ وہ سب اس سے بڑی شائستگی سے پیش آئے۔ لنچ کے بعد ہمدانی نے اسے اپنے کیبن میں بلایا اور اپائنٹ منٹ لیٹر دیتے ہوئے بولا۔ ''اس لیٹر کے ساتھ آپ کو فوری ضرورت کے

http://digestpk.blogspot.com/

لیے ایک ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دی جارہی ہے۔ آپ کیشیئر سے وصول کرلیں۔‘‘

دوسرے لفظوں میں وہ کہہ رہا تھا کہ بی بی! یہ پیسے پکڑو اور بازار جاکر دو چار ڈھنگ کے سوٹ خرید لو۔ ہوسکے تو ایک چکر بیوٹی پارلر کا بھی لگالینا۔ وہ شکریہ ادا کرکے اٹھنے لگی تو ہمدانی بولا۔ ’’اس کے علاوہ کوئی مسئلہ ہو تو آپ بلا جھجک بیان کرسکتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں کام کرنے والوں کو ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے۔‘‘

لیلیٰ کیشیئر سے پیسے لے کر آئی تو اس نے نوشین کو سارا قصہ سنایا۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ’’انہوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ یہ ایک طرح کی انویسٹ منٹ ہے۔ تم یہ پیسے اپنی ذات پر خرچ کروگی تو انہی کا فائدہ ہوگا۔ لوگ ریسیپشن پر ایک بجی بنی گڑیا کو دیکھ کر کمپنی کے بارے میں بہتر رائے قائم کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ انہوں نے مہمانوں یعنی اپنے کلائنٹس کو مرعوب کرنے کے لیے ایک نیا شوپیس سجادیا ہے۔‘‘

اسے شاپنگ کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ماں ہی اس کے لیے کپڑے وغیرہ خرید کر لاتی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نوشین سے کہا۔

’’کیا تم میری تھوڑی سی مدد کرسکتی ہو؟‘‘

’’ہاں ہاں... کیوں نہیں۔ بولو کیا بات ہے؟‘‘

’’اگر تم میرے ساتھ بازار چل سکو تو...‘‘ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ’’دراصل مجھے شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں چاہ رہی تھی کہ دو تین ریڈی میڈ سوٹ خرید لوں۔‘‘

’’نو پرابلم! چھٹی ہونے پر ہم دونوں سیدھے بازار جائیں گے اور میں تمہیں اپنی پسند کی شاپنگ کرواؤں گی۔ تم دیکھنا، میری چوائس کتنی زبردست ہے۔‘‘

نوشین کے ساتھ شاپنگ کرنا انتہائی سنسنی خیز تجربہ تھا۔ کئی دکانوں کی خاک چھاننے کے بعد اس نے لیلیٰ کو دو سوٹ دلوائے۔ ایک دکان سے لیلیٰ نے لپ اسٹک، نیل پالش اور میک اپ کا دوسرا سامان خریدا۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے چاٹ کھائی اور جب لیلیٰ سامان سے لدی پھندی گھر پہنچی تو آٹھ بج چکے تھے۔ ماں کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور انہیں طرح طرح کے وسوسے آرہے تھے۔ لیلیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ کیا تھا اگر وہ ایک دن بعد ماں کو بتا کر بازار چلی جاتی۔ اس نے ماں کو بڑی مشکل سے منایا اور دن بھر کی روداد سنانے کے بعد کپڑوں کا پیکٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ماں کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کمپنی والوں نے کام کرائے بغیر ایک ماں کی تنخواہ ایڈوانس میں کیوں دے دی؟ لیلیٰ بڑی مشکل سے ماں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئی کہ اس میں بھی کمپنی کی اپنی غرض موجود تھی اور انہوں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا تھا۔ دنیا بھر میں اچھی کمپنیاں اپنے ملازمین کی فوری ضروریات کے لیے ایڈوانس تنخواہ دیا کرتی ہیں۔

دوسرے دن وہ خوب بن سنور کر دفتر جانے کے لیے تیار ہوئی تو ماں سے نہ رہا گیا۔ وہ بیٹی کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ’’یہ کیا حلیہ بنالیا... کام پر جارہی ہو یا کسی تقریب میں؟‘‘

’’میری پیاری امی!‘‘ وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’دفتر والوں نے اسی لیے تو مجھے ایڈوانس تنخواہ دی ہے کہ میں ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق تیار ہوکر کام پر آؤں۔‘‘

اس کے بعد ماں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بیٹی غلط نہیں کہہ رہی۔ زمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔ باطن سے زیادہ ظاہر دیکھا جاتا ہے۔ آپ اندر سے چاہے کتنے ہی لائق، ذہین اور نیک فطرت کیوں نہ ہوں لیکن ظاہری چمک دمک کے بغیر آپ کی حیثیت کھوٹے سکے سے زیادہ نہیں۔ اسی لیے آج کل لوگ اپنا پیٹ کاٹ کر اچھا لباس پہنتے اور گھروں کو سجاتے ہیں۔ کوئی پیٹ میں جھانک کر نہیں دیکھتا کہ آپ نے کیا کھایا ہے لیکن لباس اور گھر کی آرائش پر سب کی نظر جاتی ہے۔

لیلیٰ دفتر پہنچی تو نوشین نے دیکھتے ہی اسے گلے لگالیا اور اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔ ’’گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی نظر ضرور اتار لیا کرو۔ ماشاء اللہ! تم نے تو ایک ہی دن میں کمال کردیا۔‘‘

’’میں اسی لیے گھر سے چادر لے کر نکلی تھی۔‘‘ لیلیٰ شرماتے ہوئے بولی۔ ’’چہرہ بھی چھپالیا تھا اس لیے کسی کی نظر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘

’’میں راستے کی نہیں اس دفتر کی بات کررہی ہوں۔ دیکھ لینا، آج کتنا ٹریفک رہے گا۔ میرا بس چلے تو تم پر ٹکٹ لگا دوں۔ شام تک اچھی خاصی آمدنی ہوجائے گی۔‘‘

نوشین کا کہا درست ثابت ہوا۔ دفتر میں داخل ہونے والا ہر شخص اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک جاتا۔ وہ نوشین کی ہدایت کے مطابق گھبرائی نہ شرمائی بلکہ اپنی جگہ بیٹھی مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی رہی۔ لنچ ٹائم میں کئی لوگوں نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن نوشین کا ساتھ ہونے کی وجہ سے اسے کسی غیر معمولی صورتِ حال کا سامنا

نہیں کرنا پڑا۔ نوشین نے اسے باور کرادیا تھا کہ غیر معمولی حُسن ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے سہارے وہ بڑے سے بڑے گھاگ مرد کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔

پہلی تنخواہ ملنے پر ہی لیلیٰ کو اندازہ ہوگیا کہ یہ رقم اس کی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔ دفتر والوں نے ایڈوانس کا دس فیصد تنخواہ میں سے کاٹ لیا تھا۔ اس نے پانچ ہزار چار سو روپے ماں کے ہاتھ پر رکھے اور بولی۔ ’’کل سے میں گھر کا بنا ہوا کھانا لے کر جاؤں گی۔ وہاں کا لنچ تو بہت مہنگا ہوتا ہے۔‘‘

’’میں تو خود نہیں چاہتی کہ تم باہر کا کھانا کھاؤ۔ مہنگا ہونے کے ساتھ ساتھ صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔‘‘

تین مہینے اسی طرح گزر گئے۔ ہر ممکن بچت کے باوجود اس تنخواہ میں گزارہ ہونا مشکل تھا۔ ان کے گھر میں ایک وقت کھانا پکتا، چائے بھی صرف ناشتے میں پی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور خرچ نہیں تھا۔ اس کے باوجود مہینا پورا ہونا مشکل ہوجاتا تھا۔ اس نے جو سوٹ پہلی تنخواہ پر بنائے تھے، اس کے بعد کوئی اور کپڑا خریدنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ اسے کمپنی کے مالک کا مشورہ مان لینا چاہیے۔ آئے دن اس کے دفتر میں ماڈل گرلز کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کے نخرے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہوتے تھے۔ کمپنی کا ہر فرد ان کے آگے پیچھے بچھا جاتا تھا۔ معمولی سے معمولی ماڈل بھی ایک اشتہار کا کم از کم دس ہزار معاوضہ لیتی تھی جبکہ ٹاپ ماڈلز لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم میں بات نہیں کرتی تھیں۔ اس نے ارشد خاں کی پی اے سے انٹرکام پر بات کی اور کہا کہ وہ باس سے ملنا چاہتی ہے۔ پی اے نے وعدہ کیا کہ وہ لنچ کے بعد اس کی باس سے میٹنگ کروادے گی۔

ارشد خاں اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے اور بولے۔ ’’کوئی پرابلم؟‘‘

لیلیٰ سنبھلتے ہوئے بولی۔ ’’سر! پرابلم تو کوئی نہیں ہے۔ دراصل اس تنخواہ میں گزارہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں سوچ رہی ہوں کہ آپ کا مشورہ مان لوں۔‘‘

’’گڈ!‘‘ ارشد خاں مسکراتے ہوئے بولے۔ ’’مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری بات پر دھیان دیا۔ اب جبکہ تم نے اس فیلڈ میں آنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو دو چار باتیں اور سمجھانا چاہتا ہوں۔ تم عامر کی کلاس فیلو ہو اس لیے تمہارا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا تعلق ایک شریف اور باعزت گھرانے سے ہے۔ دیکھو بیٹی! اس فیلڈ میں اچھے اور بُرے ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اپنے آپ کو کس طرح سنبھال سکتی ہو۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک ہی کمپین کے بعد تمہارے نام کا ڈنکا پٹ جائے گا اور لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح تمہارے گرد جمع ہونے لگیں گے۔ انہیں تم سے نہیں بلکہ اپنے مفادات سے غرض ہوگی اور اس کے لیے وہ تمہیں پُرکشش ترغیبات دیں گے۔ اس لیے میری پہلی شرط یہ ہے کہ تم دو سال تک صرف ہماری کمپنی کے لیے کام کروگی تاکہ اچھی طرح یہاں کی اونچ نیچ سمجھ لو۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ ہم تمہارا استحصال نہیں کریں گے اور تمہیں مارکیٹ ڈیمانڈ کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا۔‘‘

’’مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ آپ جیسا کہیں گے، میں وہی کروں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو۔ اگر وہ راضی ہوتی ہیں تو میں کل سے ہی تمہاری ٹریننگ شروع کرواتا ہوں۔‘‘

لیلیٰ جانتی تھی کہ ماں کو راضی کرنا آسان نہ ہوگا اس لیے اس نے تھوڑا سا جھوٹ بولنا مناسب سمجھا۔ وہ رونی صورت بنائے گھر میں داخل ہوئی اور کھانا کھائے بغیر منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ ماں نے پوچھا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’میری جاب ختم ہوگئی ہے۔‘‘

ماں کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ اپنا سینہ دباتے ہوئے بولی۔ ’’کیوں؟‘‘

’’ایک لڑکی چھٹی پر گئی ہوئی تھی، انہوں نے اس کی جگہ مجھے رکھ لیا تھا۔ اب وہ واپس آگئی ہے تو میں فارغ ہوگئی۔‘‘

’’یہ تو بہت بُرا ہوا بیٹی۔‘‘ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اب گزارہ کیسے ہوگا لیکن بیٹی کی اداس صورت دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

لیلیٰ نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بولی۔ ’’امی! آپ پریشان نہ ہوں۔ ایک در بند ہوتا ہے تو سو در کھل جاتے ہیں۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے بیٹی لیکن نہ جانے تمہیں دوسری ملازمت کب ملے۔‘‘

’’باس نے مجھے ایک آفر کی ہے لیکن اس کے لیے آپ کی اجازت ضروری ہے۔‘‘

’’کیسی آفر؟ کیا کام کرنا ہوگا؟‘‘ وہ چونکتے ہوئے بولی۔

لیلیٰ نے ہمت کرکے االفاظ جمع کیے اور آہستہ سے

http://digestpk.blogspot.com/

بولی۔ ''باس کا خیال ہے کہ میں ماڈلنگ کے لیے نہایت موزوں ہوں اور اگر اس فیلڈ میں آجاؤں تو بہت کامیاب ہو سکتی ہوں۔''

ماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے اپنی بیٹی کی زبان سے ایسے الفاظ بھی سننے کو ملیں گے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر غضب ناک لہجے میں بولی۔ ''آج تو تم نے منہ پھاڑ کر اتنی بڑی بات کہہ دی ہے، آئندہ اس بارے میں کچھ سننا پسند نہیں کروں گی۔ کم از کم میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو، جو چاہو کرنا۔''

لیلیٰ کو اس ردِعمل کی توقع نہ تھی۔ اس بارے میں مزید کچھ کہنے سے ماں اور زیادہ مشتعل ہو سکتی تھی اس لیے فی الحال خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ ماں نے کھانے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ لیلیٰ اسی طرح منہ لپیٹے پڑی رہی۔ رات کو سونے سے پہلے ماں نے ایک بار پھر کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس بار ماں کو ہتھیار ڈالنا پڑ گئے۔ وہ پیار سے بولی۔ ''اچھا! تم پہلے کھانا کھالو پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔''

لیلیٰ یہ سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے خود ہی کچن میں جا کر کھانا نکالا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چائے بنائی اور ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''اب بتائیں... آپ کو میرے ماڈل بننے پر کیا اعتراض ہے؟''

''میری بات چھوڑو، لوگ کیا کہیں گے؟ ویسے بھی اچھا نہیں لگتا کہ تم اشتہاروں میں آؤ، گھر گھر تمہارا چہرہ ٹی وی پر دیکھا جائے... بازاروں میں تمہارے پوسٹرز لگیں اور لوگ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائیں۔''

''امی! آپ کیا سمجھتی ہیں، کیا لوگ اب میرا چہرہ نہیں دیکھتے؟ بس اسٹاپ پر کھڑا ہونا دوبھر ہو جاتا ہے... پھر بس میں، دفتر میں، بازاروں میں ہر جگہ ایسی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اور آپ کن لوگوں کی پروا کر رہی ہیں؟ جنہوں نے ابا کے انتقال کے بعد پلٹ کر نہیں پوچھا کہ ہم کس حال میں ہیں... اور یہ محلے والے... ان میں سے کوئی کبھی ہمارے گھر آکر جھانکتا ہے؟ کسی نے کبھی یہ جاننے کی زحمت گوارا کی کہ ہمارا گزارہ کیسے ہو رہا ہے؟ آپ ان لوگوں سے ڈر رہی ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو ہم یہ محلہ ہی چھوڑ دیں گے۔ ایسی جگہ گھر لیں گے جہاں ہمیں کوئی نہ جانتا ہو۔ ذرا سوچیں، کل کو جب خدانخواستہ ہمارے گھر میں فاقے ہو رہے ہوں گے تو کیا یہ لوگ ہمارے منہ میں نوالہ ڈالنے آئیں گے؟''

ماں کے پاس ان باتوں کا جواب نہ تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی پھر ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے بیٹی، جیسے تمہاری مرضی لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو...''

لیلیٰ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''میں کوئی وعدہ نہیں کروں گی۔ آپ کو مجھ پر اعتماد ہونا چاہیے۔ جان دے سکتی ہوں لیکن اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔''

دوسرے دن سے لیلیٰ کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ پہلے اسے مشہور ماڈلز کے اشتہارات دکھائے گئے۔ پھر اس کا اسکرین ٹیسٹ لیا گیا۔ کری ایٹو ہیڈ یزدانی براہِ راست اس ٹریننگ کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ اس کی جوہر شناس نظروں نے پہلی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ یہ لڑکی ماڈلنگ کی دنیا میں تہلکہ مچا دے گی۔ ارشد خاں نے اسے لیلیٰ کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے بارے میں بتا دیا تھا اسی لیے یزدانی اس پر جی جان سے محنت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار لیلیٰ کلک کر گئی تو ان کی ایجنسی کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ لیلیٰ کے لباس، میک اپ، اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے پر خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ ایک ماہ بعد اسے پہلے کلائنٹ سے متعارف کروایا گیا۔ گو کہ یہ ایک رسمی سی کارروائی تھی لیکن کلائنٹ کی مرضی اور منشا کے بغیر ایجنسی والے اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔

لیلیٰ کے پہلے اشتہار نے ہی تہلکہ مچا دیا۔ کلائنٹ کو یہ اشتہار اتنا پسند آیا کہ اس نے پوری کمپین کے لیے لیلیٰ کو منتخب کر لیا۔ وہ صرف ٹی وی کمرشل میں ہی نہیں بلکہ میگزین، ہورڈنگز اور پوسٹرز کے لیے بھی اس پروڈکٹ کی ماڈلنگ کرتی۔ ارشد خاں اور یزدانی بہت خوش تھے۔ لیلیٰ کی وجہ سے انہیں پورے سال کا کنٹریکٹ مل گیا تھا۔ کلائنٹ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کی دوسری پروڈکٹس کے لیے بھی لیلیٰ کو ہی منتخب کیا جائے۔ پہلی کمپین میں ہی لیلیٰ کو معاوضے کے طور پر ٹھیک ٹھاک رقم مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی یزدانی نے اسے تین اور پروڈکٹس کے لیے بھی سائن کر لیا۔ لیلیٰ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ حالات اتنی جلدی بدل جائیں گے لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

وہ لوگ جنہوں نے کبھی ان کی خبر گیری نہیں کی تھی، اچانک ہی شرافت کے ٹھیکے دار بن کر اس کے سامنے آگئے۔ ایک روز وہ شوٹنگ سے فارغ ہو کر گھر پہنچی ہی تھی کہ

دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں نے دروازہ کھولا تو تین مردوں کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ ان میں سے ایک باریش شخص بولا۔ ''اگر گھر میں کوئی مرد ہو تو انہیں بلا دیں۔''

ماں نے کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس گھر میں ہم ماں بیٹی کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہیں ہے۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے، وہ مجھ سے کہیں۔''

''دیکھیں بہن جی! یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ یہاں یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔'' ایک اور شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ کھل کر بات کریں۔'' ماں نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سن کر لیلیٰ بھی دروازے پر آگئی۔ اسے دیکھ کر وہی آدمی بولا۔ ''آپ کی بیٹی نے جو گل کھلایا ہے، اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کا اثر دوسری لڑکیوں پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ یہ محلہ چھوڑ دیں۔''

اس سے پہلے کہ ماں کچھ کہتی، لیلیٰ آگے آگئی اور بولی۔ ''اگر ہم آپ کی بات نہ مانیں تو؟''

''تو پھر سنگین نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔'' وہی آدمی سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

''ہمیں سنگین نتائج کی دھمکی دینے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں۔ کچا چٹھا کھول دوں تو مجھ سے پہلے آپ یہ محلہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

لیلیٰ نے تو ہوا میں تیر چلایا تھا لیکن وہ نشانے پر جا لگا۔ وہ شخص اتنا بوکھلایا کہ اس کی زبان ہی بند ہو گئی اور وہ رحم طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اب تیسرے کی باری تھی۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''ہم یہاں کوئی بحث مباحثہ کرنے نہیں آئے۔ جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ آپ کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد یہ محلہ چھوڑ دیں۔''

لیلیٰ کو بھی تاؤ آگیا اور وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''آپ لوگ کان کھول کر سن لیں کہ ہم یہ محلہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہے۔ اگر آئندہ کسی نے ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تو میں اس کے خلاف مداخلت بے جا کا پرچہ کٹوا دوں گی۔ ایک رات حوالات میں رہنا پڑ گیا تو ساری چودھراہٹ دھری رہ جائے گی۔''

ان لوگوں کو اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اکیلی عورتیں ایک ہی دھمکی میں ڈر جائیں گی لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس نکلا، چنانچہ ان میں سے ایک اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے بولا۔ ''چلو بھائیو! یہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔ اس کے لیے ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔''

''ہاں ہاں... خوب اچھی طرح سوچ بچار کیجیے اور اگر کوئی حل سمجھ میں آجائے تو مجھے بھی بتا دیں۔ دیکھتی ہوں آپ لوگ کتنے پانی میں ہیں۔'' لیلیٰ نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا۔

وہ تینوں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ماں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''کیا ضرورت تھی ان لوگوں کے منہ لگنے کی؟ اب نہ جانے وہ کیا قدم اٹھائیں۔''

''پھر کیا کرتی، ان کے قدموں میں سر رکھ کر گڑگڑاتی؟ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر فریاد کرتی کہ ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دو... دوسرا مکان ملتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ امی! آپ نہیں جانتیں، یہ لوگ ہمیں بلیک میل کرنے آئے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ آج اس کا بھتا باندھ دوں تو وہی ہمارا سب سے بڑا محافظ بن جائے گا۔''

''تم کچھ بھی کہو لیکن مجھے اس بات کا ڈر تھا۔'' ماں رسان سے بولی۔ ''اب یہ لوگ ہمیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فساد کھڑا ہوتا رہے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم دوسرے علاقے میں مکان دیکھ لیں۔''

لیلیٰ نے سوچا کہ ماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اس وقت تو اس نے تھوڑی سی ہمت دکھا کر انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن یہ سلسلہ رکنے والا نہیں تھا۔ وہ کوئی بھی الزام لگا کر پولیس کو کارروائی کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ ایک بار پولیس ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیتی تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ وہ خود بھی کسی اچھے علاقے میں شفٹ ہونا چاہ رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ پہلے اپنے آپ کو تھوڑا سا اسٹیبلش کر لے لیکن اب تاخیر سے کوئی فائدہ نہیں تھا، جو کام کل کرنا ہے، وہ آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔

دوسرے دن ہی اس نے ارشد خاں کے سامنے یہ مسئلہ رکھ دیا۔ انہوں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور وعدہ کیا کہ وہ دو تین روز میں اس کے لیے کسی اچھے علاقے میں رہائش کا بندوبست کر دیں گے۔ ان کے کلائنٹس میں کئی بلڈرز بھی تھے اسی لیے وہ چاہ رہے تھے کہ لیلیٰ کرائے کے مکان میں جانے کے بجائے اپنا فلیٹ بک کروا لے جس کی ادائیگی اقساط میں ہوتی رہتی لیکن لیلیٰ اتنا بڑا رسک لینے پر تیار نہ ہوئی۔ جب تک اس کے پاس ایک معقول رقم جمع نہ ہو

http://digestpk.blogspot.com/

جاتی، وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر اسٹیٹ ایجنٹ کے توسط سے اسے گلستانِ جوہر میں ایک فلیٹ معقول کرائے پر مل گیا۔ ارشد خاں نے دفتر کے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ شفٹنگ میں لیلیٰ کی مدد کریں۔ جس دن وہ گلستانِ جوہر شفٹ ہو رہے تھے، اسی روز اسے دو خبریں ملیں۔ خالہ زبیدہ کا خط آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو پاکستان آنے کے لیے تیار کر رہی ہیں۔ اگر وہ راضی ہو گئے تو وہ لوگ بہت جلد وطن واپس آجائیں گے۔ خالہ زبیدہ کو جاپان گئے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا لیکن بہن سے ان کی خط و کتابت جاری تھی۔ لیلیٰ کو اپنی ماں کی زبانی ان کے حالات کا علم ہوا تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے لیلیٰ کو بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ خالہ اور ان کے شوہر کبھی پاکستان واپس آسکیں گے۔

دوسری خبر اسے نجمہ کے بارے میں ملی۔ اس کی شادی عامر سے طے ہو گئی تھی۔ ارشد خاں نے بیٹے کو اس بے جوڑ رشتے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن عامر اپنی محبت میں سچا تھا۔ اس لیے جیت اسی کی ہوئی۔ لیلیٰ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ خوشی خوشی نجمہ کو مبارک باد دینے اس کے گھر پہنچ گئی۔ اس کے گھر کی حالت دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا۔ نجمہ کی ماں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہوگا؟ ہمارے پاس تو مہمانوں کو بٹھانے کے لیے چار کرسیاں بھی نہیں ہیں۔“

لیلیٰ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”خالہ! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ بیٹی اتنے بڑے گھر میں جا رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔“

نجمہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہی ہیں جبکہ عامر نے کہہ دیا ہے کہ اسے جہیز وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شادی کی سب تیاری بھی وہی لوگ کر رہے ہیں۔“

نجمہ کی ماں نے کہا۔ ”یہ سب رسمی باتیں ہیں۔ لڑکی جہیز لے کر نہ جائے تو سسرال والے اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔“

”وہ ایسے لوگ نہیں ہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ لیلیٰ نے کہا۔ ”آپ اپنی حیثیت اور سہولت کے مطابق تیاری کریں، باقی سب اللہ پر چھوڑ دیں۔“

اس طرح کی دو چار باتیں کرنے کے بعد لیلیٰ وہاں سے چلی آئی۔ آتے وقت اس نے چپکے سے نجمہ کے کان میں کہہ دیا تھا کہ وہ بالکل بے فکر ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

وہ لوگ بڑی خاموشی سے اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ چلتے وقت اس نے مالک مکان کو گھر کی چابی دی اور اس سے حساب کتاب کرنے کے بعد اس گھر پر ایک الوداعی نظر ڈالی جہاں وہ پیدا ہوئی، پلی بڑھی... بچپن سے جوانی کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔ اسی گھر میں اس نے باپ سے جدائی کا صدمہ برداشت کیا اور اسی گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے سماج کے ٹھیکے داروں کی جانب سے پھینکے گئے پتھر کا وار سہا۔ زندگی پل پل بدلتے ہوئے رنگوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک رنگ یہ بھی تھا۔

ماڈل کی حیثیت سے لیلیٰ کے کیریئر کا گراف بڑی تیزی سے اوپر کی جانب جا رہا تھا۔ اس کی شہرت اور مقبولیت سے متاثر ہو کر دوسری ایڈورٹائزنگ کمپنیوں نے اسے پُرکشش پیشکش کی لیکن اس نے بڑی خوب صورتی سے ہر ایک کو ٹال دیا۔ پھر اس کی زندگی میں ایک اور اہم موڑ آیا جب ملک کے ایک نامی گرامی پروڈکشن ہاؤس کی جانب سے اسے ٹی وی سیریل میں ایکٹنگ کی پیشکش ہوئی۔ لیلیٰ نے حسبِ عادت انہیں بھی انکار کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ وہ اداکاری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے لیکن وہ لوگ اس کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جب لیلیٰ نے ماڈلنگ شروع کی تو وہ اس کے بارے میں کیا جانتی تھی۔ اس دلیل کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا لہٰذا اس نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ اسے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔

اس نے سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کے ذہن میں نئے نئے خیالات آتے چلے گئے۔ ایک ماڈل کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ تین چار سال... پھر لوگ کسی نئے چہرے کے گرد پروانوں کی طرح منڈلانے لگتے ہیں۔ اداکارہ کا کیریئر آٹھ دس سال تک چل سکتا ہے... پھر وہ کیوں خود .... کو ایک فیلڈ تک محدود رکھے؟ کیوں نہ دونوں کام ساتھ ساتھ کرے تاکہ ایک طرف سے مندی ہو تو دوسری جانب سے گزارہ ہوتا رہے۔ اس نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

دوسرے دن اس نے ارشد خاں کو اس پیشکش کے بارے میں بتا دیا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے انہیں اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ ارشد خاں نے اسے یاد دلایا کہ معاہدے کی رو سے دو سال تک وہ کسی دوسری جگہ کام نہ کرنے کی پابند ہے۔ لیلیٰ کے پاس اس اعتراض کا جواب

پہلے سے موجود تھا۔ اس نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”سر! وہ شرط ماڈلنگ کے لیے ہے۔ اداکاری کے لیے اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ معاہدے میں لکھا ہے کہ میں دو سال تک کسی دوسری ایجنسی کے لیے ماڈلنگ نہیں کروں گی۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ میں ماڈلنگ کے علاوہ کوئی بھی کام کہیں بھی کر سکتی ہوں۔“

ارشد خاں کے پاس اس منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے اس شرط کے ساتھ اسے ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کی اجازت دے دی کہ اس کی وجہ سے اس کا ماڈلنگ کا کام متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ لیلیٰ نے وعدہ کیا کہ وہ ہر حال میں ان کے کام کو ترجیح دے گی۔ اس نے پروڈکشن ہاؤس والوں کے سامنے بھی یہی شرط رکھی کہ جس روز اس کا ماڈلنگ اسائنمنٹ ہوگا، اس دن وہ ڈرامے کی شوٹنگ نہیں کرے گی۔ اس کی یہ شرط مان لی گئی اور اسے ڈرامے کی ہیروئن کے طور پر کاسٹ کر لیا گیا۔

اب لیلیٰ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ ماڈل کے طور پر اسے اتنی زیادہ پبلسٹی نہیں ملی تھی لیکن اداکارہ بنتے ہی وہ میڈیا کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ پروڈکشن ہاؤس نے سیریل کی لانچنگ کی تقریب ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں رکھی تھی، جہاں ٹی وی اور اخباری رپورٹروں اور فوٹو گرافرز کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس سیریل میں بھی پرانے اداکار تھے جنہیں میڈیا کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ صرف وہی نئی اداکارہ تھی اور اسی لیے ساری نظریں اس پر فوکس ہو گئی تھیں۔ تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کی باری بھی آئی۔ اس کے لیے مائک پر بولنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ دو چار رسمی جملے ادا کیے پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہی گھسے پٹے سوال جو وہ ہمیشہ سے فلمی رسالوں میں پڑھتی آئی تھی۔ آپ کو ایکٹنگ کا خیال کیسے آیا؟ کیا آپ بچپن سے ہی اداکارہ بننا چاہتی تھیں؟ آپ کس اداکارہ سے متاثر ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ منتظر ہی رہی کہ اس سے کوئی دلچسپ اور منفرد سوال پوچھا جائے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ کئی رپورٹرز نے اس سے انٹرویو کے لیے وقت مانگا لیکن اس نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب تک سیریل کی پانچ چھ قسطیں نشر نہیں ہو جاتیں اور لوگ اس کا کام نہیں دیکھ لیتے، وہ انٹرویو نہیں دے گی۔

اس ہفتے تقریباً سبھی اخبارات کے فلمی ایڈیشن پر اس کی رنگین تصاویر شائع ہوئیں۔ کچھ لوگوں نے اسے ٹی وی انڈسٹری میں ہوا کا تازہ جھونکا قرار دیا تو کچھ کو یہ شکایت تھی کہ اس نئی نویلی اداکارہ نے ابھی سے نخرے دکھانے شروع کر دیے اور صحافیوں کو انٹرویو دینے سے انکار کر دیا۔ چند ایک نے تو اسے یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ صحافیوں سے اچھے تعلقات بنا کر رکھے ورنہ یہ رویّہ اس کے کیریئر کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیلیٰ ان خبروں اور تبصروں سے بہت محظوظ ہوئی لیکن خود اس نے کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسے پروڈکشن ہاؤس کی جانب سے اس بارے میں محتاط رویّہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

سیریل کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی تھی۔ اسے کنٹریکٹ کے مطابق ایک معقول رقم ایڈوانس کے طور پر ادا کر دی گئی۔ وہ بڑی محنت اور دل جمعی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ سیٹ پر اپنی لائنیں یاد کر کے آتی۔ شاٹ دینے سے پہلے ایک یا دو

پڑوسن

پوسٹ مین نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ جواب میں ایک خوبرو خاتون نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

”بیگم تاج محمد آنسو کے نام ایک پارسل آیا ہے۔“

”پارسل تحفے والے خوشنما کاغذ میں لپٹا ہوا ہے یا معمولی کاغذ میں...؟“

”معمولی، بادامی کاغذ میں!“

”کس نے بھیجا ہے؟“

”مسز بشیر خیری نے۔“

”کہاں سے بھیجا ہے؟“

”سکھر، سندھ سے۔“

”پارسل میں کیا ہے؟“

”مجھے علم نہیں محترمہ۔“ پوسٹ مین نے زچ ہو کر کہا۔ ”دستخط کر کے پارسل وصول کیجیے اور خود ملاحظہ فرما لیجیے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں یہ پارسل وصول نہیں کر سکوں گی۔“

”کیوں...؟“

”کیونکہ بیگم تاج محمد آنسو سامنے والے گھر میں رہتی ہیں۔ میں تو ان کی پڑوسن ہوں۔“

پشاور سے حنا عزیز

http://digestpk.blogspot.com/

ریہرسل ضرور کرتی اور پورے اعتماد کے ساتھ کیمرے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی لائنیں بولتی۔ یونٹ کے بھی لوگ اس کے کام سے مطمئن تھے۔ ابھی اس کے ڈرامے کی آدھی ریکارڈنگ مکمل ہوئی تھی کہ اسے مزید دو سیریلز میں کام کرنے کی آفر ہوگئی۔ لیلیٰ چاہتی تھی کہ پہلے ایک سیریل مکمل ہو جائے، اس کے بعد دوسرے کام میں ہاتھ ڈالے لیکن اس کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ گھر آئی لکشمی کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔ ایک اداکارہ کے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ کام کر کے اپنے آپ کو مالی لحاظ سے مستحکم کرلینا چاہیے۔

ان مشورہ دینے والوں میں طاہر پیش پیش تھا۔ کہنے کو تو وہ سیریل میں سائڈ ہیرو کے طور پر کام کر رہا تھا لیکن اس کے علاوہ بھی وہ یونٹ کے لوگوں اور پروڈکشن ہاؤس کے کئی کام کرتا رہتا تھا۔ اسی لیے لوگ اسے ”آپ کا مخلص“ کے نام سے پکارتے تھے۔ کسی کام کے لیے انکار کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ لیلیٰ پر وہ کچھ زیادہ ہی مہربان تھا۔ شاید ایک نئی اداکارہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کا زیادہ خیال رکھتا اور بِنا کہے اس کے بہت سے کام کر دیا کرتا تھا۔ جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ لیلیٰ کو مزید دو سیریلز میں کام کرنے کی آفر ہوئی ہے تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ بلا تاخیر یہ سیریلز سائن کرلے۔ اس نے یہ گُر کی بات بھی بتائی کہ آج کے دور میں کامیاب اداکار اور اداکارہ اسے سمجھا جاتا ہے جس کے پاس زیادہ سے زیادہ کام ہو۔ گویا معیار کے مقابلے میں مقدار کو کامیابی کی پہچان سمجھ لیا گیا ہے۔ لیلیٰ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے طاہر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے دونوں سیریلز سائن کر لیے۔

لیلیٰ کے بینک بیلنس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک سال کے دوران اس کی چار سیریلز آن ایئر ہو چکی تھیں جبکہ چار تکمیل کے مختلف مراحل میں تھیں اور دو سیریلز کی بات چل رہی تھی۔ ہر سہ ماہی میں کسی نہ کسی چینل سے اس کی نئی سیریل ضرور شروع ہوتی۔ اس نے گاڑی بھی خرید لی تھی۔ وہ ہر کام طاہر کے مشورے سے کرتی۔ گاڑی کی رجسٹریشن سے لے کر ڈرائیونگ لائسنس بنوانے تک ہر مرحلے میں طاہر نے اس کی مدد کی۔ وہ بہت تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔ اس کے باوجود لیلیٰ کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ لوگوں کے سامنے طاہر سے زیادہ بے تکلف نہ ہو اور نہ ہی اس سے کسی کام کے لیے کہے کیونکہ شوبزنس کی دنیا میں بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی جرنلسٹ ان دونوں کو سیٹ سے باہر ملتے دیکھ لیتا تو فوراً ہی ایک اسٹوری مارکیٹ میں آجاتی۔ اس لیے وہ دونوں فون پر ہی اپنے تمام معاملات ڈسکس کیا کرتے تھے۔

دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ ارشد خاں کے ساتھ اس کا معاہدہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کسی دوسری ایجنسی کے ساتھ کام کرنے کے لیے آزاد تھی لیکن اس نے ارشد خاں کی ایجنسی سے اپنا تعلق برقرار رکھا اور کسی دوسری ایجنسی کے لیے کام کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی کیونکہ وہ انہیں اپنا محسن سمجھتی تھی اور انہی کی بدولت اس مقام تک پہنچی تھی۔ عامر نے بھی شادی کے بعد باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ نجمہ ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن چکی تھی اور لیلیٰ پر بھی زور دے رہی تھی کہ وہ شادی کرلے لیکن لیلیٰ کے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے بھی فرصت نہ تھی۔

ایک دن وہ شوٹنگ کے دوران ہونے والے وقفے میں سیٹ پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ اس کی نظر ایک سرخی پر جم گئی۔ ”اپنے وقت کی نامور اداکارہ کے پاس کوئی کام نہیں۔“ اس نے خبر کو غور سے پڑھا اور جھرجھری لے کر رہ گئی۔ خبر کے مطابق ماضی کی ایک مقبول اداکارہ ان دنوں بے کاری کے دن گزار رہی تھی۔ کسی زمانے میں پروڈیوسرز اس کے دروازے پر قطار لگائے بیٹھے ہوتے تھے اور آج وہ کام حاصل کرنے کے لیے پروڈیوسرز کے دفتروں کے چکر لگا رہی تھی لیکن ڈھلتی عمر کے باعث کوئی اسے کام دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ خبر پڑھ کر لیلیٰ کے دل میں اس اداکارہ کے لیے ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے۔ اس نے اخبار طاہر کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ”تم نے یہ خبر پڑھی؟ بے چاری بہت پریشان ہے۔“

”ہاں۔“ طاہر سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”دراصل اس طرح کے لوگ مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے۔ سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اسی طرح پیسا آتا رہے گا۔ اب دیکھ لو، کام کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ ویسے بائی دی وے، تم اپنی سیونگ کہاں انویسٹ کرتی ہو؟“

”کہیں نہیں۔ دراصل پہلے مجھے مکان بنانا ہے۔ اس کے لیے پیسے جمع کر رہی ہوں۔ مکان ہو جائے تو پھر سوچوں گی۔“

”کوئی ایسا کام کیوں نہیں کرتیں جس سے تمہاری آمدنی میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل بھی محفوظ ہو جائے۔“

”مثلاً؟“ وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

”مثلاً یہ کہ تم اپنا پروڈکشن ہاؤس کھول لو۔ ڈرامے

بناؤ... بیچو اور اپنے پیسے کھرے کرلو۔ یہ ایسا کام ہے جو تم ایکٹنگ سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہو۔ شمیم آرا اور سنگیتا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ ٹی وی کی کئی اداکاراؤں نے اپنے پروڈکشن ہاؤس کھول رکھے ہیں۔“

”آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اس کے لیے سرمایہ چاہیے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔“

”تم سے کون کہہ رہا ہے کہ اپنے پیسے لگاؤ۔ تمہارا تو صرف نام ہوگا۔ فنانسر دوسرے ہوں گے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ سارے نامی گرامی پروڈیوسرز دوسروں کے پیسے پر کھیل رہے ہیں۔“

لیلیٰ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ میرے کاروبار میں پیسا لگائے گا؟ اس کے بجائے وہ خود اپنا پروڈکشن ہاؤس شروع کرسکتا ہے۔“

”صرف پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اس کام کے لیے تجربے اور صلاحیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس یہ دونوں خصوصیات ہیں۔ اس لیے تمہارے نام پر پیسا لگانے میں کسی کو کوئی تکلف نہیں ہوگا۔“

”نہ بابا! یہ میرے بس کا روگ نہیں۔“ لیلیٰ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ”پروڈکشن میں سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ میں کہاں کہاں بھاگتی پھروں گی۔“

”تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ ہر کام کے لیے مارکیٹ میں لوگ موجود ہیں۔ تمہیں صرف ان کی نگرانی کرنا ہوگی۔ اگر اپنے مستقبل کو محفوظ بنانا چاہتی ہو تو فوراً یہ کام شروع کر دو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

فنانسر تلاش کرنے اور سیریل کی مارکیٹنگ کی ذمے داری طاہر نے سنبھال لی۔ لیلیٰ نے ایک معروف رائٹر سے اسکرپٹ لکھوایا۔ مرکزی کرداروں کے لیے دو تین مشہور ایکٹرز سے بات کی اور لیلیٰ پروڈکشنز کے نام سے اپنا ذاتی ادارہ قائم کرلیا۔ پہلی سیریل کی لانچنگ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی اور اسی شام نہ صرف فنانسر سے معاہدہ ہو گیا بلکہ ایک بڑے چینل نے بھی پرائم ٹائم کے لیے وہ سیریل خرید لی۔ لیلیٰ کو یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ جس کام کو وہ بے حد مشکل سمجھ رہی تھی، وہ اتنی آسانی سے ہو گیا۔ شاید وہ اپنے نام کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں تھی۔ یہ صرف طاہر جانتا تھا کہ لیلیٰ کے نام کو کس طرح کیش کروایا جا سکتا ہے۔ اس کے نام کو استعمال کر کے اس نے فنانسر کو شیشے میں اتارا اور جب سیریل لانچ ہوگئی تو چینل والے بھی اس جانب دوڑ پڑے۔

طاہر نے لیلیٰ کو سمجھا دیا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو، وہ سیریل مکمل کر کے چینل کے حوالے کر دے تاکہ اس کی ساکھ بنی رہے اور پروجیکٹ میں لگا ہوا سرمایہ بھی جلد واپس آجائے۔ لیلیٰ نے ایک ذہین ڈائریکٹر کا انتخاب کیا اور شوٹنگ شروع ہوئی۔ اس نے تمام ایکٹرز سے دو ماہ کی تاریخیں لے لی تھیں اور بلاناغہ کام ہو رہا تھا۔ لیلیٰ کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی لیکن وہ پوری تن دہی سے کام کر رہی تھی کیونکہ اس سیریل کی کامیابی سے ہی اس کا مستقبل وابستہ تھا۔

لیلیٰ نے ریکارڈ ٹائم میں کام مکمل کیا تو مارکیٹ میں اس کی دھوم مچ گئی۔ ہر بڑے چینل کی خواہش تھی کہ لیلیٰ ان کے لیے کام کرے۔ فنانسر بھی خوش تھا۔ اسے اتنے کم وقت میں بھاری منافع کی توقع نہ تھی۔ اس نے لیلیٰ سے کہہ دیا کہ اگر وہ کوئی بڑے بجٹ کا پروجیکٹ شروع کرنا چاہے تو وہ اس کے لیے بھی سرمایہ فراہم کرسکتا ہے۔ لیلیٰ نے پہلی سیریل مکمل ہوتے ہی دوسری سیریل شروع کر دی۔ اس نے اپنا آفس بھی بنا لیا تھا جہاں وہ کام سے فارغ ہو کر پروڈکشن کے معاملات دیکھتی۔ ایک دن وہ دفتر میں بیٹھی حساب کتاب کر رہی تھی کہ اچانک ہی اسے ایک خیال آیا۔ اس نے طاہر کو فون کر کے دفتر پہنچنے کی ہدایت کی۔ اس کے آنے پر لیلیٰ نے اپنی دراز سے چیک بک نکالی... اور بلینک چیک سائن کر کے طاہر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میری اس کامیابی میں تمہارا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ سچ پوچھو تو سب کچھ تم نے ہی کیا ہے۔ میرا تو صرف نام ہی استعمال ہوا ہے۔ تم تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہو گے اور تمہارے خلوص کا تو کوئی مول نہیں ہوسکتا لیکن تمہاری محنت کا صلہ ضرور ملنا چاہیے۔ یہ چیک لے لو۔ اس میں تم اپنی مرضی سے جو چاہو، رقم لکھ لو۔“

طاہر نے وہ چیک پھاڑ دیا اور بولا۔ ”دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔ ان کے بیچ پیسا آجائے تو دوستی بھی کاروبار میں بدل جاتی ہے... اور میں صرف تمہارا دوست رہنا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہاری دوستی کی قدر کرتی ہوں لیکن کسی کا حق مارنا میری فطرت میں شامل نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک مجھ سے لاکھوں روپے بٹور چکا ہوتا۔ اسی لیے میں چاہ رہی تھی کہ اس منافع میں تمہیں بھی شریک کرلوں۔“

”تم مجھے اپنی خوشیوں میں شامل رکھو، میرے لیے یہی بہت ہے۔ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔“ طاہر

http://digestpk.blogspot.com/

نے قدرے ناگواری سے کہا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی دیر تک طاہر کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے دل میں طاہر کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی حالانکہ وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے اس چیک میں ایک معقول رقم لکھ سکتا تھا لیکن اس نے منافع میں سے اپنا حصہ نہ لے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کی دوستی میں کوئی غرض شامل نہیں۔ بلاشبہ وہ ایک سچا اور مخلص دوست تھا جس نے شروع سے لے کر اب تک لیلیٰ کی بے لوث مدد کی تھی۔ اسی کے مشوروں کی بدولت لیلیٰ اپنے کیریئر کے کامیاب ترین دور میں داخل ہو چکی تھی اور مزید کامیابیاں اس کی راہ دیکھ رہی تھیں... لیکن کیا وہ صرف ایک دوست ہی تھا؟ لیلیٰ نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں اس کے لیے کوئی جذبہ محسوس نہ ہوا۔ کورے کاغذ کی طرح اس کا دل بھی سپاٹ اور بے رنگ تھا جس پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ خود طاہر نے بھی اشاروں کنایوں میں کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ لیلیٰ کو کسی اور نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ویسے بھی اس کی شخصیت میں کوئی ایسی جاذبیت نہ تھی جو لیلیٰ جیسی لڑکی کو اپنی جانب متوجہ کرتی۔ وہ عام شکل و صورت کا بندہ تھا اور عمر میں بھی لیلیٰ سے کم از کم دس سال زیادہ ہوگا۔ اگر وہ لیلیٰ کا ساتھی نہ ہوتا تو شاید وہ اس کی جانب دیکھنا بھی پسند نہ کرتی۔

دوسری سیریل مکمل ہوتے ہی لیلیٰ نے گلستانِ جوہر میں دو سو چالیس گز کا بنگلا خرید لیا۔ طاہر کا خیال تھا کہ وہ ڈیفنس یا کلفٹن میں شفٹ ہو جائے لیکن لیلیٰ اونچی چھلانگ مارنے کی عادی نہ تھی کیونکہ اس میں بعض اوقات منہ کے بل گرنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ بنگلا بھی کسی محل سے کم نہیں تھا۔ اسے اس نے اپنی مرضی کے مطابق سجایا۔ گھر کے کاموں کے لیے اس نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی جس کی وجہ سے ماں کو بھی آرام مل گیا تھا۔ اس طرف سے فارغ ہونے کے بعد لیلیٰ کی توجہ مکمل طور پر کام کی طرف ہو گئی۔ وہ لگاتار ایک کے بعد دوسری سیریل پروڈیوس کر رہی تھی اور دوسرے پروڈیوسرز کے ڈراموں میں بھی کام کر رہی تھی۔ اسے شوبزنس میں آئے سات سال ہو چکے تھے۔ اس کی عمر پچیس سال ہو گئی تھی اور اس کی ماں کی شدید خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد گھر بسا لے۔

☆☆☆

”اس اتوار کو تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں؟“ ماں نے ناشتے کی میز پر اس کے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

”نہیں لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”اس لیے کہ تمہاری خالہ ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلانا چاہتی ہیں۔ اصولاً تو یہ دعوت ہماری طرف سے ہونی چاہیے تھی لیکن وہ پہل کر گئیں۔“

”ٹھیک ہے چلیں گے۔“ اس نے گھڑی دیکھی اور اپنا بیگ اٹھا کر شوٹنگ کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں وہ خالہ زبیدہ اور اشعر کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ اس نے ساری زندگی کسی رشتے دار کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خالہ، ماموں، چچا اور پھوپی وغیرہ کیسے ہوتے ہیں۔ اس کی ننھیال میں خالہ زبیدہ کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی پرائے دیس جا بسی تھیں۔ ابّا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اس لیے چچا، پھوپی کا خانہ خالی تھا۔ ابّا کی زندگی میں ان کا کوئی دور پرے کا کزن ملنے چلا آتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اپنی کم مائیگی کے سبب وہ لوگ خاندان میں ہونے والی شادیوں میں بھی بہت کم جاتے تھے۔ اس لیے خالہ زبیدہ کی آمد اس کے لیے ایک انوکھی بات تھی۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی رشتے دار نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ کالج میں لڑکیاں جب اپنے کزنز کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتیں تو وہ شدید قسم کے احساسِ محرومی میں مبتلا ہو جاتی۔ اب خالہ اور اشعر کے آنے کے بعد اس کی یہ محرومی دور ہو گئی تھی۔ اسی لیے جب طاہر اس کے سامنے آیا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے خالہ زبیدہ کی پوری کہانی اس کے سامنے بیان کر دی۔ طاہر بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر بولا۔ ”واؤ... یہ تو بڑی زبردست اسٹوری ہے۔ اس پر ایک شان دار سیریل بن سکتی ہے۔“

”لیکن اس کی شوٹنگ کے لیے ہمیں جاپان جانا ہوگا جو میں افورڈ نہیں کر سکتی۔“

”اگر تم ہمت کرو تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔“ طاہر نے کہا۔

”چھوڑو یار... لمبا چکر ہے۔ ہمارا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے پھر ہمیں یہ بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت ہے۔“

طاہر خاموش ہو گیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اسی کہانی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

☆☆☆

خالہ زبیدہ کے گھر جانے کے لیے اس نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ویسے تو وہ عام زندگی میں بہت سادہ رہا کرتی تھی اور میک اپ بھی ضرورت کے تحت کرتی تھی لیکن نہ

جانے اس روز لاشعور میں چھپے کس جذبے کے تحت اس نے خصوصی طور پر اتنی تیاری کی۔ اس کی واڈروب جدید قسم کے قیمتی ملبوسات سے بھری پڑی تھی۔ وہ اپنی مسہری پر ان کپڑوں کو پھیلائے سوچ رہی تھی کہ اس موقع کے لیے کون سا لباس مناسب رہے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک سفید سلک کے سوٹ کا انتخاب کیا جو اس نے اپنی سیریل کے ایک سین میں ہیرو سے پہلی ملاقات کے دوران پہنا تھا۔ وہ ایک ڈریم سیکوئنس تھا اور دیکھنے والوں نے اس سین میں لیلیٰ کی پرفارمنس کی بہت تعریف کی تھی۔ اس لباس کے ساتھ اس نے سفید موتیوں کی مالا پہنی اور جب وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آئی تو ماں اسے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی اور اس کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔

”ماشاء اللہ... چشم بد دور... آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔ ٹھہرو میں تمہاری نظر اُتار لوں۔“

”ہر ماں کو اپنی بیٹی حور پری ہی معلوم ہوتی ہے۔“ لیلیٰ ہنستے ہوئے بولی۔ ”چھوڑیں ان باتوں کو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے کیک اور بوکے خریدا۔ خالہ زبیدہ کی کوٹھی بہت شان دار تھی اور اسے بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز سے مکینوں کی امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیلیٰ کو یہ اندازہ لگانے میں بالکل بھی دیر نہ لگی کہ خالہ زبیدہ انتہائی مال دار خاتون ہیں اور نائلہ کی شادی ہو جانے کے بعد اشعر ہی ان کی دولت کا تنہا وارث ہوگا۔

خالہ زبیدہ نے کھانے میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ لوگ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ اشعر بہت کم بولتا تھا لیکن لیلیٰ کے کام میں اس نے کافی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اتنی کم عمر ہونے کے باوجود اس نے ڈھیر ساری ذمے داریاں سنبھال رکھی ہیں۔ وہ خود بھی کوئی کاروبار شروع کرنا چاہ رہا تھا لیکن یہاں کا ماحول دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک ماہ میں ہی اس کا دل پاکستان سے اچاٹ ہو چکا تھا اور وہ جاپان واپس جانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا لیکن خالہ زبیدہ اس کے حق میں نہیں تھیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ جلد بازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کام شروع کرے لیکن وہ اسے جاپان جانے کی اجازت کبھی نہیں دیں گی۔

نائلہ ان دونوں سے عمر میں چھوٹی تھی۔ اس لیے زیادہ تر خاموش رہی۔ البتہ وہ لیلیٰ کی شخصیت سے بہت متاثر تھی اور اس نے فخریہ انداز میں بتایا کہ اس نے لیلیٰ کے سبھی ڈرامے دیکھ رکھے ہیں۔ اشعر اس کے پروڈکشن ہاؤس کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہا اور اچانک ہی اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس کی لیلیٰ کو بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ نائلہ چائے لینے گئی تو اشعر نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ تو آپ پہلے ہی بتا چکی ہیں کہ پارٹنرشپ کی قائل نہیں ہیں اس لیے میں آپ سے ایک دوسری بات کرنا چاہوں گا۔ اگر آپ سننا چاہیں تو...!“

”جی ہاں، بالکل۔ آپ کہیے۔ میں سن رہی ہوں۔“

”دیکھیے مس لیلیٰ! آپ اپنے پروجیکٹس کے لیے دوسرے فنانسرز سے پیسے لیتی ہیں اور انہیں منافع میں سے منہ مانگا حصہ بھی دیتی ہیں جو کہ بینک کی شرح سود سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ میں آپ کے کاروبار میں انویسٹ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد پر۔ منافع کی کوئی شرح مقرر نہیں۔ ہم دونوں نفع نقصان میں برابر کے شریک ہوں گے۔“

لیلیٰ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ فوری طور پر کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ رشتے داری کا معاملہ تھا۔ کل کو کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو خوامخواہ ہی دلوں میں گرہ پڑ جاتی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ”میرے کام میں دلچسپی لینے کا شکریہ... لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔“

”آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ اشعر خوش دلی سے بولا۔ ”انکار کی صورت میں بھی مجھے کوئی گلہ نہیں ہوگا لیکن جواب ہاں میں ہوا تو یہ خوشی ضرور ہوگی کہ آپ نے مجھے کسی قابل سمجھا۔“

گھر آنے کے بعد وہ اشعر کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ اشعر کی پیشکش میں یہ چارم تھا کہ وہ نفع نقصان میں شراکت پر آمادہ تھا جبکہ دوسرے فنانسرز اپنا مقررہ منافع لے کر چلتے بنتے تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ لیلیٰ کو اس پروجیکٹ میں فائدہ ہوا ہے یا نقصان۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کی سیریل کم داموں پر فروخت ہوئی یا اوور بجٹ ہونے کی وجہ سے معمولی منافع ہوا لیکن اسے فنانسر کو مقررہ رقم ادا کرنا پڑی۔ ایسی صورت میں اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا تھا لیکن کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے یہ سب کچھ برداشت کرنا ضروری تھا۔ اشعر سے پیسے لینے میں یہ فائدہ تھا کہ منافع کم ہو یا زیادہ، وہ دونوں ہی اس میں برابر کے حصے دار ہوتے اور لیلیٰ کو یہ گلہ نہ ہوتا کہ اس کی محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ فنانسر لے گیا۔

http://digestpk.blogspot.com/

دوسرے دن لیلیٰ نے اپنے مشیر خاص یعنی طاہر کو اس پیشکش کے بارے میں بتایا تو خلافِ توقع طاہر نے اس کی مخالفت کی اور یہ دلیل پیش کی کہ رشتے داروں کو کاروباری معاملات سے الگ ہی رکھنا چاہیے۔ کل کو خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو آپس کے تعلقات بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ لیلیٰ نے محسوس کیا کہ وہ اشعر سے حسد محسوس کر رہا ہے اور اسے ڈر ہے کہ اس بہانے وہ اور لیلیٰ آپس میں قریب ہوسکتے ہیں۔ اس کے بعد لیلیٰ نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ اب اسے خود ہی اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے معاملات کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ بزنس کو آگے بڑھانے اور اسے مزید مستحکم کرنے کے لیے ایک قابلِ اعتماد شخص کا ساتھ ضروری ہے اور اس کام کے لیے اشعر سے موزوں کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ اشعر اور دوسرے فنانسرز کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ وہ خود اس کے کاروبار میں سرمایہ لگانے کی خواہش کر رہا تھا جبکہ دوسرے لوگوں سے پیسا لینے کے لیے انہیں طرح طرح کی ترغیبات دینا پڑتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ من مانی شرائط پر سرمایہ فراہم کرتے تھے۔ اگر طاہر درمیان میں نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی بھی ان لوگوں کی شاطرانہ چالوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ اگر کسی مرحلے پر طاہر کا سہارا نہ رہا تو وہ کس طرح ان لوگوں کو ڈیل کرسکے گی؟ اس کے برعکس اشعر کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اشعر کی پیشکش قبول کرلے گی۔

دوسری صبح اس نے ناشتے کی میز پر ماں کو بھی اشعر کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا۔ یہ سن کر ان کی باچھیں کھل گئیں اور وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اشعر کی وجہ سے تمہیں کافی آسانی ہوجائے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے امی لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پیسے کا معاملہ ہے۔ کہیں اس کی وجہ سے دلوں میں میل نہ آجائے۔“

”تم خوانخواہ اپنے دل میں وسوسوں کو جگہ نہ دو۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”اشعر بہت سمجھ دار لڑکا ہے اور تمہیں بھی اس کام میں اچھا خاصا تجربہ ہوگیا ہے۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“

ماں سے بات کرنے کے بعد لیلیٰ مطمئن ہوگئی۔ اس نے اشعر کو اپنے دفتر بلایا اور اب تک اس نے جتنی سیریلز پروڈیوس کی تھیں، ان کا مکمل حساب کتاب اس کے سامنے رکھ دیا۔ اشعر نے سرسری انداز میں دو چار صفحے پلٹے اور فائل بند کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہ سب دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنے کام کو بہتر سمجھتی ہیں اس لیے آپ کا فائدہ میرا فائدہ ہے۔“

”میرے خیال میں آپ کو یہ فائل اچھی طرح اسٹڈی کرلینی چاہیے تاکہ ہر پروجیکٹ کا بجٹ، آمدنی اور اخراجات کی تفصیل آپ کے علم میں آجائے۔“ لیلیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ کہتی ہیں تو کسی وقت دیکھ لوں گا۔“ اشعر نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس کے علاوہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”کچھ نہیں، فی الحال آپ انتظار کریں۔ میں اگلے مہینے ایک نئی سیریل لانچ کرنے والی ہوں۔ اسکرپٹ میرے پاس آچکا ہے، میں دو چار روز میں اس کا بجٹ بنا کر آپ کے حوالے کردوں گی اور آپ اتنی رقم کا چیک ہمارے پروڈکشن ہاؤس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیجیے گا۔ جب تک سیریل فروخت نہیں ہوجاتی اور ہمیں اس کے پیسے نہیں مل جاتے، آپ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں تمام قانونی کارروائی اسی ہفتے مکمل کرلی جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو بتا دیں۔“

”جی نہیں۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میرے لیے اس سے زیادہ اطمینان کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ میرا سرمایہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ آپ بجٹ بنا لیں۔ میں چیک آپ کو دے دوں گا۔“

ایک ہفتے کے دوران ساری کارروائی مکمل ہوگئی۔ طاہر نے اپنے آپ کو اس معاملے سے الگ رکھا۔ ویسے وہ روزانہ اس کے دفتر آتا اور پہلے کی طرح اس کے بہت سے کام نمٹا دیتا تھا لیکن لیلیٰ اس کے رویّے میں واضح بے رخی محسوس کر رہی تھی حالانکہ اشعر کبھی اس کے دفتر یا اسٹوڈیو نہیں آیا اور نہ ہی سیریل لانچ ہونے کی تقریب میں اس نے شرکت کرنا ضروری سمجھا بلکہ اس نے لیلیٰ کو بھی سمجھا دیا تھا کہ ان کے درمیان ہونے والی ڈیل کی تشہیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے کہ میڈیا والے اسے غلط رنگ دیں اور خوانخواہ کا اسکینڈل بن جائے۔

خالہ زبیدہ، اشعر اور نائلہ باقاعدگی سے لیلیٰ کے گھر جاتے لیکن اشعر نے کبھی اس سے یہ نہیں پوچھا کہ سیریل کی شوٹنگ کس مرحلے میں ہے۔ لیلیٰ خود ہی اسے پروگریس کے بارے میں بتا دیا کرتی تھی۔ پھر ایک دن لیلیٰ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اشعر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات ماں نے اسے کہی تھی۔ دونوں بہنیں اس رشتے کے لیے تیار تھیں۔ بس لیلیٰ کی رضامندی چاہیے تھی۔ لیلیٰ نے حسب عادت ماں کو رٹا رٹایا جواب دے دیا۔ ”امی! ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ شادی کرلی تو سارے کام ادھورے رہ جائیں گے۔“

ماں کو غصہ آگیا۔ وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”کام تو کبھی ختم نہ ہوں گے لیکن یہ وقت نکل گیا تو عمر بھر پچھتاؤ گی۔“

لیلیٰ انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے دھیمے لہجے میں بولی۔ ”امی! مجھے اپنی نہیں آپ کی فکر ہے۔ میری شادی کے بعد آپ بالکل تنہا ہوجائیں گی۔ اسی لیے اتنا کام کر رہی ہوں تاکہ میرے جانے کے بعد آپ کا گزارہ آسانی سے ہوسکے۔ اگر شادی کرلی تو میرا مشن ادھورا رہ جائے گا۔“

”بھاڑ میں گیا تمہارا مشن۔“ ان کے غصے میں مزید تیزی آگئی۔ ”تم میری نہیں اپنی فکر کرو۔ دو چار سال اور گزر گئے تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔“ پھر وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ”اشعر بہت اچھا لڑکا ہے۔ اگر تم شادی کے بعد بھی میرے لیے کچھ کرنا چاہو گی تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ بھی میرا بھانجا ہے۔ کیا اسے میرا خیال نہ ہوگا۔ اپنی یہ فضول قسم کی ضد چھوڑو اور اس رشتے کے لیے ہاں کردو۔ ایسا موقع بار بار نہیں ملتا۔“

واقعی وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ ایسا موقع بار بار نہیں ملتا۔ کہتے ہیں کہ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر آتے ہی ہیں لیکن وہ تو ایک پھل دار درخت کی طرح تھی جسے دیکھ کر کسی کا دل بھی للچا سکتا تھا۔ وہ حسین تھی، مال دار تھی، ایک زمانہ اس کا مداح تھا۔ ہر جگہ اس کے چرچے تھے۔ اخباروں میں، ٹی وی پر... جس تقریب یا محفل میں جاتی، لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہوتی۔ بچے، جوان اور بوڑھے سبھی اس سے قریب ہونا چاہتے۔ اس کے آگے پیچھے پھرنے والے تو بہت تھے لیکن آج تک کسی نے اسے پروپوز نہیں کیا تھا۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ اسے اپنے گھر اور دل کی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔ طاہر کا خلوص اور وارفتگی دیکھ کر اسے کئی بار گماں گزرا کہ شاید وہ اس کی محبت میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہ منتظر ہی رہی کہ شاید کسی روز وہ اپنے جذبات کا اظہار کردے لیکن نہ جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کبھی منہ سے پھوٹ کر نہ دیا۔ البتہ اس کی باڈی لینگویج سے لیلیٰ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہے۔

گزشتہ سات سال میں یہ پہلا پتھر تھا جو اس کے آنگن میں گرا۔ اس کے ساتھ کی سبھی لڑکیوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ نجمہ جیسی غریب اور معمولی شکل کی لڑکی بھی عامر کے گھر میں راج کر رہی تھی۔ ماں ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، دو چار سال اور گزر جاتے تو کوئی نہیں پوچھتا اور وہ بھی بھارت کی ایکتا کپور کی طرح ڈرامے پروڈیوس کرتی رہتی۔ اس نے تنہائی میں ماں کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا تو اسے اشعر میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئی۔ شادی تو ایک نہ ایک دن کرنی ہی ہے تو پھر یہ موقع کیوں ضائع کیا جائے؟ جہاں تک ماں کے گزارہ کرنے کا سوال ہے تو اس کی پہلی کوشش یہی ہوتی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ ہی رکھے۔ اگر وہ اس پر تیار نہ ہوتیں تو وہ کچھ ایسا بندوبست کردیتی جس سے ان کا کام چلتا رہتا۔ یہ سب کچھ سوچ کر وہ مطمئن ہوگئی اور اس نے اشعر کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس کے فیصلے پر سبھی خوش تھے۔ البتہ طاہر کا منہ لٹک گیا۔ اس نے اوپری دل سے لیلیٰ کو مبارک باد دی لیکن اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ اسے یہ خبر سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ تکلیف پہنچی ہے۔ لیلیٰ کو اس سے ہمدردی ہونے لگی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ غلطی طاہر ہی کی تھی۔ اگر وہ ایک بار بھی اشارہ کردیتا تو وہ اسے ہی ترجیح دیتی۔ طاہر اس کے سامنے بیٹھا تھا اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ بڑی دیر بعد اس نے زبان کھولی اور کہا۔

”اپنے کیریئر کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ آئندہ ڈیڑھ دو سال تک تو تم مصروف ہو... اور اس پروڈکشن ہاؤس کا کیا بنے گا... اسے بھی وائنڈ اپ کردو گی؟“

”سب کچھ ایسے ہی چلتا رہے گا۔“ لیلیٰ نے کہا۔ ”میں نے اشعر سے بات کرلی ہے۔ میں شادی کے بعد بھی کام کرتی رہوں گی۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

طاہر طنز کرتے ہوئے بولا۔ ”شادی سے پہلے سب ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اصل روپ تو بعد میں ظاہر ہوتا ہے۔“

”میں اس بارے میں زیادہ فکرمند نہیں ہوں۔ اگر اس نے کوئی پابندی لگائی تو آرام سے گھر بیٹھ جاؤں گی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنے کیریئر کی فکر نہیں اور اب شادی تمہاری پہلی ترجیح ہے۔“ وہ جرح کرتے ہوئے بولا۔

”یونہی سمجھ لو۔“ لیلیٰ نے قطعی لہجے میں کہا۔

”اب تم فیصلہ کر ہی چکی ہو تو تمہارے لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔“ طاہر کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ”کاش! تم ہمیشہ کی طرح اس معاملے میں بھی مجھ سے مشورہ کرلیتیں۔“

”یہ فیصلہ مجھے خود ہی کرنا تھا اس لیے کسی مشورے کی

http://digestpk.blogspot.com/

ضرورت نہیں سمجھی۔“

لیلیٰ اور اشعر کی شادی انتہائی سادگی سے ہوئی۔ لیلیٰ نے شوبزنس سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فرد کو اس تقریب میں مدعو نہیں کیا اور نہ ہی میڈیا کے لوگوں کو بلایا۔ اس کے جاننے والوں میں صرف ارشد خاں، عامر، نجمہ اور طاہر ہی اس شادی میں موجود تھے۔ یہ کوئی خفیہ شادی نہیں تھی بلکہ وہ اسے ایک ذاتی معاملہ سمجھتی تھی اس لیے تشہیر مناسب نہ سمجھی۔ لیکن میڈیا والے بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ جیسے ہی اس کی شادی کی خبر عام ہوئی تو ایک منچلے رپورٹر نے اسے خفیہ شادی قرار دے کر اپنی طرف سے من گھڑت اسٹوری شائع کردی جس میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ لیلیٰ اور اشعر کے درمیان گزشتہ کئی ماہ سے افیئر چل رہا تھا۔ نیز یہ کہ اشعر نے اس کے پروڈکشن ہاؤس میں اچھی خاصی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ لیلیٰ کو یہ خبر پڑھ کر غصہ تو بہت آیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک پریس کانفرنس کر کے اس بے بنیاد خبر کی تردید کرے لیکن اشعر نے منع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح بات بڑھ جائے گی اور لوگوں کے ہاتھ ایک نیا موضوع آجائے گا۔

شادی کے ایک ہفتے بعد جب وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اشعر نے اس سے کہا۔ ”یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میں گھر پر رہوں اور تم کام پر جاؤ۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟ دفتر میں بیٹھا رہوں گا۔“

لیلیٰ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ اگر وہ پروڈکشن ہاؤس کا کام سنبھال لیتا تو اس کا کافی بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں... کیوں نہیں۔ مجھے تو خوشی ہوگی اگر تم میری کچھ مدد کر سکو۔“

”بس تو میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں۔“

وہ دونوں دفتر پہنچے تو طاہر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اشعر کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”آج تین بجے چینل والوں سے میٹنگ ہے۔ وہ ہماری ڈیمانڈ سے بیس لاکھ کم دے رہے ہیں۔ میں نے تو پوری کوشش کرلی لیکن بات نہیں بنی۔ اب تم خود ہی بات کر کے دیکھ لو۔“

”نو پرابلم!“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”اگر وہ ہماری ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکتے تو تم کسی دوسرے چینل سے بات کرو۔ دیکھو، وہ کیا کہتے ہیں۔“

”ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ یہ چینل ہمارا مستقل کلائنٹ ہے اور ہماری ہر سیریل آنکھ بند کر کے خرید لیتا ہے۔ ان سے بگاڑ کر ہم اپنے لیے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔“

”پھر کیا کیا جائے... بیس لاکھ کا نقصان برداشت کر لیں؟“ لیلیٰ نے تلخی سے کہا۔

”اگر وہ دس لاکھ بڑھا دیں تو سودا فائنل کر لو۔“ طاہر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے باوجود بھی ہم فائدے میں رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں بات کرتی ہوں۔“ لیلیٰ، اشعر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں بتانا ہی بھول گئی۔ اب اشعر بھی آفس میں بیٹھا کریں گے اور آج کی میٹنگ میں بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔“

طاہر نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بولا۔ ”گیارہ بجے ماڈل ٹاؤن میں تمہاری شوٹنگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

طاہر بھی اس سیریل میں سائڈ رول کر رہا تھا۔ یہ بات اشعر کو معلوم نہیں تھی۔ اس نے چونک کر لیلیٰ کو دیکھا تو وہ بولی۔ ”اشعر! آج میرے دونوں سین طاہر کے ساتھ ہی ہیں۔ اس لیے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں تین بجے سے پہلے ہی آجاؤں گی۔ لنچ ساتھ ہی کریں گے۔ تم جب تک پرانی فائلیں دیکھو تاکہ تمہیں بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو سکے۔ چائے کا موڈ ہو تو پیون سے کہہ دینا۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس شانے پر لٹکایا اور ہوا کے جھونکے کی طرح وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اشعر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور طاہر کے بارے میں سوچنے لگا۔ ویسے تو لیلیٰ ..... طاہر کے بارے میں تفصیل سے بتا چکی تھی لیکن اس سے ملنے اور اس کی باتیں سننے کا اتفاق پہلی بار ہوا تھا۔ لیلیٰ اسے اپنا مخلص اور ہمدرد دوست سمجھتی تھی جس نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا اور اس پروڈکشن ہاؤس کے بہت سے مسائل وہ بلا معاوضہ حل کر دیتا تھا۔ اشعر کو یہی بات کھٹک رہی تھی کہ اس زمانے میں کسی غرض کے بغیر کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے... لیکن لیلیٰ کا کہنا تھا کہ آج تک اس نے اپنی کسی خدمت کے عوض کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا بلکہ ایک دو مرتبہ لیلیٰ نے اسے کچھ دینے کی کوشش کی تو وہ ناراض ہو گیا۔ یہ سوچنا بھی غلط تھا کہ لیلیٰ کے ساتھ اس کی کوئی جذباتی وابستگی تھی۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور لیلیٰ کے سامنے حالِ دل بیان کر دیتا۔ ان تمام باتوں کا جائزہ لینے کے باوجود اشعر کے دل میں ایک

نامعلوم سی خلش سر اٹھا رہی تھی۔ اس نے جس انداز میں لیلیٰ کو بیس لاکھ کا نقصان برداشت کرنے اور کسی دوسرے چینل سے رجوع نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا، وہ اشعر کی سمجھ سے باہر تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ لیلیٰ کو ڈبل کراس کر رہا ہے۔ ایک جانب تو وہ لیلیٰ کے مفادات کا نگہبان بنا ہوا ہے تو دوسری طرف چینل والوں سے مل کر فائدے حاصل کر رہا ہے۔ اشعر نے ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ وہ غیر محسوس طریقے سے طاہر کو ان معاملات سے الگ کر دے گا۔

مقررہ وقت پر لیلیٰ، اشعر اور طاہر چینل والوں سے میٹنگ کرنے پہنچ گئے۔ ابتدا میں ان کا رویہ بہت جارحانہ تھا اور وہ کسی بھی طرح قیمت بڑھانے پر تیار نہ تھے۔ لیلیٰ نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیلیٰ نے اپنے سامنے پڑی فائل اٹھائی اور بولی۔ ”ٹھیک ہے، اگر آپ لوگ ہماری ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکتے تو ہمیں کسی دوسرے چینل سے بات کرنی پڑے گی۔“

چینل کا مارکیٹنگ ہیڈ اپنی جگہ سے یوں اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس لیلیٰ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

لیلیٰ نے اس کی تصحیح کی اور بولی۔ ”پہلی بات تو یہ کہ اب میں مس نہیں بلکہ مسز ہوں۔ اسی لیے اپنے شوہر کو ساتھ لائی ہوں تاکہ آپ لوگوں سے ان کا تعارف ہو جائے۔ اب پروڈکشن ہاؤس کے معاملات انہی کے سپرد ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ آپ صرف اپنا فائدہ دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے نقصان کی آپ کو کوئی پروا نہیں۔ لہٰذا میں سمجھتی ہوں کہ ایسی صورتِ حال میں ہمارا ساتھ چلنا ممکن نہیں۔“

”ایک منٹ۔“ وہی شخص ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”اتنی جلدی کوئی فیصلہ مت کیجیے۔ ہم کوئی درمیانی راستہ بھی نکال سکتے ہیں۔“

ایک بار پھر مذاکرات کی میز بجی۔ نئے سرے سے دلائل پیش کیے گئے۔ بالآخر چینل والے دس لاکھ بڑھانے پر رضامند ہو گئے۔ لیلیٰ نے بادل ناخواستہ یہ فیصلہ قبول کر لیا کیونکہ وہ بھی دل سے یہی چاہتی تھی کہ اس کی سیریل اسی چینل سے دکھائی جائے... لیکن اس نے چینل والوں پر واضح کر دیا کہ وہ یہ رعایت صرف اس ایک سیریل کے لیے دے رہی ہے۔ آئندہ کوئی بھی پروجیکٹ شروع کرنے سے پہلے وہ چینل سے پیشگی معاہدہ کرے گی تاکہ بعد میں کوئی بدمزگی نہ ہو۔

اشعر خاموش بیٹھا یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ وہ لیلیٰ کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے ایک کامیاب بزنس وومین کی طرح مذاکرات کیے اور بہتر شرائط پر ڈیل کرنے میں کامیاب ہو گئی جبکہ طاہر پوری گفتگو کے دوران کچھ نہ بولا۔ البتہ جب لیلیٰ نے دوسرے چینل سے بات کرنے کی دھمکی دی تو وہ اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ لیلیٰ کے اندازِ گفتگو سے خوش نہیں ہے اور چاہتا ہے کہ جو کچھ اس کے اور چینل کے درمیان پہلے سے طے ہو گیا ہے، لیلیٰ اسی پر راضی ہو جائے۔

اشعر نے باقاعدگی سے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ لیلیٰ اب پروڈکشن ہاؤس کے معاملات سے لاتعلق ہوتی جا رہی تھی اور شوٹنگ کے بعد زیادہ وقت گھر پر ہی گزارتی۔ اس نے نئی سیریل کا اسکرپٹ بھی اشعر کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اسے

بے گناہ

سنیما ہال میں میاں بیوی کی نشستوں کے برابر ایک خوب صورت نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ بیوی نے اندازہ لگایا کہ شوہر فلم سے زیادہ لڑکی پر متوجہ ہے اور مسلسل کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ کئی مرتبہ اس نے شوہر کی توجہ فلم کی طرف مبذول کرائی مگر ناکام رہی۔

اچانک نوجوان لڑکی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ اس نے پلٹ کر شوہر کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا اور چلا کر بولی۔ ”تمہاری یہ جرأت؟“

تھوڑی دیر کے لیے سنیما ہال میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ شوہر کو برا بھلا کہا گیا اور لڑکی کو مشورہ دیا گیا کہ ایسے آوارہ شخص کو پولیس کے حوالے کر دے۔

فلم ختم ہونے کے بعد جب سنیما ہال خالی ہو گیا اور شوہر گال سہلاتا ہوا بیوی کے ساتھ باہر نکلنے لگا تو اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”خدا گواہ ہے رضیہ! میں نے لڑکی کی کمر میں چٹکی نہیں لی تھی۔“

”ہاں، میں جانتی ہوں تم بالکل بے قصور ہو۔ چٹکی تم نے نہیں، میں نے لی تھی۔“

ذیشان مصطفیٰ کی کاوش، کوٹ ادو سے

http://digestpk.blogspot.com/

غور سے پڑھے اور اس کے بارے میں اپنی رائے دے۔

ابھی اشعر کو دفتر جاتے ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ ایک دن اس نے رات کے کھانے پر اشعر کو بہت خاموش اور سنجیدہ دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت نائلہ اور خالہ زبیدہ گھر پر نہیں تھیں۔ لیلیٰ سے رہا نہ گیا اور وہ پوچھ بیٹھی۔ ''کیا بات ہے اشعر! تم اس قدر خاموش اور گم صم کیوں ہو؟''

اشعر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بولا۔ ''بات ہی کچھ ایسی ہے۔ سوچ رہا ہوں تمہیں بتاؤں یا نہیں۔ تم بھی سن کر پریشان ہو جاؤ گی۔''

''میری پریشانی کی فکر مت کرو۔ اپنا مسئلہ مجھے بتاؤ۔ شاید میں کوئی حل نکال سکوں۔''

اشعر نے اسے بتایا کہ گزشتہ تین چار روز سے ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کار دفتر آتے جاتے اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ پہلے روز تو اس نے غور نہیں کیا لیکن دوسرے روز اسے کچھ شک گزرا تو اس نے کنفرم کرنے کے لیے اپنی گاڑی کو بلاوجہ ہی اِدھر اُدھر گھمانا شروع کر دیا لیکن وہ سفید کار مسلسل اس کا تعاقب کرتی رہی۔ گاڑی میں ایک ہی شخص ہوتا ہے جس نے پی کیپ اور سیاہ چشمہ لگایا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آتی۔ ویسے بھی وہ کافی فاصلہ رکھ کر تعاقب کرتا ہے۔

''تمہارے خیال میں اس تعاقب کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟'' لیلیٰ نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ شہر تو کیا اس ملک میں بھی میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ اس لیے کسی کے ساتھ دشمنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''لگتا ہے کہ کوئی شخص مجھے خوف زدہ کرنا چاہ رہا ہے۔ شاید اسے میری موجودگی ناگوار گزر رہی ہے اور وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہ رہا ہے۔''

''ایک طرف تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی تمہیں اپنے مارے جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری وجہ سے میرا کوئی رقیب پیدا ہو گیا ہو۔ ایسا شخص جو تم سے شادی کرنے کا خواہش مند ہو اور میرے آ جانے سے اس کے خواب ادھورے رہ گئے ہوں۔''

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو۔ اس سے پہلے کسی نے اشارے کنائے میں بھی یہ عندیہ نہیں دیا کہ وہ میری ذات میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر کوئی دل میں یہ بات لیے بیٹھا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اور وہ کیا سمجھتا ہے کہ تمہیں مارنے کے بعد مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا... ناممکن۔''

''یہ تمہاری سوچ ہے۔ ممکن ہے وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔'' اشعر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میری اطلاع کے مطابق کرۂ ارض پر تمہارے علاوہ ایسے کسی دوسرے انسان کا وجود نہیں۔ لہٰذا اس امکان کو خارج از بحث سمجھو۔ اس تعاقب کی کوئی اور وجہ ہو گی۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی بھتّا خور ہو اور تم سے کچھ رقم اینٹھنا چاہتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں پولیس میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیے۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ ساری عمر میری حفاظت نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن کے لیے سیکیورٹی فراہم کر دیں گے پھر وہی ٹائیں ٹائیں فش۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' لیلیٰ نے فکرمند ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اشعر نے کہا۔ ''دیکھتے ہیں، یہ تعاقب کیا رنگ لاتا ہے۔''

دو تین دن خیریت سے گزر گئے۔ چوتھے روز اشعر کو ڈاک سے ایک لفافہ ملا جس پر اس کا نام اور پروڈکشن ہاؤس کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو پلٹ کر دیکھا لیکن اس پر بھیجنے والے کا نام نہیں تھا۔ البتہ دونوں مہریں کراچی کی ہی تھیں اور یہ خط لانڈھی سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس نے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس خط کی عبارت کچھ یوں تھی۔

''میرا نام سمندر خان ہے اور میں تمہارے باپ کی پہلی بیوی کا بیٹا ہوں۔ باپ نے خاندان والوں کی مخالفت مول لے کر تمہاری ماں سے دوسری شادی کی اور اسے لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ دادا نے قسم کھائی کہ جب تک تمہاری ماں کو طلاق نہیں ہو جاتی، اس پر دنیا کا عیش و آرام حرام ہے۔ اس نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا کہ میرا باپ جاپان کے کس شہر میں مقیم ہے۔ ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ بھی وہاں رہتے تھے۔ ان کے ذریعے دادا کو ساری خبریں ملتی رہتی تھیں۔ انہیں انتظار تھا کہ جب بھی میرا باپ پاکستان آیا، وہ اس پر دباؤ ڈال کر تمہاری ماں کو طلاق دلوائیں گے۔ وہ یہ حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور مجھے وصیت کر گئے کہ میں اپنے حق کے لیے اپنے باپ کا پیچھا کرتا رہوں۔

جب مجھے اطلاع ملی کہ وہ بھی انتقال کر گیا ہے اور تم لوگ پاکستان آ رہے ہو تو میں بھی تمہارا استقبال کرنے کراچی پہنچ گیا۔ تمہارا پتا لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔ تمہاری بیوی کی وجہ سے یہ کام اور آسان ہو گیا۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ بس مجھے اپنے باپ کی دولت اور جائداد میں سے اپنا حصہ چاہیے ورنہ تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں بندوق کی نوک پر فیصلے ہوتے ہیں۔ میں تمہیں تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس کے بعد فون کروں گا لیکن تمہارا جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔ میں نہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔

فقط، سمندر خان''

یہ خط پڑھ کر اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک اس خط پر نظریں جمائے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا جو بالکل واضح تھا اور اس میں کوئی ابہام نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے وہ خط اور لفافہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا اور سوچنے لگا کہ اس کے باپ کی پہلی بیوی اور بیٹے کے بارے میں تو کبھی کسی نے کچھ نہیں بتایا اور اس کی ماں زبیدہ بیگم کا یہی کہنا تھا کہ اس کی ددھیال والے اس شادی پر رضامند نہیں تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان لوگوں کے درمیان دشمنی کی جڑیں اتنی گہری ہوں گی کہ اس کا دادا پردیس میں بھی اپنے بیٹے کی نگرانی پر کچھ لوگوں کو مامور کر سکتا ہے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ تیس سال گزر جانے کے بعد بھی ان لوگوں نے پیچھا نہیں چھوڑا اور سمندر خان ان کی تلاش میں کراچی پہنچ گیا۔ اسے سمندر خان کی کہانی میں کئی جھول نظر آ رہے تھے۔ وہ یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ تیس سال سے اس کے باپ کی نگرانی ہو رہی تھی اور وہ لوگ اس کے تمام حالات سے پوری طرح واقف تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ سمندر خان کے مطالبے کے جواب میں کیا کیا جائے؟ پہلے تو اس کی حقیقت معلوم کرنا تھی، آیا وہ واقعی اس کے باپ کی حقیقی اولاد ہے یا کوئی جعل ساز فراڈ کے ذریعے اس سے رقم ہتھیانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے سوچ لیا کہ سمندر خان کے رابطہ کرنے پر وہ اس سے برتھ سرٹیفکیٹ، قومی شناختی کارڈ اور میٹرک کا سرٹیفکیٹ مانگے گا تاکہ تصدیق ہو سکے کہ وہ واقعی اس کے باپ کا بیٹا ہے۔ اگر اس نے یہ ثبوت فراہم کر دیے تو وہ اس سلسلے میں کسی وکیل سے مشورہ کرے گا۔

وہ شام کو گھر آیا تو اس کی حالت خاصی خراب تھی۔ رات ہوتے ہوتے اسے تیز بخار ہو گیا۔ دوسرے دن وہ دفتر بھی نہیں گیا۔ اس روز لیلیٰ کی بھی شوٹنگ نہیں تھی اس لیے وہ گھر پر رہی۔ شام تک اشعر کی طبیعت سنبھل گئی تو اس نے کمرا بند کر کے وہ خط لیلیٰ کو پڑھوایا اور سختی سے تاکید کی کہ اس کا ذکر والدہ اور نائلہ سے نہ کیا جائے۔ خط پڑھ کر لیلیٰ بھی سناٹے میں آ گئی اور بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ کوئی فراڈیا ہے جو ہمیں بلیک میل کر رہا ہے۔ میں کئی مرتبہ امی کی زبانی خالہ زبیدہ کے حالات سن چکی ہوں۔ انہوں نے کبھی بھی یہ نہیں بتایا کہ خالو کی یہ دوسری شادی تھی اور ان کی پہلی بیوی اور بچہ گاؤں میں رہتے ہیں۔''

''ممکن ہے یہ بات امی کے علم میں بھی نہ ہو اور ابّا نے انہیں اپنی پہلی شادی کے بارے میں نہ بتایا ہو۔''

''میں نہیں مانتی۔ ایسی باتیں کبھی چھپی نہیں رہتیں۔ اگر واقعی تمہاری سوتیلی ماں اور بھائی کا وجود ہوتا تو یہ حقیقت کسی نہ کسی دن خالہ زبیدہ کے علم میں آ سکتی تھی۔''

''خیر، میں نے اس کا حل سوچ لیا ہے۔ اس کا فون آئے گا تو میں اس سے ثبوت کے طور پر برتھ سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ کی کاپی مانگوں گا۔ اگر وہ اپنی اصلیت ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کے بعد کچھ سوچیں گے۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تم فوری طور پر یہ خط پولیس کے حوالے کر دو۔ وہ خود ہی اس شخص کا کھوج نکال لے گی۔''

''تم بھی بعض اوقات بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔'' اشعر تلخی سے بولا۔ ''اگر یہاں کی پولیس اتنی مستعد اور چوکس ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔ سب سے پہلے وہ یہی کہیں گے کہ یہ خاندانی معاملہ ہے اور ہمیں اسے خود ہی حل کرنا چاہیے۔ وہ میرے گھر یا دفتر پر موبائل تو کھڑی نہیں کر سکتے۔''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ اس خط میں تمہیں دھمکی بھی دی گئی ہے۔ پولیس اس پہلو کو تو کبھی نظرانداز نہیں کرے گی۔'' لیلیٰ نے کہا۔

''تمہارا یہ پوائنٹ قابلِ غور ہے لیکن میں فوری طور پر پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ واقعی سمندر خان کا کوئی وجود ہے یا کوئی شخص ہمیں تنگ کرنے کے لیے یہ ڈراما کر رہا ہے۔''

اس کے بعد لیلیٰ کچھ نہ بولی لیکن اس کے دل میں وسوسے جنم لینے لگے۔ اس نے اشعر کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنی سرگرمیاں معطل کر دے۔ زیادہ وقت گھر پر ہی گزارے۔ وہ دن میں دفتر کا ایک چکر لگا لیا کرے گی۔ باقی معاملات کی نگرانی گھر بیٹھ کر بھی کی جا سکتی تھی۔

اشعر بزدل نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضوں کے پیشِ نظر اسے لیلیٰ کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد اسے

http://digestpk.blogspot.com/

اپنے موبائل پر سمندر خان کی کال موصول ہوئی۔ کوئی شخص بھاری اور کرخت لہجے میں بول رہا تھا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔''

''میں تمہیں اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتا جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ تم واقعی میرے سوتیلے بھائی ہو۔''

''بہت ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' سمندر خان نے غصے سے کہا۔ ''یہ بھی بتادو کہ تمہیں یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تم مجھے اپنا برتھ سرٹیفکیٹ، شناختی کارڈ اور میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھیج دو... جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ تم واقعی میرے باپ کی اولاد ہو۔''

''میں نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی اس لیے میٹرک کی سند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برتھ سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ لینے کے لیے مجھے گاؤں جانا پڑے گا اور میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنی غیر حاضری میں تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا موقع دوں۔ اس لیے تمہیں میری زبان پر یقین کرنا ہوگا۔ اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے حق کے لیے عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔'' اشعر نے کہا۔ ''کیونکہ میں کسی ثبوت کے بغیر تمہیں اپنا بھائی نہیں مان سکتا۔ عدالت جو فیصلہ کرے گی، وہ مجھے منظور ہوگا۔''

''شاید تم نے میرا خط غور سے نہیں پڑھا۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں بندوق کی نوک پر فیصلے ہوتے ہیں اور میں نہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔ چلو، اگر تمہارا اس دنیا سے دل اچاٹ ہوگیا ہے تو یونہی سہی۔ میں تو آدھا حصہ مانگ رہا تھا لیکن تم خود ہی پورا حصہ دینا چاہ رہے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایک بات اور بتا دوں۔ ہمارے یہاں بھائی کی بیوہ سے نکاح کا رواج ہے۔ اس طرح لیلیٰ مجھے بونس میں مل جائے گی۔''

''بکواس بند کرو اور آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' اشعر نے غصے سے کہا اور کال منقطع کر دی۔

اشعر نے لیلیٰ کو اس فون کال کے بارے میں بتایا تو وہ بُری طرح پریشان ہوگئی اور بولی۔ ''اب پولیس کو مطلع کرنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔ جو شخص اتنی خطرناک دھمکیاں دے سکتا ہے، اس سے کچھ بعید نہیں۔''

''وہ فون ایک پی سی او سے کیا گیا تھا۔ اگر پولیس اس نمبر کے ذریعے وہاں تک پہنچ بھی گئی تو کیا ہوگا۔ دن میں نہ جانے کتنے لوگ پی سی او سے فون کرتے ہیں۔ پولیس اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے گی۔''

''پولیس میں رپورٹ کرو گے تو وہ شخص بھی محتاط ہو جائے گا اور اس طرح کھلے عام سنگین دھمکیاں دینے کی ہمت نہیں کر پائے گا۔'' لیلیٰ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اس طرح میں اسے اپنا دشمن بنا لوں گا۔'' اشعر نے کہا۔ ''اور ایسے لوگ جب دشمنی پر اتر آئیں تو ان سے کسی بھی انتہائی اقدام کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' لیلیٰ تلخی سے بولی۔ ''وہ پھر تمہیں ٹیلی فون کرے گا، اسے کیا جواب دو گے؟''

''وہی جو پہلے دیا تھا۔ اگر وہ واقعی میرا سوتیلا بھائی ہے تو عدالت میں جائے۔ اسے اپنا حق ضرور ملے گا۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تم اس سے ایک میٹنگ کر لو۔ اس طرح اس کی اصلیت جاننے کے بارے میں آسانی رہے گی۔''

''یہ کوشش بھی کر لیتا ہوں۔'' اشعر نے مایوسی سے کہا۔ ''لیکن اس طرح کے لوگ اتنی آسانی سے سامنے نہیں آتے۔ وہ مجھے اسی طرح ڈرا دھمکا کر دباؤ میں لانے کی کوشش کرتا رہے گا اور جب میں اس کا مطالبہ ماننے پر تیار ہو جاؤں گا تو وہ اپنے کسی ایجنٹ کے ذریعے مجھ سے رقم وصول کر لے گا۔''

لیلیٰ اتنی خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اس نے دوسرے ہی روز ایک پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کر لیں۔ کوٹھی پر بارہ بارہ گھنٹے کے لیے دو گارڈز تعینات کر دیے گئے۔ ان میں سے ایک ہر وقت گیٹ پر موجود رہتا اور دوسرا عقبی حصے میں گشت کرتا رہتا۔ اس کے باوجود اس کے دل کو دھڑکا لگا رہتا۔ تاہم اشعر پر ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے لیلیٰ کو سمجھایا کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ سمندر خان بھی ڈرا دھمکا کر مجھ سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔ مجھے مارنے کی صورت میں اسے کچھ نہیں ملے گا بلکہ الٹا پھانسی کا پھندا اس کے گلے پڑ جائے گا۔

تین دن بعد سمندر خان کا پھر فون آیا۔ جیسے ہی اشعر نے ہیلو کہا، اس نے اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا۔

''میں نے تمہیں ایک بار پھر سوچنے کی مہلت دی تھی۔ امید ہے کہ تمہاری عقل ٹھکانے آگئی ہوگی۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اشعر نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ تم میری بات کا

جواب دو۔''

''جب تک ہماری ملاقات نہیں ہو جاتی، میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

''لگتا ہے تمہیں اوپر جانے کی بہت جلدی ہے۔ بہر حال، میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت اور دے رہا ہوں۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو میرا مطالبہ مان لو، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اشعر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائے۔ سمندر خان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو وہ اس کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اس نے یہی سمجھا کہ پولیس کو ان حالات سے آگاہ کر دے تاکہ اس پر قاتلانہ حملے کی صورت میں پولیس کے لیے ملزم کا سراغ لگانا آسان ہو جائے۔ اس نے گھر آنے کے بعد لیلیٰ کو اس فون کال کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ مناسب یہی ہوگا کہ پولیس میں رپورٹ کر دی جائے۔

لیلیٰ بولی۔ ''میں تو کب سے کہہ رہی ہوں لیکن تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آتی۔''

''ہاں، اب اس معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں کل ہی پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ درج کرا دیتا ہوں۔''

دوسرا دن بہت مصروف رہا۔ نئی سیریل کے لیے چینل سے معاہدہ ہو چکا تھا اور وہ فوری طور پر کاسٹ فائنل کر کے شوٹنگ شروع کرنا چاہ رہے تھے۔ دن بھر ایکٹرز اور ایکٹریسز کی آمد و رفت جاری رہی اور وہ دونوں ان کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے لیے لیلیٰ اور طاہر کے نام ہی فائنل ہو چکے تھے۔ البتہ بقیہ اداکاروں کے انتخاب میں وقت لگ رہا تھا کیونکہ لیلیٰ اس معاملے میں بہت محتاط تھی اور کرداروں کی مناسبت سے اداکاروں کا انتخاب کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا اور وہ جب اس کام سے فارغ ہوئے تو رات کے نو بج چکے تھے اس لیے پولیس اسٹیشن جانے کا معاملہ دوسرے دن پر چھوڑ دیا گیا۔

اسی روز رات کو ایک اور واقعہ پیش آیا۔ لیلیٰ اور اشعر بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے کھانا کھانے کے بعد ہی سو گئے۔ خالہ زبیدہ اور نائلہ لیلیٰ کی ماں سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور ان کا ارادہ رات کو وہیں قیام کرنے کا تھا۔ تین بجے کے قریب شدید فائرنگ کی آواز سے وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ان کے سر پر کھڑا گولیاں برسا رہا ہے۔ تین چار فائر ہوئے، اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اشعر نے بیڈ کی دراز سے اپنا ریوالور اور ٹارچ نکالی۔ وہ باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا لیکن لیلیٰ نے اسے روک دیا۔ پھر وہ لاؤنج میں آئی اور انٹر کام کے ذریعے گارڈ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ رات کی ڈیوٹی والا ایک گارڈ چھٹی پر تھا جبکہ دوسرا گارڈ عقبی حصے کی نگرانی پر مامور تھا۔

پندرہ منٹ بعد انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ فائرنگ کی آواز سن کر پولیس موبائل وین آگئی تھی۔ اشعر اور لیلیٰ گیٹ پر گئے تو پولیس والے گارڈ سے پوچھ گچھ کر رہے تھے جو چند منٹ پہلے ہی وہاں پہنچا تھا۔ پولیس نے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سڑک کے پار سے فائرنگ کی گئی ہے۔ گیٹ پر دو سوراخ نظر آرہے تھے جبکہ بیرونی دیوار کا پلاستر بھی اکھڑ گیا تھا۔ پولیس والوں نے اشعر سے کچھ سوالات کیے اور صبح ... پولیس اسٹیشن آکر رپورٹ درج کرانے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد وہ ان دونوں کو تسلی دے کر چلے گئے۔

اشعر اور لیلیٰ کی نیند اڑ چکی تھی۔ خاص کر لیلیٰ تو بہت خوف زدہ تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''اشعر! خدا کے واسطے اس مصیبت سے کسی طرح جان چھڑاؤ۔ میں تو کہتی ہوں کہ اس کا مطالبہ مان لو۔ جان سے پیاری کوئی چیز نہیں ہوتی۔''

''جب تک یہ تصدیق نہ ہو جائے کہ وہ میرا سوتیلا بھائی ہے کوئی بلیک میلر نہیں، میں اسے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔''

''ہم کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ مایوس ہو کر واپس چلا جائے۔''

''یہ بالکل ہی احمقانہ تجویز ہے۔ کل سے ہماری سیریل کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ چینل سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ وقت پر سیریل تیار نہ ہوئی تو ہمیں ہرجانہ دینا ہوگا۔ اور تم کیا سمجھتی ہو، وہ ہمیں اتنی آسانی سے جانے دے گا؟ ہماری مسلسل نگرانی ہو رہی ہوگی۔ اور ہم کتنا عرصہ ملک سے باہر رہ سکیں گے؟ دو مہینے، چار مہینے... زیادہ سے زیادہ چھ مہینے۔ اس کے بعد تو واپس آنا ہی ہوگا۔''

''کیوں نہ ہم مستقل طور پر جاپان چلے جائیں۔'' لیلیٰ نے تجویز پیش کی۔ ''تم تو وہیں پلے بڑھے ہو۔ وہاں کے ماحول میں آسانی سے ایڈجسٹ ہو سکتے ہو۔''

http://digestpk.blogspot.com/

”اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو ہم کبھی پاکستان نہ آتے۔ سب سے بڑا مسئلہ نائلہ کا ہے۔ اس کی شادی کرنی ہے اور وہاں رہ کر اس کے لیے رشتہ تلاش کرنا ممکن نہیں۔“

”پھر کیا کرو گے؟ اس مسئلے کا کوئی حل ہے تمہارے پاس؟“ لیلیٰ نے پوچھا۔

”ہاں، میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی بات پر قائم رہوں گا اور جب تک وہ ثبوت فراہم نہیں کرے گا، میں اسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ویسے بے فکر رہو۔ وہ مجھے نہیں مار سکتا کیونکہ میرے مرنے کے بعد اسے کچھ نہیں ملنے والا۔ وہ صرف ہمیں دہشت زدہ کرکے ہم سے رقم بٹورنا چاہتا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ واقعی تمہارا بھائی ہے تو اسے ثبوت دینے میں کیا پرابلم ہے۔ کم از کم اپنا شناختی کارڈ ہی دکھا دے۔“

”شاید وہ سمجھتا ہے کہ میں پھر بھی اس کی بات نہیں مانوں گا... اور عدالتی کارروائی اس کے بس کا روگ نہیں۔ ویسے بھی وہ کہہ چکا ہے کہ ان کے یہاں فیصلے بندوق کی نوک پر ہوتے ہیں۔“

باتیں کرتے کرتے صبح ہوگئی۔ لیلیٰ نے ناشتا بنایا اور وہ دونوں تیار ہوکر گھر سے نکل پڑے۔ ان کا ارادہ پہلے پولیس اسٹیشن جانے کا تھا۔ اشعر نے حال ہی میں پراڈو خریدی تھی اور ان دنوں وہ اسی گاڑی میں سفر کرتا تھا جبکہ لیلیٰ شوٹنگ پر جانے کے لیے اپنی کار استعمال کرتی تھی۔ اس روز بھی وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہوکر پولیس اسٹیشن پہنچے۔ ڈیوٹی پر موجود سب انسپکٹر نے اشعر سے کچھ سوالات کیے اور جب اشعر نے اسے سمندر خان کے خط اور دھمکی آمیز فون کالز کے بارے میں بتایا تو وہ کافی ناراض ہوا اور بولا۔ ”آپ لوگ خود تو پولیس سے تعاون نہیں کرتے اور بعد میں اسے ہی الزام دیتے ہیں۔ اگر آپ یہ خط ملتے ہی ہمیں اطلاع کر دیتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ پھر آپ کو ٹیلی فون پر قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں۔ تب بھی خاموش رہے۔ اب بھی اگر رات والا واقعہ نہ ہوتا تو شاید آپ چپ سادھے رہتے۔“

”دراصل مجھے ڈر تھا کہ اس طرح سمندر خان ہمارا دشمن بن جائے گا۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کئی روز تک میرا تعاقب بھی ہوتا رہا ہے۔ اس لیے پولیس سے رابطہ کرنے کی صورت میں یہ بات بھی اس کے علم میں آجاتی۔“

”دوست تو وہ اب بھی آپ کا نہیں ہے۔“ سب انسپکٹر ساجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”خیر، جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ ایک درخواست دے دیں جس میں ان تمام واقعات کا تفصیل سے ذکر ہو۔ یہ خط بھی درخواست کے ہمراہ منسلک کر دیں اور ان فون نمبرز کا بھی حوالہ دیں جہاں سے آپ کو کالز کی گئی تھیں۔ میں فی الحال آپ کے گھر اور دفتر پر سیکیورٹی کا بندوبست کر دیتا ہوں تاکہ اس سمندر خان کو بھی اندازہ ہو جائے کہ آپ پولیس کی مدد لے چکے ہیں۔ اس طرح اسے کھل کر کھیلنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ پوچھ گچھ کے لیے مجھے آپ کے اہلِ خانہ بالخصوص آپ کی والدہ کا تعاون درکار ہوگا۔ وہی آپ کے والد کے گاؤں اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ دفتر کے لوگوں اور ملازمین سے بھی پوچھ گچھ ہوگی۔ اس کے بغیر ہم سمندر خان تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ ہماری طرف سے آپ کو مکمل تعاون فراہم کیا جائے گا۔“ اشعر نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ اگر وہ آپ سے دوبارہ رابطہ کرے تو براہ کرم اس کی اطلاع فوراً ہمیں دیں۔“

وہ لوگ پولیس اسٹیشن سے سیدھے دفتر آئے۔ طاہر ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس روز انہیں آؤٹ ڈور لوکیشن دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ یہ جگہ کراچی کے مشرق میں واقع گلشنِ حدید سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ لیلیٰ کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر طاہر سمجھ گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے ورنہ وہ تو ہمیشہ ہنستی مسکراتی آیا کرتی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہوا ہے لیکن اشعر کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تب اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

”خیریت تو ہے... آپ لوگ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“

”خیریت نہیں ہے طاہر۔“ لیلیٰ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”رات ہمارے گھر پر فائرنگ ہوئی ہے۔ شکر ہے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہم لوگ پولیس اسٹیشن سے ہی آ رہے ہیں۔“

”حیرت ہے، تمہارا کون دشمن پیدا ہو گیا؟ جس علاقے میں تم رہتی ہو، وہاں تو پولیس کا گشت رہتا ہے۔ اس لیے یہ دہشت گردی کی کارروائی بھی نہیں ہو سکتی۔“

”دشمن پیدا ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔“ لیلیٰ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ اس سے پہلے کہ وہ طاہر کو تمام حالات سے آگاہ کرتی، اشعر نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

وہ بولا۔ ”چلو بھئی، دیر ہو رہی ہے۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ دھوپ تیز ہوگئی تو وہاں کھڑا ہونا بھی مشکل ہو جائے گا۔“

لیلیٰ اور طاہر نے اپنی گاڑیاں وہیں چھوڑ دیں اور اشعر کی پراڈو میں بیٹھ کر منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوگئے۔ طاہر بڑی حسرت سے اس گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس گزشتہ دس سال سے پرانے ماڈل کی مہران تھی جسے وہ کوشش کے باوجود تبدیل نہیں کر پایا تھا۔ اس کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ دوسرے درجے کا ایکٹر تھا اور اسے زیادہ تر ثانوی کردار ہی ملتے تھے جن کا معاوضہ بھی مہینوں میں ملتا تھا۔ لیلیٰ کی مہربانی سے اسے دو تین سیریلز میں مرکزی کردار مل گیا تھا لیکن وہ زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ لیلیٰ اسے اس لیے موقع دے رہی تھی کہ اس کی سیریلز کی کہانیاں زیادہ تر ہیروئن کے گرد گھومتی تھیں اور ان میں مرد کرداروں کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔

انہیں وہ لوکیشن پسند آئی۔ سین کی ضرورت کے لحاظ سے وہ جگہ نہایت مناسب تھی۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے بات چیت کی۔ دراصل انہیں گوٹھ کے ایک اسکول کے مناظر شوٹ کرنا تھے۔ اس سیریل میں لیلیٰ گاؤں کے اسکول کی استانی کا رول کر رہی تھی۔ اس کا بھی بچوں کو پڑھاتے ہوئے ایک شاٹ تھا۔ دوسرے منظر میں اسے اسکول کے برآمدے میں کھڑے ہوکر طاہر کے ساتھ کچھ مکالمے بولنا تھے جو گوٹھ کے وڈیرے کے بیٹے کا کردار ادا کر رہا تھا۔ انہوں نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے اجازت بھی لے لی اور دو گھنٹے بعد وہ واپس چلے آئے۔

دوسرے دن لیلیٰ نے سیریل کے ڈائریکٹر اور کیمرا مین کو طاہر کے ہمراہ لوکیشن دیکھنے کے لیے بھیجا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی سب انسپکٹر ساجد آ گیا۔ وہ اپنی تفتیش شروع کر چکا تھا۔ اس نے اشعر اور لیلیٰ کا تفصیلی بیان ریکارڈ کیا۔ اشعر کو تو پاکستان آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اس لیے اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ البتہ لیلیٰ کے بیان میں ساجد نے گہری دلچسپی لی اور اس کے والد کے انتقال سے لے کر اب تک پیش ہونے والے حالات اور واقعات کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کرتا رہا۔ ارشد خاں، عامر، نجمہ اور طاہر کے بارے میں بھی اس نے بہت سی باتیں پوچھیں اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو اس کی والدہ سے ملنے گھر آئے گا۔

خالہ زبیدہ کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے خالو سے ہونے والی پہلی ملاقات سے لے کر شادی ہونے تک کے تمام واقعات تفصیل سے بتا دیے۔ انہیں اپنے سسر، دیوروں اور نندوں کے علاوہ ان کے گاؤں کا نام بھی یاد تھا۔ ان کے سسر کی وہاں زمینیں تھیں اور سارا خاندان اسی گاؤں میں آباد تھا۔ البتہ انہیں یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے شوہر نے پہلے بھی ایک شادی کر رکھی تھی اور ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ اپنے شوہر کو ایک سچا اور مخلص انسان سمجھتی تھیں جس نے ان کی خاطر اپنے گھر والوں سے ناتا توڑ لیا اور ساری عمر دیارِ غیر میں گزار دی۔ وہ شخص بھلا ان سے کیسے غلط بیانی کر سکتا تھا۔ سب انسپکٹر ساجد کے لیے اتنی معلومات کافی تھیں۔ ان کے ذریعے وہ سمندر خان تک پہنچ سکتا تھا۔

دو دن بعد آؤٹ ڈور شوٹنگ کا پروگرام تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ سب لوگوں کو صبح آٹھ بجے پہنچنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ طاہر حسبِ معمول تمام انتظامات میں پیش پیش تھا۔ اس کا خلوص اور جذبہ دیکھ کر اشعر کے دل میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ طاہر کی قدر کرنے لگا تھا۔ اسے طاہر کی موجودگی سے بڑی ڈھارس تھی کیونکہ وہ پہلے کی طرح پروڈکشن ہاؤس کے بہت سے کام بغیر کہے کر دیا کرتا تھا۔

خالہ زبیدہ کی طبیعت رات سے ہی ناساز تھی۔ اشعر اس معاملے میں کسی قسم کی بے احتیاطی اور بے پروائی کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے صبح اٹھتے ہی ڈاکٹر کو فون کرکے اپائنٹمنٹ لے لیا۔ اسے دو بجے ماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ شوٹنگ پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دے لیکن لیلیٰ نے اصرار کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی لیکن پہلی شوٹنگ پر ضرور ساتھ چلے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ اگر کام وقت پر ختم نہ ہوا تو وہ بارہ بجے وہاں سے چل دے گا۔

ان کا قافلہ ٹھیک آٹھ بجے روانہ ہو گیا۔ لیلیٰ نے ڈائریکٹر اور کیمرا مین سے کہہ دیا تھا کہ وہ جلد از جلد کام ختم کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اشعر کو بارہ بجے ایک ضروری کام سے واپس جانا ہے۔ یہ سن کر طاہر اسے چھیڑنے لگا اور بولا۔ ”تم تو ایسے کہہ رہی ہو کہ اشعر کے بغیر ہم لوگ شوٹنگ نہیں کر سکتے۔ لگتا ہے کہ تم نے پروڈکشن ہاؤس کے معاملات کے ساتھ ساتھ اپنا تجربہ اور صلاحیتیں بھی اسے منتقل کر دی ہیں۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ لیلیٰ بھناتے ہوئے بولی۔ ”آج ان کے سیریل کی پہلی شوٹنگ ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ سارا کام ان کی موجودگی میں ہو۔“

”...ں کریں گے لیکن تین چار بجے سے پہلے فارغ ہونا مشکل ہے۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔

http://digestpk.blogspot.com/

لوکیشن پر پہنچ کر انہوں نے اپنی گاڑیاں اسکول کے احاطے میں پارک کیں۔ اس روز بھی لوگ اپنی اپنی کاروں میں آئے تھے۔ اس کے علاوہ یونٹ کی.... وین اور وینیٹی وین بھی ان کے ساتھ آئی تھی۔ لوکیشن پر پہنچ کر اشعر نے اپنی جیب پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''ارے... سگریٹ تو آفس میں ہی رہ گئے۔ تم لوگ کام شروع کرو۔ میں سگریٹ لے کر ابھی آتا ہوں۔''

لیلیٰ منہ بنا کر رہ گئی۔ اشعر کو کثرت سے سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ وہ کئی بار اس سے سگریٹ چھوڑنے کے لیے کہہ چکی تھی لیکن وہ وعدہ کرنے کے باوجود اس عادت سے باز نہ آتا۔ اشعر کے جانے کے بعد ان لوگوں نے اپنا سامان نکالا اور شوٹنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لیلیٰ نے ہیڈ ماسٹر سے کہہ دیا تھا کہ شوٹنگ کے دوران بچوں کو کلاس روم میں ہی رہنا چاہیے ورنہ وہ لوگ سکون سے کام نہیں کر سکیں گے۔

تھوڑی دیر بعد اشعر سگریٹ لے کر واپس آیا تو اسکول کے بچے ان کی گاڑیوں کے گرد جمع تھے اور ایک ٹیچر انہیں کلاس روم میں جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اشعر نے بچوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچنے کے لیے اپنی پراڈو اسکول کے احاطے کے باہر ایک درخت کے سائے تلے کھڑی کر دی اور اندر آ کر تیاریوں کا جائزہ لینے لگا۔

شوٹنگ شروع ہو چکی تھی لیکن اس کی رفتار دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ تین بجے سے پہلے اپنا کام ختم نہیں کر سکیں گے۔ طاہر کا صرف ایک ہی شاٹ تھا۔ وہ اپنا سین شوٹ کروانے کے بعد ریفریشمنٹ کا انتظام کرنے گلشنِ حدید چلا گیا۔ اس کی واپسی گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ لیلیٰ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ نیشنل ہائی وے پر کچھ لوگوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ اسے لوٹنا چاہ رہے تھے لیکن اس نے گاڑی روکنے کے بجائے اس کی اسپیڈ بڑھا دی اور کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ساڑھے گیارہ بجے بریک ہوا اور سب لوگ ریفریشمنٹ کے لیے بیٹھ گئے۔ طاہر کسی کام سے باہر گیا تو لیلیٰ اپنی لائنیں یاد کرنے لگی۔ اشعر نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''اوہو... بارہ بج گئے۔ میں چلتا ہوں۔ تم بھی کام سے فارغ ہو کر گھر ہی آنا۔''

اس کا جملہ ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ نائلہ کی کال تھی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کو ایک میٹنگ کے سلسلے میں اچانک ہی اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے۔ اس لیے آج کا اپائنٹ منٹ کینسل ہو گیا ہے۔ اب دو دن بعد کا وقت دیا ہے۔

اشعر کو بہت غصہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں انسان کی صحت سے زیادہ میٹنگوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر انہیں جانا ہی تھا تو اپنی جگہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو بٹھا جاتے لیکن اس طرح کون سوچتا ہے؟ اس نے واپسی کا ارادہ ملتوی کیا اور شوٹنگ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس شاٹ میں لیلیٰ ایک اسکول ٹیچر کے روپ میں بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو سب یہی سمجھے کہ قریب ہی کوئی بم پھٹا ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو ایک انتہائی دل خراش منظر ان کے سامنے تھا۔ اشعر کی پراڈو کے پرخچے اڑ گئے تھے اور وہ شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ آگ اتنی شدید تھی کہ اس کی حدت ان تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اشعر نے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور لیلیٰ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

طاہر نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر پولیس اور فائر بریگیڈ کو فون کر دیا۔ پولیس موبائل تو دس منٹ بعد ہی پہنچ گئی۔ انہوں نے سب سے پہلے اسکول کے بچوں کو گھر بھیجنے کے لیے کہا اور پھر جائے حادثہ کا معائنہ کرنے کے بعد ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ کر دی۔ تھوڑی دیر بعد متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او، بم ڈسپوزل اسکواڈ کا عملہ اور فائر بریگیڈ کی گاڑی بھی آ گئی۔ انہوں نے آگ تو بجھا دی لیکن پراڈو جل کر تباہ ہو چکی تھی۔ جب اس کا معائنہ کیا گیا تو اس کے انجن کے پاس ٹائم بم کا چھوٹا سا ٹکڑا...... نظر آیا جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس طرح اشعر کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اگر وہ اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو جاتا تو وہ بھی پراڈو کے ساتھ ہی جل کر کوئلہ ہو جاتا۔

سب انسپکٹر ساجد نے سمندر خان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارنا شروع کر دیے۔ ایک پولیس پارٹی اس کے گاؤں بھی روانہ کر دی گئی تھی۔ ساجد نے اشعر اور لیلیٰ کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اپنی تمام سرگرمیاں معطل کر دیں اور گھر پر ہی رہیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد حملہ آور تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا جبکہ اشعر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر پولیس اپنی کوشش میں ناکام رہی تو وہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر فیملی سمیت جاپان چلا جائے گا اور اپنے باپ کی طرح اپنی زندگی کا بقیہ حصہ وہیں گزار دے گا۔

ایک ہفتے بعد سب انسپکٹر ساجد نے اسے فون کر کے اطلاع دی کہ حملہ آور پکڑا گیا ہے اور وہ دونوں فوراً تھانے پہنچ جائیں۔ وہاں انہوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔

حوالات میں سمندر خان نہیں بلکہ طاہر سر جھکائے کھڑا تھا۔

''یہ... یہ سب کیا ہے؟'' لیلیٰ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے طاہر کو کیوں گرفتار کیا ہے؟''

''اس لیے کہ یہی اصل ملزم ہے۔'' ساجد نے اطمینان سے جواب دیا پھر وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گیا اور انہیں اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ دونوں کو یہ جان کر خوشی اور حیرت ہوگی کہ سمندر خان نامی آپ کے کسی سوتیلے بھائی کا وجود نہیں ہے اور نہ ہی آپ کی کوئی سوتیلی ماں ہے۔ ہماری جو پارٹی وہاں گئی تھی، اس کی انکوائری کے مطابق اب اس گاؤں میں آپ کے خاندان کا کوئی فرد نہیں رہتا۔ آپ کے دادا اور چچاؤں کا انتقال ہو گیا ہے جبکہ پھوپیاں بیاہ کر دوسرے شہروں کو چلی گئی ہیں۔ ہماری پارٹی نے مقامی پولیس کے تعاون سے گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے جو معلومات حاصل کیں، ان کے مطابق آپ کے والد کی نہ تو کوئی دوسری بیوی ہے اور نہ کوئی بیٹا۔ اس لیے وہ کوئی اور تھا جو سمندر خان بن کر آپ لوگوں کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔''

''لیکن طاہر کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟'' لیلیٰ نے پوچھا۔

''یہ سارا جال اسی نے بُنا تھا۔ جب پہلی بار مجھے اس واقعے کا علم ہوا تو مجھے سمندر خان کی کہانی میں کئی جھول نظر آئے۔ تیس سال بعد کسی شخص کا اپنے باپ کے وارثوں تک پہنچ جانا سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ لوگ سمندر خان سے ڈرتے رہے لیکن میں پہلے روز ہی سمجھ گیا تھا کہ سمندر خان ایک فرضی کردار ہے جس کی آڑ میں کوئی اور شخص اپنا کھیل کھیل رہا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی تفتیش کا رخ اس جانب موڑ دیا۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو آپ سے بے حد قریب ہو اور جسے آپ کے تمام حالات سے واقفیت ہو۔ میرا پہلا شک طاہر پر گیا لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا؟ ہم پولیس والے جب کیوں اور کیسے میں الجھ جائیں تو ساری گتھیاں ایک ایک کر کے سلجھتی جاتی ہیں۔ جب آپ کی گاڑی میں بم بلاسٹ ہوا تو پہلا سوال میرے ذہن میں یہی آیا کہ اگر یہ کام سمندر خان کا ہے تو اسے آپ کی واپسی کے پروگرام کی اطلاع کیسے ملی؟ پھر طاہر کا ریفریشمنٹ لینے کے بہانے وہاں سے کھسک جانا بھی مجھے کھٹک رہا تھا۔ جب یہ تصدیق ہو گئی کہ سمندر خان ایک فرضی کردار ہے تو میں نے اپنی پوری توجہ طاہر پر مرکوز کر دی۔ اس خط کی تحریر پر مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ گاؤں میں رہنے والے کسی اَن پڑھ کی ایسی ہینڈ رائٹنگ اور اندازِ تحریر نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھ گچھ کے بہانے اسے تھانے بلایا اور اسے بہلا پھسلا کر ایک تحریری بیان دینے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی کہ تفتیش کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس نے میری باتوں میں آ کر ایک مختصر بیان لکھ دیا اور مجھے ذرہ برابر شک نہ رہا کہ یہ خط طاہر نے ہی لکھا تھا۔ میں نے اسے حوالات میں بند کر دیا اور جب پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے ان تمام واقعات کی ذمے داری قبول کر لی۔''

''لیکن طاہر نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟'' لیلیٰ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ شروع سے ہی آپ کی دولت پر اس کی نظر تھی۔ وہ اسی لیے آپ کا اعتماد حاصل کرنے میں کوشاں رہتا کہ مناسب موقع دیکھ کر وہ آپ کو شادی کے لیے پروپوز کرے گا لیکن اس سے پہلے ہی اشعر صاحب درمیان میں آ گئے۔ آپ نے صرف ان سے شادی ہی نہیں کی بلکہ انہیں اپنے کاروباری امور میں بھی شریک کر لیا۔ طاہر سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔ آپ اپنی سادگی میں اسے بہت سی ذاتی باتیں بتا چکی تھیں۔ اس نے انہی کی روشنی میں سمندر خان کا فرضی کردار تخلیق کیا اور اس کی آڑ میں اشعر کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اشعر کے قتل کا سارا الزام سمندر خان پر آئے گا۔ پولیس سمندر خان کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہے گی اور وہ آپ سے مزید ہمدردی جتا کر مناسب موقع پر شادی کر لے گا۔ اس طرح وہ آپ کے ساتھ ساتھ اشعر کی بھی تمام دولت کا مالک بن جاتا۔''

سب انسپکٹر ساجد نے اپنی بات ختم کی تو لیلیٰ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ''مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔''

اشعر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے وہ شعر نہیں سنا، ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔''

سب انسپکٹر ساجد نے دوسرا مصرع پڑھا۔ ''دیتے ہیں یہ دھوکا بازی گر کھلا۔''

بات ختم کر کے ساجد نے چپراسی کو بلا کر چائے کے لیے کہا۔ لیلیٰ گم صم سی تھی۔ وہ طاہر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ واقعی دولت ایسی چیز ہے جس کے لیے انسان اپنے آپ کو ایک ایسے خول میں بند کر لیتا ہے کہ اسے پہچاننا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مگر وقت آنے پر جب اس کا اصل چہرہ سامنے آتا ہے تو یہ جان کر شدید حیرت اور صدمہ ہوتا ہے کہ اس انسان نے دولت کے لیے ایسا کیا جسے آپ اپنے بے حد قریب اور اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں...!

http://digestpk.blogspot.com/

دوسرا رنگ

شہرِ آشوب

مریم کے خان

کچھ دلوں ...... جگہوں اور شہروں پر ہمیشہ خوف کا موسم بسیرا کئے رکھتا ہے ...... جستجوئے شوق اور ہزار جدوجہد کے باوجود ان کی زندگی میں کبھی بہار کے پھول نہیں کھلتے ...... ان کے دل کی گلیوں میں گہری خاموشی اور سناٹا چھایا رہتا ہے ...... نظامِ انصاف کا فقدان انہیں غلامی سے قریب تر اور آزادی سے دور کرتا چلا جاتا ہے ...... طاقت کے زور پر زیر لینے والی ایک شکستہ ویراں وادی کے قرب و جوار میں گردش کرتی کہانی جس کی ہر جا مقتل گاہ تھی۔

نئے موسموں کے انتظار میں زندگی تیاگ دینے والے جانبازوں کا ماجرائے دگرگوں

نواز گل دفتر میں داخل ہوا تو ریٹا اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ روز اسے دیکھ کر مسکراتی تھی اس لیے نہیں کہ وہ نواز گل کو پسند کرتی تھی بلکہ اس لیے کہ تاخیر سے آنے پر نواز گل کو ایڈیٹر فران سے جھاڑ پڑتی' اس بات سے ریٹا کو بہت خوشی ہوتی۔ ریٹا کٹر قدامت پرست اور کسی قدر نازی خیالات رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے خیالات چھپانے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے خیال میں باہر سے آنے والے تارکینِ وطن نہ صرف گوروں کی نسل خراب کررہے تھے بلکہ ان کا کلچر بھی بدل رہے تھے، سب سے بڑھ کر وہ ان سے روزگار چھین رہے تھے۔

نواز گل برطانیہ کے ایک معروف اخبار میں رپورٹنگ کرتا تھا' اس کا شعبہ سیاست تھا لیکن وہ ضرورت پڑنے پر دوسرے کام کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا اس لیے فران اس کی تاخیر سے آنے کی عادت بھی برداشت کرلیتا تھا۔ صرف بیس سال کی عمر میں اس مقام تک پہنچ جانا دوسروں کے لیے قابلِ رشک بھی تھا اور اس کی صلاحیتوں کی دلیل بھی۔ نواز گل نے ریٹا کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''کاش! کبھی تم پیار سے مسکرا کر دیکھو۔''

''وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔'' ریٹا نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اور فران تمہیں یاد کررہا ہے۔''

''کیا پتا آ ہی جائے۔'' نواز گل نے فران کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے وہ دن آئے گا۔''

نواز گل اندر چلا گیا اور ریٹا دانت پیس کر رہ گئی۔ نواز اکثر اسے چھیڑتا تھا اور وہ چڑ جاتی تھی۔ کسی کالے برطانوی سے محبت کرنے سے بہتر تھا، وہ ساری عمر بغیر محبت کے ہی گزار دیتی۔ نواز گل، فران کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے ہی اخبار کا تازہ ایڈیشن دیکھ رہا تھا اور اس کے سامنے میز پر رکھے کپ سے کافی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اس نے نواز گل کی طرف دیکھا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔

''آج بھی تم تاخیر سے آئے ہو...''

''اس کے لیے میں آج بھی معذرت خواہ ہوں۔'' نواز نے مسکرا کر کہا۔ اسے معلوم تھا فران حسبِ عادت کہہ رہا ہے۔

فران نے اخبار اس کے سامنے کردیا۔ اس میں ایک تصویر تھی جس میں پندرہ سولہ سال کے متعدد نوجوان ہاتھوں میں پتھر لیے مسلح فوجیوں کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ تصویر ایک آرٹیکل کے ساتھ تھی۔ آرٹیکل مقبوضہ کشمیر کے بارے میں تھا۔ فران نے پوچھا۔ ''تم نے یہ دیکھا ہے؟''

نواز کا منہ بن گیا۔ مضمون نگار اخبار کا ایک پرانا صحافی تھا جو کٹر بھارت نواز تھا۔ اس مضمون میں بھی اس نے دل کھول کر بھارت کی حمایت کی تھی اور صورتِ حال کی خرابی کی تمام ذمے داری پاکستان پر ڈال دی تھی۔ نواز نے سر ہلایا۔

''ہاں، پڑھا ہے۔''

''کیا تم سیمور سے متفق ہو؟'' فران نے مضمون نگار کا نام لیا۔ اس کے لہجے میں شرارت نمایاں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ نواز سیمور سے چڑتا ہے۔ ان میں تنازع اس وقت پیدا ہوا جب فرانس میں ہونے والے نسلی فسادات کی رپورٹنگ کے لیے ان دونوں کو بھیجا گیا اور انہوں نے متضاد رپورٹس بھیجی تھیں، اس پر اخبار مالکان نے ان کو طلب کرکے میٹنگ کی تھی جو دونوں کے جھگڑے پر ختم ہوئی۔ بس ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

''میں اس کی صرف ایک بات سے اتفاق کرسکتا

ہوں... اگر وہ کہے کہ وہ دنیا کا سب سے گھٹیا صحافی ہے تو میں فوراً اس کی بات مان لوں گا۔''

''اس لیے کہ وہ یہودی ہے؟''

''نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ سچ مچ گھٹیا صحافی ہے۔''

فران نے کمپیوٹر پر ایک فائل کھولی۔ یہ بھارت کے زیرِ تسلط کشمیر کے بارے میں تھی۔ فران نے کہا۔ ''گزشتہ چند مہینوں میں کشمیر کے حالات میں ڈرامائی تبدیلی آئی ہے اور بظاہر اچھے نظر آنے والے حالات اچانک ہی خرابی کی انتہا کو چھونے لگے ہیں۔ مسلسل کرفیو اور ہڑتالوں سے عام آدمی کی زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی ہے۔''

''یہ تو سب جانتے ہیں۔'' نواز نے کہا۔

''نواز! میں محسوس کررہا ہوں کہ ہمارے اخبار کا بین الاقوامی ڈیسک اس معاملے سے انصاف نہیں کررہا۔ میں چاہتا ہوں کہ کشمیر کی موجودہ صورتِ حال کا مکمل احاطہ کیا جائے۔''

نواز نے سیمور کی رپورٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس نے احاطہ کیا تو ہے۔''

فران نے اخبار ایک طرف کردیا۔ ''یہ جھوٹ کا پلندا ہے۔ مجھے حقیقی رپورٹنگ چاہیے۔''

نواز چپ رہا۔ اس نے پوچھا نہیں کہ حقیقی رپورٹ کہاں سے ملے گی۔ اسے پتا تھا بلی خود تھیلے سے باہر آجائے گی۔ آخر فران نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اور ریٹا انڈیا جاؤ۔''

''میں اور ریٹا؟'' نواز اچھل پڑا۔ ''مجھے کوئی اعتراض

http://digestpk.blogspot.com/

نہیں لیکن وہ کسی صورت نہیں مانے گی۔"

"اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے۔" نواز نے شانے اچکائے۔ "ویسے مجھے منتخب کرنے کی وجہ؟"

فران پہلی بار مسکرایا۔ "کیونکہ تمہارا تعلق کشمیر سے ہے۔"

شام کو گھر جاتے ہوئے وہ میٹرو میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا وہ واقعی کشمیری ہے۔ وہ برطانیہ میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی سرزمین کشمیر پر قدم نہیں رکھا تھا۔ اسے کشمیری زبان نہیں آتی تھی اور اس کی اردو بھی واجبی سی تھی لیکن آج اس کو کشمیری کہا گیا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ زمین سے رشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے۔ وہ اپنے اسٹیشن پر اترنے لگا تو ٹرین کے کھلے دروازے سے سرمنڈے نوجوانوں کا ایک گروپ وحشیانہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ انہوں نے صرف نواز کو نہیں بلکہ کچھ کمزور حضرات اور عورتوں کو پیچھے دھکیلا۔ یہ برطانوی معاشرے کی بگڑی ہوئی تصویر تھی۔ نسل پرست نوجوان جن کے نزدیک ہر مسئلے کا ایک ہی حل تھا کہ غیر برطانوی افراد کو برطانیہ سے نکال دو۔ نواز نے بہ مشکل باہر جانے کا راستہ بنایا لیکن کئی افراد جنہوں نے اس اسٹیشن پر اترنا تھا، اندر رہ گئے اور اب بے بسی سے تلملا رہے تھے۔

نواز نے گھر میں داخل ہوتے ہی پکارا۔ "گرینڈ پا! آپ کہاں ہیں؟"

"یہاں ہوں بیٹے۔" اندر سے ایک نحیف آواز میں جواب آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے دادا اپنے کمرے میں ہوں گے لیکن اس نے حسبِ عادت پوچھا تھا۔ فیاض گل کو دو سال سے فالج تھا۔ نواز ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نرس آکر فزیوتھراپی اور دوسرے کام نمٹاتی تھی۔ نواز کمرے میں آیا، فیاض گل بستر پر دراز ایک کتاب دیکھ رہے تھے، ان کا ایک ہاتھ کام کرتا تھا اور وہ اس کی مدد سے اپنے بہت سے کام کر لیتے تھے۔ ستّر برس کی عمر میں بھی وہ باہمت اور حوصلہ مند آدمی تھے۔

نواز جب صرف بارہ برس کا تھا تو اس کے ماں باپ دونوں ایک ٹریفک حادثے میں اس دنیا سے گزر گئے تھے۔ تب سے فیاض گل نے نواز کی پرورش کی تھی۔ یہی وجہ تھی اس کی شخصیت پر دادا کی چھاپ تھی۔ نواز نے آکر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو روشنی اندر آنے لگی۔ "آپ نے میگی سے پردہ کیوں نہیں ہٹوایا؟"

"بس کچھ نیم تاریکی میں رہنے کو دل چاہ رہا تھا... تم سناؤ؟"

نواز کرسی کھینچ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "گرینڈ پا! یہ بتائیں کیا میں کشمیری ہوں؟"

"ہاں، تم کشمیری نژاد ہو جیسے کہ اس ملک میں لاکھوں لوگ ہیں۔"

"میں یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہوں... کیا تب بھی کشمیری کہلاؤں گا؟"

"ہاں، زمین اپنا نام اتنی آسانی سے واپس نہیں لیتی ہے۔ بات کیا ہے؟"

"فران مجھے کشمیر بھیج رہا ہے..."

فیاض گل پُرجوش ہو گئے۔ "واقعی... تم کشمیر جاؤ گے؟"

"ہاں نوکری ہے... جانا تو پڑے گا۔" اس نے شانے اچکائے۔

فیاض گل کا جوش مدھم پڑ گیا۔ "یعنی تم صرف نوکری کی وجہ سے جاؤ گے؟"

"اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے گرینڈ پا؟"

"وہ تمہارے آباؤاجداد کی سرزمین ہے، کیا تمہیں اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی؟"

"دلچسپی ضرور ہے لیکن کشش نہیں ہے۔" نواز نے صاف گوئی سے کہا۔ "میرا ملک یہ ہے جہاں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہوں۔"

"اس کے باوجود کہ یہاں کے لوگ اب بھی ہمیں کشمیری سمجھتے ہیں؟"

"اس میں میرا قصور تو نہیں ہے، یہ آپ کا یا یہاں کے آبائی لوگوں کا قصور ہے۔ آپ اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آئے اور یہ لوگ ہمیں اس ملک کا شہری نہیں سمجھتے۔"

"یہ تمہیں ڈی گریڈ تو کرتے ہیں۔"

"ہاں لیکن صرف اس لیے میں برطانیہ کو اپنا ملک ماننے سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ آج میں جس مقام پر ہوں، اس میں اس ملک کا ہاتھ ہے۔"

"میرے بچے... تمہاری صلاحیتیں بھی تو ہیں۔"

"گرینڈ پا! کشمیر میں مجھ جیسے لاکھوں کشمیری جوان ہیں، کیا ان سب کو وہ مواقع ملے جو مجھے ملے ہیں...؟ اس کے برعکس برطانیہ میں آباد میرے جیسے ہزاروں کشمیریوں کو ملے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" فیاض گل نے اعتراف کیا۔ "لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کشمیر سے ہمدردی نہ رکھو۔"

"ایسا نہیں ہے، ہم سب اپنے سابق وطن سے ہمدردی رکھتے ہیں۔" نواز نے یقین سے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، مجھے کشمیر جانا چاہیے؟ یہ ایک مشکل جاب ہے۔"

"تمہیں جانا چاہیے۔" فیاض گل نے حسرت سے کہا۔ "کاش! میں ایک بار پھر کشمیر دیکھ سکتا۔"

نواز مسکرایا۔ "گرینڈ پا! آپ کے پاس یہ موقع چالیس سال رہا لیکن آپ یہاں آنے کے بعد ایک بار بھی کشمیر نہیں گئے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" فیاض گل شرمندہ ہو گئے۔ "ہم وہ منافق نسل ہیں جو کشمیر کشمیر کرتے یہاں آکر بس گئے اور ساری عمر کشمیر کی تسبیح پڑھتے رہے لیکن مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ شکر ہے، ہماری نئی نسل اس منافقت سے پاک ہے۔"

"گرینڈ پا... یہ صاف گوئی بھی اس ملک نے دی ہے۔"

نواز اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے کمپیوٹر پر اخبار دیکھا۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ ذمے داری کا حصہ تھا۔ سیمور کا مضمون وہ صبح دیکھ چکا تھا لیکن اس نے ایک بار پھر اسے پڑھا۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس شخص کے خیالات کس قدر متعصبانہ تھے۔ وہ یہودی تھا اور اس کے خیال میں دوسری قوموں اور دنیا کے اہم مسائل کو یہودی نظر سے دیکھنا اس کا حق تھا۔ سیمور کا مضمون پڑھنے کے بعد اسے کشمیر سے زیادہ دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

فران مزاجاً.... معتدل خیالات رکھنے والا انصاف پسند گورا تھا۔ خاص طور سے دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اس میں مغربی ممالک کی پالیسیوں پر وہ خاصے متوازن خیالات رکھتا تھا اور اس میں اتنی جرأت تھی کہ ان خیالات کا اظہار بھی کر سکے۔ اس نے یہ مقام اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اخبار کا سب سے اہم ایڈیٹر تھا۔ نواز کو جاب اسی نے دلائی تھی۔ دس سال پہلے جب نواز نے اخبار میں کام شروع کیا تو وہ ایک معمولی سا رپورٹر تھا جس کے ذمے غیر اہم کام لگائے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی اور بالآخر وہ اخبار کے چند اہم رپورٹرز میں شامل ہو گیا۔ اس کی یہ ترقی اس کے بعض ساتھیوں کو بہت کھٹکتی تھی لیکن فران اور اس جیسے معتدل لوگ نواز کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

اگلے روز نواز دفتر پہنچا تو خلافِ توقع ریٹا نے اسے دیکھ کر مسکرانے کے بجائے منہ بنایا۔ نواز اس کی میز کے پاس رک گیا۔ "خیریت... آج تم نے طنزیہ مسکراہٹ سے بھی گریز کیا ہے؟"

"مجھے تمہارے ساتھ کشمیر بھیجا جا رہا ہے۔" اس نے بگڑے لہجے میں کہا۔

"تو اس میں اتنا بُرا منانے کی کیا بات ہے؟"

"کیونکہ مجھے تم سے یا کشمیر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس میں دلچسپی کہاں سے آگئی۔ یہ تو ہماری جاب کا حصہ ہے۔"

"ہاں، جاب ہے۔" ریٹا جھنجلا گئی۔ "لیکن تم سوچو جس جاب میں انسان کو دلچسپی نہ ہو وہ جاب کیسے مکمل کرے گا؟"

"بہتر ہوگا، یہ بات تم فران سے کرو۔" نواز نے اسے مشورہ دیا۔

"کر چکی ہوں۔" اس نے پھر بُرا سا منہ بنایا۔ "وہ سننے کے لیے تیار نہیں پھر اس نے مجھے کشمیر کی کچھ تصویریں بھی دکھائی ہیں۔" ریٹا نے ایک فولڈر اس کے سامنے کر دیا۔ "تم خود دیکھو، کیا ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص کشمیر جانے سے انکار کر سکتا ہے؟"

فولڈر میں کشمیر کے فطری مناظر کی تصاویر تھیں۔ پہاڑ جن کی چوٹیاں برف پوش تھیں، جھیلیں جن میں آسمان نظر آتا تھا، ایسے باغ جن میں ہزار رنگ کے پھول تھے اور ایسے

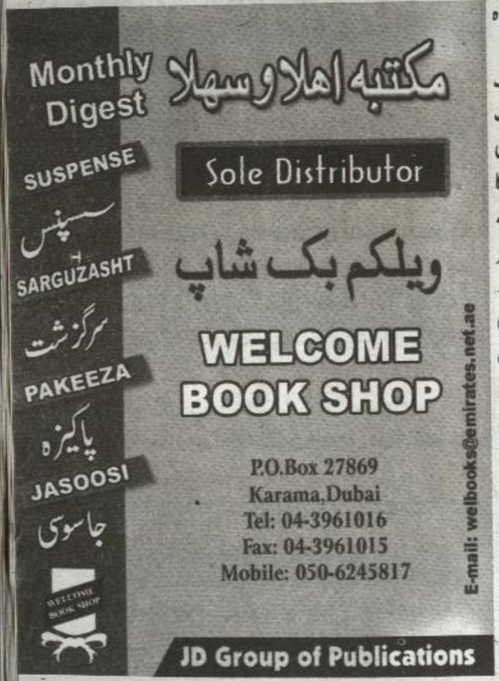

http://digestpk.blogspot.com/

جھرنے جن کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ان میں پانی کے بجائے شیشہ بہہ رہا ہے۔ تہ در تہ جنگل اور میلوں پر پھیلے گلیشیئر ز تھے۔ خود نواز بھی ان مناظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ بچپن سے وہ کشمیر کے بارے میں سنتا آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کشمیر کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہے لیکن اس فولڈر کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کشمیر کے بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ ریٹا نے بے چارگی سے کہا۔

''بتاؤ، انسان کیسے انکار کرسکتا ہے... یہ فران کا کمینہ پن نہیں ہے؟''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن ہمیں کشمیر میں یہ سب نظارے دیکھنے کو نہیں ملیں گے کیونکہ ہم شہروں اور قصبوں میں جائیں گے اور وہاں وہی سب دیکھنے کو ملے گا جو ٹی وی اور اخبارات میں دکھایا جاتا ہے۔''

''پھر بھی امکان ہے کہ شاید کہیں یہ سب دیکھنے کو مل جائے۔'' ریٹا نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''شاید۔'' نواز نے کہا اور اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔ آج اس کی طلبی نہیں ہوئی تھی۔ نواز سارا دن کشمیر کے بارے میں میڈیا کی رپورٹس دیکھتا رہا اور جیسے جیسے وہ رپورٹس دیکھ رہا تھا اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں مغربی میڈیا تصویر کا ایک رخ دکھا رہا ہے اور رپورٹس میں حقائق کا تناسب بہت کم ہے۔ اکثر رپورٹس میں بھارت کی طرف جھکاؤ واضح تھا۔ پھر اس نے بھارتی اخبارات اور ٹی وی کی کشمیر کے بارے میں رپورٹس کو دیکھا تو یہاں بھی جانب داری بہت واضح تھی۔

شام تک اس کی معلومات میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ شام کو فران نے اسے اور ریٹا کو طلب کیا اور انہیں ایک ایک لفافہ دیا۔ ''اس میں ریٹرن ٹکٹ ہے اور اوپن ہے۔ ایک چیک اخراجات کے لیے ہے۔ کل تک ویزا بھی لگ جائے گا۔''

''ہمیں کب روانہ ہونا ہے؟'' نواز نے پوچھا۔

''جلد از جلد۔ ویزا لگتے ہی تم دونوں پہلی فلائٹ سے روانہ ہوجاؤ گے۔''

''ایک سوال اور ہے... اس کام کے لیے مجھے تم نے کیوں منتخب کیا ہے؟''

نواز کے سوال پر فران مسکرایا۔ ''تمہیں شاید حیرت ہو... تمہارا نام سیمور نے تجویز کیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کیونکہ تم کشمیر سے تعلق رکھتے ہو اس لیے وہاں کے لوگ تم پر اعتماد کریں گے اور یوں تمہیں کام کرنے میں آسانی رہے گی۔''

☆☆☆

جس وقت برٹش ائرویز کا طیارہ دہلی کی طرف محوِ پرواز ہوا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ جب وہ دہلی ائرپورٹ پر اترتے تو وہاں صبح کے آثار ہوتے۔ نواز نے ڈنر کرتے ہی سونے کے لیے سیٹ دراز کرلی۔ لمبی پرواز میں وہ اپنا بیشتر وقت سو کر گزارتا تھا۔ ریٹا اس کے برابر میں بیٹھی اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہی تھی۔ وہ تقریباً ستائیس برس کی خوش شکل اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھی اور کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں تھا اس لیے اکثر نواز اسے چھیڑتا رہتا تھا۔

انہیں دہلی ائرپورٹ پر چند گھنٹے گزارنے کے بعد سری نگر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ریٹا یہ جان کر کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ انڈیا کا دارالحکومت دیکھے۔ نواز نے اسے تسلی دی۔ ''یہ کام تم واپسی پر کرسکتی ہو۔ ابھی تو ہمیں سری نگر پہنچنا ہے کل کشمیری، ریلی نکال کر اقوام متحدہ کے دفتر تک مارچ کریں گے۔''

''آخر یہ لوگ انڈیا کے ساتھ سکون سے کیوں نہیں رہتے؟'' ریٹا نے منہ بنایا۔

''کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انڈیا نے ان کی آزادی سلب کی ہوئی ہے۔''

''بکواس... انڈیا ایک بڑا ملک ہے۔ کشمیریوں کو اس کے ساتھ رہنے میں زیادہ فائدہ ہے۔''

''یہ بات تم چل کر کشمیریوں کو سمجھانا... ممکن ہے وہ تمہاری بات مان جائیں۔'' نواز بولا اور پھر شرارت سے کہا۔ ''ویسے یہ مل کر رہنے والی بات ہے قابلِ غور... کہ دو مختلف عقائد اور قومیت کے حامل افراد مل کر رہیں۔''

ریٹا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔ نواز سیٹ پھیلا کر سو گیا۔ اس کی آنکھ ریٹا کے ہلانے پر کھلی تھی۔ ''اٹھ جاؤ دہلی آنے والا ہے۔''

نواز نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ ائرہوسٹس ناشتے کی ٹرالی لا رہی تھی، وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی لینڈنگ کا اعلان ہونے لگا اور کوئی دس منٹ بعد طیارہ رن وے پر اتر چکا تھا۔ اکتوبر میں موسم گرم اور خشک تھا، اس کا اندازہ نواز کو باہر آتے ہی ہوگیا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور فضا میں دھوئیں کی آلودگی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ امیگریشن کے لیے پہنچا تو اس کا نام دیکھ کر امیگریشن افسر چونک گیا، اس نے اردو میں کہا۔ ''مسٹر نواز! کیا تمہارا تعلق

انڈیا سے ہے۔''

''میرا خیال ہے میرا پاسپورٹ برٹش ہے۔'' نواز نے جواب دیا۔

''پھر تمہارے باپ کا تعلق یہاں سے ہوگا؟''

''ہاں ان کا تعلق یہیں سے تھا لیکن میں انگلینڈ میں پیدا ہوا ہوں، اس لحاظ سے برٹش شہری ہوں۔''

امیگریشن افسر نے اس سے مزید کچھ سوال کیے کہ اسے کہاں کہاں جانا ہے۔ نواز نے اس کے سوالوں کے غلط جواب دیے۔ اگر وہ اسے اپنے کشمیری ہونے یا کشمیر جانے کے بارے میں بتا دیتا تو شاید اسے الگ سے لے جا کر پوچھ گچھ کی جاتی۔ امیگریشن سے نمٹ کر وہ لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے بورڈ پر دیکھ لیا تھا کہ سری نگر جانے والی پرواز دس بجے روانہ ہوگی۔ کچھ دیر میں ریٹا بھی لاؤنج میں آ گئی لیکن وہ اس سے ذرا دور اور لاتعلق انداز میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے طیارے میں طے کرلیا تھا کہ بلاضرورت شناسائی ظاہر نہیں کریں گے۔

نواز اور ریٹا کا پروگرام طے شدہ تھا۔ نواز کو مقبوضہ کشمیر پہنچ کر مقامی لیڈر شپ سے مل کر حالات اور کشمیریوں کے خیالات جاننے کی کوشش کرنی تھی جبکہ ریٹا کو این جی اوز کی مدد سے ان خواتین تک پہنچنا تھا جو کشمیر میں جاری تحریک سے کسی طرح بھی متاثر ہوئی تھیں۔ نواز اور ریٹا دونوں کے پاس کچھ رابطے تھے لیکن وہ ان کو ضرورت کے وقت ہی استعمال کرسکتے تھے۔ اس وقت تک ان کو اپنی شناخت چھپا کر رکھنی تھی اسی لیے انہوں نے خود کو سیاح ظاہر کیا تھا کیونکہ مقبوضہ کشمیر میں ایسے واقعات ہوئے تھے جب غیر ملکی میڈیا کو ان کی سیکیورٹی کے بہانے وہاں داخلے سے روک دیا گیا تھا۔

وقت گزاری کے لیے نواز مقامی اخبارات لے آیا اور انہیں دیکھنے لگا۔ یہ چھ سات صفِ اول کے اخبارات تھے۔ اس نے نوٹ کیا کہ ان سب میں کشمیر کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ کشمیر کا ذکر صرف کسی بھارتی راہنما کے الفاظ میں تھا ورنہ وہاں جاری تحریک کے بارے میں خبریں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اخبارات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے انہیں ڈسٹ بن کی نذر کیا اور ائرپورٹ پر موجود ایک کوریئر سروس کے دفتر پہنچا۔ وہاں اس نے اپنا نام اور ایک پارسل نمبر بتایا۔

''کیا میرا یہ پارسل آ گیا ہے؟'' اس نے کاؤنٹر پر موجود خوب صورت لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی نے چیک کیا اور بولی۔

''یس سر! پارسل آ گیا ہے، آپ دو سو روپے ادا کر کے لے سکتے ہیں۔''

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کرکے رسید حاصل کرسکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

http://digestpk.blogspot.com/

نواز نے اسے دو سو روپے ادا کیے، مقامی کرنسی کا وہ پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔ پارسل لے کر وہ لاؤنج کے ساتھ باتھ روم میں آیا۔ اس نے اسے کھولا تو اس میں دو موبائل فونز اور اس میں مقامی نیٹ ورک کی سمز تھیں۔ اس کا بندوبست بھی ان کے یہیں کے رابطہ کاروں نے کیا تھا اور ان تک اس طرح پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ اس نے خالی ڈبا وہیں پھینک دیا اور واپس آ گیا۔ ریٹا کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا پاؤں لڑکھڑایا اور اس نے بے ساختہ اس کی سیٹ کا سہارا لیا۔ اسی دوران میں موبائل اس کے ہاتھ سے نکل کر ریٹا کے پہلو میں گر گیا۔

”سوری!“ وہ بولا۔

”نو پرابلم۔“ ریٹا نے جواب دیا اور ساتھ ہی عادت کے مطابق بُرا سا منہ بنایا۔ نواز واپس اپنی نشست پر آ گیا۔ اسے ہنسی آ رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اس قسم کے طریقہ کار پابندیوں اور رکاوٹوں سے بچنے کے لیے اپنائے جاتے ہیں۔ صحافت اور خاص طور سے سیاسی تحقیقی صحافت میں وقت کی اہمیت ہوتی ہے اور اگر وقت گزر جائے تو رپورٹس بے کار ہو جاتی ہیں۔ ساڑھے نو بجے سری نگر جانے والی فلائٹ کی بورڈنگ کا اعلان ہوا اور وہ اپنا بیگ سنبھالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ یہ مقامی پرواز تھی اور وہ ٹکٹ دکھا کر سری نگر جانے والے طیارے میں سوار ہو گیا۔ ریٹا اس بار اس کے ساتھ نہیں تھی.... اس کی جگہ ایک مقامی شخص تھا۔ یہ چھوٹے بالوں اور کسی قدر سخت تاثرات والا جوان آدمی تھا۔ اس کے بال سامنے سے اڑے ہوئے تھے، اس نے سادہ اور موٹے کپڑے کی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔

دہلی سے سری نگر کی فلائٹ مختصر تھی اور وہ گیارہ بجے وہاں پہنچ گئے۔ نواز کا خیال تھا کہ یہ مقامی فلائٹ تھی اس لیے انہیں سوال جواب کے مراحل سے نہیں گزرنا پڑے گا اور وہ صرف ٹکٹ دکھا کر باہر آ جائیں گے۔ لیکن وہاں غیر متوقع طور پر مسافروں سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی کہ وہ کیوں اور کس لیے سری نگر آئے ہیں۔ نواز سے آگے ایک مقامی کشمیری تاجر تھا جو کاروباری دورے سے واپس آ رہا تھا لیکن اس سے بھی یوں پوچھ گچھ ہو رہی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے کشمیر آ رہا ہو۔ نواز کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ لازمی اس کا پاسپورٹ چیک کرتے اور اس سے کہیں زیادہ سوال کیے جاتے۔

نواز کی باری آئی تو سوالات کرنے والے نے اسے مقامی سمجھا۔ نواز نے خالص برٹش لہجے میں کہا۔ ”ٹورسٹ۔“ اور پاسپورٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ افسر نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا لیکن برٹش پاسپورٹ اس کے سامنے تھا، وہ اسے نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے پوچھا۔

”تم کس لیے یہاں آئے ہو؟“

”ٹورسٹ کس لیے آتے ہیں؟“ نواز نے شانے اچکائے۔

”تمہارا تعلق کشمیر سے ہے؟“

”میرا تعلق انگلینڈ سے ہے۔“ نواز نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”لیکن تمہارا نام اور صورت مقامی ہے۔“

”میرے دادا کا تعلق یہیں سے تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کہاں سے؟“

نواز نے اس بار جھوٹ بولا۔ ”دہلی سے۔“

”تب تم دہلی کیوں نہیں گئے؟“

”دہلی میں اب دیکھنے کو کیا ہے، اس لیے میں کشمیر دیکھنے آیا ہوں۔“

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہاں کے حالات خراب ہیں؟“

”حالات خراب ہیں۔“ نواز نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن انگلینڈ یا یہاں انڈیا میں تو مجھے اخبارات یا ٹی وی پر ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔“

سیاہ رو افسر چیں بہ جبیں ہوا۔ ”رہائش کہاں ہے؟“

”ابھی باہر نکل کر دیکھوں گا۔“ اس نے جواب دیا اور اسے جانے کی اجازت مل گئی۔ نواز کو اس پر حیرت ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اس کے پیچھے لمبی قطار تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ مقامی کشمیری اس سیاہ رو افسر کو نفرت سے دیکھ رہے تھے جس کا تعلق یقیناً بھارت کے کسی اور حصے سے تھا۔ وہ باہر آیا، اسے ریٹا کا انتظار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں ان کو لینے کوئی نہ کوئی آیا ہوگا۔ کچھ دیر میں ریٹا بھی آ گئی۔ اس نے نواز سے پوچھا۔

”ہمارے میزبان نہیں آئے؟“

مغربی اشتراک سے کام کرنے والی ایک مقامی این جی او ان کی میزبان تھی لیکن ابھی تک این جی او کی جانب سے کوئی نہیں آیا تھا۔ نواز نے اس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں خود کچھ کرنا ہوگا۔“

”کیا کرنا ہوگا؟“

”کسی ہوٹل میں قیام۔“ اس نے جواب دیا اور ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا، ٹیکسی ان کے قریب آ گئی۔

ڈرائیور ادھیڑ عمر اور خستہ حال شخص تھا۔ ”کدھر جائے گا

صاحب؟“

”کسی اچھے سے ہوٹل میں۔“ نواز نے جواب دیا۔

”میم صاحب بھی ساتھ ہیں؟“ ڈرائیور نے ریٹا کو دیکھا۔

”ہاں، انہیں بھی ہوٹل کی تلاش ہے۔“ نواز نے کہا۔

”تو پھر بیٹھو۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے سامان ڈکی میں رکھا اور وہ دونوں پچھلی نشست پر آ گئے۔ ٹیکسی میں ناگوار سی بُو آ رہی تھی اور نواز اس بُو کو پہچانتا تھا۔ یہ چرس کی بُو تھی البتہ ریٹا لاعلم تھی، اس نے ناگواری سے کہا۔ ”اس نے ٹیکسی کو کتنا گندہ رکھا ہوا ہے کتنی بُو ہے۔“

”یہ انگلینڈ نہیں، انڈیا ہے۔“ نواز نے اسے یاد دلایا۔

ٹیکسی، ائرپورٹ کے علاقے سے باہر آئی تو نواز کو لگا جیسے وہ کسی محصور شہر میں آ گئے ہوں۔ وہاں ہر طرف بیریئر تھے فوجی چوکیاں اور جا بہ جا خار دار تاروں سے بند راستے تھے۔ یہاں لوگوں کو روک روک کر ان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ان کو بھی روکا گیا لیکن ریٹا کو دیکھ کر انہیں جانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ نواز نے ایک جگہ ایمبولینس کو بھی رکے دیکھا۔ ظاہر ہے اس کی تلاشی بھی لی جا رہی تھی۔ ریٹا حیران ہوئی۔ ”میرے خدا... ایمبولینس کو کیوں روک رکھا ہے؟“

”کیونکہ یہ کشمیر ہے۔“ نواز نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک کہا ہے صاحب۔“ ٹیکسی والا اچانک انگریزی میں بولا۔ ”مجھے دیکھو میں بی اے پاس ہوں اور میرے لیے اپنے ملک میں نوکری نہیں ہے، ٹیکسی چلا کر گزارہ کر رہا ہوں۔“

”یہاں نوکریاں کس کو ملتی ہیں؟“

”باہر والوں کو... جن کا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ نواز نے اپنا چھوٹا سا لیکن طاقت ور ریکارڈر آن کر دیا تھا۔

”باہر والوں کو کیوں، مقامی لوگوں کو ملازمتیں کیوں نہیں ملتیں؟“

”ہمیں بے روزگار اور بھوکا رکھنا سرکار کی پالیسی ہے کیونکہ ہم ان سے آزادی مانگتے ہیں۔“

کیونکہ اب گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اس لیے ریٹا نے بھی حصہ لیا۔ ”تم لوگ آزادی کیوں چاہتے ہو؟“

”کیونکہ کشمیری بھارت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے، اس نے زبردستی کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔“

”اس قبضے کو ساٹھ سال ہو چکے ہیں، کیا اب بھی کشمیری انڈیا کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے؟“ نواز نے پوچھا۔

”جب انڈیا نے کشمیر پر قبضہ کیا تو اس وقت ہمارے بزرگوں نے مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر انڈیا ہمیں حقوق دیتا، کشمیریوں کو اپنے برابر سمجھتا تو ہم تحریک نہیں چلاتے... لیکن آپ خود دیکھ چکے ہو، یہاں انڈیا ایسے قابض ہے جیسے کسی دشمن ملک پر قبضہ کیا جاتا ہے۔“ ڈرائیور نے باہر جا بہ جا موجود سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

نواز اور ریٹا اس سے سوالات کرتے رہے۔ نواز کوشش کر رہا تھا کہ اس سے مقامی تحریک کے بارے میں معلوم کرے۔ ڈرائیور نے کہا۔ ”ہم نے دیکھ لیا، ساٹھ سال میں کسی نے ہماری مدد نہیں کی، اس لیے ہم نے اپنی آزادی کی جنگ خود لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”اس جنگ میں کون تمہاری مدد کر رہا ہے؟“ ریٹا کے اس سوال پر وہ ہنسا۔

”میم صاحب! اگر کوئی ہماری مدد کر رہا ہوتا تو دو مہینے میں دو سو سے زیادہ کشمیری نہیں مارے جاتے۔ یہاں سے کشمیریوں کے جنازے نہیں، بھارتی فوجیوں کی ارتھیاں اٹھتیں۔“

نواز نے محسوس کیا کہ ڈرائیور پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی حالات کے بارے میں جاننے کی وجہ سے ان کے لیے بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم مستقل طور پر ہمارے لیے کام کر سکتے ہو؟“

”آپ کا کام کیا ہے صاحب؟“

”کشمیر کی سیر کرنا اور یہاں کے لوگوں سے ملنا۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ وہ راضی ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ویران نظر آنے والے ہوٹل کے سامنے رکا۔

”یہ ہوٹل ہے؟“ ریٹا نے پوچھا۔

”جی میم صاحب!“ اس نے ڈکی سے سامان.... نکالتے ہوئے کہا۔ ”کسی زمانے میں یہاں رکنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ کئی ہفتے پہلے بکنگ کرانی پڑتی تھی۔ اب یہاں بس اِکّا دُکّا مسافر ہی آتے ہیں۔“

ہوٹل کے اندر بھی ویرانی تھی اور ملازم بھی کم تھے۔ ان کے پاسپورٹ دیکھ کر انہیں کمرے مل گئے۔ منیجر نے جو خود کاؤنٹر پر موجود تھا انہیں بتایا۔ ”حکومت کی طرف سے کسی بھی مشکوک فرد کو کمرا دینے کی سختی سے ممانعت ہے ورنہ سارا ملبا ہم پر گرتا ہے۔“

”مشکوک فرد سے کیا مراد ہے؟“ نواز نے رجسٹر پر سائن کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہر کشمیری۔“ منیجر نے رجسٹر بند کر دیا اور گھنٹی بجا کر ایک ملازم کو بلایا۔ ”صاحب اور میم صاحبہ کو ان کے کمرے دکھا دو۔“

http://digestpk.blogspot.com/

ملازم نے چابیاں لیں اور ان کے بیگ اٹھا لیے۔ وہ انہیں دوسری منزل پر واقع برابر برابر کمروں میں لایا۔ اس نے پہلے ریٹا کو کمرا دکھایا اور پھر نواز کے کمرے میں آیا۔ نواز نے سامنے سے پردہ ہٹایا تو اسے جھیل کے کنارے حضرت بل کے مزار کے قریب مسجد نظر آئی۔ یہاں بھی گلیاں اور سڑکیں ویران تھیں، کرفیو نہیں تھا لیکن کرفیو کا سا سماں تھا۔ ریٹا اس کے کمرے میں آئی۔ اس نے شکایت کی۔

''یہاں اے سی نہیں ہے۔''

''یہاں اے سی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' نواز نے کہا۔ ''یہاں کھڑکی میں آکر دیکھو، جھیل کی طرف سے کیسی ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔''

ریٹا کھڑکی کے قریب آئی۔ ''واہ... کتنا خوب صورت منظر ہے لیکن لوگ کہاں ہیں؟''

''یہی تو المیہ ہے۔ شہر موجود ہے، وادی ہے اور خوب صورت نظارے ہیں لیکن لوگ غائب ہیں۔'' نواز نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ہمیں مقامی طور پر حرکت کرنے اور لوگوں سے ملنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''تم این جی او کو کال کرو۔'' ریٹا نے اسے یاد دلایا۔ ''ان کا نمائندہ ہمیں لینے کیوں نہیں آیا؟''

''اچھا یاد دلایا تم نے۔'' نواز نے کہا اور موبائل نکال کر مسز ششما امرت کو کال کی۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کرلی گئی۔

''ششما امرت۔''

''میں آپ کا مہمان بات کر رہا ہوں۔ آپ کی طرف سے ہمیں کوئی لینے نہیں آیا؟''

''سوری... یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ جہاں میری این جی او کا دفتر ہے، وہاں صبح کے وقت شدید فائرنگ ہوئی ہے اور فوجیوں نے کئی افراد کو شوٹ کر دیا ہے۔ پورا علاقہ سیل ہے۔ نہ کوئی آسکتا ہے اور نہ کوئی جا سکتا ہے۔''

''اوہ...'' نواز کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ''یہاں کے حالات اس حد تک خراب ہیں؟''

''آپ کی سوچ سے بھی زیادہ...'' ششما نے کہا۔ ''آپ دونوں کہاں ہیں؟ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے میں آکر آپ سے ملتی ہوں۔''

نواز نے اسے ہوٹل کا نام بتایا۔ اس نے کال منقطع کر کے ریٹا کی طرف دیکھا۔ ''جنہیں ہماری مدد کرنی تھی، فی الحال وہ خود مدد کے محتاج ہیں۔''

حالات جان کر ریٹا کو مایوسی ہوئی۔ ''اس کا مطلب ہے ہمیں اسی ہوٹل میں بند ہو کر بیٹھنا پڑے گا۔''

''نہیں، ہم صحافی ہیں... اپنا راستہ خود نکال سکتے ہیں۔'' نواز نے جواب دیا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

عین اس وقت سری نگر کے ایک پوش علاقے کے بڑے سے بنگلے میں سرگرمیاں جاری تھیں۔ یہ ان دولت مند کشمیریوں کا علاقہ تھا جو حالات خراب ہوتے ہی دہلی یا جموں کا رخ کرتے تھے کیونکہ وہاں بھی ان کی کوٹھیاں تھیں۔ ابھی بھی بہت سارے بنگلے اپنے مکینوں سے خالی ہو چکے تھے۔ جو رہ رہے تھے، وہ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

یہ چھ سات نوجوان تھے۔ انہوں نے مخصوص کشمیری لباس پہن رکھے تھے۔ وہ جس کمرے میں تھے وہاں ہر طرف جدید ترین اسلحہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے جو اپنا پسٹل صاف کر رہا تھا، سر اٹھا کر اس چھوٹے بالوں اور چہرے سے مضبوط نظر آنے والے شخص کو دیکھا۔

''وہ کل ہوٹل سے نکلیں گے؟''

''بالکل۔'' چھوٹے بالوں والے نے جواب دیا۔

''ممکن ہے وہ حالات کی خرابی دیکھ کر باہر نکلنے سے گریز کریں؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جدید رائفل تھی۔

مختصر بالوں والوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ جس کام کے لیے آئے ہیں، اسے کرنے کے لیے لازمی باہر نکلیں گے۔''

''یعنی کل ہمیں ہوٹل کے پاس ہونا چاہیے؟'' پسٹل صاف کرنے والے نے کہا۔

''بالکل... اور تم لوگوں کو اپنا کام ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیے۔'' مختصر بالوں والے نے کہا اور ان کو بریف کرنے لگا۔ وہ سب غور سے سن رہے تھے حالانکہ انہیں یہ ساری باتیں ازبر ہوگئی تھیں کیونکہ وہ کوئی درجن بار اس سے سن چکے تھے اور انہیں کل تک مزید کوئی درجن بھر بار ہی سننا تھا لیکن وہ ہر بار یوں غور سے سنتے جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔ ان میں کوئی غیر سنجیدہ یا بے پروا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جانتے تھے، مشن کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ جب مختصر بالوں والے نے اپنی بات ختم کی تو اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

''کسی کو سوال کرنا ہے؟''

پسٹل صاف کرنے والے نے کہا۔ ''اگر ان دونوں نے مزاحمت کی تو کیا کریں؟''

''انہیں بے بس کر سکتے ہو لیکن جانی نقصان بالکل نہیں ہونا چاہیے۔'' مختصر بالوں والے نے سخت لہجے میں واضح کیا۔

''اس سے مشکل ہو سکتی ہے۔'' پسٹل والے نے کہا۔

''پھر بھی انہیں کچھ ہونا نہیں چاہیے۔'' مختصر بالوں والے کا لہجہ تنبیہ آمیز تھا۔

''فوج مداخلت کرے گی۔'' ایک اور شخص نے کہا۔

''کوشش کریں گے کہ اس کی نوبت نہ آئے۔ اگر فوج درمیان میں آئی تو...'' مختصر بالوں والے نے اپنے ہتھیاروں کی طرف دیکھا۔ ''بڑے مقاصد کے لیے کچھ قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں۔''

وہ سب ایک منظم اور جسدِ واحد کی طرح مربوط گروپ کی صورت کام کر رہے تھے۔ ان میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی تھی جو یقیناً برسوں کے ساتھ کا نتیجہ تھی۔ مختصر بالوں والے کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی، باقی سب پچیس سے تیس کے درمیان تھے۔ وہ مہارت اور مشاقی کے ساتھ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ مصروف تھے جیسے ان کا کام یہی ہو۔

☆☆☆

عین اس وقت دہلی کی ایک معمولی سی عمارت میں سرکاری حکام کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ یہ بھارت کے اعلیٰ دفاعی اور جاسوسی اداروں کا جوائنٹ گروپ تھا۔ یہ گروپ خاص طور سے کشمیر کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ گزشتہ تقریباً ایک عشرے سے جاری دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ نے دنیا کے ماحول کو تبدیل کر دیا تھا۔ اب آزادی کے لیے جدوجہد اور کوشش کو دہشت گردی کا نام دے دیا گیا تھا۔ خاص طور سے جہاں بھی مسلمان آزادی یا اپنے دفاع کے لیے کوشش کر رہے تھے، اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک تحریک کشمیر کی تھی جو گزشتہ ساٹھ برس سے حقِ خود ارادیت کے حصول کے لیے جاری تھی۔ اسے یہ حق دنیا میں امن کی ذمے دار اقوامِ متحدہ نے دیا تھا۔

ایک عشرے کے دوران میں کشمیر کی پاکستان سے ملنے والی سرحدوں کو بند کر کے اور جبر کے تمام حربوں کے ذریعے کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی کو دبا کر بھارت مطمئن تھا کہ اس نے کشمیر کی تحریک کو دفن کر دیا ہے۔ اچانک ہی قابو میں نظر آنے والے واقعات نے یوٹرن لیا اور بے بس اور لاچار ہو جانے والی کشمیری قوم میں جان پڑ گئی۔ ساٹھ سال سے آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے کشمیریوں کا ویسے تو پہلے بھی سوائے خدا کے کوئی مددگار نہیں تھا لیکن بھارت اس تحریک کی حمایت اور مدد کا الزام پڑوسی ملک پر لگا کر مغرب کی ہمدردیاں سمیٹتا رہا تھا۔

سرما ختم ہوتے ہی کشمیر میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ وجہ بھارتی فوج کی جانب سے دو کشمیری خواتین کی بے حرمتی اور پھر ان کا قتل تھا۔ ان مظاہروں نے بھارت اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بھارتی حکومت بوکھلا گئی۔ صورتِ حال پیچیدہ تھی اور اس سے نمٹنے کے لیے حکومت نے تمام خفیہ ایجنسیوں کا ایک مشترکہ گروپ تشکیل دیا جس کا کام کشمیر کی صورتِ حال سے نمٹنا تھا۔

جوائنٹ گروپ چھ اراکین پر مشتمل تھا۔ پانچ کا تعلق مختلف ایجنسیوں سے تھا اور چھٹا پی ایم کا نمائندہ تھا۔ اس گروپ کا غیر رسمی سربراہ وہی تھا۔ اوجھا پٹیل نامی اس غیر رسمی سربراہ نے میٹنگ کے آغاز میں تشویش سے کہا۔

''کشمیر کی صورتِ حال ہماری توقعات سے زیادہ خراب ہے۔''

''وہاں کی صورتِ حال کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔'' انٹیلی جنس کے نمائندے نے کہا۔ ''سرکار کے تحت کام کرنے والے سویلین انٹیلی جنس اداروں کو غلط اندازے لگانے کا شوق ہے۔''

ایجنسی کے نمائندے نے اس کی تائید کی۔ ''کشمیر کے حالات کے بارے میں ہمارے اندازے ہمیشہ غلط ہی ثابت ہوئے ہیں۔''

اس پر را کا نمائندہ غصے میں آگیا۔ ''کشمیر عملاً فوج کے حوالے ہے اس لیے انٹیلی جنس کی ذمے داری بھی اسی پر آتی ہے۔''

''ہم اپنی ذمے داری نبھا رہے ہیں۔'' آرمی انٹیلی جنس کا نمائندہ بولا۔ ''آپ میں سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ہم کتنے مشکل حالات میں وہاں کام کر رہے ہیں۔''

''آج کل حالات بہت خراب ہیں۔'' ایک وفاقی ایجنسی کا نمائندہ بولا۔ ''یہ حیران کن تحریک ہے کیونکہ بظاہر کوئی اس کا لیڈر نہیں ہے۔''

''ان کا سرغنہ وہ بڈھا ہے۔'' را کے ایجنٹ نے حقارت سے ایک بزرگ کشمیری لیڈر کا نام لیا۔ ''اگر پانچ سال پہلے ہمارا منصوبہ مان لیا جاتا تو آج ہم ان سب کو قبر میں سُلا چکے ہوتے۔''

را نے کشمیری لیڈروں کی ٹارگٹ کلنگ کا منصوبہ بنایا تھا لیکن بھارتی حکومت نے اپنی اندرونی اور بیرونی مشکلات کی وجہ سے را کے اس منصوبے کی منظوری نہیں دی۔ بیس سال پہلے ایک لیڈر کے قتل کے بعد کشمیری سڑکوں پر نکل آئے تھے

http://digestpk.blogspot.com/

اور یہ تحریک پورے ایک عشرے تک جاری رہی تھی۔ بھارتی حکومت پھر اس تجربے کو دہرانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وفاقی ایجنسی کے نمائندے نے کہا۔

''نہیں اس بار جو ہو رہا ہے، وہ کسی لیڈر کا محتاج نہیں ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تحریک کی قیادت نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور وہ اسے بنا کسی لیڈر شپ کے چلا رہے ہیں۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے؟'' را کا نمائندہ بولا۔

''بالکل ممکن ہے۔ جب کاز بالکل واضح ہو اور عمل کا بھی پتا ہو تو ہر شخص لیڈر بن جاتا ہے۔'' وفاقی ایجنسی کے نمائندے نے درست تجزیہ کیا۔ ''کسی لیڈر کو راستے سے ہٹانا یقیناً مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے؟'' اوجھا پٹیل نے پوچھا۔

''طاقت کا استعمال اور کشمیری قیادت کو عالمی سطح پر دہشت گرد قرار دلوانا۔'' ملٹری ایجنسی کے نمائندے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''طاقت کا استعمال تو ساٹھ سال سے ہو رہا ہے۔'' را کے نمائندے نے طنز کیا۔

''اسی نے ابھی تک کشمیر کو ہمارے ساتھ رکھا ہوا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ماضی کی بحث میں الجھنے کے بجائے حال کے مسائل پر توجہ دیں۔'' اوجھا پٹیل نے کہا۔

وفاقی ایجنسی کے نمائندے نے کہا۔ ''میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمیں کشمیر میں دونوں آپشن استعمال کرنے چاہئیں۔ طاقت کا استعمال تو فوج ہی کر سکتی ہے لیکن کشمیری لیڈروں اور جنگجوؤں کو عالمی سطح پر بدنام کرنے کا کام ہم سب کو کرنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے حالات ہمارے حق میں ہیں اور مغربی میڈیا آنکھ بند کر کے ہماری گائیڈ لائن پر کام کر رہا ہے۔''

''لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کشمیری بالکل بے بس ہیں۔ عالمی سطح پر ان کی موثر تنظیمیں ہیں۔ خاص طور سے برطانیہ میں بہت بڑی تعداد میں کشمیری ہیں اور یہی لوگ انہیں سب سے زیادہ فنڈز مہیا کرتے ہیں۔ پھر ہمارا پڑوسی ملک بھی ان کا وکیل بنا ہوا ہے۔'' را کے نمائندے نے خبردار کیا۔

''ہم ان دونوں سمتوں میں کام کر رہے ہیں۔ ایک تو ہم برطانیہ میں رہنے والے کشمیریوں کو دہشت گردوں کا حامی اور مددگار ثابت کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے ان کو کشمیر میں فنڈنگ سے روکنا چاہتے ہیں۔'' وفاقی ایجنسی کا نمائندہ بولا۔

''اس مقصد کے لیے ہمارا ایک جوائنٹ گروپ کام کر رہا ہے۔ ہم نے پلان بنا لیا ہے اور جلد اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔''

اوجھا پٹیل جو زیادہ تر خاموشی سے سن رہا تھا، اس نے آخر میں کہا۔ ''اس بار تمام ایجنسیز کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ ممبئی حملے والے واقعات نہیں ہونے چاہئیں جس سے دنیا کو ہم پر ہنسنے کا موقع ملے۔ دوسری صورت میں سرکار کے پاس خفیہ ایجنسیوں کی تطہیر کا منصوبہ تیار ہے اور اس میں بہت سارے لوگوں کی ہمیشہ کے لیے چھٹی ہو جائے گی۔''

اس دھمکی نے وہاں موجود لوگوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا اور سب کے چہرے سفید پڑ گئے۔ بھارت دنیا میں سب سے زیادہ خفیہ ایجنسیاں رکھنے والا ملک ہے۔ اس کے باوجود اس کی ایجنسیوں میں فوری منصوبہ سازی کی صلاحیت کی شدید کمی ہے۔ جب وہ میٹنگ کے بعد باہر نکلے تو کشمیر ایجنسی کے نمائندے نے کچھ دور واقع ایک عمارت کا رخ کیا۔ یہ اس ایجنسی کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ مختلف مراحل سے گزر کر وہ ایجنسی کے سربراہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک کشمیری پنڈت تھا اور طویل عرصے تک را کی کشمیر ڈیسک پر کام کر چکا تھا۔ نمائندے نے جو پنڈت کا نائب بھی تھا، اسے تفصیل سے میٹنگ کے بارے میں بتایا۔ پنڈت نے حقارت سے کہا۔

''یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ اب میں انہیں بتاؤں گا کہ کام کیسے ہوتا ہے۔''

''کیوں نہیں جناب۔'' نائب نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''آپ کی ذہانت میں کیا شبہ ہے۔''

''ہم سائنٹیفک انداز میں کام کرتے ہیں۔'' پنڈت نے فخر سے کہا۔ ''ہمارے روابط عالمی سطح پر ہیں اس لیے ہمارے پلان کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ہمارے آدمی پوری طرح تیار ہیں سر۔'' نائب نے اسے بتایا۔ ''وہ سری نگر چناران میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''تم سری نگر کے لیے روانہ ہو جاؤ، تمام کام تمہاری نگرانی میں ہونا چاہیے۔'' پنڈت نے نائب کو حکم دیا۔ وہ بھی کشمیری تھا اور مسلمان تھا۔ ''ناکامی کا مطلب سمجھتے ہو نا؟''

''جی جناب!'' نائب نے گھگیا کر کہا۔

''بس تو پھر روانہ ہو جاؤ۔ مجھے ہر صورت کل کامیابی کی اطلاع ملنی چاہیے۔''

''ایسا ہی ہو گا جناب!'' نائب نے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

نواز سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی

اور کھڑکی سے آتی ہوا میں جھیل کی نمی اور پھولوں کی مہک شامل ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے کام کا آغاز کہاں سے کرے؟ اس کے پاس کوئی ایک درجن معروف کشمیری لیڈروں کی فہرست تھی جن سے وہ انٹرویو لینا چاہتا تھا لیکن یہ سب کے سب اپنے گھروں میں نظر بند تھے اور بھارتی حکومت کی مرضی کے بغیر کوئی ان سے نہیں مل سکتا تھا۔ ظاہر ہے، نواز بھی نہیں مل سکتا تھا۔ فی الحال اسے کل نکلنے والی ریلی کی کوریج کرنا تھی، اس سے اسے کشمیری عوام کے موڈ کا درست اندازہ ہوتا۔

اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ پہلے وہ اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن ایک منٹ بعد دوبارہ اسی انداز میں دستک ہوئی تو وہ بستر سے اتر کر دروازے تک آیا۔ ''کون ہے؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''دوست۔'' دوسری طرف سے ایک ہلکی سی نسوانی آواز آئی۔

نواز چونک گیا، یہ ریٹا نہیں تھی پھر اتنی رات گئے اس کے کمرے کے باہر کون عورت تھی؟ اس نے سوچا اور ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک چادر پوش عورت کھڑی تھی اور اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آئی۔ نواز نے مزاحمت کی لیکن اسے روکنے میں ناکام رہا۔ ایک لمحے کو نواز کا جسم تن گیا اور وہ کسی ناگہانی صورتِ حال کے لیے بھی تیار ہو گیا لیکن جب وہ اس کی طرف مڑا تو وہ چادر اتار کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

نواز کچھ دیر کے لیے مبہوت رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک دل کش اور نک سک سے تیار لڑکی تھی۔ شہابی رنگت اور اوپر کی طرف جوڑے میں بندھے ہوئے سرخی مائل سیاہ بال تھے۔ تیکھے نقوش اور بڑی بڑی آنکھیں اس کی دل کشی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے گہرے بھورے رنگ کی قمیص اور اسی رنگ کی شلوار پہن رکھی تھی لیکن یہ خاصا ماڈرن قسم کا لباس تھا کیونکہ قمیص کا گلا اور پشت دونوں خاصی فراخ تھیں۔ ایک لمحے کو نواز کی نظریں بھٹکیں لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم اور اس طرح اندر کیوں گھس آئی ہو؟''

''مسٹر نواز گل۔'' لڑکی نے خلافِ توقع سرد اور روکھے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں خبردار کرنے آئی ہوں۔ کل ہوٹل سے باہر کچھ لوگ تمہاری گھات میں ہو سکتے ہیں۔''

''کون لوگ؟'' نواز نے اسے غور سے دیکھا۔

''وہی جو چاہتے ہیں کہ اس حسین وادی کے لوگ ان کے غلام بن کر رہیں۔ وہ [illegible] اور تمہاری ساتھی کو اٹھانے کی کوشش کریں گے۔''

''وہ کون ہیں اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ تم کون ہو اور مجھے کیوں خبردار کر رہی ہو؟''

''میرا تعلق وادی سے ہے اور میں تمہاری خیرخواہ ہوں۔''

''اگر کچھ لوگ ہوٹل کے باہر ہمارے منتظر ہوں گے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''ہوٹل سے نکلنے سے گریز کرنا۔ کم سے کم جب تک سامنے جھیل میں تمہیں سرخ پرچم والی کشتی نہ نظر آئے۔ اس کے بعد تم نکل سکتے ہو۔''

''کوئی ہمیں کیوں اغوا کرنا چاہے گا؟''

''کیونکہ تم اور تمہاری ساتھی برطانوی شہری ہو۔'' لڑکی نے کہا۔ ''میری باتیں یاد رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''ایک منٹ میری بات...'' نواز نے اسے روکنا چاہا لیکن لڑکی کا گھٹنا اس کی ناف سے لگا اور وہ کراہ کر جھکا تو لڑکی نے کہنی اس کی گدی پر رسید کی اور وہ منہ کے بل قالین پر گر گیا۔ اگر قالین نہ ہوتا تو اسے شاید ایک دو دانت یا ناک کی ہڈی سے محروم ہونا پڑتا۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن اسے چکر آ گیا تھا اور جب تک وہ سنبھل کر کھڑا ہوتا، لڑکی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے دونوں وار اتنی پھرتی اور مہارت سے کیے تھے کہ نواز کو روکنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ حالانکہ اس نے سیلف ڈیفنس کی تربیت لے رکھی تھی۔ لڑکی کی مہارت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا تھا کہ اس نے دونوں وار بس اتنی قوت سے کیے کہ وہ ناکارہ ہو جائے، اسے کوئی نقصان نہ ہو۔ نواز نے دروازہ اندر سے بند کیا اور واش روم میں جا کر منہ پر سرد پانی کے چھینٹے مارے۔

لڑکی نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے جو کہا تھا، وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا تو اسے معلوم تھا کہ بھارتی حکمران کشمیر کی تحریک کو روکنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے مغربی طاقتوں کی مدد سے کشمیر میں لڑنے والی بیشتر تنظیموں کو دہشت گرد قرار دلوا دیا تھا۔ لیکن اب جو تحریک شروع ہوئی تھی، اس میں تشدد کے بجائے احتجاج کا عنصر نمایاں تھا اور یہی چیز بھارتی حکومت کو بدحواس کر رہی تھی۔ نہتے لوگوں پر تشدد نے بین الاقوامی میڈیا کی توجہ بھی حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور بھارت کے پاس لوگوں کو مارنے اور ان کو زخمی کرنے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں

http://digestpk.blogspot.com/

تھا... کیونکہ احتجاج کرنے والے سب عام نہتے کشمیری تھے۔ بہت بڑی تعداد میں سویلین ہلاکتوں نے بھارتی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر کشمیر کو ایک بہت بڑے قید خانے میں تبدیل کر دیا تھا جہاں سے اطلاعات کو باہر جانے سے روکا جائے۔ صحافیوں اور سیاحوں کو کشمیر آنے سے روکا جا رہا تھا۔ اسی طرح اطلاعات کے ذرائع جیسے فون، موبائل فونز، ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ سروسز پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود اطلاعات باہر جا رہی تھیں اور بھارتی مظالم دنیا کے سامنے آرہے تھے۔

نواز اس لڑکی کی باتوں کو سنجیدگی سے لے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اگر اس کا تعلق بھارتی حکومت سے ہوتا تو اسے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حکومت ان کو غلط بیانی کرنے کے جرم میں بہ آسانی کشمیر سے نکال سکتی تھی۔ اس کے لیے لڑکی کے بجائے پولیس بھیجنا کافی ہوتا جو ان کو ائرپورٹ لے جا کر دہلی جانے والی پہلی پرواز پر بٹھا دیتی۔ اس کے باوجود نواز نے فیصلہ کیا کہ وہ لڑکی کی باتوں پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کرے گا۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس بار اسے نیند آگئی۔ صبح ریٹا نے دروازہ بجا کر اسے اٹھایا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

نواز نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ اس نے واش روم کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“

وہ سرد پانی سے غسل کر کے اور تازہ دم ہو کر آیا تو ریٹا کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر کہا۔ ”یہ منظر کتنا خوب صورت ہے۔“

”ہاں، اب دیکھنا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے نصیب کتنے خوب صورت ہیں۔“

ریٹا نے منہ بنایا۔ ”سیاست نہیں... ہم یہاں صحافت کے لیے آئے ہیں۔“

”ہاں لیکن سیاست اور صحافت دونوں آپس میں جڑے ہیں۔“ نواز نے ایک بار کھڑکی سے جھانک کر ہوٹل کے سامنے والے حصے کا معائنہ کیا۔ اسے وہ شخص فوراً نظر آگیا جو بلاوجہ ایک کھمبے سے ٹیک لگائے اخبار پڑھنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ چہرے اور حلیے سے وہ کشمیری لگ رہا تھا۔ اسی طرح مخالف سمت میں ایک اور تقریباً اسی حلیے کا جوان آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس شہر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ لوگ کھمبے کے ساتھ کھڑے ہوتے یا فٹ پاتھ پر بیٹھتے۔ اس کا مطلب تھا کہ نگرانی ہو رہی تھی البتہ یہ نگرانی کون کر رہا تھا، یہ کہنا مشکل تھا۔ نواز نے فوری فیصلہ کیا کہ باہر نکلنے سے گریز کرنا ہے۔ اس کی اطلاع کے مطابق احتجاجی ریلی دوپہر کو نکلتی، اس سے پہلے باہر جانا ضروری نہیں تھا۔

وہ ناشتا کرنے نیچے ڈائننگ ہال میں آئے۔ وہاں ویرانی تھی۔ ایک بیرے نے انہیں بے دلی سے بتایا کہ ناشتے میں صرف ٹوسٹ اور ابلے ہوئے انڈے ہیں۔ انہوں نے وہی منگوا لیے۔ ریٹا نے بُرا سا منہ بنایا لیکن اسے یہی کھانا پڑا۔ ناشتے کے بعد البتہ چائے بہترین تھی۔ وہ اوپر آئے تو ریٹا نے کہا۔ ”کیا خیال ہے، باہر چلیں؟“

”میرا خیال ہے ابھی باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”تم نے باہر دیکھا نہیں ہے، کوئی فرد نظر نہیں آرہا ہے۔ جب کسی شہر میں لوگ نہ نکلیں تو سمجھ لو وہاں نکلنا مناسب نہیں ہے۔“

”یہ دو افراد تو ہیں۔“ ریٹا نے باہر نظر آنے والے دو افراد کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا یہ اس شہر کے نہیں ہیں؟“

”اگر یہ اس شہر کے ہوتے تو اس طرح سکون سے باہر نہ بیٹھے ہوتے۔“

ریٹا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے یہ ہماری نگرانی کر رہے ہیں؟“

”تم مطلب نکالنے کے لیے آزاد ہو۔“ نواز نے کہا اور موبائل پر فران کا ذاتی نمبر ملایا۔ کچھ دیر میں فران نے کال ریسیو کر لی۔

”کیا بات ہے؟“

”حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”تم نظر میں آگئے ہو؟“ فران کے لہجے میں تفتیش تھی۔

”میرا خیال ہے... لیکن کسی خاص وجہ سے ہمیں چھوٹ دی جا رہی ہے۔“

”کل رات کوئی آیا تھا؟“ فران نے پوچھا۔

”ہاں، آیا تھا۔“

”اس کی بات پر عمل کرنا۔“ فران نے کہا اور لائن منقطع کر دی۔

نواز حیران تھا کہ فران کو یہ بھی معلوم تھا۔ وہ کسی اخبار کے ایڈیٹر کے بجائے کسی جاسوس ایجنسی کا سربراہ لگ رہا تھا جس کے معلومات حاصل کرنے کے اپنے ذرائع ہوتے ہیں۔ اس کال کا یہ فائدہ ہوا کہ لڑکی پر رہا سہا شک بھی ختم ہو گیا۔ البتہ ریٹا مشکوک ہو گئی۔

”یہ تم کس سے بات کر رہے تھے؟“

”فران سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”فران...“ ریٹا نے حیرت سے کہا۔ ”اسے یہاں کے معاملات کا کیا علم ہے؟“

”تم شاید جانتی نہیں ہو۔ فران پانچ سال انڈیا میں اخبار کا نامہ نگار رہا ہے اور یہاں اس کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔“

ریٹا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ سب فران کا ذاتی سیٹ اپ ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ نواز نے صاف گوئی سے کہا۔ ”لیکن اتنے اخراجات وہ اکیلے نہیں کر سکتا... لازمی بات ہے ہم اخبار کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

ریٹا کا شک ختم نہیں ہوا اور وہ وقفے وقفے سے نواز کا دماغ کھاتی رہی اور وہ اسے ٹالتا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے جھیل میں سرخ جھنڈے والی کشتی نظر آگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر نکلنے کا وقت آگیا۔ اس نے باہر جھانکا تو اسے دونوں افراد غائب دکھائی دیے۔ اس کے فوراً بعد سنسان سڑکیں یکایک لوگوں سے بھر گئیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ گھروں میں موجود ایک ایک فرد باہر نکل آیا ہے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پتھر تھے اور زبان پر نعرے۔ نواز نے ریٹا سے کہا۔

”اب باہر نکلنے کا وقت آگیا ہے۔“

وہ کیمرے لے کر باہر نکلے تو لاکھوں افراد کا منظم ہجوم سڑکوں پر نکل آیا۔ ہجوم اتنا تھا کہ کہیں زمین نظر نہیں آرہی تھی اس کے باوجود نظم و ضبط بہت زیادہ تھا، شاذ ہی کہیں بدنظمی یا دھکم پیل نظر آئی تھی۔ گلیوں سے نکلنے والے ہجوم کا رخ اقوام متحدہ کے دفتر کی طرف تھا۔ لوگوں نے پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے جن پر آزادی کے حق میں اور انڈیا کے خلاف نعرے درج تھے۔ نواز اور ریٹا بھی اس ہجوم میں شامل ہو گئے۔ ریٹا کو دیکھ کر لوگوں نے اس کے آس پاس کی جگہ خالی کر دی اور پھر ان کے ہاتھ میں کیمرے اور ریکارڈر دیکھ کر وہ جان گئے کہ یہ صحافی ہیں۔

”اتنے لوگ۔“ ریٹا نے حیرانی سے کہا۔ ”اگر لندن میں اتنے لوگ ملکہ کے خلاف نکل آئیں تو وہ تخت سے دست بردار ہو جائے۔“

”لیکن یہ انڈیا ہے۔“ نواز نے اسے یاد دلایا۔ ”ہوشیار رہنا... یہاں کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

”تم میرے ساتھ رہنا۔“ ریٹا سہم گئی۔ اس نے کبھی اس قسم کا ہجوم نہیں دیکھا تھا۔ نواز مسکرایا اور آہستہ سے کہا۔

”دفتر میں تو تم میری صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتی ہو۔“

”وہاں دوسری بات ہے۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”یہاں تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تم یہاں کام کرنے آئی ہو۔“ نواز نے اسے یاد دلایا۔ ”اور کام اس طرح نہیں ہوتا ہے۔“

”تم مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے۔“ ریٹا نے صاف انکار کر دیا۔

ریلی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے جا رہے تھے۔ نواز اور ریٹا تصویریں لے رہے تھے۔ ساتھ ہی نواز کا ریکارڈر آن تھا۔ وہ موقع پا کر ریلی میں شریک کشمیریوں سے ان کے تاثرات بھی ریکارڈ کر رہا تھا۔ اگرچہ نعروں کے شور میں کوئی واضح بات مشکل سے ریکارڈ ہوتی لیکن نواز کا اصل مقصد تو ریلی کو ریکارڈ کرنا تھا۔ اس کے ڈیجیٹل کیمرے میں چار جی بی کا اسمارٹ کارڈ لگا تھا اور اس میں کافی تصویریں آسکتی تھیں۔ اس لیے وہ بے فکری سے تصویریں لیے جا رہا تھا۔ لیکن جب وہ کوئی خاص تصویر لیتا تو اسے فوری طور پر ایک خاص فولڈر میں محفوظ کر لیتا۔ یہ فولڈر اسے فران کو بھیجنا تھا۔

اس ریلی کے لیے ایک بزرگ لیڈر نے کئی دن پہلے کال دے دی تھی اور یہ پورے شہر سے بیک وقت نکلی تھی۔ نواز نے دیکھا کہ سڑکوں اور گلیوں سے فوج اور پولیس غائب تھی۔ ظاہر ہے اتنے بڑے ہجوم کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کم سے کم انتظامیہ ریلی نکلنے اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی تھی اس لیے فوج اور پولیس سمٹ کر خاص علاقوں میں محدود ہو گئی تھی۔

گلیوں اور محلوں سے نکلنے والا ہجوم اب ذیلی سڑکوں سے ہوتا ہوا مرکزی شاہراہ پر مل رہا تھا اور یہاں بہت زیادہ ہجوم تھا۔ سوائے سروں کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ریٹا حیران تھی۔ ”یہ تو بہت بڑی ریلی ہے۔ اگر اتنی بڑی ریلی لندن میں نکلے تو وہاں تو تہلکہ مچ جائے۔“

”وہ برطانیہ ہے اور یہ بھارت ہے۔ دوسرے برطانوی عوام اپنے ملک کے مالک ہیں جبکہ کشمیری انڈیا کے غلام ہیں۔ عوام کی بات مانی جاتی ہے اور غلاموں کو اپنی بات منوانی پڑتی ہے۔“

ریٹا نے اسے گھورا اور آہستہ سے بولی۔ ”لگتا ہے تم پر اس ریلی کا زیادہ ہی اثر ہوا ہے۔“

”ذرا ان لوگوں کو دیکھو، یہ اس خطرے کے باوجود نکلے ہیں کہ انڈین فوج ان پر فائرنگ کرے گی، کیا یہ بات متاثر کن نہیں ہے؟“

http://digestpk.blogspot.com/

ریٹا سہم گئی۔ ''فائرنگ کا خطرہ ہے؟''

''بالکل ہے۔ تم صحافی ہو، بے شک عورتوں کی ڈیسک تک محدود ہو لیکن تمہارے اندر چھٹی حس تو ہوگی۔ کیا تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟ سڑکوں سے فوج اور پولیس غائب ہے۔''

''ہاں، محسوس تو ہو رہا ہے۔'' ریٹا نے سر ہلایا۔

''مجھے واضح طور پر خون کی بُو آ رہی ہے۔'' نواز کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''اگر فائرنگ کی آواز آئے تو اس جگہ سے دور رہنے کی کوشش کرنا اور کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے تو اپنا کارڈ گلے میں ڈال لینا۔''

''مجھے ان سب باتوں کا علم ہے۔'' ریٹا نے بیزاری سے کہا۔ وہ اس ہجوم میں واحد عورت تھی اور عورتوں کا جلوس کہیں اور تھا۔ نواز نے دیکھا کہ ریلی کے آگے اور کناروں پر زیادہ تر معمر افراد تھے اور جوانوں کو درمیان میں رکھا گیا کیونکہ بھارتی فوج چن چن کر نوجوانوں کو نشانہ بناتی تھی۔ نواز تصویریں لے رہا تھا کہ اس کے کیمرے میں ایک چہرہ آیا اور اس نے بے ساختہ اس کی تصویر لے لی۔ اسی وقت اس آدمی نے بھی نواز کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ نواز نے اس کی تصویر لی ہے لیکن جب تک نواز کیمرا ہٹا کر دیکھتا، وہ شخص پھرتی سے ہجوم میں غائب ہو چکا تھا، یہ وہی چھوٹے بالوں اور گول چہرے والا شخص تھا جو سری نگر کی فلائٹ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا کہ وہ اسے یہاں نظر آیا تھا؟ نواز نے سوچا۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن وہ کشمیری تھا اور ریلی میں شامل تھا تو اسے دیکھ کر اس طرح غائب کیوں ہوا تھا؟ نواز کی نظریں اسے ہجوم میں تلاش کرنے لگیں۔ پھر اسے ریٹا کا خیال آیا اور اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے بھی غائب پایا اور اسی لمحے اسے فائرنگ کی تیز آواز سنائی دینے لگی۔

☆☆☆

ریلی کے اعلان نے بھارتی ایوانوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔ کشمیری ایک بار پھر کمر کس کر اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے اور اس بار ان کے تیور ماضی سے کہیں زیادہ خراب لگ رہے تھے۔

اس بار کشمیریوں نے ہتھیار کے بجائے پتھر اٹھا لیے تھے۔ ان کی زبانوں پر نعرے تھے اور پلے کارڈز کی مدد سے بھارت کے خلاف اپنی نفرت اور آزادی کے مطالبے کا اظہار کر رہے تھے۔ نوّے کے عشرے کے مقابلے میں اب عام لوگوں کو انٹرنیٹ اور موبائل جیسے ابلاغ کی سہولتیں میسر تھیں۔ کشمیری نوجوان ویب سائٹس اور ایس ایم ایس سروس کی مدد سے اپنی تحریک کو پھیلا رہے تھے۔ لوگوں کا منظم ہجوم ایک کال پر سڑکوں پر نکل آتا اور پورے شہر کو مفلوج کر دیتا تھا۔ ایسے میں فوج کو بنکروں اور بیرکوں میں روپوش ہونا پڑتا کیونکہ لاکھوں کے ہجوم کے ساتھ تصادم خطرناک ہو سکتا تھا۔ آج کل کوئی بات چھپانا ناممکن ہے اور یہ فوراً عالمی میڈیا پر آ جاتی ہے۔ بے شک مغربی میڈیا بھارت کی ہم نوائی کر رہا ہے لیکن وہاں آزاد میڈیا بھی ہے جو صورتِ حال کو عام لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

اس بار بھارت کی حکومت نے حکمتِ عملی تبدیل کرتے ہوئے کشمیریوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اکا دکا واقعات میں کشمیری مارے جاتے تھے لیکن آج لاکھوں افراد سے نمٹنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ فوج کو اوپر سے حکم آ گیا تھا اور وہ اس پر عمل درآمد کے لیے بالکل تیار تھی۔ جیسے ہی ریلی کا ایک حصہ ایک فوجی بنکر کے پاس پہنچا، خاردار تاریں اور بنکر دیکھ کر لوگوں میں اشتعال پھیل گیا۔ انہوں نے نعرے بازی تیز کر دی اور کچھ افراد نے بنکر کے سامنے کھڑے مسلح سپاہیوں کی طرف پتھر بھی اچھالے۔ وہ شاید اسی کے منتظر تھے۔ انہوں نے چوکی انچارج کے حکم پر رائفلوں کے منہ نہتے ہجوم کے خلاف کھول دیے۔

یہ ڈرانے کے لیے کی جانے والی ہوائی فائرنگ نہیں تھی بلکہ براہِ راست جسموں کا نشانہ لے کر کی جانے والی ہلاکت خیز فائرنگ تھی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ریلی کا سامنے والا حصہ لاشوں اور زخمیوں میں تبدیل ہو گیا۔ بچ جانے والے افراد بھاگ رہے تھے۔ اسی وقت شہر کے دوسرے حصوں میں بھی فوج نے ریلی پر فائر کھول دیا، یہ بہت خوف ناک منظر تھا۔ فوج اب بنکروں اور مورچوں سے آگے آ کر نہتے لوگوں کو قتل کر رہی تھی جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ آزادی مانگ رہے تھے۔ حکومت اور فوج کا خیال تھا کہ ماضی کی طرح وہ طاقت کا استعمال کر کے لوگوں کو ڈرا دیں گے لیکن اس بار عوام کا موڈ کچھ اور تھا۔ لوگوں نے زخمیوں اور لاشوں کو پیچھے کیا اور اس کے بعد تازہ دم لوگ پتھر لے کر آگے آ گئے۔ ہزاروں افراد نے فوج اور پولیس پر اتنا شدید پتھراؤ شروع کیا کہ انہیں پسپا ہونا پڑا۔ وہ پیچھے ہٹتے گئے اور لوگ مرنے کے باوجود آگے بڑھتے رہے۔ پھر ان کی راہ میں جو سرکاری عمارت آئی، اسے نذرِ آتش کر دیا۔ کئی بنکرز اور فوج کے مورچے جلا دیے کیونکہ وہ فوج نے خالی کر دیے تھے۔ پولیس اسٹیشن اور بینکوں کی عمارتیں آگ اگل رہی تھیں۔

سورج غروب ہونا شروع ہوا تو شہر کے بہت سارے

مقامات پر آگ لگی ہوئی تھی۔ لاشوں اور زخمیوں کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا جہاں لوگ اپنے پیاروں کو تلاش کر رہے تھے۔ آج انہیں آزادی کے مطالبے کی ایک اور بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ بیس سال پہلے کشمیری لیڈر کے جنازے پر فائرنگ کے بعد اور آج شہر میں ہلاکتوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ ریلی پر فائرنگ کی خبر سن کر پوری وادی سوگ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

نواز، فران کو کال کر کے رپورٹ دے رہا تھا۔ اس نے اصل رپورٹ مع تصویروں کے انٹرنیٹ کی مدد سے بھیج دی تھی۔ ''میں اسپتالوں میں کم سے کم سو افراد کی لاشیں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ مرنے والوں میں نوّے فی صد جوان ہیں۔ میں نے تصویریں بھی بھیجی ہیں۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' فران نے کہا۔ ''اور کچھ؟''

''ریٹا لاپتا ہے۔'' نواز نے کہا۔ ''میں نے اسے فائرنگ سے پہلے ہی غائب پایا تھا۔''

''میرے خدا!'' فران کے منہ سے نکلا۔ ''مجھے اسی بات کا خدشہ تھا اسی وجہ سے میں نے ریٹا کو بھیجنے کی مخالفت کی تھی۔''

''مخالفت؟'' نواز حیرت سے بولا۔ ''اسے تو تم نے ہی منتخب کیا تھا؟''

''میں نے نہیں اسے جیسی مور نے منتخب کیا تھا۔'' فران کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''میں صرف تمہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ ریٹا کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔''

''میں نے مقامی پولیس کو اطلاع کر دی ہے اور دہلی میں برٹش سفارت خانے کو بھی بتا دیا ہے۔''

''اب مجھے تمہاری طرف سے تشویش ہے۔'' فران نے کہا۔ ''تم کہاں مقیم ہو؟''

''اسی ہوٹل میں جہاں ہم رکے تھے۔''

''وہاں سے نکل جاؤ اور کسی غیر معروف جگہ رکو بلکہ ہوٹل میں کوئی ضروری سامان نہیں ہے تو وہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' نواز نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جیسی مور اخبار میں بھارتی اور اسرائیلی لابی کا باقاعدہ ایجنٹ تھا اور وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتا بھی نہیں تھا۔ اگر اس نے اصرار کر کے ریٹا کو شامل کرایا تھا تو یہ سازش بھی ہو سکتی تھی۔ ریٹا کے غائب ہونے کے بعد اس نے فوری طور پر اسے فون کیا لیکن عین اس وقت موبائل سروس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ سروس جان بوجھ کر بند کی گئی تھی تاکہ دنیا کو خبر ہونے سے پہلے بھارتی فوج اپنا کام کر لے۔ اس نے ہجوم میں ریٹا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔

رات گئے موبائل سروس بحال ہوئی تو نواز نے اپنے آئی فون پر رپورٹ لکھ کر اسے موبائل انٹرنیٹ کی مدد سے فران کو بھیج دیا۔ تصویریں بھی اس نے اسی طرح بھیجی تھیں۔ اس وقت وہ ایک اسپتال میں تھا جہاں کم سے کم پچاس افراد کی لاشیں اور دو سو کے قریب زخمی لائے گئے تھے اور ان کی کراہوں اور مرنے والے افراد کے عزیزوں کی آہ و بکا سے ماحول سوگوار ہو رہا تھا۔ نواز سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ ہوٹل جانا واقعی مناسب نہیں تھا۔ خاص طور سے ریٹا کے غائب ہونے کے بعد۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' پاس سے گزرتی ایک برقع پوش لڑکی کہتی ہوئی چلی گئی۔ نواز کا دل دھڑک اٹھا، یہ وہی لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ رکی نہیں تھی اس لیے نواز اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اسپتال کے تاریک برآمدے میں ایک ستون کی آڑ میں رک گئی۔ نواز اس کے پاس آیا۔

''تم وہی ہو نا؟''

''ہاں اور تم خطرے میں ہو۔ بھارتی ایجنٹ تمہاری تلاش میں ہیں۔''

''میری ساتھی لڑکی...''

لڑکی نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس کی فکر مت کرو، فی الحال اپنی فکر کرو کیونکہ انہیں اصل میں تمہاری تلاش ہے۔ تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''وہ اسپتال میں بھی ہیں؟''

''بالکل... ورنہ یہاں سے نکلنے میں کیا مسئلہ تھا۔'' لڑکی نے فکرمندی سے کہا۔ ''کیا تم اندر جا کر کسی ڈاکٹر کا کوٹ حاصل کر سکتے ہو۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' نواز اس کا مطلب سمجھ گیا۔

''اگر تم باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ تو اسپتال کے مین گیٹ کے دائیں طرف سبز رنگ کا چھوٹا سا بنگلا ہے۔ اس کے آگے بغلی گلی ہے، اس میں آ جانا۔''

''پہلے تم بتاؤ... تم کون ہو؟''

''تمہاری ہمدرد۔'' لڑکی نے کہا اور اس سے پہلے نواز اسے روکتا، وہ تاریکی میں غائب ہو گئی۔ نواز فکرمند ہو گیا۔ اگر اس کی بات درست تھی تو وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ برطانوی شہری ہونے کے ناتے اس کی گرفتاری اور کوئی

http://digestpk.blogspot.com/

عدالتی کارروائی تو مشکل تھی لیکن اسے ہمیشہ کے لیے غائب کیا جاسکتا تھا اور اس کا الزام مقامی حریت پسندوں پر بھی لگایا جاسکتا تھا۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اسپتال میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا اور وہاں یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ کون بھارتی ایجنٹ ہے۔ نواز نے ایک نرس کو دواؤں کی ٹرے لیے ایک دروازے سے اندر جاتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔ یہ دواؤں کے لیے مخصوص کمرا تھا۔

''سسٹر! میں ایک رضا کار ڈاکٹر ہوں، کیا مجھے کوٹ مل سکتا ہے؟''

''کپڑوں کا کمرا اس سے آگے والا ہے۔'' نرس نے بنا کسی شک کے کہا۔ حالات ایسے تھے کہ جو بھی ڈاکٹر تھا، وہ زخمیوں کے کام آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نواز اگلے کمرے میں آیا۔ یہاں پیرا میڈک کے لیے کپڑے تھے، ان میں ڈاکٹروں کے کوٹ بھی تھے۔ نواز نے ایک کوٹ لیا اور پھر ایک اسٹیتھو اسکوپ بھی گلے میں ڈال لیا۔ ساتھ ہی اس نے وہاں پڑی گرم ٹوپی بھی اٹھا کر سر پر رکھ لی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے اسے ایک جگہ کلپ بورڈ نظر آیا، اس نے وہ بھی اٹھا لیا اور اب وہ ڈاکٹر لگ رہا تھا۔ وہ برآمدے تک آیا تو اس نے دیکھا مین گیٹ پر دو افراد موجود ہیں اور ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ سامنے سے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ برآمدے سے اتر کر دائیں طرف آیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس طرف بھی اسپتال کا کوئی کمرا ہو۔ لیکن وہ باغ کے ساتھ ملحق چار دیواری تک پہنچا اور اچانک ہی اسے پھلانگ کر باہر آگیا۔ یہ گندی گلی تھی اور یہاں کچرا بکھرا ہوا تھا۔ وہ کوٹ اتارتا ہوا گلی سے نکل آیا۔ اسٹیتھو اسکوپ اور کلپ بورڈ وہ پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ اسے مین گیٹ کے سامنے والے حصے میں آنے کے لیے خاصا گھوم کر آنا پڑا۔ اتفاق سے وہ اس چھوٹی گلی کے سامنے نکلا جو سبز رنگ کے بنگلے کے ساتھ نیچے کہیں جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اس میں داخل ہوا، تاریکی میں دو ہاتھوں نے اسے دبوچ لیا۔

☆☆☆

شمس ڈار کا غصے سے بُرا حال تھا۔ وہ ریلی کی صبح سری نگر آگیا تھا اور اسے اطلاع ملی تھی کہ برطانوی صحافی نواز گل اور اس کی ساتھی لڑکی ریٹا اپنے ہوٹل سے نکلے ہی نہیں۔ اس کے آدمی ہوٹل کی مکمل نگرانی کر رہے تھے پھر اسے یہ جان کر کوفت ہوئی کہ مقامی یونٹ نے کوئی متبادل پلان بنایا ہی نہیں تھا۔ اس نے یونٹ کے سربراہ کیشال کو طلب کر لیا۔ کیشال شمالی بھارت کا رہنے والا تھا اور وہ شمس سے خار کھاتا تھا۔ اس کے خیال میں کسی مسلمان کو ایجنسی کا نائب سربراہ بنانا اسے تباہ کرنے کے مترادف تھا۔ حالانکہ شمس ڈار کا خاندان ساٹھ سال سے بھارت سرکار کے ساتھ وفاداری نبھا رہا تھا۔ اسی وفاداری کے صلے میں شمس اس منصب تک پہنچا تھا۔ بے شمار دوسرے مالی فوائد وہ پہلے ہی حاصل کر رہا تھا۔ اس کا شمار وادی کے چند امیر ترین مسلمانوں میں ہوتا تھا اس لیے اسے پروا نہیں تھی کہ مقامی لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کا سارا خاندان پہلے ہی دہلی منتقل ہو چکا تھا۔

''متبادل پلان کیوں نہیں بنایا گیا؟''

''کیونکہ ہوٹل انتظامیہ جنگجوؤں کی حامی ہے اور وہ کسی صورت وہاں حملہ نہیں کر سکتے۔'' کیشال نے وضاحت کی۔

''ان دونوں کو ہر قیمت پر ہمارے قبضے میں آنا چاہیے۔'' شمس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اوپر والے ناکامی کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' کیشال بے پروائی سے بولا۔ ''میرے پاس متبادل پلان ہے۔ ہم انہیں ریلی کے موقع پر قابو کریں گے۔''

''جب ان کے چاروں طرف لاکھوں لوگ ہوں گے؟''

''ہاں، فائرنگ کے وقت ہونے والی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر میرے آدمی ان دونوں کو اٹھا لیں گے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے... لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہوگا... آپ اعتماد رکھیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔'' شمس نے اپنی برتری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ورنہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کیشال اسے اہمیت نہیں دیتا تھا اور بعض معاملات میں وہ اس کا ماتحت بھی نہیں تھا بلکہ براہِ راست پنڈت کو جواب دہ تھا۔ کیشال کے ہونٹوں پر ایک حقارت بھری مسکراہٹ آئی اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی شمس اسے گالیاں دینے لگا۔ اسے ریلی کے بارے میں پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ سہ پہر کو ریلی پر پانچ مقامات پر فائرنگ ہوئی جس میں ابتدائی اندازے کے مطابق سو سے زیادہ افراد ہلاک اور کوئی پانچ سو کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ لیکن شمس کو ان کی فکر نہیں تھی۔ اسے یہ فکر تھی کہ اگر برطانوی صحافی اور اس کی ساتھی ان کے قابو میں نہ آئی تو وہ پنڈت کو کیا منہ دکھائے گا۔ اصل میں یہ اسی کا منصوبہ تھا جسے پنڈت نے اپنا قرار دے کر اوپر والوں کو پیش کر دیا تھا اور جب شمس کو پتا چلا تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب اس پلان میں ناکامی ہوتی تو پنڈت کا نزلہ

اس پر گرتا۔

شام تک اسے معلوم ہوا کہ ریٹا نامی انگریز عورت کو کیشال کے آدمی لے آئے ہیں لیکن اس کا ساتھی غائب تھا۔ کیشال نے اسے فون پر بتایا تو شمس نے گرج کر کہا۔ ''اسے کیوں نہیں اٹھایا؟''

''پہلے میرے آدمیوں نے لڑکی کو اٹھایا اور جب اسے اٹھانے گئے تو وہ غائب ہو چکا تھا۔''

''یہ سب تمہاری غفلت ہے۔ میں اوپر تمہاری رپورٹ بھیجوں گا۔''

''ابھی ہمیں مکمل ناکامی نہیں ہوئی۔'' کیشال اس بات سے فکر مند ہوگیا۔ شمس بہرحال اس کا باس تھا۔ اگر وہ اس کے خلاف رپورٹ دیتا تو یہ اس کے کیریئر پر داغ بن جاتی۔ ''میرے آدمی اسے اسپتالوں میں تلاش کر رہے ہیں۔''

''صرف اسپتالوں میں؟'' شمس غرایا۔ ''پولیس اسٹیشنز میں کون دیکھے گا؟''

کیشال کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے اپنے آدمیوں کو پولیس اسٹیشنز کی نگرانی کرنے کا حکم بھی دیا۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد اسے معلوم ہوا کہ نواز گل اپنی ساتھی ریٹا کی گمشدگی کی رپورٹ کر کے جا چکا ہے۔ مزید یہ کہ رپورٹ برٹش سفارت خانے تک بھی جا پہنچی تھی۔ نواز گل خود پہلے کی طرح غائب تھا۔ ہوٹل کی نگرانی کرنے والوں نے بتایا تھا کہ وہ ابھی تک وہاں نہیں آیا ہے۔ اس نے جب یہ اطلاع شمس کو دی تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کیشال سے کہا۔ ''اپنے آدمیوں کو شہر میں پھیلا دو۔ مجھے ہر صورت یہ شخص صبح سے پہلے چاہیے۔''

کیشال کو احساس ہوا کہ وہ غلطی کر چکا ہے۔ اسے نواز گل کی نگرانی کروانی چاہیے تھی لیکن وہ ریٹا کے چکر میں رہا اور جب تک اس کے آدمی ریٹا کو اٹھاتے، نواز غائب ہو چکا تھا جبکہ اصل آدمی وہی تھا۔ اس کے بغیر ان کا پلان ادھورا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ شہر کے تمام اسپتالوں کی نگرانی کریں اور اگر انہیں نواز جیسے حلیے والا آدمی نظر آئے تو فوراً مطلع کریں۔ دو گھنٹے بعد اسے پتا چلا کہ اس حلیے کا ایک آدمی سری نگر کے مرکزی اسپتال میں دیکھا گیا تھا، کیشال اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن وہ جب وہاں پہنچا تو نواز گل وہاں سے بھی نکل چکا تھا۔

کیشال اپنے آدمیوں پر برس پڑا اور اس نے آس پاس کا خیال کیے بغیر ان کو لتاڑنا شروع کر دیا۔ یہ مقامی ایجنٹ اسپتال کی نگرانی کر رہے تھے۔ اچانک کوئی چلّایا۔

''یہ بھارتی ایجنٹ ہے... کسی صحافی کو گرفتار کرنے کی بات کر رہا ہے۔''

کیشال نے احتیاط نہیں کی تھی اور کسی نے اس کی بات سن لی۔ وہاں جذبات سے بھرے کشمیری تھے جنہوں نے لمحوں میں انہیں گھیر لیا اور جب کیشال اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ہتھیار نکالے تو لوگوں کو یقین ہوگیا کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ نواز جوڈو کا داؤ استعمال کرتا، اسی لڑکی کی سرگوشی سنائی دی۔ ''یہ میں ہوں، میرے ساتھ آؤ۔''

وہاں مکمل تاریکی تھی لیکن لڑکی اسے اعتماد سے لیے جا رہی تھی جیسے اسے اندھیرے میں سب صاف نظر آ رہا ہو۔ وہ نشیب میں اتر رہے تھے۔ یہاں انہیں سنبھل کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ لڑکی اسے آنے والی اونچ نیچ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ نواز نے اس سے پوچھا۔ ''ہمیں اور کتنی دور چلنا ہوگا؟ مجھے تلاش کرنے والے زیادہ دور نہیں ہیں۔''

''ان کی فکر مت کرو، وہ اس وقت میرے ساتھیوں کے گھیرے میں ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کئی کو زندہ واپسی بھی نصیب نہ ہو۔'' لڑکی نے کہا۔

اس سے پہلے کہ نواز کچھ کہتا، اوپر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ کئی افراد نے چھوٹے ہتھیاروں سے مسلسل فائرنگ کی تھی۔ لڑکی رک گئی، اس نے تشویش سے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، مجھے تلاش کرنے والے نہتے ہوں گے؟''

''میرے خدا... وہاں اسپتال میں بہت سارے عام شہری بھی ہیں۔'' لڑکی نے کہا اور ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ اس بار اس کی رفتار تیز تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئے۔ یہ دراصل کسی تین منزلہ مکان کا نچلا حصہ تھا۔ یہاں پر روشنی تھی۔ لڑکی نے آنکھوں سے عینک اتار دی۔ نواز کے لیے یہ اجنبی چیز نہیں تھی۔ یہ مکمل تاریکی کو نیم تاریکی میں بدل دینے والی عینک تھی۔ اسی وجہ سے لڑکی اسے مکمل اعتماد سے لیے چلی جا رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا ساخستہ حال کمرا تھا جہاں بیٹھنے کو کچھ نہیں تھا۔ لڑکی نے دروازہ بند کیا۔ یہ وہی لڑکی تھی لیکن اس وقت خالص کشمیری لڑکی کے حلیے میں تھی۔ اسپتال میں اس کا لباس کچھ اور تھا۔ نواز پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''تم کون ہو اور اتنی تیزی سے لباس کیسے بدل لیتی ہو؟''

''پہلے سوال کا جواب نہیں دے سکتی اور دوسرا بے کار

http://digestpk.blogspot.com/

ہے۔" لڑکی نے خشک لہجے میں کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"تم چپ نہیں رہ سکتے؟" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے، میں چپ ہو جاتا ہوں لیکن تم یہ تو بتا سکتی ہو کہ میری ساتھی کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ جہاں ہے اپنی مرضی سے گئی ہے۔"

نواز چونکا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میرے ساتھیوں نے اسے ایک طرف جاتے دیکھا تھا۔ فائرنگ اور ہجوم کی وجہ سے وہ اس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے لیکن اسے زبردستی لے جانے کے کوئی آثار نہیں تھے۔"

نواز نے سکون کا سانس لیا۔ "اس کا مطلب ہے، وہ خیریت سے ہے۔"

"مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔" لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نہیں جانتے آج کل اس خطے میں کیا ہو رہا ہے۔ بھارت کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کو دہشت گرد تحریک قرار دینے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔"

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور لڑکی نے جواب میں ویسی ہی دستک دی۔ دوسری بار مختلف دستک ہوئی اور لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر آنے والا ایک پچیس چھبیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور تشویش زدہ تھا۔ لڑکی نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"ہم نے بھارتی ایجنٹس کو روک لیا تھا لیکن انہوں نے ہتھیار نکال لیے۔ فائرنگ میں جہاں زیب شہید ہو گیا۔ تین ایجنٹ مارے گئے اور ایک بچ نکلا، شاید وہی سرغنہ تھا۔"

لڑکی کے چہرے پر بھی دکھ کی پرچھائیں چھا گئی پھر اس نے پوچھا۔ "باقی کہاں ہیں؟"

"سب نکل آئے ہیں۔ اب ہمارا اس علاقے سے نکلنا ضروری ہے۔ کل صبح لازمی سرچ آپریشن ہوگا۔" نوجوان نے کہا۔ پھر وہ نواز کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم ٹھیک ہو دوست؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں لیکن میری ساتھی..."

"اس کی فکر مت کرو لیکن اس نے حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ اسے ان حالات میں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"وہ خود نہیں آئی، اسے بھیجا گیا ہے۔" نواز نے کہا۔

"لیکن یہ کہہ رہی ہے، وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" نوجوان نے تشویش سے کہا۔ "وہ ایک مغربی عورت ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو اس خطے کے حالات پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اپنی جدوجہد کو ایک نئی سمت میں شروع کیا ہے اور بھارت کی کوشش ہے، اسے سبوتاژ کر دے۔"

نواز ان کے خدشات سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "کیا تمہارا تعلق جنگجوؤں سے ہے؟"

"نہیں، ہمارا تعلق ایک دوسرے گروپ سے ہے۔" نوجوان نے کہا۔

"کیا تم مجھ پر اعتبار کرتے ہو؟"

"کرنا پڑے گا کیونکہ تمہیں جس شخص نے بھیجا ہے، وہ ہمارے لیے قابلِ اعتماد ہے۔"

"فران؟" نواز حیران ہوا۔

نوجوان نے سر ہلایا۔ "ہاں، مغربی میڈیا میں وہ ہمارے چند دوستوں میں سے ایک ہے۔ اب یہاں سے نکلو۔"

وہ اس مکان سے نکل آئے اور رات کی تاریکی میں گلیوں اور ویران راستوں پر سفر کرتے ہوئے کوئی نصف گھنٹے بعد ایک چھوٹی سی بستی کے ایک مکان میں داخل ہوئے۔ باہر سے خاموش اور تاریک نظر آنے والے اس مکان میں اندر چہل پہل اور روشنی تھی۔ وہاں چھ سات افراد تھے۔ نوجوان ان سے سلام دعا کرتا ہوا اندر ایک کمرے میں آیا اور اس نے موم بتی جلائی۔ یہاں روشنی نہیں تھی۔ زمین پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اس نے نواز کو بیٹھنے کو کہا اور خود بھی قالین پر بیٹھ گیا۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک شخص اندر آیا اور قہوے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔

"کچھ دیر میں کھانا آجائے گا۔" نوجوان نے اسے بتایا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے لیکن کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ کیا چکر ہے؟"

"چکر بہت سادہ سا ہے۔ انڈیا ہماری نئی جدوجہد کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ فلسطین کی طرح کشمیر کے مسئلے کو بھی دہشت گردی کی جنگ سے منسلک کر دے۔ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ اقوامِ متحدہ کی کشمیر پر قراردادیں ہیں۔"

"قرارداد تو فلسطین پر بھی تھی۔" نواز نے اعتراض کیا۔

"فلسطین کا مسئلہ قرارداد پر عمل درآمد کے بعد پیدا ہوا ہے، یہاں تو سرے سے عمل درآمد ہی نہیں ہوا ہے۔ اس لیے بھارت ایسے حالات پیدا کرنا چاہ رہا ہے کہ جب مغربی طاقتوں کی اس خطے سے دلچسپی ختم ہو جائے تو وہ ان کی مدد سے ان قراردادوں کو لپیٹ دے اور کشمیر کو مکمل طور پر ہضم کر جائے۔"

"یہ کوشش بھی انڈیا بہت عرصے سے کر رہا ہے۔"

"لیکن اب اس نے تحریکِ آزادی کو دہشت گردی قرار دلوانے کی نئی پلاننگ کی ہے۔ اس کے تحت یہاں مغربی باشندوں کو اغوا اور قتل کیا جائے گا اور دوسرے یورپ اور امریکا سے تعلق رکھنے والے کشمیری نژاد لوگوں کو دہشت گردوں کا ہمدرد اور سرپرست ثابت کیا جائے گا۔"

نواز سمجھ رہا تھا۔ "میرا تعلق آبائی طور پر کشمیر سے ہے۔"

"اور پھر تم صحافی ہو۔ اگر تمہیں دہشت گردوں کا ساتھی ثابت کر دیا جائے تو کیا یورپ اور دوسرے ملکوں میں آباد کشمیری اچانک ہی مشکوک نہیں ہو جائیں گے؟"

"ممکن ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" نواز بولا۔ "لیکن ہمیں تو ہمارے اخبار نے بھیجا ہے۔"

نوجوان مسکرایا۔ "جس طرح وہاں ہمارے ہمدرد ہیں تو بھارت کے ہمدرد ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ وہ اسے اطلاعات ہی نہیں بلکہ اس کے منصوبوں میں عملی مدد بھی دیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں ایک منصوبے کے تحت یہاں بھیجا گیا ہے... لیکن کیا فران کو یہ بات نہیں معلوم؟"

"فران کو دیر سے پتا چلا... جب تم دونوں کو بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور یہ فیصلہ اوپر سے ہوا تھا۔"

"فران مجھ سے تو کہہ سکتا تھا۔"

"تم سے کیسے کہہ دیتا، جب تم اس بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں تھے؟"

"تو کیا اب میں جان گیا ہوں؟"

"تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

نواز نے سر ہلایا۔ وہ سوچ رہا تھا، اچانک اسے ایک خیال آیا اور اس نے نوجوان سے کہا۔ "جب ہم سری نگر آرہے تھے تو طیارے میں ایک شخص میرے برابر میں بیٹھا تھا اور وہی شخص مجھے ریلی میں نظر آیا اور مجھے دیکھتے ہی غائب ہو گیا۔ اس کے کچھ منٹ بعد ریتا بھی غائب ہو گئی۔ میں نے اس کی تصویر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لی ہے۔"

"دکھاؤ مجھے۔" نوجوان نے دلچسپی سے کہا۔ اب تک اس نے نواز کو اپنا نام نہیں بتایا تھا اور نہ ہی نواز نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ نواز نے اپنے کیمرے میں اس کی تصویر نکالی اور کیمرا اس کی طرف بڑھا دیا۔ نوجوان نے آدمی کی تصویر دیکھی اور چونک گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تو وہی ہے جو اسپتال میں تمہیں تلاش کر رہا تھا... اور اس نے میرے ساتھیوں پر فائرنگ کی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ بھارتی ایجنٹ ہے؟"

نوجوان سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ شخص پہلے بھی ایک معاملے میں سامنے آیا تھا۔ انڈیا نے حریت پسندوں کے جعلی گروپ بنا لیے ہیں، ان میں بھارتی ایجنٹس بالکل حریت پسندوں والا حلیہ بنا کر رکھتے ہیں۔ یہ حریت پسندوں کے نام پر ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جن کا مقصد تحریک کو بدنام کرنا ہے۔ ایک مغربی صحافی جو بھارت کا بہت ہمدرد ہے اسے ایک ایسے ہی گروپ نے اپنی نام نہاد کارروائیوں کے بارے میں بتایا تھا اور اس نے رپورٹ بنا کر اسے فرانس کے ایک اخبار میں شائع کیا تھا۔"

"میں نے وہ رپورٹ دیکھی تھی۔"

"اس صحافی سے بھی یہی شخص ملا تھا۔ اس نے تصویر نہیں دی تھی لیکن وہ تصویر ہمیں اپنے ذرائع سے مل گئی تھی۔ سوچنے کی بات تھی کہ یہ صحافی حریت پسندوں کا اتنا ہمدرد کیسے ہو گیا کہ اسے ایک حریت پسند کی تصویر مل رہی ہے اور وہ اسے شائع نہیں کر رہا ہے۔"

اب نواز گل کی سمجھ میں آیا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا، یہ ایک کھیل تھا جس کا سلسلہ لندن سے شروع ہوا تھا اور یہ کشمیر تک پھیل چکا تھا۔ اس نے نوجوان سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "اس کے برعکس تمہارا آنا ہمارے لیے سود مند رہا۔ اگر وہ کسی اور کو بھیجتے تو فران کو پتا ہی نہیں چلتا اور ان کی سازش کامیاب ہو جاتی۔"

نواز سمجھ چکا تھا کہ سازش کیا ہے پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔ "سازش کیا ہے؟"

"سازش یہ ہے کہ تمہیں حریت پسندوں کا ہمدرد ثابت کیا جائے اور تمہاری گرفتاری دکھا کر تم پر مقدمہ چلے اور پھر تمہیں واپس برطانیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ وہاں تم نئے سرے سے زیرِ عتاب آتے۔"

"اس کے لیے ضروری ہے کہ حریت پسندوں سے میرا رابطہ ثابت کیا جائے۔"

"انڈین سب کر سکتے ہیں۔ ان کو اس قسم کے ڈراموں کی بہت پریکٹس ہو گئی ہے اور ان ڈراموں میں جو تکنیکی خامیاں رہ جاتی ہیں، انہیں مغرب کے ادارے محض اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ ڈرامے میڈ اِن انڈیا ہوتے ہیں۔" نوجوان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ پھر اس نے گہری سانس لی۔ "فی الحال حالات ہمارے لیے بہت خراب ہیں اور ہمیں ہر قدم پھونک کر اٹھانا پڑ رہا ہے۔ کم سے کم پانچ سال ہمارے لیے مشکل ہیں۔"

http://digestpk.blogspot.com/

''پانچ سال بعد کیا ہوگا؟''

''تم صحافی ہو اور جانتے ہو کہ پانچ سال بعد مغرب کے حوالے سے اس خطے میں کیا تبدیلی آنے والی ہے۔''

نواز اس تبدیلی کے بارے میں جانتا تھا لیکن مسئلہ ابھی کا تھا اور وہ بڑی مشکل میں پڑ چکا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور دیوار سے پشت لگا کر صورتِ حال پر غور کرنے لگا، اس کی عقابی نگاہوں میں فکرمندی تھی۔

☆☆☆

شمس کو اپنے دفتر میں اطلاع مل چکی تھی۔ اسپتال میں ہونے والی جھڑپ میں اس کی ایجنسی کے تین افراد اور چار شہری مارے گئے تھے۔ کیشال زخمی حالت میں وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ اس کے دفتر میں تھا۔ اس کی ناک پر چوٹ لگنے کی وجہ سے خون بہا تھا جسے اس نے صاف کرلیا تھا لیکن اس کے نشانات ابھی بھی اس کی ناک اور کپڑوں پر واضح تھے۔ شمس نے اسے سرد نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''تم مسلسل ناکام جارہے ہو۔''

ایک لمحے کو ایسا لگا کہ کیشال اس پر برس پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میرے آدمی اسے پورے سری نگر میں تلاش کررہے ہیں۔''

خلافِ توقع شمس نے اسے لتاڑا نہیں کیونکہ وہ خود بہت پریشان تھا۔ کچھ دیر پہلے اسے پنڈت کی کال آئی تھی اور اس نے رپورٹ مانگی تھی۔ شمس نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ لڑکی ان کے ہاتھ آگئی ہے اور لڑکے کی تلاش جاری ہے۔ لیکن پنڈت ان باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے شمس کو مطلع کیا کہ اس کے پاس صرف کل تک کی مہلت ہے، اس کے بعد یہ خبر بین الاقوامی میڈیا پر آجائے گی اور ان کے لیے حالات کو اپنی مرضی سے چلانا ممکن نہیں رہے گا۔ شمس اسی لیے کیشال سے نرمی برت رہا تھا، اس نے کہا۔

''ہمارے پاس کل تک کی مہلت ہے۔''

''کل تک وہ ہمارے قبضے میں ہوگا۔'' کیشال نے کہا۔ ''میں نے ابھی سری نگر سینٹرل کمانڈ سے بات کی ہے، سری نگر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ شہر سے باہر نہیں جاسکتا۔''

شمس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کیشال کو شوٹ کردے۔ یہ شخص جس کا انڈین انٹیلی جنس میں نام تھا، نہایت نکما ثابت ہوا تھا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''اسے سری نگر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہیں کہیں چھپا رہے گا جب تک یہ معاملہ انٹرنیشنل میڈیا پر نہیں آجاتا... اور اس کے بعد ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔''

''کل تک تو اسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔'' کیشال نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''تب ایک آسان کام ہوگا اور وہ یہ کہ ہم دونوں کی چھٹی ہوجائے گی۔ میں تو دہلی چلا جاؤں گا، تم اپنے بارے میں ابھی سے سوچ لو کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔''

کیشال کا تعلق شمالی بھارت کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا اور اس نے غربت میں پرورش پائی تھی۔ اپنی محنت سے اس نے تعلیم حاصل کی اور پھر پہلے سی آئی ڈی میں اور وہاں سے را میں آگیا۔ را میں نوکری کے دوران اس کا بیشتر وقت کشمیر میں گزرا تھا اور اسی وجہ سے جب کشمیر کے لیے یہ وفاقی ایجنسی بنی تو اس میں کیشال کو بھی منتخب کیا گیا۔ وہ تو ایجنسی کا سربراہ بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اب یہاں اس کی نوکری ختم ہونے کے آثار تھے۔ اگر نوکری ختم نہ بھی ہوتی، تب بھی وہ اس عہدے پر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ حریت پسندوں جیسے گروپس کی تشکیل کا خیال کیشال کا تھا اور اسی نے اس پر عمل درآمد کیا تھا۔ ان گروپوں کی مدد سے ان کو کئی کامیابیاں ملی تھیں لیکن یہ معاملہ ان کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ کیشال کے خیال میں اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس کا منصوبہ ایک کشمیری (شمس) نے بنایا تھا۔ اگر اسے یہ کام سونپا جاتا تو وہ اسے کہیں بہتر طریقے سے کرسکتا تھا۔ اب شمس کے ساتھ اس کے کیریئر پر بھی بن آئی تھی۔ شمس تو دہلی میں اپنے عالی شان گھر چلا جاتا... وہ کہاں جاتا؟ اسے اپنی نوکری بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اسے صبح سے پہلے نواز گل کو تلاش کرنا تھا۔ اس نے شمس کی طرف دیکھا۔

''لڑکی کا کیا کرنا ہے؟''

''کچھ نہیں، ابھی اسے حفاظت سے رکھو اور یہ یقین دلاتے رہو کہ وہ دوستوں میں ہے۔''

یہ کیشال کے لیے ایک اور پریشان کن ہدایت تھی کیونکہ اس سے پہلے اسے صرف یہ حکم ملا تھا کہ اس برطانوی صحافی لڑکی کو اٹھانا ہے اور اٹھایا اسے جاتا ہے جو دشمن ہو۔ اگرچہ جب کیشال کے آدمی نے اسے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ بغیر کسی مزاحمت اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اب وہ ان کے پاس تھی اور اس نے اپنے ماتحتوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دشمن نہیں ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے ہاتھ جو عورتیں آتی تھیں، ان کا وہ لوگ کیا حشر کرتے تھے۔ لیکن یہ بات وہ شمس سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بدقسمتی سے اسے پلان کا

صرف اتنا حصہ بتایا گیا تھا جس پر اسے عمل کرنا تھا اور اب پورا پلان اس کے سامنے آرہا تھا۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے اپنے نائب راجین کو کال کی۔

''لڑکی کہاں ہے؟''

''نیچے تہ خانے میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا ہے؟'' کیشال نے تیزی سے پوچھا۔

''نہیں، ہم سب احتیاط.... کررہے ہیں۔ اسے برانڈی زیادہ دی ہے اس لیے وہ ہوش میں نہیں ہے۔''

''بھگوان۔'' کیشال دل ہی دل میں بولا اور زبان سے کہا۔ ''احمق... اسے فوراً اوپر لاؤ اور اس کی حالت ٹھیک کرو... تم لوگ کتوں سے بھی بدتر ہو۔''

اس کا اندیشہ درست نکلا تھا۔ اس کے ماتحت لڑکی پر ٹوٹ پڑے تھے۔ معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جارہے تھے۔ اب نواز گل کا ملنا اور بھی ضروری ہوگیا تھا، وہ مل جاتا تو سب ٹھیک ہوجاتا۔ اس نے تمام ذرائع استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور فون سنبھال لیا۔

☆☆☆

نواز دل ہی دل میں تجزیہ کررہا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی اور ریٹا کی سلامتی کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی طرح دہلی میں برطانوی ہائی کمیشن پہنچ جائے۔ اگر وہ ان لوگوں کے ہاتھ لگ جاتا تو اس کی زندگی تو خطرے میں پڑتی ہی مگر ریٹا لازمی ماری جاتی۔ اب بھی وہ نہ جانے کس حال میں تھی۔ اگر بھارتی حکام کا منصوبہ یہی تھا تو وہ اب تک سری نگر سے باہر جانے والے تمام راستے بند کرچکے ہوتے۔ اس نے کھانا کھالیا تھا اور اس وقت آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والی آوازیں معدوم ہوچکی تھیں۔ وہ لوگ سوگئے تھے یا پھر یہاں سے جاچکے تھے۔

پھر وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے یہ لڑنے والے لوگ نہیں لگے تھے۔ اگرچہ ان کے پاس ہتھیار تھے اور وہ ان کا استعمال بھی جانتے تھے لیکن ان کا انداز لڑنے والوں سے مختلف تھا۔ وہ دوسری سمت میں کام کررہے تھے۔ وہ بھارتی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کو جواب دے رہے تھے۔ اپنے حلیے اور انداز سے یہ عام کشمیری نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے جبکہ حریت پسند اپنے حلیے سے ہی جنگجو نظر آتے تھے۔ نواز نے محسوس کیا کہ جس طرح بھارتی حکومت نے کشمیر کی تحریکِ آزادی کو ختم کرنے کے لیے نئے طریقے اپنائے تھے، بالکل اسی طرح کشمیریوں نے بھی تحریک کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی حکمتِ عملی بدل لی تھی۔ اب وہ لڑائی کے بجائے احتجاج کے طریقے اپنا رہے تھے۔ یہ سب سوچتے ہوئے اسے نیند آگئی لیکن اسے..... زیادہ دیر سونا نصیب نہیں ہوا۔ صبح سے پہلے ہی اسے کسی نے بیدار کردیا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔

''اٹھو، ہمیں یہاں سے جانا ہے۔''

نواز نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم اپنا نام نہیں بتاؤ گی؟''

''کیا نام جاننا ضروری ہے؟'' لڑکی نے دوسری طرف دیکھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اپنی شناخت چھپا رہے ہو اور اس لیے میں نے کسی کا نام پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لیکن میں تمہارا نام ضرور جاننا چاہوں گا۔ یقین کرو، یہ نام کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔ دل میں رہے گا۔''

''ربیعہ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن تم کبھی یہ نام نہیں لوگے۔''

''میں نے کہا نا، یہ نام میرے دل میں رہے گا۔''

''اب اٹھ جاؤ، تمہیں سری نگر سے نکالنا ہے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے، میرا دہلی میں برطانوی ہائی کمیشن تک پہنچنا لازمی ہے۔''

صحن میں ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا واش روم تھا۔ وہ وہاں سے فارغ ہوکر آیا تو ناشتا تیار تھا۔ باہر ابھی روشنی ہو رہی تھی۔ وہ ناشتا کررہا تھا کہ رات والا نوجوان آگیا۔ اپنے انداز اور باتوں سے وہ اس گروپ کا سربراہ لگتا تھا۔ ربیعہ نے اس کے سامنے بھی چائے رکھ دی اور وہ ناشتے میں شریک ہوگیا۔ ناشتے کے بعد اس نے نواز سے کہا۔ ''اب تمہیں سری نگر سے نکال کر دہلی پہنچانا ہے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔''

''کل رات سری نگر کے بہت سارے علاقوں میں پولیس اور پیراملٹری نے چھاپے مارے ہیں۔ سو کے قریب افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ انہیں شدت سے تمہاری تلاش ہے۔''

''ہائی کمیشن کیا کررہا ہے؟''

''اس کے بھارتی حکومت سے روابط ہوں گے لیکن عملاً ان کا کوئی آدمی سری نگر میں نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ معاملات مکمل طور پر بھارت کے ہاتھ میں ہیں۔ کیا یہ خبر میڈیا پر آگئی ہے؟''

''صرف اس حد تک کہ ریلی کی رپورٹنگ کرتے ہوئے دو برطانوی صحافی لاپتا ہوگئے ہیں اور پولیس کو شبہ ہے کہ ان کو جنگجوؤں نے اغوا کرلیا ہے۔''

http://digestpk.blogspot.com/

"یعنی کہانی اسی لائن پر چل رہی ہے۔" نواز نے تشویش سے کہا۔ "کیا اس صورت میں میرا نکلنا خطرے والی بات نہیں ہوگی؟"

"ہاں خطرہ تو ہے لیکن اگر یہاں چھاپا پڑ گیا تو تم لازمی پکڑے جاؤ گے۔" نوجوان نے کہا۔ "سنا ہے اگر آج تم ان کو نہیں ملے تو کل سے سری نگر سے باہر جانے کے تمام راستے بند کردیے جائیں گے، اس صورت میں تم یہاں پھنس جاؤ گے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں ان کے ہاتھ نہ آؤں تو ان کا منصوبہ ناکام ہوجائے گا کیونکہ کل تک سب کچھ بین الاقوامی میڈیا پر آجائے گا۔"

"اس صورت میں وہ چاہیں گے کہ تم زندہ واپس نہ جاسکو کیونکہ اس طرح بہت سارے چہرے بے نقاب ہوسکتے ہیں اور کہانی سامنے آگئی تو یہ ان کے لیے بہت بڑا دھچکا ہوگا۔"

"صرف مجھے یا ریٹا کو ختم کردینے سے ان کا مسئلہ حل نہیں ہوگا، فران تو ہے... اور وہ بھی اتنا ہی جانتا ہے۔"

"وہ ملازم ہے اور ایک حد سے آگے جاکر ہماری مدد نہیں کرسکتا کیونکہ اس طرح وہ نظروں میں آجائے گا۔" نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اصل مسئلہ اس وقت ہوا جب فران کا منصوبہ بھارت نوازوں کے علم میں آیا اور انہوں نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک دیر ہوچکی تھی اور فران بھی تم لوگوں کی روانگی نہیں روک سکتا تھا۔"

"اس لیے اس نے تم لوگوں سے رابطہ کیا؟"

"ہاں، وہ تمہارا اور ریٹا کا تحفظ چاہتا ہے۔"

"وہ مجھے بھی تو خبردار کرسکتا تھا، میری اس سے فون پر بات ہوئی ہے۔"

"تمہارے فون ٹریس کیے جاچکے ہیں اور اگر تم یہاں موبائل استعمال کرنے کی کوشش کرو گے تو دس منٹ سے بھی پہلے اس جگہ چھاپا پڑ جائے گا۔"

"یہ خدشہ مجھے بھی تھا اس لیے میں نے موبائل استعمال نہیں کیا۔"

"اگر ان کا ایک پلان ناکام ہوگیا تو انہوں نے اس کا متبادل تیار رکھا ہوگا اور ہمارے حساب سے یہ متبادل تم دونوں کا خاتمہ ہوگا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ان کے ہاتھ آجاؤ۔ تمہیں مار کر وہ الزام تحریک پر لگا سکتے ہیں۔ اس سے بھی ان کے مقاصد پورے ہوسکتے ہیں اس لیے اب تمہارا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔" نواز نے سر ہلایا۔ "لیکن یہاں سے نکلیں گے کیسے؟"

"یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ سری نگر سے جموں کے لیے روزانہ سو سے زیادہ بسیں چلتی ہیں۔ لیکن ان سب کی مکمل تلاشی لی جارہی ہے اور ہر مسافر کے کاغذات چیک کیے جارہے ہیں۔ اگر تمہارا حلیہ بدل دیا جائے، تب بھی کاغذات کہاں سے لائیں گے؟"

"پیدل نکلنے کے راستے ہیں؟"

"راستے تو کئی ہیں لیکن ان سب پر نگرانی ہوگی اور پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ ہے۔"

نواز سمجھ رہا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ بہت مشکل میں پڑ گئے تھے اور وہ اس سے ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

نواز نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ فی الحال وہ ان کے رحم و کرم پر تھا اور اسے وہی کرنا تھا جو یہ کہتے۔ اسے ان پر بھروسا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی نکلیں گے لیکن اس وقت وہ حیران رہ گیا جب ربیعہ بھارتی اسٹائل میں ساڑی باندھ کر وہاں آئی اور اس نے ایک کُرتہ پاجامہ نواز کے حوالے کیا۔ "یہ جلدی سے پہن لو... ہم ہندوؤں کے روپ میں یہاں سے نکلیں گے۔"

ربیعہ نے ماتھے پر ٹیکا لگا رکھا تھا اور بال چوٹی کی صورت میں باندھ لیے تھے۔ اس کے جاتے ہی نوجوان آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بال صاف کرنے والی مشین تھی۔ نواز سمجھ گیا کہ یہ مشین اس پر آزمائی جائے گی۔ وقت نہیں تھا اس لیے نوجوان نے نواز کے بال گیلے کیے اور مشین سے ان کو بالکل صاف کردیا۔ اس کا سر سفید نظر آرہا تھا۔ اس سفیدی کو ختم کرنے کے لیے اس پر ہلکا سا زیتون کا تیل لگا دیا تو سر یوں چمکنے لگا جیسے نواز باقاعدگی سے استرا پھرواتا ہو۔ ربیعہ نے آکر اس کے ماتھے پر تلک لگایا۔ اب وہ باہر نکلنے کے لیے تیار تھے۔ نواز نے اپنا کیمرا اور موبائل پاجامے کے کُرتے میں چھپالیے تھے۔ اس دوران میں نوجوان نے ربیعہ کو ایک نقشے کی مدد سے سمجھایا کہ انہیں کہاں سے نکلنا ہے۔ نواز نے نقشہ دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ سری نگر کے ایک پوش علاقے کی طرف جارہے تھے جہاں زیادہ تر سرکاری افسران کی رہائش تھی... اور ظاہر ہے، اس علاقے میں سیکیورٹی بھی اسی حساب سے ہوتی۔ اس نے نوجوان سے تصدیق کی۔

"کیا ہم اس طرف جارہے ہیں؟"

"ہاں، ہائیڈ آؤٹ یہیں ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"لیکن یہ تو بہت خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں قدم قدم

پر پولیس اور پیراملٹری والے موجود ہوں گے۔" اس نے اعتراض کیا۔

"ہاں لیکن ایک بار تم وہاں پہنچ گئے تو اس وقت تک کے لیے محفوظ ہوجاؤ گے جب تک تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست نہیں ہوجاتا۔"

"لیکن کچھ دیر پہلے تو مجھے سری نگر سے باہر نکالنے کا پروگرام تھا؟"

وہ تو ہے لیکن فی الحال تو تمہیں کہیں چھپانا ہے۔ ویسے یہ آئیڈیا اس کا ہے۔" نوجوان نے ربیعہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میرے خیال میں تم وہاں محفوظ رہو گے۔" ربیعہ نے سر ہلایا۔

"کہاں؟"

"یہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی رہائش گاہ ہے۔ وہ اکیلا رہتا ہے اور ان دنوں جموں اپنی فیملی کے پاس گیا ہوا ہے۔"

"اس کی رہائش گاہ پر کوئی گارڈ تو ہوگا؟"

"ہاں لیکن وہ مجھے جانتا ہے۔" ربیعہ نے مختصراً کہا اور کھڑی ہوگئی۔ "اب چلو، دیر ہورہی ہے۔"

وہ مکان سے نکلے اور سڑک پر چلنے لگے کیونکہ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا اس لیے جو انہیں دیکھتا، ایک بار ضرور چونک جاتا تھا۔ ربیعہ نے اس سے کہا۔ "ہمیں دور جانا ہے، تم تھک تو نہیں جاؤ گے؟ ہم کوئی سواری نہیں لے سکتے... راستے میں جگہ جگہ چیکنگ ہورہی ہے۔"

"مجبوری ہے جب تم لڑکی ہوکر اتنا حوصلہ کررہی ہو تو میں تو مرد ہوں، مجھے کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ویسے اگر راستے میں کسی نے روک لیا تو میرا لہجہ بھانڈا پھوڑ دے گا۔ میری تو اردو بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم گونگے بن جانا۔" ربیعہ نے کہا۔

نواز اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا جو جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی قوم کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی۔ اسے پکڑے یا مارے جانے کا خوف بھی نہیں تھا۔

"تم کیا کرتی ہو؟" نواز نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہی جو تم دیکھ رہے ہو۔"

"تمہارا گھر ہوگا... ماں باپ، بہن بھائی ہوں گے؟"

"کبھی تھے، اب میرا کوئی نہیں ہے۔" اس نے بنا کسی تاثر کے کہا۔ "سوپور کے ایک گاؤں میں میرا گھر تھا۔ انڈین فوج نے بمباری کرکے میرا گھر تباہ کردیا، سب مارے گئے۔ بس میں بچی تھی۔ مجھے ایک رشتے دار یہاں لے آیا اور اس نے میری پرورش کی۔ لیکن کچھ عرصے پہلے اسے پولیس گرفتار کرکے لے گئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ تب سے میں اکیلی ہوں۔"

"کیا اس گروپ میں زیادہ تر تمہارے جیسے لوگ ہیں؟"

"نہیں، ان میں سے اکثر گھر والے ہیں اور کشمیر کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے تمہارا گروپ لڑاکا نہیں لگتا... تم لوگ کسی انٹیلی جنس کی طرح کام کررہے ہو۔"

"تم نے درست تجزیہ کیا ہے۔ ہم لڑنے والے نہیں ہیں۔ ہم بھارتی حکومت کے عزائم کا پتا چلاتے ہیں۔ جاسوسی کرتے ہیں اور عوام کو متحرک کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ اور ایس ایم ایس کے ذریعے عوام میں بیداری پیدا کرتے ہیں اور دنیا کو حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر روزانہ خبریں جاری کرتے ہیں۔"

"اس کے علاوہ بھی تم لوگ کچھ کرتے ہو۔"

"وہ کیا؟"

"میرا خیال ہے تم لوگوں نے بھارتی فورسز اور سول حکام میں جگہ بنالی ہے اور ان کی جاسوسی کرتے ہو۔"

تم نے درست کہا۔ ہم جس افسر کے گھر جارہے ہیں، وہ ریاستی سرکار میں ایک اہم عہدے پر ہے اور میں تین سال سے اس کے گھر ملازمہ ہوں۔"

نواز چونکا۔ "تم تین سال سے اس کے پاس ملازم ہو؟"

"اس کے لیے میں ہندو مہاوتی ہوں۔"

نواز ہچکچایا۔ "تم کیا کرتی ہو وہاں... میرا مطلب ہے..."

"تم غلط مت سمجھو۔ میں اس کے گھر میں کچن میں کام کرتی ہوں، اس کے لیے کھانا پکاتی ہوں لیکن اس سے کہیں اہم بات یہ ہے کہ میں تحریک اور حریت پسندوں کے خلاف سازشوں سے باخبر ہوجاتی ہوں۔"

نواز نے سکون کا سانس لیا۔ "سوری... تم نے برا منایا تو۔"

"نہیں، میں نے برا نہیں منایا۔ فہیم رائے ہندو ہونے کے باوجود ایک شریف آدمی ہے۔ اکیلے رہنے کے باوجود اس نے کبھی مجھے غلط نظروں سے نہیں دیکھا۔"

"اسے تم پر شک نہیں ہوا؟"

"نہیں، وہ مجھے اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ میں صرف ایک ملازمہ ہوں۔ اس لیے میں شک سے بچی ہوئی ہوں پھر میں ایک قابلِ اعتماد ذریعے سے اس تک پہنچی تھی اس لیے اس نے کبھی شک نہیں کیا۔"

"کبھی تمہارے گروپ کے لوگ پکڑے یا مارے گئے ہیں؟"

http://digestpk.blogspot.com/

اس نے حیرت سے نواز کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے خیال میں ہم محفوظ ہیں؟ حالانکہ ہم حریت پسندوں سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ کشمیر میں کوئی کشمیری محفوظ نہیں ہے سوائے اس کے جو حکومت کے ساتھ ہے۔ ہمارے سات ساتھی اب تک مارے جا چکے ہیں، ایک درجن پکڑے جا چکے ہیں۔ ان میں سے کل ایک تمہیں بچاتے ہوئے مارا گیا۔“

”اوہ... مجھے افسوس ہے۔“

”نہیں، اس میں افسوس کی بات نہیں ہے یہ سب ہم اپنے وطن کے لیے کر رہے ہیں۔“ ربیعہ نے کہا اور اچانک رک گئی۔ اس وقت وہ ایک بڑی سڑک کو عبور کرنے جا رہے تھے۔ سامنے سے کچھ مسلح فوجی آ رہے تھے۔ یہ اس دوران میں نظر آنے والے اولین فوجی تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مڑتے یا راستہ بدلتے، فوجیوں کی نظر ان پر پڑ گئی کیونکہ وہ لباس اور حلیے سے ہندو لگ رہے تھے اس لیے فوجی چوکنا تو نہیں ہوئے لیکن اشارے سے ان کو پاس بلایا۔ ربیعہ نے غیر محسوس انداز میں کہا۔

”ڈرے سہمے ہوئے نظر آؤ، دونوں ہاتھ جوڑ لو۔“

نواز نے ایسا ہی کیا۔ ربیعہ نے پاس جاتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے سرکار ہمیں کیوں روکا؟“

ان میں ایک نان کمیشنڈ آفیسر تھا اس نے حریص نظروں سے ربیعہ کا جائزہ لیا۔ ”کہاں جا رہی ہے... یہ کون ہے تیرا؟“

”پتی دیو ہے۔“

”کیا نام ہے تیرا اور اس کا؟“

”سوشیلا اور یہ پرمان ہے۔“

”یہ کیوں نہیں بولتا؟“

”بولے گا کیسے، بچپن سے گونگا ہے۔“ ربیعہ نے اٹھلا کر کہا۔ وہ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ چاروں فوجیوں کی آنکھیں اس پر گڑی تھیں۔

”کہاں جا رہی ہے، پتا نہیں ہے حالات کیسے خراب ہیں۔ کل اتنے مسلے مارے گئے ہیں، آج وہ شر کریں گے۔“

”پتا ہے، پر کیا کریں نوکر ہیں... کام پر تو جانا پڑتا ہے۔ سجاش جی بڑے افسر ہیں، ان کے بنگلے پر ہم دونوں میاں بیوی نوکری کرتے ہیں۔“

”ان کی نہیں تو کیا ہماری نوکری کرے گی۔“ نان کمیشنڈ آفیسر بولا۔ ”آخر اتنی سندر ناری ہے تو۔“

”تو اب ہم جائیں؟“ ربیعہ نے خوش ہو کر کہا جیسے اسے اپنی تعریف اچھی لگی ہو۔

”ہاں جا۔“ اس نے فراخ دلی سے اجازت دی اور وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

”تم اداکاری اچھی کر لیتی ہو۔“

”یہاں سب کرنا پڑتا ہے۔“ ربیعہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی آبادی کی گلیوں میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

کیشال نے دہلی اور سری نگر ایئرپورٹ کے کیمروں میں محفوظ ہونے والی نواز گل کی تصویریں نکلوائی تھیں اور صبح ہوتے ہی یہ تصویریں شہر میں تلاش پر مامور پولیس اور فوج کے اہلکاروں کو پہنچا دی گئی تھیں۔ جیسے ہی ربیعہ اور نواز فوجیوں کے پاس سے آگے روانہ ہوئے ایک آرمی جیپ وہاں آئی۔ اس میں موجود لیفٹیننٹ نے فوجیوں کو تصویر دی۔

”اس آدمی کو تلاش کرنا ہے۔ زندہ پکڑنا ہے۔“

نان کمیشنڈ آفیسر نے غور سے تصویر دیکھی پھر وہ اچھل پڑا۔ ”یہ تو وہی ہے گونگا پتی دیو۔“

جیسے ہی لیفٹیننٹ کو معلوم ہوا کہ مطلوبہ آدمی ایک عورت کے ساتھ ہندوؤں کے بھیس میں سامنے والی آبادی میں داخل ہوا ہے، اس نے فوراً وائرلیس پر پیغام بھیج دیا۔ پانچ منٹ میں کیشال تک یہ پیغام پہنچ گیا اور وہ اپنے آدمیوں سمیت اس طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت کشمیری اپنے شہدا کے جنازے دفنانے کی تیاری کر رہے تھے۔

☆☆☆

آبادی ختم ہوئی تو اس کے ساتھ باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں آبادی نہیں تھی لیکن باغات کے رکھوالوں کے رہنے کے لیے کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ باغات میں داخل ہوئے تھے کہ نواز نے بلندی سے نیچے آبادی کے ساتھ فوجی گاڑیوں کو رکتے دیکھا۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا۔ اس نے ربیعہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

”میرا خیال ہے ہم ٹریس ہو گئے ہیں، وہ دیکھو۔“

درمیانے سائز کے فوجی ٹرکوں سے فوجی اتر اتر کر آبادی کی طرف جا رہے تھے پھر ایک دستہ باغات کی طرف آنے لگا۔ ربیعہ پریشان ہو گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید کہیں تمہیں پہچان لیا گیا ہے۔“

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے لیکن ابھی وہ باغات کے وسط میں تھے کہ اوپر بھی کچھ گاڑیاں رکتی نظر آئیں۔ ان سے کیشال اور اس کے ساتھی اترے تھے۔ کیشال نے درست اندازہ لگایا تھا کہ وہ ابھی باغات میں ہی ہوں گے۔ اس لیے اس نے اوپر کا رخ کیا تھا۔ اب نیچے فوج تھی اور اوپر

کیشال اور اس کے ساتھی۔ انہوں نے محاصرہ مکمل کر لیا تھا۔ دائیں طرف پہاڑ تھے اور بائیں طرف ایک خالی ڈھلان تھی۔ اس پر آتے ہی وہ نظروں میں آ جاتے۔

باغات بھی بہت بڑے اور گھنے نہیں تھے۔ اس میں زیادہ تر سیب اور اخروٹ کے درخت لگے تھے جو زیادہ بڑے نہیں ہوتے اور ان میں فاصلہ بھی تھا۔ یہاں انہیں تلاش کیا جا سکتا تھا اور وہ چند گھنٹے سے زیادہ روپوش نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ درمیان میں ایک کوٹھری کے پاس رک گئے۔ ربیعہ نے نواز سے کہا۔ ”ہم پھنس گئے ہیں۔“

”میرا خیال ہے تم نکل سکتی ہو۔“ نواز نے آہستہ سے کہا۔ ”انہیں میری تلاش ہے۔“

”میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم چلی جاؤ... میرا خیال ہے یہ اکیلی عورت پر توجہ نہیں دیں گے۔“

”پلیز! چپ کرو... مجھے کچھ سوچنے دو۔“ ربیعہ نے کہا۔ ”تمہیں بچانا بہت ضروری ہے۔“

وہ ایک چھوٹی سی چار دیواری کے اندر تھے۔ اس پر چھت نہیں تھی، ایک طرف ایک کوٹھری تھی۔ اچانک کوٹھری سے ایک آدمی نکلا۔ وہ انہیں دیکھ کر چونکا۔ پھر ان کی طرف آیا۔ ”کون ہو تم؟“

نواز نہیں دیکھ سکا لیکن ربیعہ نے نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا تھا۔ وہ بولی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

یہ کوئی غریب آدمی تھا، پستول دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ ”میں ادھر نگران ہوں جی۔“

”اس کوٹھری میں کیا ہے؟“

”یہاں میں رہتا ہوں۔“

”اور کون ہے اندر؟“

”کوئی نہیں ہے، بس میں ہوں۔“

”تم دیکھ کر آؤ۔“ ربیعہ نے نواز سے کہا اس نے جا کر کوٹھری میں جھانکا اور بولا۔

”یہاں کوئی نہیں ہے۔“

اس دوران میں ربیعہ اس شخص کے بارے میں فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ خطرناک نہیں ہے بلکہ ان کے کام آ سکتا ہے کیونکہ وہ اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے پستول نیچے کر لیا اور بولی۔ ”ہمارے پیچھے پولیس ہے، کیا تم کوئی ایسی جگہ بتا سکتے ہو جہاں ہم چھپ جائیں؟“

آدمی کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”ایک جگہ ہے، وہاں آپ کو سارے انڈیا کی فوج مل کر بھی تلاش نہیں کر سکتی۔“

نواز نے ربیعہ کے پاس آ کر کہا۔ ”ہم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے۔“

”لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔“ ربیعہ نے کہا اور اس شخص سے پوچھا۔ ”وہ جگہ کہاں ہے؟“

”آئیں جی میرے ساتھ۔“ وہ کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ نواز نے پھر کہنا چاہا لیکن ربیعہ نے اسے اشارے سے روک دیا۔ وہ شخص انہیں کوٹھری کے اندر لایا۔ یہاں سوائے ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی اور کچھ معمولی سامان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ چارپائی کے نیچے گھسا اور اس نے نہ جانے کیا کیا کہ نیچے سے زمین کا ایک حصہ تختے کی صورت میں الگ ہو گیا۔ ”اس کے اندر چلے جائیں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”یہ کھلتا اور بند کیسے ہوتا ہے؟“ ربیعہ نے پوچھا۔

”دیکھیں، اس طرح سے کھلتا ہے۔“ آدمی نے عملی طور پر مظاہرہ کر کے دکھایا۔

”اور اندر سے کیسے کھلتا ہے؟“ نواز نے پوچھا۔

”اندر... اندر سے تو نہیں کھلتا ہے جی، باہر سے ہی کھولنا پڑتا ہے۔“

”پہلے تم اندر جاؤ۔“ ربیعہ نے کہا اور پستول کا رخ آدمی کی طرف کر دیا لیکن نواز نے اسے روک دیا۔

”نہیں، پہلے میں جاؤں گا۔“

نواز کو یہ شخص مشکوک لگ رہا تھا اور اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اندر جا کر کوئی ہتھیار نہ نکال لے۔ نواز ربیعہ کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ وہ اسے بھی چھپنے والی جگہ لے جانا چاہتی تھی تاکہ وہ چاہے بھی تو ان کو دھوکا نہ دے سکے۔ نواز چارپائی کے نیچے گھس کر اندر اتر گیا۔ یہاں سیڑھیاں تھیں اور اندر نیم تاریکی تھی۔ نیچے چھوٹا سا تہ خانہ تھا اور وہاں عجیب سی بو رچی ہوئی تھی۔ اس وقت نواز نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اسے کوئی خطرے والی بات نظر نہیں آئی۔ اس نے ربیعہ سے کہا۔

”اسے نیچے بھیج دو۔“

ربیعہ نے اسے نیچے بھیجا اور پھر خود بھی آ گئی۔ اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ربیعہ اندر آئی تو نواز نے دروازے کا معائنہ کیا۔ یہ لکڑی کا تختہ تھا جسے سرکا کر کھول اور بند کیا جاتا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا نظر نہ آنے والا کھٹکا تھا اور اسے اندر سے بھی کھولا جا سکتا تھا۔ یعنی وہ شخص جھوٹ بول رہا تھا۔

ربیعہ نے اسے گھورا۔ ”تم نے جھوٹ کہا تھا۔“

http://digestpk.blogspot.com/

"مجھے آپ دونوں سے ڈر لگ رہا تھا جی۔" وہ شخص گھگیا کر بولا۔

ربیعہ نے ناک سکیڑی۔ "یہ بو کیسی ہے؟"

نواز نے بھی پہلی بار بو پر توجہ دی۔ "یہ... یہ تو شراب کی بو ہے۔"

"شراب..." ربیعہ نے اس شخص کو گھورا۔ "تم یہاں شراب بیچتے ہو؟"

"نہیں جی..." اس نے کہنا چاہا۔

نواز نے اندر رکھے ہوئے پیپوں کو پہلی بار دیکھا اور جب اس نے انہیں چیک کیا تو وہ دیسی شراب سے بھرے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص مجرم تھا اور ممکنہ طور پر بھارتی ایجنٹ بھی تھا کیونکہ بھارتی حکومت اس قسم کے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ کشمیر میں منشیات اور شراب رکھنا کوئی جرم نہیں ہے۔ پولیس بھی نشہ فروخت کرنے والوں اور مجرموں کو گرفتار نہیں کرتی۔ "تم شراب بیچتے ہو؟"

"میں نہیں جی۔" وہ شخص لرزنے لگا۔ اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کے بھیس میں اس کے سامنے مقامی مسلمان تھے۔ "یہ باغ شاہ صاحب کا ہے۔"

"کون شاہ صاحب؟"

"رکن الدین شاہ۔"

"وہ غدار۔" ربیعہ نے نفرت سے کہا۔ "وہ یہ گندے کام بھی کرتا ہے۔"

"جو شخص اپنے لوگوں سے غداری کر سکتا ہے اس کے لیے یہ معمولی جرم ہے۔" نواز نے کہا۔ "اندر آ جاؤ، میں دروازہ بند کر دیتا ہوں۔"

اندر کچھ موم بتیاں رکھی تھیں۔ انہوں نے ایک موم بتی جلائی اور تختہ لگا دیا۔ نگران کو ایک کونے میں بٹھا دیا تھا۔ نواز نے اس سے سوال کیا۔ "یہاں تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟"

"نہیں، میں اکیلا ہوتا ہوں۔"

"اس جگہ کے بارے میں اور کون جانتا ہے؟"

"شاہ صاحب کا منیجر آتا ہے لیکن وہ اس وقت آتا ہے جب شراب لانی یا لے جانی ہو۔ وہ کل ہی ہو کر گیا ہے۔"

"ہماری تحریک کے دشمن ایسے ہی لوگ ہیں۔" ربیعہ بولی۔ "یہ بھارت کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں جو ان کی قوم کے لوگوں کا خون پی رہا ہے۔"

وقت گزاری کے لیے نواز نے تہ خانے کی مکمل تلاشی لی۔ اس کا خیال تھا کہ نگران نے وہاں کوئی اسلحہ نہ چھپا رکھا ہو لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ربیعہ سوچ رہی تھی پھر اس نے نواز سے کہا۔ "یہ باغات بہت بڑے رقبے پر ہیں اور پولیس یا فوج دوپہر تک ان کی تلاشی نہیں لے سکے گی۔"

"دوپہر کے بعد کیا ہوگا؟"

"جنازوں کے بعد دوبارہ جلوس نکلیں گے اور لوگ احتجاج کریں گے۔" ربیعہ نے یقین سے کہا۔

"کل سو سے زیادہ لوگ مارے جا چکے ہیں، یہ آج پھر احتجاج کریں گے؟" نواز نے تعجب سے کہا۔

"مرنا تو کشمیریوں کے لیے کھانے جیسا ہو گیا ہے۔ روز جیتے ہیں اور روز مرتے ہیں۔ اب ہم مرنے سے نہیں ڈرتے۔" ربیعہ نے تلخی سے کہا۔ "بہرحال، جلوس ضرور نکلیں گے اور فوج اور پولیس اس جگہ سے جانے پر مجبور ہو جائے گی، تب ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع ملے گا۔"

نواز نے گھڑی دیکھی، صبح کے نو بج رہے تھے۔ یعنی ان کو کم سے کم چھ گھنٹے یہاں گزارنے تھے۔ انہیں تہ خانے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا، وہاں ہوا کی آمد و رفت کا کوئی نظام تھا اس لیے گھٹن نہیں تھی اور بیٹھنے کے لیے دریاں تھیں۔ اب انہیں صرف وقت گزارنا تھا بشرطیکہ ان کو تلاش کرنے والے پہلے ہی یہاں نہ آ جاتے اور ان کو تلاش نہ کر لیتے۔ یہ بات بھارتی حکومت کے علم میں بھی ہوگی کہ جنازوں کے بعد دوبارہ ریلی نکلے گی اور تلاش کرنے والے اپنا کام جلد کرنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

کیپٹال اور اس کے ساتھی باغات میں گھس آئے تھے۔ ان کے ساتھ فوجی بھی تھے اور تلاشی کا کام وہی کر رہے تھے۔ باغات میں جو شخص نظر آ رہا تھا، اسے گرفتار کر کے بے دریغ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ وہ نواز اور اس کی ساتھی لڑکی کا پوچھ رہے تھے جو ہندوؤں کے بھیس میں تھے۔ ظاہر ہے کسی کو ان کے بارے میں نہیں معلوم تھا اس لیے مظلوم لوگ تشدد سہہ رہے تھے۔ کیپٹال اور اس کے ساتھی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے فوجیوں کے کام میں مداخلت نہیں کی بلکہ یہ تو ان کی دلی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ بنگلے میں حریت پسندوں کے حلیے کے برعکس اس وقت وہ کمانڈوز ٹائپ کی سیاہ وردیوں میں تھے اور سب سے الگ نظر آ رہے تھے۔ کیپٹال کی حالت اب بہتر تھی۔ صرف ناک ذرا سی سوجی ہوئی تھی۔

تقریباً ایک سو فوجی تلاشی کا کام کر رہے تھے لیکن باغات کا رقبہ بہت بڑا تھا۔ کیپٹال تشویش زدہ ہو گیا۔ اس نے سینٹرل کمانڈ سے درخواست کی تھی کہ اسے مزید فوجی دیے

جائیں لیکن ان کی طرف سے معذرت کر لی گئی۔ سری نگر میں فوج کا بڑا حصہ حفاظتی مقاصد کے لیے لگا دیا گیا تھا کیونکہ حکومت کو معلوم تھا کہ دوپہر کے بعد احتجاجی ریلیاں نکلیں گی تو ان سے نمٹنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ کیپٹال سوچ رہا تھا کہ دوپہر تک وہ لوگ ہاتھ نہیں آئے تو اس کے بعد مشکل ہو جائے گی۔ اس نے شمس کو کال کی۔

"مجھے مزید فوجیوں کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ باغات میں چھپے ہیں لیکن تلاش میں دیر ہو سکتی ہے۔"

"میں نے اوپر بات کی تھی لیکن مزید فوجی دینے سے انکار کر دیا گیا ہے۔"

"دو گھنٹے میں صرف بیس فی صد حصہ کلیئر ہوا ہے۔"

شمس کے لیے بھی یہ تشویشناک بات تھی۔ ان کا پہلا پلان تو تقریباً ناکام ہو چکا تھا کیونکہ نواز اور ربنا کی گمشدگی کی اطلاع بین الاقوامی میڈیا پر آ چکی تھی اور اب ان کے توسط سے کوئی ڈراما کرنا ناممکن تھا۔ لیکن اب ان دونوں کو ہمیشہ کے لیے غائب کرنا لازمی ہو گیا تھا جس کے بعد اس کی ذمے داری تحریک آزادی پر ڈالی جا سکتی تھی۔ اگرچہ یہ الزام ان کے پلان کردہ منصوبے جتنا جان دار تو نہیں تھا لیکن اس سے کم سے کم وہ خود کسی الزام سے بچ جاتے۔ اگر نواز بچ نکلنے میں کامیاب رہتا تو ان کے ہاتھ سوائے جگ ہنسائی کے اور کچھ نہیں آتا۔ شمس نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں اور تم بھی تلاش کا کام تیز کرو۔ ویسے تمہیں یقین ہے کہ وہ باغات میں ہی ہیں؟"

"سو فیصد۔" کیپٹال نے یقین سے کہا۔ "کیونکہ ہم نے جتنی تیزی سے اس علاقے کو گھیرا ہے، ان کو یہاں سے نکلنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔"

بارہ بجے تک وہ ایک تہائی باغات چیک کر چکے تھے اور مزید پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ کیپٹال کو اطلاع مل رہی تھی کہ کل کی ریلی میں مارے جانے والوں کے جنازے نکلنا شروع ہو گئے ہیں۔ ماضی میں جب اس طرح بہت بڑی تعداد میں لوگ مارے جاتے تھے تو ان کی نماز جنازہ عام طور سے ایک ساتھ ادا کی جاتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے سے کشمیریوں نے حکمت عملی بدل دی تھی۔ اب وہ پورے شہر سے جنازے لے کر نکلتے تھے اور ریلی کی صورت میں گھما کر ان کو مختلف قبرستانوں میں دفناتے تھے۔ اس طرح وہ پورے شہر کو جام کر دیتے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر حریت پسندوں اور اسلحے کی نقل و حرکت بھی کی جاتی تھی۔ شہری اتنی بڑی تعداد میں گھروں سے نکل آتے تھے کہ فوج اور پولیس کے لیے انہیں روکنا ناممکن

ہو جاتا تھا۔ پھر اس دوران میں وہ فوج اور پولیس کی خالی چوکیوں اور غیر محفوظ سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دیتے تھے۔ رکاوٹوں کی مدد سے سڑکیں اس طرح بند کرتے تھے کہ فوج کے لیے تیزی سے حرکت کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ جو فوجی گاڑیاں محاصرے کی کوشش کرتی تھیں، ان پر پیٹرول بموں سے حملے کرتے تھے۔ اس لیے جب ریلیاں نکلتی تھیں تو فوج اور پولیس چند علاقوں تک محدود ہو جاتی تھی۔

ایک بجے کے قریب وہ ایک چھوٹے باغ میں داخل ہوئے جس میں ایک چھوٹی سی پکی چار دیواری اور اس میں بنی کوٹھری تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کوئی نہیں تھا۔ تلاشی لینے والے فوجی ذرا مایوس تھے کیونکہ انہیں تشدد کے لیے نہ تو کوئی شخص ہاتھ آیا تھا اور نہ ہی کوٹھری میں ایسی کوئی چیز تھی جس کو توڑ پھوڑ کر وہ اپنی وحشت کی تسکین کر سکتے۔ انہوں نے کیپٹال کو رپورٹ دی۔ "یہاں کوئی نہیں ہے سر!"

لیکن کیپٹال کی تسلی نہیں ہوئی، اس نے خود جا کر کوٹھری میں دیکھا۔ وہاں معمولی سا ساز و سامان اور ایک چارپائی کے سوا کچھ نہیں تھا، اچانک اسے خیال آیا۔ اس نے باہر آ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ "چارپائی ہٹا کر دیکھو۔"

سپاہی حکم کی تعمیل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

کوئی چار گھنٹے بعد ان کو اوپر سے آوازیں آنے لگیں۔ ربیعہ نے پستول کا رخ نگران کی طرف کر دیا اور آہستہ سے بولی۔ "اگر تم نے فوجیوں کو خبردار کرنے یا کوئی آواز نکالنے کی کوشش کی تو میں تمہیں فوراً شوٹ کر دوں گی۔"

"میں چپ رہوں گا جی۔" اس نے سہم کر کہا۔

"اسی میں تمہاری عافیت ہے۔" نواز نے اسے خبردار کیا۔ اوپر سے آنے والی آوازوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ نواز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تک آیا۔ وہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ تلاشی لینے والے شاید ابھی برابر والے باغ میں تھے لیکن ان کے شور اور توڑ پھوڑ کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ وہ کسی شخص پر تشدد کر رہے تھے جو چلا رہا تھا اور ان سنگ دل لوگوں کو خدا رسول کے واسطے دے رہا تھا۔ نواز کا دل کہہ رہا تھا کہ اب وہ بھارتیوں کے ہاتھ آ گیا تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ وہ اپنا راز چھپانے کے لیے اسے اور ربنا کو مار کر اس کا الزام حریت پسندوں پر لگا دیں گے اور خود کو صاف بچا لیں گے۔ وہ خوف زدہ تو نہیں تھا لیکن اسے اپنے دادا کا خیال آ رہا تھا۔ ان کا اس دنیا میں وہی ایک سہارا رہ گیا تھا۔ اگر وہ مارا جاتا تو شاید فیاض گل بھی مر جاتا۔ اسی

http://digestpk.blogspot.com/

لمحے اسے کوٹھری سے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ بھارتی ان کے سر پر آگئے تھے۔ انہوں نے کوٹھری کا معائنہ کیا اور کچھ چیزیں الٹی پلٹیں اور باہر نکل گئے۔ وہاں ان کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ انسان اور نہ قیمتی سامان۔ نواز نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ فوجی تلاشی لے کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن چند لمحوں بعد کوئی کوٹھری میں آیا اور پھر نواز نے اسے کہتے سنا۔

”چار پائی ہٹا کر دیکھو۔“

نواز نے بے ساختہ پلٹ کر ربیعہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک ہی بات تھی... انجام آگیا تھا۔ اب خدا ہی انہیں بچا سکتا تھا۔

☆☆☆

کیشال کے حکم کی تعمیل میں فوجی آگے بڑھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ چار پائی کو ہاتھ لگاتے، اچانک کوئی چلّایا۔ ”وہ دیکھو، کسی نے ہمارے ٹرکوں کو آگ لگا دی ہے۔“

کیشال سمیت سب نے بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھا جہاں سڑک پر کھڑے ان کے دونوں ٹرک دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ اس فوجی دستے کا کمانڈنگ آفیسر ایک کیپٹن تھا اور اس نے چلا کر اپنے آدمیوں کو اوپر جانے کا حکم دیا۔ فوجی اس کے حکم پر...... اوپر کی طرف جانے لگے۔ کیشال کیپٹن کی طرف لپکا اور غرا کر بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟ انہیں واپس بلاؤ۔“

”تمہارا دماغ درست ہے۔“ کیپٹن جواباً غرایا۔ ”اوپر میرے آدمیوں پر حملہ ہوا ہے۔“

”ہونے دو، یہ کام زیادہ اہم ہے۔“

کیپٹن کچھ کہنے والا تھا کہ اوپر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور وہ خود بھی اوپر کی طرف بھاگا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ ان باغات میں حریت پسندوں کے گھیرے میں نہ آجائیں۔ بھارتی فوج خود آبادیوں کا محاصرہ کرتی تھی لیکن اسے یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ اس کا محاصرہ کیا جائے۔ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ کیشال کو نظر انداز کر کے اوپر کی طرف جانے لگے۔ کیشال دانت پیسنے لگا۔ اس نے سینٹرل کمانڈ سے رابطے کے بارے میں سوچا لیکن اس دوران میں اوپر سے آتی فائرنگ کی آواز بڑھ گئی تھی۔ کیشال کے ساتھی بھی گھبرائے ہوئے نظر آنے لگے اور ان میں سے ایک نے کہا۔

”ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

کیشال جانے سے پہلے اس کوٹھری کا ایک بار پھر معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”چار پائی ہٹاؤ، مجھے شبہ ہے کہ اس کے نیچے کوئی چھپنے کی جگہ ہے۔“

کیشال کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر چار پائی الٹ دی۔

☆☆☆

نواز تیزی سے نیچے آیا اور اس نے کہا۔ ”وہ نیچے آنے والے ہیں۔“

”میں زندہ گرفتار نہیں ہوں گی۔“ ربیعہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ”ذلت کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنے ساتھیوں کے نام بتانے سے بہتر ہے، میں عزت سے مر جاؤں۔“

”تم کیا کرو گی؟“ نواز بولا۔

”جو اندر آیا، اسے شوٹ کر دوں گی۔“

یہ سن کر نگران کی حالت خراب ہو گئی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ”آپ نے ان پر فائر کیا تو وہ سب کو مار دیں گے، مجھے بھی مار دیں گے۔“

”ہم اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟“ ربیعہ نے سرد لہجے میں کہا۔

”ایک راستہ ہے جی۔“ نگران ہچکچا کر بولا۔ ”لیکن آپ وعدہ کرو، کسی سے نہیں کہو گے۔“

”یہاں کوئی اور راستہ بھی ہے؟“ ربیعہ نے تعجب سے کہا۔ اسی لمحے اوپر سے چیخنے اور فائرنگ کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔

نواز چونکا۔ ”یہ فائرنگ کیسی ہے؟“

ربیعہ خوش ہو گئی۔ ”کھیل شروع ہو گیا۔“ اس نے کہا اور نگران سے بولی۔ ”راستہ بتاؤ، میں وعدہ کرتی ہوں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“

نگران پھرتی سے اٹھا اور اس نے ایک طرف رکھے شراب کے پیپے ہٹائے۔ ان کے نیچے ویسا ہی تختہ تھا جیسا کہ چار پائی کے نیچے تھا۔ اسی لمحے اوپر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے چار پائی الٹ دی ہو۔ نواز بولا۔ ”جلدی کرو، وہ آنے والے ہیں۔“

نگران نے تختہ ہٹا دیا۔ نیچے ایک چھوٹی سی کچی سرنگ نظر آرہی تھی۔ سب سے پہلے ربیعہ اس میں گئی اور پھر نگران داخل ہوا۔ سب سے آخر میں نواز گیا۔ اس وقت اوپر سے تختہ ہٹایا جا رہا تھا۔ سرنگ مشکل سے ڈھائی فٹ قطر کی ہو گی اور اس میں صرف گھٹنوں کے بل چلنا ہی ممکن تھا۔ خود کو بچانے کے لیے وہ بلا تکلف چاروں ہاتھ پیروں سے چل رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ جلد از جلد سرنگ سے نکل جائیں۔ ربیعہ نے پوچھا۔

”یہ کتنی لمبی ہے اور کہاں نکلتی ہے؟“

”فرلانگ بھر لمبی تو ہو گی۔“ نگران ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ادھر ایک نالا ہے، اس کی جھاڑیوں میں نکلتی ہے۔“

سرنگ کی محدود فضا میں ان کی تیز سانسوں اور چلنے کی آواز اس طرح سے گونج رہی تھی کہ ان کو عقب سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ لوگ ان کے پیچھے آرہے تھے۔ ان کا سرنگ سے جلد نکل جانا لازمی تھا۔ وہ بیس منٹ تک اسی طرح سفر کرتے رہے۔ تھکن، مٹی اور زخموں سے ان کا برا حال ہو گیا تھا۔ ہاتھ اور گھٹنے چھل گئے تھے اور کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی تھی۔ جب سرنگ کا دہانہ آیا اور وہ جھاڑیاں ہٹا کر باہر نکلے تو کچھ دیر ان سے سیدھا کھڑا ہوا ہی نہیں گیا۔ جب تک ربیعہ اور نواز سیدھے ہو کر سانس درست کرتے، نگران غائب ہو گیا۔ وہ خاموشی سے کہیں سرک گیا تھا اور وہ بالکل نہیں دیکھ سکے تھے۔ ربیعہ چونکی۔

”یہ کہاں گیا؟“

”شاید بھاگ گیا۔“ نواز نے آس پاس دیکھا۔ ”اب یہاں سے نکلو، وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔“

نواز کا اندازہ درست تھا، سرنگ کے دہانے سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ ربیعہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور وہ تیزی سے لیکن دبے قدموں اس طرف بڑھے۔ آس پاس سے آتی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ زمین کے اوپر بھی ان کی تلاش جاری ہے۔ ایک جگہ وہ نالے سے نکلے اور درختوں میں گھس گئے۔ یہاں نالا ختم ہو گیا تھا اور آگے ہموار زمین تھی۔ اسی لمحے وہ نظروں میں آگئے اور ایک برسٹ چلا۔ گولیاں ان کے آس پاس سے درختوں کو چھیدتی ہوئی گزر گئیں۔ وہ بال بال بچے تھے۔ ربیعہ نے نواز سے کہا۔ ”تم آگے جاؤ، میں انہیں روکتی ہوں۔“

”نہیں، تم بھی چلو۔“ نواز نے انکار کر دیا۔ ”صرف ایک پستول سے تم انہیں نہیں روک سکتیں۔“

”کچھ دیر روک سکتی ہوں۔“ ربیعہ نے کہا۔ ”ورنہ یہ پیچھا کر کے ہم دونوں کو مار دیں گے۔“

نواز سمجھ رہا تھا۔ اب اس کی گرفتاری اہم نہیں رہی تھی اور بھارتی اسے مارنے کی پوری کوشش کرتے اور اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر سکتے تھے۔ ان پر عقب سے اندھا دھند فائرنگ کی جا رہی تھی اور وہ صرف اس لیے محفوظ تھے کہ درمیان میں باغات کی منڈیریں تھیں۔ وہ جھک کر بھاگ رہے تھے اور گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ نواز نے دیکھا کہ فوجی وردیوں کے بجائے سیاہ وردیوں میں ملبوس

افراد ان پر فائرنگ کر رہے تھے، یہ شاید ... تھے۔ انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے وہ تیزی سے ان کی طرف آرہے تھے۔ ربیعہ ایک دیوار کی آڑ میں رک گئی۔ اس سے آگے کھلی جگہ پر گولیاں بہت تیزی سے آرہی تھیں۔ دونوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”نواز! تم نکلنے کی کوشش کرو۔“

نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے، تم دیکھ رہی ہو فائرنگ کتنی شدید ہے۔“

اس وقت پوزیشن یہ تھی کہ باغات کو گھیرنے والی بھارتی فوج اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ شہر بھر سے ریلیاں نکلنا شروع ہو گئی تھیں۔ پھر اوپر موجود ٹرکوں کو پیٹرول بم مار کر آگ لگا دی گئی تھی اور ٹرکوں میں موجود چار سپاہی زخمی ہوئے تھے۔ باغات میں صرف کیشال اور اس کے نصف درجن ساتھی تھے۔ کچھ نے سرنگ میں اتر کر تعاقب کیا تھا اور کچھ زمین پر رہے تھے۔ کیشال نے لڑکی اور نواز کو دیکھ لیا تھا اور وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ کیشال نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

”ان کو قتل کر دو۔“

اس کے آدمی یہی کوشش کر رہے تھے لیکن ربیعہ اور اس کے ساتھ نواز کی قسمت تھی کہ اب تک وہ محفوظ رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک چار دیواری میں گھر گئے جس کے آگے صاف میدان تھا اور وہ اس سے گزرنے کی کوشش کرتے تو یقیناً کیشال اور اس کے آدمیوں کا نشانہ بن جاتے۔ وہ تین اطراف سے ان کو گھیر کر شدید فائرنگ کرنے لگے۔ کیشال کے ہونٹوں پر کل سے پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی، وہ کامیابی کے قریب تھا۔ نواز زندہ نہ سہی، اس کی لاش بھی ہاتھ آجاتی تو یہ بھی اس کی کامیابی شمار ہوتی کیونکہ وہ فیلڈ ورکر تھا۔ پلان کی ناکامی کا ملبا کس پر گرتا اور عین ممکن ہے اسے ایجنسی سے رخصت کر دیا جاتا... اور یہ بھی کیشال کے حق میں بہتر ہوتا۔ اس طرح ممکن ہے، اسے شخص کی جگہ مل جاتی۔ کیشال خود چار دیواری سے ذرا دور رک گیا اور اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ آگے جائیں۔ وہ بادل ناخواستہ آگے بڑھے کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ اگرچہ ابھی تک دوسری طرف سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا لیکن ان کے پاس اسلحے کی موجودگی کا امکان تھا۔ وہ دونوں خودکار رائفلوں سے مسلح تھے اور پوری طرح چوکس بھی تھے لیکن یکے بعد دیگرے دوسری طرف سے دو فائر ہوئے اور کیشال کے دونوں آدمی گر گئے۔ کیشال اور اس کے آدمی بدحواس ہو کر پیچھے آئے اور پھر بے تحاشا فائرنگ کرنے

http://digestpk.blogspot.com/

لمحے اسے کوٹھری سے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ بھارتی ان کے سر پر آ گئے تھے۔ انہوں نے کوٹھری کا معائنہ کیا اور کچھ چیزیں الٹی پلٹیں اور باہر نکل گئے۔ وہاں ان کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ انسان اور نہ قیمتی سامان۔ نواز نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ فوجی تلاشی لے کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن چند لمحوں بعد کوئی کوٹھری میں آیا اور پھر نواز نے اسے کہتے سنا۔

''چارپائی ہٹا کر دیکھو۔''

نواز نے بے ساختہ پلٹ کر ربیعہ کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک ہی بات تھی... انجام آ گیا تھا۔ اب خدا ہی انہیں بچا سکتا تھا۔

☆☆☆

کیشال کے حکم کی تعمیل میں فوجی آگے بڑھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ چارپائی کو ہاتھ لگاتے، اچانک کوئی چلّایا۔ ''وہ دیکھو، کسی نے ہمارے ٹرکوں کو آگ لگا دی ہے۔''

کیشال سمیت سب نے بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھا جہاں سڑک پر کھڑے ان کے دونوں ٹرک دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ اس فوجی دستے کا کمانڈنگ آفیسر ایک کیپٹن تھا اور اس نے چلا کر اپنے آدمیوں کو اوپر جانے کا حکم دیا۔ فوجی اس کے حکم پر...... اوپر کی طرف جانے لگے۔ کیشال کیپٹن کی طرف لپکا اور غرا کر بولا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ انہیں واپس بلاؤ۔''

''تمہارا دماغ درست ہے۔'' کیپٹن جواباً غرایا۔ ''اوپر میرے آدمیوں پر حملہ ہوا ہے۔''

''ہونے دو، یہ کام زیادہ اہم ہے۔''

کیپٹن کچھ کہنے والا تھا کہ اوپر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور وہ خود بھی اوپر کی طرف بھاگا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ ان باغات میں حریت پسندوں کے گھیرے میں نہ آ جائیں۔ بھارتی فوج خود آبادیوں کا محاصرہ کرتی تھی لیکن اسے یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ اس کا محاصرہ کیا جائے۔ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ کیشال کو نظر انداز کر کے اوپر کی طرف جانے لگے۔ کیشال دانت پیسنے لگا۔ اس نے سینٹرل کمانڈ سے رابطے کے بارے میں سوچا لیکن اس دوران میں اوپر سے آتی فائرنگ کی آواز بڑھ گئی تھی۔ کیشال کے ساتھی بھی گھبرائے ہوئے نظر آنے لگے اور ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

کیشال جانے سے پہلے اس کوٹھری کا ایک بار پھر معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''چارپائی ہٹاؤ، مجھے شبہ ہے کہ اس کے نیچے کوئی چھپنے کی جگہ ہے۔''

کیشال کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر چارپائی الٹ دی۔

☆☆☆

نواز تیزی سے نیچے آیا اور اس نے کہا۔ ''وہ نیچے آنے والے ہیں۔''

''میں زندہ گرفتار نہیں ہوں گی۔'' ربیعہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''ذلت کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنے ساتھیوں کے نام بتانے سے بہتر ہے، میں عزت سے مر جاؤں۔''

''تم کیا کرو گی؟'' نواز بولا۔

''جو اندر آیا، اسے شوٹ کر دوں گی۔''

یہ سن کر نگران کی حالت خراب ہو گئی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ ''آپ نے ان پر فائر کیا تو وہ سب کو مار دیں گے، مجھے بھی مار دیں گے۔''

''ہم اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟'' ربیعہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''ایک راستہ ہے جی۔'' نگران ہچکچا کر بولا۔ ''لیکن آپ وعدہ کرو، کسی سے نہیں کہو گے۔''

''یہاں کوئی اور راستہ بھی ہے؟'' ربیعہ نے تعجب سے کہا۔ اسی لمحے اوپر سے چیخنے اور فائرنگ کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔

نواز چونکا۔ ''یہ فائرنگ کیسی ہے؟''

ربیعہ خوش ہو گئی۔ ''کھیل شروع ہو گیا۔'' اس نے کہا اور نگران سے بولی۔ ''راستہ بتاؤ، میں وعدہ کرتی ہوں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

نگران پھرتی سے اٹھا اور اس نے ایک طرف رکھے شراب کے پیپے ہٹائے۔ ان کے نیچے ویسا ہی تختہ تھا جیسا کہ چارپائی کے نیچے تھا۔ اسی لمحے اوپر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے چارپائی الٹ دی ہو۔ نواز بولا۔ ''جلدی کرو، وہ آنے والے ہیں۔''

نگران نے تختہ ہٹا دیا۔ نیچے ایک چھوٹی سی کچی سرنگ نظر آ رہی تھی۔ سب سے پہلے ربیعہ اس میں گئی اور پھر نگران داخل ہوا۔ سب سے آخر میں نواز گیا۔ اس وقت اوپر سے تختہ ہٹایا جا رہا تھا۔ سرنگ مشکل سے ڈھائی فٹ قطر کی ہو گی اور اس میں صرف گھٹنوں کے بل چلنا ہی ممکن تھا۔ خود کو بچانے کے لیے وہ بلا تکلف چاروں ہاتھ پیروں سے چل رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ جلد از جلد سرنگ سے نکل جائیں۔

ربیعہ نے پوچھا۔

''یہ کتنی لمبی ہے اور کہاں نکلتی ہے؟''

''فرلانگ بھر لمبی تو ہو گی۔'' نگران ہانپتے ہوئے بولا۔ ''ادھر ایک نالا ہے، اس کی جھاڑیوں میں نکلتی ہے۔''

سرنگ کی محدود فضا میں ان کی تیز سانسوں اور چلنے کی آواز اس طرح سے گونج رہی تھی کہ ان کو عقب سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ لوگ ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ ان کا سرنگ سے جلد نکل جانا لازمی تھا۔ وہ بیس منٹ تک اسی طرح سفر کرتے رہے۔ تھکن، مٹی اور زخموں سے ان کا برا حال ہو گیا تھا۔ ہاتھ اور گھٹنے چھل گئے تھے اور کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی تھی۔ جب سرنگ کا دہانہ آیا اور وہ جھاڑیاں ہٹا کر باہر نکلے تو کچھ دیر ان سے سیدھا کھڑا ہوا ہی نہیں گیا۔ جب تک ربیعہ اور نواز سیدھے ہو کر سانس درست کرتے، نگران غائب ہو گیا۔ وہ خاموشی سے کہیں سرک گیا تھا اور وہ بالکل نہیں دیکھ سکے تھے۔ ربیعہ چونکی۔

''یہ کہاں گیا؟''

''شاید بھاگ گیا۔'' نواز نے آس پاس دیکھا۔ ''اب یہاں سے نکلو، وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔''

نواز کا اندازہ درست تھا، سرنگ کے دہانے سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ ربیعہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور وہ تیزی سے لیکن دبے قدموں اس طرف بڑھے۔ آس پاس سے آتی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ زمین کے اوپر بھی ان کی تلاش جاری ہے۔ ایک جگہ وہ نالے سے نکلے اور درختوں میں گھس گئے۔ یہاں نالا ختم ہو گیا تھا اور آگے ہموار زمین تھی۔ اسی لمحے وہ نظروں میں آ گئے اور ایک برسٹ چلا۔ گولیاں ان کے آس پاس سے درختوں کو چھیدتی ہوئی گزر گئیں۔ وہ بال بال بچے تھے۔ ربیعہ نے نواز سے کہا۔ ''تم آگے جاؤ، میں انہیں روکتی ہوں۔''

''نہیں، تم بھی چلو۔'' نواز نے انکار کر دیا۔ ''صرف ایک پستول سے تم انہیں نہیں روک سکتیں۔''

''کچھ دیر روک سکتی ہوں۔'' ربیعہ نے کہا۔ ''ورنہ یہ پیچھا کر کے ہم دونوں کو مار دیں گے۔''

نواز سمجھ رہا تھا۔ اب اس کی گرفتاری اہم نہیں رہی تھی اور بھارتی اسے مارنے کی پوری کوشش کرتے اور اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کر سکتے تھے۔ ان پر عقب سے اندھا دھند فائرنگ کی جا رہی تھی اور وہ صرف اس لیے محفوظ تھے کہ درمیان میں باغات کی منڈیریں تھیں۔ وہ جھک کر بھاگ رہے تھے اور گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ نواز نے دیکھا کہ فوجی وردیوں کے بجائے سیاہ وردیوں میں ملبوس [illegible] کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے وہ تیزی سے ان کی طرف آ رہے تھے۔ ربیعہ ایک دیوار کی آڑ میں رک گئی۔ اس سے آگے کھلی جگہ پر گولیاں بہت تیزی سے آ رہی تھیں۔ دونوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''نواز! تم نکلنے کی کوشش کرو۔''

نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے، تم دیکھ رہی ہو فائرنگ کتنی شدید ہے۔''

اس وقت پوزیشن یہ تھی کہ باغات کو گھیرنے والی بھارتی فوج اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ شہر بھر سے ریلیاں نکلنا شروع ہو گئی تھیں۔ پھر اوپر موجود ٹرکوں کو پیٹرول بم مار کر آگ لگا دی گئی تھی اور ٹرکوں میں موجود چار سپاہی زخمی ہوئے تھے۔ باغات میں صرف کیشال اور اس کے نصف درجن ساتھی تھے۔ کچھ نے سرنگ میں اتر کر تعاقب کیا تھا اور کچھ زمین پر رہے تھے۔ کیشال نے لڑکی اور نواز کو دیکھ لیا تھا اور وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ کیشال نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

''ان کو قتل کر دو۔''

اس کے آدمی یہی کوشش کر رہے تھے لیکن ربیعہ اور اس کے ساتھ نواز کی قسمت تھی کہ اب تک وہ محفوظ رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک چار دیواری میں گھر گئے جس کے آگے صاف میدان تھا اور وہ اس سے گزرنے کی کوشش کرتے تو یقیناً کیشال اور اس کے آدمیوں کا نشانہ بن جاتے۔ وہ تین اطراف سے ان کو گھیر کر شدید فائرنگ کرنے لگے۔ کیشال کے ہونٹوں پر کل سے پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی، وہ کامیابی کے قریب تھا۔ نواز زندہ نہ سہی، اس کی لاش بھی ہاتھ آ جاتی تو یہ بھی اس کی کامیابی شمار ہوتی کیونکہ وہ فیلڈ ورکر تھا، پلان کی ناکامی کا ملبا کس پر گرتا اور عین ممکن ہے اسے ایجنسی سے رخصت کر دیا جاتا... اور یہ بھی کیشال کے حق میں بہتر ہوتا۔ اس طرح ممکن ہے، اسے شخص کی جگہ مل جاتی۔ کیشال خود چار دیواری سے ذرا دور رک گیا اور اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ آگے جائیں۔ وہ بادل ناخواستہ آگے بڑھے کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ اگرچہ ابھی تک دوسری طرف سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا لیکن ان کے پاس اسلحے کی موجودگی کا امکان تھا۔ وہ دونوں خودکار رائفلوں سے مسلح تھے اور پوری طرح چوکس بھی تھے لیکن یکے بعد دیگرے دوسری طرف سے دو فائر ہوئے اور کیشال۔ ونوں آدمی گر گئے۔ کیشال اور اس کے آدمی بدحواس ہو کر ا پیچھے آئے اور پھر بے تحاشا فائرنگ کرنے

http://digestpk.blogspot.com/

لگے لیکن ہدف کہاں تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

نواز نے آج تک کسی کو اتنا سچا نشانہ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ ربیعہ نے ایک چھوٹے سے سوراخ سے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے گولی ماردی تھی۔ گولیاں دونوں کی پیشانیوں پر لگی تھیں اور وہ فوراً مر گئے تھے۔ نواز نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا؟''

''اگر میں انہیں نہیں مارتی تو یہ کچھ دیر میں ہم دونوں کو مار دیتے۔'' ربیعہ نے کہا۔ ''اب یہ کچھ دیر ہم سے دور رہیں گے۔ فوج واپس جارہی ہے، یہ اس کی مدد نہیں لے سکتے۔''

''لیکن انہیں مدد مل سکتی ہے۔'' نواز نے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''کہاں سے نکل سکتے ہیں؟'' ربیعہ نے مایوسی سے کہا۔ ''یہاں سے نکلتے ہی ہم ان کی نظر میں آجائیں گے۔ کاش... کہ تم میری بات مان جاتے اور پہلے نکل جاتے تو میں انہیں کچھ دیر تو روک سکتی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کونے سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' نواز نے باغ کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بعد ہمیں صاف جگہ پر کچھ ہی فاصلہ طے کرنا ہوگا۔''

ربیعہ نے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر غور کیا اور بولی۔ ''بہت مشکل ہے۔ فائرنگ کرنے والے کم سے کم چار ہیں۔ ایک دو ہوتے تو بچنے کا چانس بھی ہوتا۔''

''پھر بھی کوشش تو کرنی چاہیے۔ وہ لوگ پاس آرہے ہیں۔'' نواز نے جھانک کر دیکھا۔

وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے اور وہ ایک بار دیوار تک آجاتے تو ان کے بچنے کا امکان ختم ہوجاتا۔ ان کا یہاں سے نکلنا ضروری تھا اور نکلنا بھی مشکل تھا۔ ربیعہ نے باہر دیکھا... گولی اس کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ وہ خطرناک حد تک قریب آگئے تھے۔ ربیعہ نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، کوشش کرتے ہیں... آگے جو اللہ کو منظور۔''

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ جھکے ہوئے اس کونے کی طرف بڑھے جس کے آگے کوئی بیس گز کی خالی جگہ تھی اور اس کے بعد ایک اور دیوار تھی۔ وہ اس تک پہنچ جاتے تو کسی حد تک محفوظ ہوجاتے۔ دیوار کے اس کونے تک پہنچ کر ربیعہ نے نواز سے کہا۔ ''جیسے ہی میں ایک دو تین کہوں، تمہیں بھاگنا ہے۔''

''اور تم؟''

''میں کوشش کروں گی کہ کسی کو پاس نہ آنے دوں... دو کے مقابلے میں ایک کو نشانہ بنانا مشکل کام ہے۔''

بات نواز کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے سر ہلایا اور جیسے ہی ربیعہ نے تین کہا، وہ پوری قوت سے دیوار کی طرف دوڑا۔ اس کے کانوں میں گولیوں کا شور گونج رہا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اس میں ربیعہ کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ بھی شامل تھی جس نے ایک اور بھارتی کو گرادیا تھا۔ گولی اس کے پاؤں میں لگی تھی۔ اس کی فائرنگ کی وجہ سے نواز کو دیوار تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ وہ دوسری طرف کودا اور تیزی سے سانس لینے لگا۔ وہ زندگی میں کبھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر دیکھا تو ربیعہ بھی دوڑتی نظر آئی۔ اس کا پستول خالی ہوگیا تھا اور اب وہاں رکنے کا مطلب زندہ گرفتاری تھی۔ وہ کسی صورت ان درندوں کے ہاتھ زندہ حالت میں نہیں آنا چاہتی تھی جو عورت کی عزت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

پیچھے سے ہونے والی بے تحاشا فائرنگ میں وہ اڑتی ہوئی آئی تھی۔ نواز کھڑا ہوگیا اور چلا چلا کر اسے آنے کو کہہ رہا تھا۔ ربیعہ دیوار کے پاس آگئی تھی اسے ساڑی کی وجہ سے کچھ مشکل ہورہی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس لباس کے ساتھ بھی بھاگ دوڑ کی عادی تھی۔ دس سیکنڈ میں وہ دیوار کے پاس تھی۔ نواز نے ہاتھ بڑھا کر اسے اندر کھینچنے کے لیے سہارا دیا اور اسی لمحے ربیعہ کے جسم کو جھٹکا لگا۔ وہ گرنے کے انداز میں دیوار کے دوسری طرف آئی۔ نواز گھبرا گیا۔

''ربیعہ! کیا ہوا؟''

''کچھ... کچھ نہیں۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ نواز نے دیکھا، اس کی کمر خون سے سرخ ہورہی تھی۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔ اسی لمحے اس باغ میں ایک طرف سے دو مسلح افراد برآمد ہوئے۔ نواز ایک لمحے کو گھبرا گیا لیکن انہوں نے اس پر توجہ دیے بغیر آنے والوں کو نشانہ بنانا شروع کردیا۔ کیشال اور اس کے آدمیوں کی بدقسمتی کہ اب وہ کھلے میں تھے۔

☆☆☆

اس روز موسم بہت سرد تھا۔ شمال سے یخ بستہ ہوا چل رہی تھی اور لندن میں سرما کی پہلی برف باری کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس کے باوجود شہر کی رونق عروج پر تھی۔ سڑک اور فٹ پاتھ لوگوں سے بھرے ہوئے تھے اور لوگ بے فکری سے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ نواز نے رشک سے انہیں دیکھا۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ بدامنی اور غلامی کیا ہوتی

ہے۔ یہاں چند لوگ پلے کارڈز لے کر کسی اہم اسٹریٹ پر مظاہرے کے لیے کھڑے ہوجاتے تو حکومت ہل جاتی تھی۔ اسی دنیا میں بعض ایسے مظلوم خطے بھی تھے جہاں سارے شہر کی آبادی بھی سڑکوں پر آجاتی تو ظالموں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، امن کے معاملے میں بھی دنیا کا توازن خراب ہوگیا ہے۔ نواز ایک ...... کیفے میں بیٹھا تھا۔ وہ دو دن پہلے ہی واپس آیا تھا۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے کرسی پر فران آکر بیٹھ گیا۔ ''کیا حال ہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بے دلی سے بولا۔ ''معاملات نمٹ گئے؟''

''اتنی آسانی سے کہاں نمٹنے والے ہیں۔'' فران نے سرد آہ بھری۔ ''یہ قصہ تو کشمیر کی آزادی تک جاری رہے گا۔''

''ریٹا نے کیا بیان دیا ہے؟''

''یہی کہ اسے نہیں معلوم کہ اسے اغوا کرنے والے کون تھے، وہ بالکل خاموش اور اس کے ساتھ مثبت تھے۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا گزری تھی؟'' نواز کا لہجہ کسی قدر تلخ ہوگیا۔

''اس نے جو بتایا ہے، وہ آف دی ریکارڈ ہے۔'' فران نے کہا۔ ''اسے پبلک میں نہ لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔''

''کیا اس لیے کہ اس میں بھارتی ملوث تھے؟''

''بالکل یہی بات ہے۔ سارا کھیل الٹ گیا۔ ریٹا کی جان بچ گئی، یہ بھی بڑی بات ہے۔ ورنہ جب میں نے اس کے غائب ہونے کی خبر سنی تھی تو میں پرامید نہیں تھا کہ وہ زندہ واپس آسکے گی۔''

''تم مجھے تو خبردار کرسکتے تھے۔'' نواز نے شکوہ کیا۔

''میں یہ کام کیسے کرتا جبکہ میں تمہاری سوچ سے واقف نہیں تھا۔'' فران نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا ہوتا ہے۔''

''یہ سب کیا ہے؟'' نواز نے تذبذب سے کہا۔ ''اس کھیل کا ایک مرکزی کردار ہونے کے باوجود میں اسے پورے طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں۔''

فران اس کے اور اپنے لیے کافی لایا۔ اس نے اپنے کاغذی کپ سے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''اتنا تو تم جان گئے ہو گے کہ میں تحریکِ آزادی کا حامی اور سپورٹر ہوں۔''

''ظاہر ہے۔''

''یہاں میڈیا میں کچھ لوگوں نے کشمیر گروپ بنا رکھا ہے، میں اس کا ایک ممبر ہوں۔ یہ گروپ فی الحال خفیہ ہے کیونکہ اگر ہم منظرِ عام پر آگئے تو [illegible] ہے ہمیں ہماری پوزیشن سے محروم ہونا پڑے۔ اس سازش کی بھنک ہمیں جون میں مل گئی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ آلۂ کار میرے دفتر سے تلاش کرلیے جائیں گے۔ جب تک میں اس سازش سے باخبر ہوتا، اس وقت تک سب طے ہوچکا تھا۔''

''اس لیے تم نے ہمیں اس جہنم میں جانے دیا؟'' نواز کا لہجہ الزام دینے والا ہوگیا۔

''میں نے کہا نا میں مجبور تھا اور اس وقت میں تمہیں منع کرتا تو کیا تم مان جاتے... اور میری بات کو مفروضہ نہیں سمجھتے؟''

نواز نے سوچا اور قائل ہوگیا۔ ''ہاں، شاید میں ایسا ہی سمجھتا۔''

''دوسرے یہ کہ بات کھل جاتی اور میرا کردار بھی سامنے آجاتا۔ بہرحال، میں نے کشمیر میں اپنے روابط استعمال کیے اور تم لوگوں کو بچانے کی کوشش شروع کردی۔''

''یہ کون لوگ ہیں... میں ان کے بارے میں آخر تک نہیں جان سکا؟''

''تمہارا نہ جاننا ہی بہتر ہے۔ یوں سمجھ لو کہ کشمیریوں کی نئی نسل نئے انداز میں اور نئے دور کے ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں اتر آئی ہے، وہ جاسوسی اور میڈیا کی تکنیک استعمال کررہے ہیں۔ کشمیر اور بھارت کی انتظامیہ میں ان کے ایجنٹ کام کررہے ہیں جو ان کو اطلاعات دیتے ہیں۔ یہ انٹرنیٹ اور موبائل کی مدد سے لوگوں کو بیدار کررہے ہیں۔ یہ ان جدید ذرائع کی مدد سے لوگوں کو منظم بھی کرتے ہیں۔ اب ریلی نکالنے یا کوئی اعلان کرنے کے لیے اخبارات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب بھی کوئی فیصلہ ہوتا ہے، چند گھنٹوں کے اندر پوری وادی کو اس کے بارے میں معلوم ہوجاتا ہے۔ لوگ فوراً گھروں سے نکل آتے ہیں، راستے بند کردیتے ہیں اور ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ اس چیز نے بھارتی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ لاکھوں کے مجمع کو منتشر کرنا یا اس سے نمٹنا آسان کام نہیں ہے۔ کہنے کو تو کشمیر میں بھارت کی آٹھ لاکھ فوج اور پیراملٹری ہے لیکن اس کا بڑا حصہ کنٹرول لائن پر ہے۔ شہروں اور آبادی میں استعمال کرنے لیے ان کے پاس محدود تعداد میں فوجی دستے ہیں۔ مزید فوج کشمیر میں لانا آسان نہیں ہے۔ سویلین انتظامیہ ہڑتال سے متاثر ہوتی ہے۔''

''کشمیریوں نے حکمتِ عملی تبدیل کرتے ہوئے مرکزی سیاسی قیادت کے علاوہ اپنا کوئی بھی مرکزی سیٹ اپ بنانے سے گریز کیا ہے۔ بے شمار چھوٹے چھوٹے گروپ تشکیل دیے ہیں جو انٹرنیٹ اور موبائل کی مدد سے ایک دوسرے سے رابطہ

http://digestpk.blogspot.com/

کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بھارتی فوج اور حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے یہ بہت سارے کام کرتے ہیں جیسے سرکاری اور فوجی گاڑیوں کو آگ لگانا، سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کرنا، فون لائنز اور بجلی کی تاریں کاٹنا... رسد کے راستوں کو خراب کرنا یا ان پر رکاوٹیں ڈالنا... تھانوں پر حملے کر کے بے گناہ افراد کو رہا کرانا۔''

نواز متاثر ہوا تھا۔ ''میں اگرچہ عملی طور پر سب دیکھ چکا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ کشمیر کے نوجوان اتنے منظم انداز میں کام کر رہے ہیں۔''

''میرا جس گروپ سے رابطہ ہے، وہ سری نگر میں کام کرتا ہے۔ اس کے کئی اراکین سرکاری محکموں میں ملازم ہیں یا ان کے ملازموں سے کسی طرح روابط ہیں۔ اس سے یہ کشمیری عوام کے خلاف کیے جانے والے اقدامات سے پیشگی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس گروپ میں چند افراد کمپیوٹر اور آئی ٹی کے ماہر بھی ہیں۔ وہ بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرتے ہیں۔ بیرونِ ملک آباد کشمیریوں کو تحریک کی مالی اور ذہنی حمایت پر آمادہ کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر دنیا کے اہم ترین میڈیا تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ ہمارا برٹش گروپ بھی انہی کی کوششوں سے بنا ہے۔ ایسے ہی کئی گروپ دنیا کے اور ترقی یافتہ ممالک میں بن چکے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ آنے والے دنوں میں کشمیر کے مسئلے کو بین الاقوامی ایوانوں میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔''

''لیکن اس سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟''

''کوئی بھی مسئلہ اچانک اور بیٹھے بٹھائے حل نہیں ہو جاتا... اور خاص طور سے قوموں کی آزادی کے مراحل بہت طویل ہوتے ہیں۔ اس میں قدم اٹھانے پڑتے ہیں اور پھر انتظار کرنا ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ابھی کشمیریوں نے قدم اٹھائے ہیں، آزادی کا مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔''

نواز نے گہری سانس لی۔ ''شاید میں جذباتی ہو گیا ہوں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، خاص طور سے اس لڑکی کا مجھے افسوس ہے۔ تمہیں معلوم ہے، وہ یہاں آئی تھی اور دو سال... برطانیہ میں تعلیم حاصل کر کے گئی ہے۔''

''نہیں، میرا اور اس کا ساتھ بہت تھوڑے وقت کے لیے تھا پھر وہ بچھڑ گئی۔'' نواز کا لہجہ غمگین ہو گیا۔ ''تم کہہ سکتے ہو کہ اس نے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔''

''اس نے ایک اچھے کاز کے لیے جان دی ہے۔''

''میری وجہ سے صرف ایک اچھی لڑکی اپنی جان سے نہیں گئی ہے بلکہ کشمیر کی تحریک بھی ایک اچھی کارکن سے محروم ہو گئی ہے۔''

''محروم نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے کچھ اچھے کارکن اور مل گئے ہیں۔'' فران نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

نواز نے سوچا اور مسکرا دیا۔ ''تم نے ٹھیک کہا، اس کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔''

فران فکرمند نظر آنے لگا۔ ''دنیا نائن الیون کے فوبیا سے نکل رہی ہے۔ سچ کو عارضی طور پر چھپایا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھارتی حکومت بھی سمجھتی ہے اس لیے وہ مسئلہ کشمیر کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ صرف ایک سازش تھی جس کا مقصد تحریک کو مغرب میں بدنام کرنا اور ان ملکوں میں آباد کشمیریوں کو دہشت گرد ثابت کرنا تھا۔ یہ سازش ناکام ہو گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھارت مزید سازشیں نہیں کرے گا۔''

''میں سمجھتا ہوں، ہمیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' نواز نے کہا۔

''اب کشمیری دو محاذوں پر لڑ رہے ہیں، ایک کشمیر کا مقامی محاذ ہے اور دوسرا بین الاقوامی محاذ... اور دونوں ایک جیسی اہمیت کے حامل ہیں۔''

''اس سے پہلے کشمیر کے بین الاقوامی محاذ کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی تھی۔'' نواز نے اس سے اتفاق کیا۔

''لیکن اب اس پر توجہ دی جا رہی ہے۔ اس میں کام کی گنجائش بہت زیادہ ہے۔'' فران نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا دوست... پھر ملیں گے۔ ابھی تو تم چھٹی پر ہو۔''

''ہاں اور یہ چھٹیاں میں انٹرنیٹ پر گزارنا چاہتا ہوں۔'' نواز بولا۔

فران مسکرایا۔ ''مجھے امید ہے، وہاں تمہیں کچھ اچھے دوست مل جائیں گے۔''

''مجھے بھی یہی امید ہے۔'' نواز نے کہا اور فران کو جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ پھر اسے ربیعہ یاد آئی۔ اس نے نواز کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ گولی عقب سے اس کے دل کے نچلے حصے کو متاثر کر گئی تھی۔ اسے مرتے مرتے بھی کشمیر کی فکر تھی اور اس نے نواز سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کشمیر کی آزادی کے لیے کام کرے گا اور نواز نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی باقی عمر اس کاز کے لیے وقف کر رہا ہے۔ اس سے وعدہ لے کر ربیعہ سکون سے مر گئی تھی۔ نواز نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس وعدے کو زندگی کی آخری سانس تک نبھائے گا۔

☆